ماہنامہ
کرن
اپریل 2018
کرن کا دسترخوان
PakiBooks.Site

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

بانی ـــــ محمود بابر فیصل

نگران ـــــ محمود ریاض

مدیرہ ـــــ نادرہ خاتون

مدیرِ اعلیٰ ـــــ عامر محمود

نائب مدیرہ ـــــ شعاع عمیر

مدیرہ خصوصی ـــــ امت الصبور

اشتہارات ـــــ خالدہ جیلانی

قانونی مشیر ـــــ نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

حمد — بہزاد لکھنوی — 11

نعت — بہزاد لکھنوی — 11

انٹرویو

روبینہ عارف — شاہین رشید — 12

آواز کی دنیا سے — حماد اسماعیل — 19

میری بھی سنیے — عائشہ جہاں زیب — 16

مقابل ہے آئینہ — آزاد رجسٹ — 24

ناول

شب غم کی سحر — رخ چوہدری — 26

ہوائیں رخ بدل گئیں — نگہت عبداللہ — 206

مکمل ناول

من حاتزم — ام طیفور — 88

ہم ستارے ہوتے — سدرۃ المنتہیٰ — 156

ناولٹ

ڈھل گئی دھوپ — صدف ریحان — 52

غم ہے یا خوشی ہے تو — تنزیلہ ریاض — 133

افسانے

بہت دیر کر دی — نظیر فاطمہ — 129

آنکل پیار محبت — ماورا طلحہ — 42

وہ رات — قرۃ العین خرم — 78

راز — بشریٰ ساہا — 152

زرمینہ — نبیلہ خان — 195

دلہن رہی جو — سویرا فلک — 222

خاندان — مزمل سلیم — 238

محبت کا پھیلاؤ — سیمابت عاصم — 228

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) — 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ — 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 7000 روپے

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو — شعاع عمیر — 244

یادوں کے دریچے سے — بشریٰ محمود — 247

مجھے یہ شعر پسند ہے — شگفتہ سلمان — 249

نہلے پہ دہلا — ذوالقرنین — 252

موتی چنے ہیں — ادارہ — 251

مسکراتی کرنیں — روبینہ شریف — 250

نامے میرے نام — مدیرہ کرن — 253

اپریل 2018

جلد 41 شمارہ 1

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37 - اردو بازار، کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37 - اردو بازار، کراچی

پبلشر نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

PakiBooks.Site

اداریہ

کسی بھی معاشرے میں خرابی اور بدامنی کا پودا نہیں اگتا۔ یہ کچھ طاقت ور اور متعدد افراد کی غلطیاں اس کا سبب بنتی ہیں۔ اگر ان غلطیوں کا ادراک کر کے ان کا تدارک کر لیا جائے تو توازن قائم رہتا ہے۔ لیکن اگر انا اور ضد درمیان میں آجائے تو یہ بیج تن آور درخت بن جاتا ہے۔ جس کی جڑیں پورے معاشرے میں پھیل جاتی ہیں۔

آج پوری دنیا جس انتشار اور بدامنی کا شکار ہے، اس کی اصل وجہ یہ انا، ضد اور عدم برداشت ہے۔ دوسروں کو برداشت کرنے کا جذبہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ اجتماعی سطح پر نہیں انفرادی سطح پر بھی عدم برداشت کے رویے سے خطرناک نتائج سامنے آرہے ہیں۔

میانہ روی، رواداری، تحمل مزاجی ایک دوسرے کو برداشت کرنا، معاف کرنا اور انصاف کرنا، یہ وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں توازن قائم رہتا ہے۔ جس معاشرے میں تحمل اور رواداری اٹھ جائے وہ انسانی معاشرہ کم اور انسانی جنگل کا نقشہ زیادہ پیش کرتا ہے۔ صبر، برداشت کو اپنا لیا جائے تو ہمارے معاشرتی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ قوت برداشت ان اعلا صفات میں سے ہے جو افراد کے لیے انفرادی طور پر اور اقوام کے لیے اجتماعی طور پر فوز و فلاح، کامیابی و کامرانی، عزت و عظمت اور ترقی و سربلندی کا ذریعہ ہیں۔

اس وقت ہم جس صورت حال سے گزر رہے ہیں، اس کی بنیادی وجہ انا، ضد، عدم برداشت اور دوسروں کو تسلیم نہ کرنے کا رویہ ہے۔

اجتماعی سطح پر حالات بدلنے پر ہم قادر نہیں لیکن انفرادی سطح پر حالات کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ دوسروں کا نقطہ نظر سننے، اسے برداشت کرنے کی عادت معاشرے میں بہتری لا سکتی ہے۔

اس شمارے میں،

- فنکارہ "روبینہ عارف" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- آواز کی دنیا سے "حماد اسماعیل" اس ماہ مہمان ہیں،
- فنکارہ "عائشہ جہاں زیب" کہتی ہیں میری بھی سنیے،
- اس ماہ "اقرا جٹ" کے مقابل ہے آئینہ،
- "شب غم کی سحر" نزہ رخ چوہدری کا نیا سلسلہ وار ناول،
- "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- "من عاجزم من بے کسم" ام طیفور کا مکمل ناول،
- صدف عمر کا مکمل ناول "اک نظر چاہیے"،
- "غم ہے یا خوشی ہے تو" تنزیلہ ریاض کا ناولٹ،
- "ڈھلتی عمر کی دھوپ" صدف ریحان گیلانی کا ناولٹ،
- نظیرہ فاطمہ، سیما بنت عاصم، سویرا فلک، قرۃ العین خرم ہاشمی، منزہ سلیم، بشریٰ ساجد، ماورا طلحہ، اور نبیلہ خان کے افسانے اور مستقل سلسلے،

مفت:

"کرن کا دسترخوان" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ مفت حاصل کریں۔

حمد

جب سرور ملا ہے دعا کر کے
تو مسکرایا خدا بھی ستارہ وا کر کے

گداگری بھی اک اسلوب فن ہے جب میں نے
اسی کو مانگ لیا اس سے التجا کر کے

شب فراق کے ہر جبر کو شکست ہوئی
کہ میں نے صبح تو کر لی خدا خدا کر کے

یہ سوچ کر کہ کبھی تو جواب آئے گا
میں اس کے در پہ کھڑا رہ گیا صدا کر کے

یہ چارہ گر ہیں کہ اک اجتماع بد ذوقاں
وہ مجھ کو دیکھیں تری ذات سے جدا کر کے

خدا بھی ان کو نہ بخشے تو لطف آجائے
جو اپنے آپ سے شرمندہ ہوں خطا کر کے

بہزاد لکھنوی

نعت رسول مقبولؐ

مدینے کو جائیں یہ جی چاہتا ہے
مقدر بنائیں یہ جی چاہتا ہے

مدینے کے آقا دو عالم کے مولا
ترے پاس آئیں یہ جی چاہتا ہے

جہاں دونوں عالم ہیں محوِ تمنا
وہاں سر جھکائیں یہ جی چاہتا ہے

محمدؐ کی باتیں محمدؐ کی سیرت
سنیں اور سنائیں یہ جی چاہتا ہے

درِ پاک کے سامنے دل کو تھامے
کریں ہم دعائیں یہ جی چاہتا ہے

دلوں سے جو نکلیں دیارِ نبیؐ میں
سنیں وہ صدائیں یہ جی چاہتا ہے

پہنچ جائیں بہزاد جب ہم مدینے
تو خود کو نہ پائیں یہ جی چاہتا ہے

بہزاد لکھنوی

PakBooks.Site

روبینہ عارف سے ملاقات

شاہین رشید

ایک وقت تھا جب ماں کے کردار کے لیے درمیانی عمر کی آرٹسٹ کے بالوں پہ بھی سفیدی لگا دی جاتی تھی کہ پتا چلے کہ یہ ماں ہے حالانکہ وہ سچ مچ یعنی حقیقت میں بھی جوان بچوں کی ماں ہوتی تھیں ......

اب موجودہ دور میں یہ ٹرینڈ بدل چکا ہے اور اب ماؤں کے بال سفید نہیں کیے جاتے بلکہ وہ جس عمر کی ہوتی ہیں اسی عمر کا انہیں دکھایا جاتا ہے ...... ایسی ہی ایک آرٹسٹ جو ڈراموں میں "ماں" کے رول کرتی ہیں ان سے آپ کی ملاقات کروائیں گے۔ روبینہ عارف جن کا بہ حیثیت ایک آرٹسٹ کے تو تعارف ہے ہی مگر ایک اور تعارف بھی ہے کہ یہ معروف کرکٹر تسلیم عارف (مرحوم) کی بیگم بھی ہیں۔

☆ "کیسی ہیں آپ؟"

❖ "اللہ کا شکر ہے۔"

☆ "کبھی پاکستان تو کبھی امریکا مزے ہیں آپ کے ...... امریکا میں کون ہے آپ کا؟"

❖ "میری بیٹی امریکا میں رہتی ہے اور میں اکثر اس کے پاس چلی جاتی ہوں اور ہاں مزے کی زندگی گزر رہی ہے اور اگر تسلیم عارف صاحب حیات ہوتے تو زندگی اور بھی حسین ہو جاتی۔"

☆ "بالکل ...... وہ نہ صرف بہت اچھے کھلاڑی تھے بلکہ بہت اچھے انسان بھی ان کے جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوا وہ تو خیر ساری زندگی نہیں پر ہو سکتا ...... مگر زندہ رہنے کے لیے بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے اور ......؟"

❖ "جی ...... میں آپ کی بات سمجھ گئی اور میں اس معاملے میں اپنے رب کی اور تسلیم عارف صاحب کی بہت مشکور ہوں کہ وہ ہمارے لیے بہت کچھ چھوڑ کر گئے اور پھر میں خود بھی کام کرتی ہوں تو مجھے اور میرے بچوں کو کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔"

☆ "کہتے ہیں نا کہ خرچ کرنے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے ...... تو ایسا ...... ؟"

❖ "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں خود بھی کماتی ہوں۔ پھر میرے بیٹے جوان ہیں جن کی آمدنی بہت اچھی ہے۔ پھر کرکٹ بورڈ کی طرف سے پینشن ملتی ہے۔ اور تسلیم صاحب کی وفات کے بعد نیشنل بینک نے بھی ایک خطیر رقم میرے اکاؤنٹ میں ڈلوائی تھی۔ تو بس اللہ کا بڑا کرم ہے۔ نہ بچوں کی پڑھائی میں رکاوٹ آئی اور نہ ہی کوئی اور مسائل درپیش ہوئے اور ہاں گھر بھی ہمارا اپنا ہے۔ اور یہ بھی بڑا کرم ہے کہ تسلیم صاحب کی زندگی کے ساتھی دوست، سب ہماری اس طرح عزت کرتے ہیں جس طرح ان کی زندگی میں کرتے تھے۔"

☆ "اپنے بچوں کے بارے میں بتائیں ...... کیا کرتے ہیں؟"

❖ "جب تسلیم عارف صاحب کا انتقال ہوا تو بیٹی مریم عارف تقریباً 21 سال کی تھی، بیٹا بیس سال کا اور چھوٹا بیٹا 16 سال کا تھا۔ اب چھوٹا بیٹا "انیان عارف" کرکٹر بھی ہے اور نیشنل بینک میں جاب بھی کرتا ہے۔ بڑا بیٹا کمپیوٹر انجینئر ہے عمران عارف وہ لندن میں اپنا بزنس کرتا ہے اس کا اپنا گھر بھی ہے اور بیٹی امریکا میں رہتی ہے ...... تینوں شادی شدہ ہیں اور ماشاءاللہ سے میں نانی اور دادی بھی ہوں۔"

☆ "ماشاءاللہ ...... آپ کو اس فیلڈ میں کتنے سال ہو گئے ہیں؟ اور کیسے آئیں؟"

❖ "مجھے اس فیلڈ میں آئے ہوئے تقریباً 20 سال ہو گئے ہیں اور میں اس فیلڈ میں تسلیم عارف صاحب کی مرضی اور اجازت سے آئی تھی۔ مجھے اس فیلڈ میں لانے کا سہرا "کاظم پاشا" کے سر جاتا ہے اور یوں میرا پہلا سیریل "آنچل" تھا جو کہ بہت زیادہ مقبول ہوا اور جب ڈرامہ مقبول ہوا تو آرٹسٹ بھی مقبول ہو جاتے ہیں۔ تو مجھے بھی اس سیریل سے پہچان ملی اور پھر سلسلہ شروع ہو گیا، ایک کے بعد ایک ڈرامے، ٹیلی فلمز اور سیریلز ملنے لگے۔"

☆ "شوق تھا یا اتفاقاً آئیں ...... اور تسلیم عارف صاحب نے کوئی اعتراض کیا؟"

❖ "شوق تھا ...... کالج کے زمانے سے ...... اور کالج کی ڈرامیٹک سوسائٹی کی ممبر بھی تھی اور ایکٹویٹیز میں حصہ بھی لیتی رہتی تھی، میں نے اپنے شوق کا برملا اظہار نہیں کیا تھا، البتہ کاظم پاشا صاحب نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ مجھ میں کچھ کرنے کی صلاحیت ہے۔ انہوں نے آفر دی اور میں نے قبول کر لی۔ بس پھر سلسلہ چل پڑا ...... اور انہوں نے بالکل بھی اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ بہت خوش ہوئے اور میری بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ گھر میں کوئی ٹینشن نہ ہو تو کام کرنے کا مزا بھی آتا ہے اور میں نے ہمیشہ اپنے کام کو انجوائے کیا ہے اور اب تک میں بہت کام کر چکی ہوں۔ بہت سا کام "آن ایئر" ہے اور بہت سا کام "انڈر پروڈکشن" بھی ہے۔"

☆ "آپ کے بچے آپ کو اپنے بچپن سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کا رجحان ہے اس طرف؟"

❖ "میری بیٹی اور بڑے بیٹے کو تو اس فیلڈ میں آنے کا کوئی شوق نہیں۔ نہ انہوں نے کبھی اظہار کیا۔ البتہ میرا چھوٹا بیٹا جو کہ کرکٹر بھی ہے اسے اداکاری کا شوق بھی ہے اور اس نے فلم "میں ہوں شاہد آفریدی" میں کام بھی کیا ہے اور شائقین نے اسے پسند بھی کیا ہے۔ اسے آفرز بھی بہت ہیں لیکن اپنی جاب اور اپنے کھیل کی وجہ سے وہ ڈراموں کے لیے ٹائم نہیں دے پاتا۔ جبکہ میری خواہش ہے کہ وہ ڈراموں میں بھی کام کرے ...... اور ان شاءاللہ وہ ضرور کام کرے گا۔"

☆ "ہمیشہ آپ نے ماں کے رول کیے یا کچھ مختلف رول بھی کیے؟"

❖ "میں ہمیشہ سے ہی ماں کے رول کر رہی

PakiBooks.Site

ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ ''ماں'' کے رول میں بڑی ورائٹی اور بڑی ویری ایشن ہوتی ہے اور ماں کے علاوہ بھی میں نے گیٹ اپ والے رولز بھی کیے ہیں ایک سیریل تھا ''مل کر بچھڑا نہ کرو'' اس میں میں نے ایک غنڈی عورت کا کردار کیا تھا۔ بہت بولڈ کردار تھا اور لوگوں نے بہت پسند کیا تھا اور چونکہ میں ایک ماں ہوں تو مجھے ماں کے رول کرنا ہی اچھا لگتا ہے۔''

☆ ''ان بیس اکیس سالوں میں اور آپ نے اس فیلڈ میں کیا کیا کام کیا؟''

''اداکاری کے ہر شعبے میں کام کیا ہے۔ ٹیلی فلم، سوپ، ڈرامہ سیریل کمرشلز، اور فلم سب میں کام کیا اور سب میں مجھے پذیرائی ملی۔ مجھے سب جگہ کام کرنے کا مزا آیا لیکن فلم میں کام کرنا زیادہ اچھا لگا۔ بڑی سلور اسکرین کا تو اپنا ہی مزا ہے۔ مزید فلمیں کر رہی ہوں لیکن فی الحال تو ایک ہی فلم ریلیز ہوئی ''بھائی لوگ'' کے نام سے، کافی پسند کیا اسے شائقین نے۔''

☆ ''گڈ...... ہماری فلم انڈسٹری اب پھر ایکٹو ہوئی ہے۔ کچھ کہیں گی اس کے بارے میں؟''

''بالکل کہوں گی...... یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہماری فلم انڈسٹری پھر سے ایکٹو ہوئی ہے اور جس طرح آج کل اچھی فلمیں بن رہی ہیں ان شاء اللہ ہماری انڈسٹری بہت ترقی کرے گی اور جس طرح ایک زمانے میں ہماری فلمیں پسند کی جاتی تھیں اسی طرح اب دوبارہ بھی پسند کی جائیں گی...... اب تو بڑے اچھے اچھے سینما ہاؤسز بھی بن گئے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ ڈرامہ تو پسند کیا ہی جاتا ہے فلمیں بھی بہت پسند کی جاتی ہیں۔''

☆ ''ڈرامہ زیادہ مقبول ہے یا فلم؟''

''ڈرامہ اور فلم کی الگ الگ کلاس ہے۔ فلم میں اگرچہ اسٹوری بھی ہوتی ہے لیکن اس میں شائقین کی دلچسپی کا سامان بھی ہوتا ہے جیسے گانے، ڈانس، آئٹم سونگ وغیرہ...... پھر بڑی اسکرین تو لوگ تین گھنٹے میں اچھی خاصی تفریح کر لیتے ہیں۔ میری نظر میں تو ڈرامہ ڈرائنگ روم میڈیم ہے۔''

☆ ''ڈراموں کے بارے میں کیا کہیں گی...... اور اس میں دکھائی جانے والی عورت کے بارے میں کیا کہیں گی؟''

''ہمارے ڈرامے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ ہیں ہمارے ڈرامے کو بہت پسند کیا جاتا ہے...... جہاں تک اس میں دکھائی جانے والی عورت کی بات ہے تو ہمارے [illegible] عورت، مظلوم ہے بھی اور دکھائی بھی جاتی ہے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں تعلیم کی کمی ہے ورنہ دیگر ممالک میں تو پڑھی لکھی خواتین جاب کرتی ہیں۔ دیگر شعبوں میں کام کرتی ہیں اور اپنے گھر والوں کا ساتھ دیتی ہیں ہمارے یہاں بھی اب خواتین بہت آگے نکل چکی ہیں ماشاء اللہ ہر شعبے میں نمایاں ہیں۔''

☆ ''بالکل ہماری عورت باصلاحیت بھی ہے اور ہر شعبے میں ہے مگر ایسے ڈرامے کیوں دکھائے جاتے ہیں ہم لوگ ساس بہو کے جھگڑوں سے ہی باہر نہیں آتے؟''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر چونکہ تعلیم کی کمی ہے اور خواتین کو ہی ایسے ڈرامے پسند آتے ہیں تو ایسے ڈرامے پیش کیے جاتے ہیں۔ بلکہ اب معاشرہ بدل رہا ہے۔ عورت اسٹرونگ ہو رہی ہے اور ہر شعبے میں اپنا لوہا منوا رہی ہے اور ہمارے قرآن نے عورت کو جتنے حقوق دیے ہیں اگر وہ سب خواتین کو مل جائیں تو ہمارے معاشرے کی عورت سب سے زیادہ اسٹرونگ کہلائے گی۔''

☆ ''آج کل کے فنکار کیا اپنے کام کے ساتھ سنجیدہ ہیں؟''

''جو اپنے کام سے سنجیدہ ہوتے ہیں وہ اس انڈسٹری کا مستقل حصہ بن جاتے ہیں اور جو سنجیدہ نہیں ہوتے وہ پھر اسکرین سے غائب ہو جاتے ہیں۔ آج وہ ہی فنکار کامیاب ہے جس کو اس انڈسٹری میں رہنے کے لیے محنت کرنا بھی آتی ہے اسے سیکھنے کا بھی شوق ہوتا ہے۔''

☆ ''محنت کریں لگن سے کام لیں...... اور کوئی

خاص بات جو آپ نئے ٹیلنٹ سے کہیں؟''

''بالکل...... میں نیو ٹیلنٹ سے کہوں گی کہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کریں اور پھر اس فیلڈ میں آئیں۔ کیونکہ اس فیلڈ بلکہ ہر فیلڈ میں تعلیم بہت ضروری ہے۔''

☆ ''نئے لوگ آپ سینئرز کے ساتھ کیسے ہیں؟''

''رویہ اور تربیت لوگ گھر سے لے کر آتے ہیں اور جب نئے لوگ ہمارے ساتھ بیٹھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی تربیت کیسی ہوئی ہے...... یہ کس ماحول سے آئے ہیں اور یہ کتنے دن اس انڈسٹری میں رہ سکیں گے اور مجھے خوشی ہے کہ اس فیلڈ میں اچھے گھرانے کے پڑھے لکھے لوگ آ رہے ہیں۔''

☆ ''ہمارے یہاں ٹائم کی پابندی کا بڑا ایشو رہتا ہے...... کیا اب لوگ وقت کی پابندی کرتے ہیں؟''

''کم سے کم میں اپنے کام کے لیے بہت سیریس ہوں اور وقت کی پابندی بھی کرتی ہوں...... اب تو صبح 10 بجے تک کام ہوتا ہے۔ میں تو وقت پر جاتی ہوں اور اپنے ٹائم پہ فارغ ہو کر گھر آ جاتی ہوں...... اور جن لوگوں کو اپنے کام سے پیار ہوتا ہے لگن ہوتی ہے وہ وقت کی پابندی بھی کرتے ہیں...... ویسے بھی وقت کی پابندی کرانا ڈائریکٹر کا کام ہے اور اب اتنا کام ہو گیا ہے کہ لوگ اگر وقت کی پابندی نہیں کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔''

☆ ''آپ ایک زندہ دل شخصیت کی مالک لگتی ہیں...... کیا ایسا ہی ہے؟''

''بالکل ایسا ہے۔ مجھے فلم دیکھنا خاص طور پر سینما میں بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے گھر سے باہر کھانا کھانا اچھا لگتا ہے۔ گھومنا پھرنا اچھا لگتا ہے۔ فیملی کے ساتھ گھومنا پھرنا مجھے بہت بہت اچھا لگتا ہے۔''

☆ ''ملک سے باہر جاتی ہیں۔ گھر کی سجاوٹ کے لیے چیزیں لاتی ہوں گی آپ؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنا...... اسے سجانا بنانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ کھانا پکانے کا بھی شوق ہے مگر ٹائم کم ملتا ہے ویسے میرے ہاتھ میں ذائقہ ہے بچے بہت پسند کرتے ہیں میرے کھانوں کو۔''

☆ ''گیمز سے لگاؤ ہے...... پی ایس ایل کے میچ دیکھے آپ نے؟''

''کرکٹ اور فٹ بال بہت پسند ہے اور پی ایس ایل کے میچز بھی دیکھے۔ بہت انجوائے کیا۔''

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے روبینہ عارف صاحبہ سے اجازت چاہی۔

☆☆☆

PakiBooks.Site

میری بھی سنیئے

عائشہ جہاں زیب

شاہین رشید

1 ''میرا نام؟''

''عائشہ جہاں زیب۔''

2 ''پکاری جاتی ہوں؟''

''momce۔''

3 ''اس دنیا میں آئی؟''

''22 جنوری کو...... تو اسٹار بنتا ہے ''دلو'' اور قد پایا میں نے 5 فٹ 3 انچ۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔''

4 ''تعلیمی میدان سر کیے؟''

''ایم فل انگریزی لٹریچر۔''

5 ''شادی؟''

''الحمدللہ شادی ہو چکی ہے اور ماشاء اللہ سے تین بچے ہیں۔''

6 ''فیلڈ میں آئی؟''

''حادثاتی طور پر گھر میں صرف ''اماں'' نے اعتراض کیا پھر مان گئیں۔ انہیں اس فیلڈ میں خاص طور پر اس پروگرام میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔''

7 ''خواب دیکھتی تھی کہ......؟''

''میں ایک اچھی رائٹر ہوں مگر بن نہ سکی مصروفیات اور ذمہ داریوں نے۔''

8 ''خبرناک میں آنے سے پہلے؟''

''گھر داری اور ٹیچنگ میں مصروف رہتی تھی۔ اب خبرناک میں مصروف رہتی ہوں۔ خبرناک کرکے مزا آرہا ہے۔''

9 ''میری ایک اچھی عادت؟''

''کہ مجھے صبح اٹھنے کی عادت ہے اور اس کی وجہ اسٹوڈنٹ لائف اور پھر چھ سال کی ٹیچنگ اور اب بچوں کو اسکول بھیجنا۔''

10 ''مجھے گریز ہے؟''

''اپنے پسندیدہ کاموں کا۔ گھر کی صفائی ستھرائی کرنے کا اور اپنے ہاتھوں سے کھانا پکانا۔''

11 ''تنہائی کا سہارا کب لیتی ہوں؟''

''جب غصہ آتا ہے۔ جب کوئی میری بات نہ سمجھے تو بس پھر اپنا کمرہ اور تنہائی...... کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی...... کیونکہ کمرہ لاک ہوتا ہے۔''

12 ''میں ڈرتی ہوں؟''

''اپنے ہی غصے سے۔''

13 ''مجھے آفرز ہیں؟''

''اس فیلڈ کے ہر شعبے میں کام کرنے کی آفر ہے۔ ماڈلنگ کی بھی فلم کی بھی اور اداکاری کی بھی...... مگر ابھی کچھ نہیں کرنا سوائے خبرناک کے۔''

14 ''کبھی شوق تھا؟''

''آئینہ دیکھنے کا...... بس اب تو تیار ہوتی ہوں تو آئینے میں دیکھ لیتی ہوں کہ صحیح تیار ہوئی ہوں کہ نہیں...... اور کیسی لگ رہی ہوں۔''

15 ''میرا دل چاہتا ہے؟''

''ایک خوب صورت جزیرہ ہو اور میں ہوں بس۔''

16 ''بھوک مٹانے کا بہترین طریقہ؟''

''میں تو پھل کھاتی ہوں۔ تازگی کا احساس ہوتا ہے اور سب کو پھل کثرت سے کھانا چاہیے۔''

17 ''ایک تہوار جو یاد آتا ہے؟''

''مجھے بسنت بہت پسند تھا...... مگر جب سے اس پہ پابندی لگی ہے کوئی تہوار بھایا ہی نہیں۔''

18 ''کیا بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟''

''سب کچھ ہی اچھا پکاتی ہوں، مگر سرسوں کا ساگ بٹیر اور حلیم میں بہت ذائقہ آتا ہے۔''

19 ''گھر میں کس جگہ کھانا کھانے میں مزا آتا ہے؟''

''صرف اور صرف اپنے بیڈ پہ انجوائے کرتی ہوں۔''

20 ''لڑکے اس وقت بہت برے لگتے ہیں؟''

''جب وہ جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں۔''

21 ''میری ایک ایکسٹرا صلاحیت؟''

''چھٹی حس بہت اسٹرونگ ہے۔''

22 ''میرے بیگ میں ہر وقت موجود ہوتی ہیں؟''

''ایک عدد لپ اسٹک، کاغذ، پنسل، چیونگم اور کچھ پیسے۔''

23 ''لوگوں کی معصومانہ فرمائش؟''

''پلیز ایک سیلفی بنوالیں۔''

24 ''میں فکر مند رہتی ہوں؟''

''نئی جنریشن سے کہ ان کا کیا بنے گا۔''

25 ''جھوٹ بولنا کب ضروری ہو جاتا ہے؟''

''جب کسی کو بچانا ہوتا ہے تو جھوٹ بولتے

میں کوئی عار نہیں ہوتا۔"

26 "مجھے اچھا لگتا ہے؟"

◆ "اپنے بچوں پہ خرچ کرنا اور اپنی پسند کی کراکری لینا۔"

27 "بچپن کی ایک عادت جو ابھی بھی موجود ہے؟"

◆ "بچپن میں بہت ضدی ہوتی تھی۔ پھر یہ عادت کم ہوگئی، مگر ختم نہیں ہوئی..... ابھی بھی کسی بات کی ضد آجائے تو ضرور پوری کرتی یا کرواتی ہوں۔"

28 "میرے لیے ذرا مشکل ہوتا ہے؟"

◆ "اپنی غلطی کو تسلیم کرنا۔"

29 "بہت اتھلاتی ہوں، فخر کرتی ہوں؟"

◆ "جب کوئی میری تعریف کرتا ہے۔ میری خوبیاں بیان کرتا ہے۔ مجھے عزت دیتا ہے۔"

30 "میرا بہترین تعلیمی دور؟"

◆ "جب میں "ایم فل" کر رہی تھی۔"

31 "ایک دیرینہ خواہش؟"

◆ "کہ ورلڈ ٹور کروں۔"

32 "سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں؟"

◆ "اپنے بچپن کے کھلونے...... مجھے نہیں یاد کہ میں نے کوئی کھلونا توڑا ہو۔"

33 "مشورہ مانتی ہوں؟"

◆ "اپنے دل کا۔"

34 "اپنی کمائی خرچ کرتی ہوں؟"

◆ "اپنے پر..... اپنے بچوں پر۔"

35 "بچت کرتی ہوں؟"

◆ "بچت..... ارے کہاں ہوتی ہے۔ ہو جائے تو کیش کی شکل میں رکھتی ہوں تاکہ ضرورت پڑنے پہ کام آئے۔"

36 "کس کے بغیر گزارہ کر سکتی ہوں؟"

◆ "موبائل کے بغیر...... مشکل ہوگی، پھر عادت ہو جائے گی۔"

37 "تجربات سکھاتے ہیں؟"

◆ "جی ہاں سکھاتے ہیں..... مگر میں تو اپنے ہی تجربے سے سیکھتی ہوں۔"

38 "گھر میں میرا پسندیدہ کمرہ؟"

◆ "سن روم......Sun Room"۔

39 "محبت کے بارے میں میری سوچ؟"

◆ "کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ مگر لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔"

40 "کھانے میں پسندیدہ چیز؟"

◆ "کیچپ۔"

41 "سچی محبت کی پہچان؟"

◆ "برے وقت میں پکاریں یا قریب آجائے گا یا دور ہو جائے گا۔"

42 "کب نہیں تھکتی؟"

◆ "جب میں لانگ ڈرائیو پہ ہوتی ہوں۔"

43 "بچپن میں بہت کھائی تھی؟"

◆ "کینڈیز، بہت کھائی تھی اور اب بھی کھاتی ہوں۔"

44 "گھر آتے ہی دل چاہتا ہے؟"

◆ "میرا کمرہ ہو اور میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

45 "نیند نہیں آتی؟"

◆ "جب تک اپنے پاؤں نہ دھولوں..... پاؤں دھوئے بغیر تو اپنے بیڈ پہ بھی نہیں جاتی۔"

46 "میری کوشش اور خواہش ہے کہ؟"

◆ "میری کتاب جلدی شائع ہو جائے۔"

47 "گھر میں پسندیدہ لباس؟"

◆ "عموماً جینز پہنتی ہوں۔"

48 "گھر سے باہر جاؤں تو اپنے ساتھ لازمی رکھتی ہوں؟"

◆ "پانی کی بوتل، فروٹ اور پیسے۔"

49 "خبریں شیئر کرتی ہوں؟"

◆ "اپنے دوستوں کے ساتھ اور اپنے شوہر کے ساتھ۔"

50 "انتقام لیتی ہوں؟"

◆ "ارے نہیں...... بلکہ اپنا فیصلہ اللہ پہ چھوڑ دیتی ہوں۔"

☆☆

آواز کی دنیا سے

حماد اسماعیل

شاہین رشید

PakiBooks.Site

ریڈیو تو انسان کے لیے اس کے جنم جنم کا ساتھی ہے جب کچھ نہیں ہوتا دل بہلانے کو تو ریڈیو ہوتا ہے کیونکہ ریڈیو اپنے سامعین کو ہر طرح سے انٹرٹین کرتا ہے۔ آج کل پی ایس ایل کے میچز ہو رہے ہیں...... لوڈ شیڈنگ ملک سے ختم ہوئی نہیں لہذا کرکٹ کے "جنونی" ریڈیو سے ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور لمحہ لمحہ باخبر رہتے ہیں۔ تو جناب دنیا کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، ریڈیو کی اہمیت کبھی کم نہیں ہو گی۔

ریڈیو کو زندہ رکھنے میں ریڈیو کے پریزینٹرز کا بہت ہاتھ ہے۔ یہ اپنی آواز، اپنے انداز اور اپنے پروگرام کے ذریعے سامعین کے دلوں پہ راج کرتے ہیں۔ ایف ایم 105 کے پریزنٹر حماد اسماعیل بھی سامعین کے دلوں میں راج کرتے ہیں۔ اس بار "آواز کی دنیا" میں حماد اسماعیل ہمارے مہمان ہیں۔

☆ "کیا حال ہیں حماد صاحب؟"

◆ "جی الحمدللہ۔"

☆ "آپ کی فیلڈ کے بارے میں تو ہم باتیں کریں گے ہی لیکن ضروری ہے کہ پہلے آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

◆ "جی میں راجپوت ہوں اور راجپوت کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بہادر ہوتے ہیں۔ اور میں واقعی بہت بہادر ہوں۔ اور مشکلات کو سہہ جانے کی طاقت ہے مجھ میں۔ بہن بھائیوں میں میرا نمبر پہلا ہے، پھر میری چھوٹی بہن ہے اور پھر دو بھائی ہیں۔ والد صاحب پیشے کے لحاظ سے الیکٹریکل انجینئر ہیں...... گریجویٹ ہوں میں...... میٹرک اسلامیہ پبلک اسکول گلشن اقبال سے کیا۔ وہیں گلشن اقبال کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا اور پھر اسلامیہ کالج سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ شادی شدہ ہوں، گھر والوں کی پسند سے ہوئی اس لیے اسے ارینج میرج کہیں گے۔ میرا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں ہم سب اور اس حوالے سے میں ہمیشہ اپنے پروگرام میں کہتا ہوں کہ خوشیاں بانٹنے سے خوشیاں بڑھتی ہیں اور غم بانٹنے سے کم ہوتے ہیں۔ اور یہی ہماری تربیت کا حصہ بھی ہے کہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو شیئر کریں اور میں اپنی خوشیاں اپنی فیملی اور اپنے سامعین سے شیئر کرتا ہوں۔ اور اپنی پریشانیاں اپنی فیملی سے شیئر کرتا ہوں تو پریشانیاں کم ہوتی ہیں اور اچھے مشورے بھی مل جاتے ہیں۔"

☆ "2003ء میں آپ نے ریڈیو جوائن کیا یہ وہ دور تھا جب ہمارے ملک میں بڑی

تیزی کے ساتھ چینلز بھی کھل رہے تھے تو آپ ٹی وی کی سائیڈ کیوں نہیں گئے؟''

❖''جی......ریڈیو سے میری وابستگی 2003ء سے ہے اور ٹی وی کی طرف کیوں نہیں گیا۔ تو اس زمانے میں ریڈیو ایف ایم کا بھی ایک چارم تھا اور لوگ بھی اس طرف آرہے تھے تو مجھے بھی شوق ہوا، آر جے بننے کا اتنا رجحان نہیں تھا جتنا ریڈیو کی فیلڈ میں کچھ کام کرنے کا تھا ———— ریڈیو کے مختلف شعبوں میں کام کرتے کرتے آر جے بنا اور سینئر پروڈیوسر بھی ہوں۔''

☆''ٹی وی شہرت بھی دیتا ہے اور پیسا بھی، ریڈیو کیا دیتا ہے......صرف ریڈیو ہی کرتے ہیں یا کوئی اور جاب بھی کرتے ہیں؟''

❖''ریڈیو خود ایک جاب ہے اور بہت سے آر جے ریڈیو کو پارٹ ٹائم جاب کے طور پر بھی کرتے ہیں، لیکن میں جب سے ''اپنا کراچی 107'' کے ساتھ بہ حیثیت سینئر پروڈیوسر کے منسلک ہوا ہوں۔ تب سے ریڈیو ہی میری فل ٹائم جاب ہے اور فیملی کو ٹائم دینا وہ بھی ایک طرح سے جاب ہی ہے۔ اس کو ٹائم دینا وقت پر سارے کام مکمل کرنا فیملی کے ساتھ بہت ضروری ہوتا ہے......اور جناب ٹی وی بالکل شہرت دیتا ہے۔ لیکن ریڈیو کا جو پھیلاؤ ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ بہت سی جگہوں پہ بہت سے گھروں میں ٹی وی نہیں دیکھا جاتا صرف ریڈیو سنا جاتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ جب موبائل فون پہ ایف ایم ریڈیو ضرور ہوتا تھا۔ اور لوگ سنتے تھے اور سنتے ہیں اور جو سنتے ہیں وہ ہمیں جانتے بھی ہیں اور جب کسی محفل میں یا کہیں بھی میں اپنا نام لیتا ہوں تو جواب ملتا ہے کہ میں آپ کو سنتا تھا یا سنتی تھی اور ہم آپ کے نام سے آپ کی آواز سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ تو اس وقت اچھا بھی بہت لگتا ہے اور اپنائیت کا احساس بھی ہوتا ہے کہ کوئی تو ہے جو مجھے جانتا ہے۔''

☆''ریڈیو کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟ پی ایس ایل دیکھ رہے ہیں؟''

❖''ریڈیو کے علاوہ بھی کافی مصروفیات اور ایکٹوٹیز ہیں۔ اسپورٹس سے بہت لگاؤ ہے۔ باڈی بلڈنگ کا شروع سے شوق ہے مگر اب وقت ذرا کم ملتا ہے۔ اور پی ایس ایل دیکھتا ہوں بہت شوق سے اور چونکہ کراچی میں رہتا ہوں تو کراچی کنگ کو سپورٹ کرتا ہوں لیکن پاکستان سے بہت محبت اور ساری ٹیمیں بہت اچھی ہیں بہت محنت کرتی ہیں، میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر میچ کو پورا دیکھوں۔ کرکٹ سے بہت لگاؤ ہے اور ان میچ رہتا ہوں ہر ٹیم سے اور اپ ڈیٹ بھی رہتا ہے اور کرکٹ کے حوالے سے اپنے سامعین سے سوالات بھی کرتا ہوں۔ اور مزے کی بات یہ کہ جب بھی فارغ ہوتا ہوں تو محلے کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ ضرور کھیلتا ہوں۔ گو کہ تھوڑی مشکل ہوتی ہے مگر کھیلتا ضرور ہوں۔''

☆''آپ کے پروگرام کا فارمیٹ کیا ہوتا ہے؟ اسکرپٹ لکھتے ہیں؟ تیاری کس طرح کرتے ہیں؟''

❖''ایف ایم 107 میں آنے سے پہلے ایف ایم 105 میں میں پروفیشن شوز کرتا تھا کو کانٹینٹ اور ریفنڈ شوز ہوتے ہیں اور ہوتے تھے اور میں کوشش

کرتا ہوں کہ کالز پہ اور ایس ایم ایس پہ زیادہ بھروسا نہ کیا جائے۔ بلکہ اپنا کانٹینٹ ہو اور تیاری نہیں کرتا مطلب اسکرپٹ نہیں لکھا البتہ پوائنٹس بھی کبھار لکھ لیتا ہوں اور اس میں میرے خیال سے کوئی قباحت نہیں ہے۔ جہاں تک تیاری کی بات ہے تو اخبارات پڑھنا میرا معمول ہے خواہ میں شو کروں یا نہ کروں اور نیوز بھی ضرور سنتا ہوں کہ معلوم ہو کہ دنیا بھر میں اور پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ سیاست میں کیا ہو رہا ہے۔ اسپورٹ میں کیا ہو رہا ہے۔ شوبز کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے تاکہ اگر کوئی کسی موضوع پہ بات کرے تو اس کی ہسٹری میرے پاس ضرور ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی آر جے کے لیے کسی بھی شو کے لیے تیاری کرنا بہت ضروری ہے......صرف آ کے مائیک کھلنا اور بولنا شروع ہو جانا شو کرنا نہیں ہوتا......آپ کی تیاری میں پلے لسٹ کا ہونا ضروری ہے اور آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ آپ کے پروگرام میں کس طرح کے کس ٹیمپو کے سونگ ہونا ضروری ہیں۔ سب کچھ آپ کے پاس تیار ہونا ضروری ہے۔''

☆''آر جے بننے کے لیے کیا کوئی ٹریننگ بھی ہوتی ہے اور آواز اچھی ہونی چاہیے یا انداز؟''

❖''آر جے بننے کے لیے میری نظر میں ٹریننگ ضروری نہیں ہے بلکہ آپ کا مشاہدہ اچھا ہونا بہت ضروری ہے کچھ اداروں نے ٹریننگ دینے کا کام شروع کیا تھا مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ آپ کے اردگرد کیا کام ہو رہا ہے، لوگ کس طرح اظہار کر رہے ہیں، اپنے احساسات کا، یہ جاننا بہت ضروری ہے......اور گزشتہ دنوں میں نے اپنے سامعین سے بھی پوچھا کہ آر جے کے لیے آواز کا اچھا ہونا ضروری ہے یا لہجے کا......تو لوگوں نے کہا کہ لہجہ اچھا ہونا چاہیے، اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ آواز سے زیادہ لہجے کو اہمیت دیتے ہیں اور لہجہ اچھا ہو تو پھر شاید لوگوں کو آواز بھی اچھی لگنے لگتی ہے......پھر لہجے سے آپ

کی تربیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی اچھی ہے کتنی مناسب ہے کچھ لوگوں کی آواز بہت اچھی ہوتی ہے مگر وہ مائیک کے لیے کام نہیں کر سکتے کہ ان کا لہجہ اور بولنے کے انداز اچھا نہیں ہوتا۔''

☆''ایک پروفیشنل آر جے کی کیا تعریف ہے؟''

❖''میرے خیال میں ایک پروفیشنل آر جے میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ جب آپ اسٹوڈیو کے اندر داخل ہوتے ہیں تو باہر کی دنیا سے کچھ ٹائم کے لیے الگ ہو جاتے ہیں آپ کی پسند نہ پسند سب ختم ہو جاتی ہے۔ میں اگر کسی ریڈیو اسٹیشن پہ کام کر رہا ہوں تو مجھے لازمی ان کی پالیسی کے تحت کام کرنا ہوتا ہے۔ اگر میں اداس ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ کوئی دکھی گانے سنوں تو میں ایسا نہیں کر سکتا......اب میں صبح کے وقت پروگرام کرتا ہوں تو یہ وہ ٹائم ہوتا ہے جب لوگ ہلکے پھلکے فریش کر دینے والے گانے سننا چاہتے ہیں، تاکہ ان کی صبح اچھی ہو جائے۔ میں اپنی وجہ سے کسی کو اداس نہیں کر سکتا۔ تو وہ دو تین گھنٹے جو میں لوگوں کے

ساتھ مائیک کے ذریعے سے رہتا ہوں مجھے لوگوں کے لیے اور اپنی فیلڈ کے لیے کام کرتا ہوتا ہے۔ اس وقت میں حماد اسماعیل نہیں لوگوں کا پسندیدہ آر جے ہوتا ہوں۔"

☆ "جب ٹریفک میں پھنس جاتے ہیں تو اپنے اردگرد کن چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں؟ کبھی لیٹ ہوئے؟"

"جب میں ٹریفک میں پھنستا ہوں تو میں دیکھتا ہوں کہ دوسری گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ریڈیو سن رہا ہوتا ہے تو تھوڑا یہ ضرور ہوتا ہے کہ کون سا ایف ایم سن رہا ہے اور اگر نہیں تو دیگر لوگوں کی ایکٹویٹیز کیا ہیں اور وقت کے معاملے میں ہمیشہ بہت احتیاط کرتا ہوں کہ اگر مجھے کہیں 12 بجے جانا ہوتا ہے تو گھر سے اس طرح نکلتا ہوں کہ لازمی طور پر پونے بارہ بجے تک پہنچ جاؤں، وقت پہ پہنچنے کا قائل ہوں میرے لیے کبھی کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں لیٹ آتا ہوں۔"

☆ "کیا نیا ٹیلنٹ آرہا ہے اور نئے ٹیلنٹ کے لیے آپ کیا کہیں گے؟ آپ نے نیا ٹیلنٹ متعارف کرایا؟"

"میں جب اس فیلڈ میں آیا تھا تو سنا یہی ہوا تھا کہ سینئرز نئے لوگوں کے لیے تھوڑا پرابلم کرتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے، کافی سارے نئے لوگ اس فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں اور آ بھی رہے ہیں اور میں نئے ٹیلنٹ کے لیے یہ ضرور کہوں گا کہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ آر جے بن جائے، شاید فیم کے لیے لیکن ہر شخص کی ایک ذمہ داری ہوتی ہے، کہ جب آپ مائیک پہ آئیں اور پروگرام کریں تو یہ سوچ کر کریں کہ لوگ آپ کو سن رہے ہیں اور کئی لوگ آپ کو فالو بھی کر رہے ہیں، اگر آپ ستاروں کے حوالے سے کوئی بات کر رہے ہیں تو وہ بڑے غور سے سنیں گے کہ ان کے ستارے کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے۔ تو نیا ٹیلنٹ ضرور آئے مگر تمام تر ذمہ داریوں کے ساتھ، صرف فیم کے شوق میں نہ آئے...... اور جہاں تک یہ بات کہ میں نے ٹیلنٹ متعارف کرایا یا نہیں تو میں اب نام تو نہیں لوں گا لیکن میں کافی لوگوں کو آگے لے کر آیا اور انہیں اچھے مشورے بھی دیے اور کوشش کی کہ جس طرح میرے سینئرز نے ہمیشہ مجھے صحیح راہ دکھائی اسی طرح میں بھی نئے ٹیلنٹ کو صحیح راہ دکھاؤں اور بحیثیت سینئر پروڈیوسر کے میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں نئے ٹیلنٹ کو صحیح طرح گائیڈ کروں۔"

☆ "کبھی پروگرام کے دوران چھینک آئی یا کوئی اور گڑبڑ ہوئی؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ ریڈیو کی جو لائیو لی نیس وہ ہی ریڈیو کی پہچان ہے چھینک آجانا یا کھانسی وغیرہ ہونا تھوڑا گلا خراب ہونا سب نیچرلی ہے اور جو سننے والا ہے وہ بھی ان چیزوں کو سمجھتا ہے کہ جو صاحب یا صاحبہ پروگرام کر رہے ہیں وہ مشین نہیں ہیں بلکہ انسان ہیں...... ہاں کچھ باتیں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ ریڈیو پہ نہیں ہونی چاہیے وہ میں ہونے نہیں دیتا...... جیسے اگر کوئی بریکنگ نیوز آجائے تو اس وقت اپنے آپ کو بالکل نارمل رکھنا ہوتا ہے تو میں اپنے آپ کو نارمل رکھتا ہوں اور اس انداز میں نیوز بریک کرتا ہوں کہ سننے والے کو اندازہ ہو کہ اس وقت ہمارے اردگرد کیا تبدیلیاں آرہی ہیں یا ملک میں کیا ہو رہا ہے۔"

☆ "ایف ایم کے سفر میں کہاں کہاں پڑاؤ کیا اور ریڈیو میں کیا کشش کھینچ لائی؟"

"جہاں تک کشش کی بات ہے تو مجھے شوق تھا اور شوق ہی مجھے ریڈیو پہ لایا لیکن یہ امید نہیں تھی کہ میں اتنا عرصہ ریڈیو پہ گزار دوں گا...... بڑا اچھا لگتا تھا جب میں ریڈیو پہ پروگرام سنتا تھا کہ لوگ کس طرح پروگرام کر لیتے ہیں...... FM107 سے اپنے شوق کا آغاز کیا...... آؤٹ ڈور براڈ کاسٹنگ کرتا تھا لوگوں کو ٹریفک کے بارے میں آگاہ کرتا تھا...... پھر 107 سے ہی پروگرام کا آغاز کیا۔ اس کے بعد ایف ایم 103 سے پروگرام کیے، پھر ہوٹ ایف ایم 105 سے پروگرام کیے اور اب دوبارہ میں ایف ایم 107 سے منسلک ہو گیا ہوں۔ میں نہ صرف پروگرام کرتا ہوں بلکہ سینئر پروڈیوسر بھی ہوں۔"

☆ "سرکاری ریڈیو اور پرائیویٹ ایف ایم میں فرق ہے سرکاری FM میں پاکستانی گانے لگائے جاتے ہیں اور پاکستان کی ہی بات کی جاتی ہے پرائیویٹ ایف ایم ایسا کیوں نہیں کرتا؟"

"پرائیویٹ ایف ایم چینل بھی پاکستان کی ہی بات کرتے ہیں، پاکستان کی ہی ترجمانی کرتے ہیں...... البتہ میوزک کے حوالے سے میری رائے کچھ مختلف ہے میں سمجھتا ہوں کہ جب دوسرے ممالک ہماری میوزک لگاتے ہیں اور ہماری میوزک کو پسند کیا جاتا ہے تو پھر ہمارے ملک میں بھی دوسرے ممالک کی میوزک کو پسند کیا جا سکتا ہے...... تو میرا خیال ہے کہ پڑوسی ملک کی میوزک سنوانے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے...... لوگ ہر طرح کا میوزک سننا پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں نا کہ میوزک کی کوئی زبان نہیں ہوتی تو میوزک کے معاملے میں روک ٹوک اچھی نہیں لگتی...... تو ہم چاہتے ہیں کہ لوگ اپنی پسند کا میوزک سنیں...... اور باقی یہ کہ اپنا ملک ہے ہم اس کی بات نہیں کریں گے تو پھر کس کی کریں گے۔"

☆ "چلیں جی یہ بتائیں کہ آپ مزاج کے کیسے ہیں؟ گھر والوں کو کتنا ٹائم دیتے ہیں؟"

"مزاج کا اچھا ہوں اور میرا نہیں خیال کہ میں گرم ہوں۔ باقی صحیح رائے تو میرے بارے میں دوسرے ہی دے سکتے ہیں...... گھر والوں کو کتنا ٹائم دیتا ہوں۔ یہ ذرا مشکل سوال ہے اور شاید ٹائم مینجمنٹ میں میں فیل ہوں، گھر والوں کا یہی شکوہ ہوتا ہے کہ آپ ہمیں ٹائم نہیں دیتے۔ مگر میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ میں گھر والوں کو پراپر ٹائم دوں۔"

☆ "کھانے میں کیا پسند ہیں؟"

"کھانے کا شوقین ہوں اور بریانی مجھے بہت پسند ہے اور جب معلوم ہوتا ہے کہ کراچی میں فلاں جگہ کی بریانی بہت اچھی ہوتی ہے تو میں وہاں جا کر ضرور ٹرائی کرتا ہوں کہ کیسی ہے بریانی۔"

☆ "فیلڈ کے بارے میں ایک اور سوال کہ ڈبنگ کمرشلز وائس اوور یا اداکاری کی؟"

"اداکاری میں کوئی تجربہ نہیں کیا، اور ریڈیو کے حوالے سے اگر وائس اوور کرنی پڑے تو ضرور کرتا ہوں، ڈبنگ کا تجربہ کیا بھی تھا اور کرتا رہتا ہوں اگر موقع دیا جاتا ہے۔"

☆ "اس فیلڈ میں کس کو اپنا رہنما یا مخلص سمجھتے ہیں؟"

"اس فیلڈ میں اتنی پروفیشنل ازم آچکی ہے کہ کوئی کسی کو نہ گائیڈ کرتا ہے اور نہ ہی کوئی کسی کے ساتھ مخلص ہے...... لیکن میں اس لحاظ سے بہت خوش قسمت ہوں کہ جب میں اس فیلڈ میں آیا تو جس شخص نے مجھے بہت سکھایا اور آج تک میں جن سے سیکھ رہا ہوں اور جن کی مدد لیتا ہوں میں ان کا نام ضرور لینا چاہوں گا "انجی" ان کا نام ہے اور سب ان کو اسی نام سے جانتے ہیں اور یہ وہ شخص ہیں جنہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور یہ بتایا کہ کس طرح درست طریقے سے ریڈیو پہ کام کیا جاتا ہے کس طرح پروفیشنل طریقے سے کام کیا جاتا ہے۔"

"اور اس کے ساتھ ہی ہم نے حماد اسماعیل صاحب سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا۔

☆☆

اقراء جٹ

ادارہ

س: ''اصلی نام کیا ہے، گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟''

ج: ''میرا نام اقراء ہے اور گھر والے پیار سے ''اقی، اقو، اکو، میری'' سے پکارتے ہیں۔ بہت سے سوئٹ ناموں سے پکارا جاتا ہے کیا کیا بتائیں اب۔''

س: ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج: ''آئینہ بہت کچھ کہتا ہے ناقابل بیان (الفاظ نہیں)۔ آئینہ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں اور نیک اچھی صورت کے ساتھ نیک اچھی سیرت مانگتی ہوں۔''

س: ''حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟''

ج: ''حسین صورتیں دیکھ کر کوئی خیال نہیں آتا بھئی، ہم خود ماشاء اللہ سے اتنے حسین ہیں کہ اگلا دنگ رہ جاتا ہے (پچی بھی مذاق نہیں سمجھنا' ہاہاہاہا)۔''

س: ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو کیا ملے گا؟''

ج: ''میں کچھ بھی اکثر پاس نہیں رکھتی (پرس، پاؤچ)۔ اگر ہو تو پیسے، رنگز، آئینہ (چھوٹا سا)، ٹشو پیپر اور بھی ایسی بہت سی چیزیں۔''

س: ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج: ''ڈرتی بھی ہوں اور نہیں بھی۔''

س: ''مہمان کیسے اچھے لگتے ہیں؟''

ج: ''مہمان بہت اچھے لگتے ہیں، اللہ کی رحمت ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی تھوڑی دیر کے لیے آئیں تو مجھے غصہ بھی آرہا ہوتا ہے کہ اتنی جلدی واپسی۔''

س: ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج: ''کھانا اب تو ہم خود بنانے لگے ہیں، چکن کڑاہی، پلاؤ، شاہی زردہ، قیمہ اور فش پکوڑے۔''

س: ''اگر آپ کو ایک دن کی حکومت مل جائے تو؟''

ج: ''پہلی بات تو مل نہیں سکتی اگر کبھی مل بھی جائے (خیالی دنیا سے) تو ہم سب کے چہروں پر سچی مسکراہٹ دیکھنا چاہیں گے۔''

س: ''پسندیدہ شاعر؟''

ج: ''مختلف شاعروں کے مختلف شعر پسند ہیں جن میں اکثریت علامہ محمد اقبال، وصی شاہ، فیض احمد فیض اور احمد فراز ہیں (خود بھی شاعری کرنے لگی ہوں) بابا بلھے شاہ کے کلام سے عشق ہے۔''

س: ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج: ''مزاجاً شریف ہی ہوں (ہاہاہا)۔ میرا مزاج کوئی ایک ہو تو بتاؤں نا۔ پل پل بدلنے والے مزاج رکھتی ہوں، ویسے تھوڑی سخت مزاج ہوں۔''

س: ''کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟''

ج: ''مجھے تقریباً ہر مزاج کے لوگ ہی ٹھیک لگتے ہیں، دو غلے، منافقت والے لوگ زہر لگتے ہیں۔ مخلص لوگ اپنے جیسے بہت زیادہ پسند ہیں۔''

س: ''اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو؟''

ج: ''ایسا سوال.... ؟ پاکستان میں لوڈشیڈنگ نہ ہو اُف...... پہلی بات ایسا ہوگا نہیں اگر ہو بھی جائے تو ہم سب بل ادا کرتے کرتے ہی ختم ہو جائیں گے (ہی ہی ہی)۔''

س: ''اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت؟''

ج: ''اللہ کو یاد کرنے کا بہترین وقت تنہائی ہوتی ہے، اکثر رات کو دو، تین بجے یاد کرو تو ایک وجد سا سکون طاری ہو جاتا ہے دل پر۔ ایک سکون سا ملتا ہے، بے اختیار دل سے اللہ اللہ نکلتا ہے بس اسی حالت میں رہنے کو جی چاہتا ہے۔''

س: ''آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟''

ج: ''دونوں ہی ہوں اور نہیں بھی (ہاہاہاہا)۔ نہیں سمجھے نا، مجھے خود نہیں پتا (ہے نا مزے کی بات)۔''

س: ''کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟''

ج: ''کسی کسی کا ضرور ہوتا ہے مگر میرا، مجھے نہیں پتا۔ مجھ پر تو بہت سخت آزمائشیں ہیں، بس دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

س: ''وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے سوچ آتی ہے، دنیا کیا کہے گی؟''

ج: ''دنیا کی عادت ہے ہر کام میں کیڑے نکالنا (باتیں کرنا، یقین جانیے میرے اپنوں نے ہی مجھے اتنا ہرٹ کیا ہے کہ کوئی سوچ نہیں سکتا۔ اتنی سی عمر میں اتنے دکھ کوئی سوچ نہیں سکتا۔ بس میرا دل جس بات پر مطمئن ہو، وہی میں کرتی ہوں۔''

س: ''آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟''

ج: ''کافی ڈراؤنی سچویشن ہے، سنسان راستہ اور پیچھے کتا لگا ہوا، اُف...... کیا فلمی سین ہے (فلم کے مطابق تو آگے ساجن کے سینے سے جا ٹکرانا چاہیے، ہاہاہا)۔ کتا اگر سنسان راستے میں پیچھے لگ جائے تو بھاگ کر کسی درخت پر چڑھ جاؤں گی (ماہر ہوں)۔ ساتھ ساتھ کچھ صورتیں پڑھنی شروع کر دوں گی۔''

س: ''آپ کی نظر میں محبت؟''

ج: ''ایک پاکیزہ احساس ہے، ہر رشتے میں فیوی کول کا کام کرتی ہے محبت۔ میری ہر بات محبت سے شروع محبت پر ختم۔''

س: ''کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟''

ج: ''اللہ تعالیٰ کے احسانات ہیں جی بس، اس کا کرم ہے ورنہ یہ گناہ گار بندی کسی قابل نہیں۔ (ویسے جو لوگ میرے ساتھ مخلص ہیں، مجھ لیں وہ بھی مجھ پر احسان ہی ہے)۔''

س: ''اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟''

ج: ''تعریف کس کو اچھی نہیں لگتی ؟ اور میں تو تعریف سننے کی عادی ہوں۔ بچپن سے آج تک تعریف ہی ہوئی ہے، ہر کام میں اور اور آل بھی (یہ الگ بات ہے پہلے چاہے بے عزتی بھی ہو جائے)۔''

س: ''ڈرامے دیکھتی ہیں؟''

ج: ''ڈرامے دیکھتی ہوں اگر ڈیڈی صاحب رحم کر کے کیبل لگوا دیں۔''

س: ''اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہیں؟''

ج: ''اگر کوئی ناراض ہو جائے تو میں مناتی نہیں کیونکہ میری غلطی ہوتی ہی نہیں، بس اکیلے بیٹھ کر رو لیتی ہوں، ویسے میرے خاص دوست نہیں۔''

س: ''زندگی سے کیا سیکھا؟''

ج: ''سب لوگ مطلبی ہیں، میرے یقین کا بہت لوگوں نے خون کیا ہے۔ میری زندگی ویران ہو گئی، ہر سپنا ٹوٹ گیا اس مطلبی دنیا کی وجہ سے، مگر اب ویسا اعتبار نہیں کرتی مگر ساتھ ضرور دے دیتی ہوں اگر کوئی مجبور لگے تو۔''

س: ''ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟''

ج: ''ستاروں کو گردش رکھنے والی اللہ کی ذات ہی ہے، بس اللہ کی ذات پر یقین ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں۔''

س: کوئی آخری بات؟

ج: ''بات تو آخری ہو نہیں سکتی مگر بس اتنا کہوں گی کسی کا دل نہ دکھائیں، کسی کے ساتھ دھوکا دہی نہیں کریں۔ کسی کو اتنا پریشان نہ کریں کہ وہ اپنی ہی نظروں میں گر جائے۔ اتنا یاد رکھیں ہر وقت، ہر جگہ اللہ دیکھ رہا ہے۔''

☆☆

PakiBooks.Site

رخ چوہدری

شبِ غم کی سحر

یہ دسمبر کے اوائل کی بے حد سرد صبح تھی۔ رات بھر سے برف باری ہو رہی تھی۔ لندن کے اس علاقے میں ہمیشہ ہی برف باری تمام ملک سے زیادہ ہوتی تھی۔ موسم جتنا شدید تھا۔ اتنا ہی اس بات کا متقاضی کہ انسان اس سرد موسم کی جان لیوا ٹھنڈ سے بچنے کا اہتمام کرے۔ مگر موسموں کے چونچلے تو وہ لوگ اٹھاتے ہیں۔ جن کے پاس وسائل ہوں۔ مگر ہر جگہ پر ایسے لوگ بستے ہیں۔ جن کے پاس وسائل کم اور مسائل زیادہ ہوتے ہیں کہ ایک سانس کی...... سہولت بھی آسانی سے حاصل نہیں کرتے۔ وہ ایک وقت کھانے کے لیے بھی گرم سے گرم سرد سے سرد موسم سے لڑتے ہیں۔ تاکہ کم از کم ایک وقت کا کھانا تو مل جائے۔

اور اسی ایک وقت کے کھانے اور بیمار کی دوا کے لیے وہ بڑھیا جگہ جگہ سے پھٹے۔ پیوند زدہ سوئٹر اور پھٹے جوتوں کے ساتھ ایک نائٹ کلب کی عمارت کے نیچے بیٹھی تھی۔ چہرے پر عمر کی جھریوں نے اس کے چہرے پر غربت اور افلاس کی ساری کہانی لکھ ڈالی تھی۔ سردی کی شدت سے وہ کٹی بیٹھی تھی سامنے پھٹا ''ہیٹ'' رکھا تھا۔ جو بطور ''کشکول'' استعمال کر رہی تھی۔ صبح سے شام اور شام سے اب رات ہونے جا رہی تھی ہر گزرتا پل ٹھنڈ میں اضافہ کرتا ہوا بڑھیا کو اٹھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے اپنی چندھی آنکھوں سے اسٹریٹ لائٹس کو دیکھا...... کمزور جھریوں بھرے ہاتھوں سے ہیٹ کے اندر ٹٹولا کہ اتنی رقم ہوگئی ہے کہ بیمار بڈھے شوہر کے لیے ایک وقت کا کھانا اور ایک وقت کی دوا خریدی جا سکتی ہے۔ مگر اندازہ ہو گیا تھا کہ اسے اور بیٹھنا پڑے گا۔ وہ جو آتے جاتے بندے کے آگے ہیٹ کرتی جس کو کچھ ڈالنا ہوتا۔ ڈالتا آگے بڑھ جاتا...... اور یہ وہ لوگ ہوتے جو دائیں بائیں سے آتے یا قریبی شاپنگ مال سے آتے جاتے سکہ ڈال جاتے۔ نائٹ کلب سے برآمد ہونے والے تو اوباش قہقہے لگاتے گزر جاتے۔ وہ نشے میں اتنے دھت ہوتے کہ اسے اپنا ہیٹ اٹھا کر بچانا پڑتا۔

ان ہی نشئی بازوں میں سے ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکا اور لڑکی بے ہودہ قہقہے لگاتے ...... اس کے

انتہائی قریب سے گزرے...... آگے بڑھتے لڑکی رکی...... مڑی اور بڑھیا کے قریب آکر رک گئی اور ہیٹ اٹھا کر پیسے گننے لگی۔ بڑھیا پہلے تو خوف زدہ ہوئی پھر منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ لڑکی بدتمیزی سے جھکی۔ اس کے سامنے سکے اچھال کر ہیٹ میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"ہائے اولڈ لیڈی واٹ یو وانٹ۔"

بڑھیا ضرورت مند تھی عام غریب بھکاریوں کی طرح اپنی داستان بڑھا چڑھا کر سنانے لگی۔ لڑکی اور لڑکا مستی میں "چچ...... چچ" کرتے رہے۔ پھر بدتمیزی سے ہنستے ہوئے لڑکی نے ہیٹ اس عورت سے چھین لیا۔ عورت گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ انگریزی میں اسے گالیاں دینے لگی۔ لڑکا کچھ گھبرایا شاید اسے بڑھیا کی جھریوں پر ترس آگیا تھا۔ یا اس کی سنائی ہوئی داستان کا اثر ہوگیا تھا۔ اس نے لڑکی کو منع کیا۔

"ڈونٹ ڈو دس تھنگ"

"اوہ کم آن...... چل" لڑکی نے ہیٹ میں سے جمع شدہ رقم نکالی اور بوائے فرینڈ کا ہاتھ پکڑ کر قہقہے لگاتی بھاگ گئی۔ اس غریب عورت کی آہیں اور بددعائیں بھی اس کو سنائی نہیں دیں۔ بڑھیا...... فرش پر گری روتی رہی۔

☆☆☆

اور آپ کی نظر ہے "سلیم منزل" سلیم منزل اپنی بناوٹ اور خوب صورت نقش و نگار کے لحاظ سے قدیم فن تعمیر کا شاہکار نظر آتی ہے۔ سلیم منزل میں کئی پیڑیاں آباد ہوئیں فنا ہوئیں۔ اور ہر پیڑھی کے ساتھ اس منزل کی نسلوں کا نوابی خون تو نسل در نسل چلتا رہا مگر نوابی جاہ و جلال اور ٹھاٹھ باٹھ میں دائیں بائیں کے خون اور زبانوں کی ملاوٹ کی وجہ سے سلیم منزل میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔

جیسے اس وقت سلیم الدین اپنی نسل کے ساتھ یہاں آباد ہیں۔ ان کے خاندان میں...... خود سلیم الدین، دو بہنیں کبریٰ خاتون، ذکیہ خاتون ہیں جو کہ بیاہ کر شہر سے الگ آباد ہیں۔ سلیم الدین اپنے والدین کے اکلوتے چشم و چراغ فرزند تھے اور ان کی والدہ حمیدہ خاتون اپنے اکلوتے نور نظر کے لیے دل میں ڈھیروں ارمان رکھتی تھیں اور بیٹے کی شادی اپنی ہی برادری میں یعنی کہ کسی نوابی خون نوابی زبان اور نوابی رسم و رواج والی لڑکی سے کرنا چاہتی تھیں۔

مگر کیا کیجیے کہ نکاح کی گرہ لگانا ان کے اختیار میں تو تھا نہیں کہ کسی نوابن کو سلیم الدین کی دلہن بنا کر لے آتیں۔ انہوں نے تو ابھی ڈھنگ سے لڑکیاں دیکھی بھی نہیں تھیں کہ ان کے میاں نواب علیم الدین — اپنے دیرینہ دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ کو بطور بہو پسند کر آئے۔

ملک غیاث احمد بہت ہی اچھے انسان تھے۔ زر...... زمین کیا نہیں تھا ان کے پاس بھینسوں کے باڑے! کھیت کھلیان...... ہرا اناج گھر کا...... آموں کا باغ غرض قدرت نے سر سے پیر تک نواز رکھا تھا۔ مگر طبیعت اتنی حلیم اتنے منکسر المزاج بس کہ کبھی ملازم کو ملازم نہیں سمجھا۔ اتنے فراغ دل کہ بغیر کسی غرض کے ہر کسی کی مدد کے لیے جان و دل سے حاضر ہوتے وہ مدد خواہ مالی ہوتی یا کسی بھی قسم کی ہوتی۔ ملک غیاث احمد بہت بزلہ سنج اور زندہ دل انسان تھے۔ علیم الدین نوابی خون رگوں میں رکھتے تھے اسی لیے...... لیے دیے رہتے دوستی میں بھی نوابی پن دکھاتے...... مگر ملک غیاث احمد ایسے انسان تھے کہ علیم الدین ان کی دوستی سے دامن بچا نہ سکے۔

اور پھر دونوں کی دوستی دو جسم یک قالب والی حیثیت اختیار کر گئی۔ گھروں میں آنا جانا ہوا تو ایک دن اپنی ذاتی ملازمہ کے ساتھ گزرتی ہوئی شگفتہ کا جو آنچل ڈھلکا...... وہیں میاں سلیم کا دل اٹکا۔ نظریں ہٹانا بھول گئیں سرخ و سپید انتہائی خوب صورت سی معمولی تعلیم بلکہ نہ ہونے کے برابر تعلیم کے باوجود شگفتہ بیگم نے سلیم الدین کے دل میں جذبوں کے باغ کھڑے کر دیے......

PakiBooks.Site

اور اب سلیم الدین جو پڑھ رہے تھے۔ جس کے لیے والدہ نے ڈھیروں خواب دیکھ رکھے تھے اور ارادہ کیے بیٹھی تھیں کہ۔

"اپنے سلیم کی دلہن تو ہم لکھنؤ ہی سے لے کر آئیں گے۔ ہمیں یہاں کی لڑکیاں پسند نہیں۔" اب اللہ ہی جانے کہ حمیدہ بیگم نے غرور کیا تھا کہ نہیں بہر حال...... ان کے ارمانوں کی نوخیز کلیوں پر جب بے موسمی برسات بری شگفتہ بیگم کی صورت تو وہ زار و قطار روئیں۔ کونوں کھدروں میں خود سے ہی لپٹ لپٹ کر دہائی دی کہ۔

سکھی ہم تو لٹ گئے برباد ہو گئے
ہمارے ننھے میاں ہم سے کھو گئے

ہر چند کہ انہوں نے اپنے اس خود ساختہ غم میں اپنی صاحب زادیوں کو شریک کرنا چاہا مگر دونوں اپنے اپنے گھروں کو اتنی پیاری تھیں کہ کبریٰ نے صاف کہہ دیا کہ......

"اماں جان بھائی کی پسند لاجواب ہے آپ کو اور کیا چاہیے کہ شگفتہ بھابھی جیسی کھاتے پیتے گھرانے کی حسین لڑکی مل رہی ہے۔"

"آپا بیگم ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں جان شگفتہ بھابھی بہت اچھی ہیں بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں ہیں ستواں ناک ہے۔ مانیے کھلتا گلاب ہیں ہماری شگفتہ بھابھی بس آنکھیں بند کیجیے اور ہاں کر دیجیے۔"

ذکیہ خاتون نے بھی اپنی پسندیدگی کی مہر اس رشتے پر ثبت کر دی تو حمیدہ خاتون کو جگہ نہ مل پا رہی تھی کہ اپنی کھسیاہٹ کو کہاں چھپائیں۔ کون سی ایسی دلیل ڈھونڈ کر لائیں کہ وہ نقطۂ اعتراض کھڑا کر سکیں۔

"ارے! آپ لوگ بھی اپنے بھیا کی طرح شگفتہ کے حسن پر فریفتہ ہو گئیں۔ ارے شگفتہ بیگم کی ناک بے شک ستواں ہے، قد تو سرو نہیں ہے ناں، ارے ہمارے اکلوتے صاحب زادے ہیں۔ ہم نے ہزاروں خواب بنے ہیں ان کی دلہن کے حوالے سے۔ ارے وہ لکھنؤ میں ہماری چچیری بہن کی پانچ بیٹیاں ہیں ایک سے بڑھ کر ایک حسین...... ہم زبان۔ ہم خیال اپنے رشتے دار...... خطوط میں وہ اکثر ہمیں جتایا بھی کرتیں۔ حمیدہ خاتون سلیم میاں کا رشتہ کرتے وقت ہماری بیٹیوں کو نظر انداز مت کیجیے گا۔ ارے ہماری تو ہماری اولاد نے خاندان میں بکی کرا دی...... اب ہم سلیقہ خاتون کو کیا شکل دکھائیں گے۔"

حمیدہ خاتون باقاعدہ اس صدمے میں گریہ زاری کرتیں تب ذکیہ خاتون اور کبریٰ خاتون والدہ سے لپٹ کر خوب ہنسا کرتیں۔

"ارے! اماں جان...... اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو پیدائشی شکل عطا کر رکھی ہے ناں، یا ابھی تک حسین ہے۔ آپ یہی شکل خالہ سلیقہ خاتون دکھا دیجیے گا۔ کیوں آپا بیگم؟"

دونوں بہنیں ہنستیں تو دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہوئے سلیم میاں خوش ہو جاتے کہ ان کی ہمشیرگان ان کی ہم خیال ہیں۔

خاندان الگ، زبان الگ، علاقہ الگ ان سب باتوں پر تحفظات شگفتہ بیگم کو بھی تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ آتش الفت میں اکیلے سلیم میاں ہی جھلس رہے تھے۔ شگفتہ بھی اس آگ پر ہاتھ تاپتی پائی گئی تھی تب ہی تو ملک صاحب نے سلیم میاں کے رشتے کو انتہائی سنجیدگی سے لیا تھا اور رشتے کی "ہاں...... ناں" کا اختیار بہن کو دے دیا تھا۔

"نہ! شگفتہ پتر دس! سلیم وچ کوئی کمی ہے۔"

"آہو! پاجی...... سنگیگاں دی۔" شگفتہ بیگم کا مزاج نام سے زیادہ شگفتہ تھا۔ جھٹ برجستہ جواب دیا تو...... ملک صاحب چونک کر اسی انداز میں بولے۔

''ہا! ہائے مرجانی جتی نہ ہوئے تے ......توں سنگیگاں والے نال ویاہ کرنا اے۔ اخے ......سنگیگاں دی کی اے۔'' ملک صاحب کا قہقہہ شگفتہ کے رخساروں پر حیا کے رنگ بکھیر دیتا تب وہ اپنی بھابھی کے اوٹ میں چھپ جاتی۔

''بھابی جی! دیکھو پاجی ہوراں ......نوں''

''لے! ویکھیا سی ...... تے ویاں کیتا سی ناں ...... جھلی نہ ہوئے تے ...... نالے ......ملک جی تسی کی رنگیلا بنے رہندے او ...... کیوں تنگ کررہے او ...... وچاری نوں۔''

''لیہ! دس میں تے کڑی کولوں ...... ایدی رضا مندی پوچھ رہیا واں' اے ہاں کرے تے میں سلیم ہوراں نوں رشتہ لے کے آن دا سگنل دواں۔'' ملک غیاث نے حقہ قریب کھینچا اور غڑغڑ کرنے لگے۔ اس بات پر باجرا بھابھی نے پلٹ کر شگفتہ کو دیکھا۔ وہ شرما گئی۔

''کیوں! اِنی شگفتو کی رائے اے تیری! ہاں کر لیے کہ ناں۔''

شگفتہ سٹ کر بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو گئی دوپٹے کا کونا دانتوں میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرنے لگا تو اس نے جھٹ زبان پر گدگدی کر دی۔ تو زبان نے دھیرے سے ''ہاں'' کہا اور دانتوں کی اوٹ میں چھپ گئی۔ اور وہ اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو سنبھال وہاں سے بھاگ گئی۔

تو یہ تھا چھوٹا سا تعارف دو مختلف زبان دو مختلف گھرانوں دو مختلف ثقافتوں کے ملاپ کا اب ملاپ تو قدرت نے لکھا تھا ہو گیا۔ اب اگر سلیم میاں اپنی پہلی محبت کو پا کے مسرور تھے، وہیں شگفتہ بیگم بھی اس چاہت کے حصول کے بعد بے حد خوش اور مطمئن تھیں۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھے کہ دونوں طرف کے لوگ بھی مطمئن اور بے فکر ہو جاتے ـــــ شگفتہ کی طرف کے لوگ تو بہت خوش تھے۔

مگر سلیم کی زندگی کے ڈرامے کا بے حد اہم کردار والدہ حمیدہ خاتون کو زندگی بھونچال آنے کا قلق تھا۔ وہ ختم ہونے کے بجائے بڑھ رہا تھا۔ وہ جو شاعر نے کہا ناں کہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''

ہر چند کہ شگفتہ بیگم بہت اچھی فرماں بردار قسم کی بہو ثابت ہو رہی تھیں دوسرا ان کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ ان کے شوہر سلیم الدین نے ماں کے خلاف جا کر ان سے شادی کی ہے تو ان کا بھی فرض بنتا ہے کہ ان کی والدہ کی ہر کڑوی کسیلی بات کو ہنس کر سہہ جائیں۔ اب حمیدہ بیگم لکھنؤ کے نواب خون کی باقیات تھیں اور وہ چاہتی تھیں کہ نوابی خون کی نسلیں تا قیامت بڑھتی رہیں اسی لیے انہوں نے شگفتہ بیگم سے تقاضا کر دیا۔

''دلہن! بیگم ہمیں سب سے پہلے پوتا چاہیے ...... صرف پوتا۔'' حمیدہ خاتون کا یہ کہنا تھا کہ شگفتہ بیگم کھانے کی میز سے اٹھیں۔ اور جانے لگیں سلیم اور حمیدہ خاتون نے حیرت سے ان کو دیکھا۔

''یہ! آپ کھانا ادھورا چھوڑ کر کہاں چلیں دلہن بیگم۔''

''او! اماں جان آپ نے ابھی خود ہی تو آکھیا ہے کہ مجھے پوتا (بیٹی) چاہیے تو اس خیر اں نے کتے فریج میں نہ رکھ دیا ہو۔ فریز رمیں جم ای نہ جائے ...... نکال لاتی ہوں۔ آپ اس پر نمک اور نبو (لیموں) نچوڑ کر کھائیں سنا ہے شوگر اور بی پی کے لیے مفید ہے ...... میں' میں ابھی لے کر آئی ...... آپ ...... آپ یہ نوالہ بھی رکھ دیں۔ میں یوں گئی تے ...... ووں آئی۔''

اب شگفتہ بیگم تو شگفتہ بیگم تھیں یہ بھی نہ دیکھا کہ اکلوتی ساس کا بی پی ان کی باتیں پہلے ہی ہائی کر چکی ہیں اور شوہر صاحب شرمندہ سے کبھی والدہ کو تک رہے ہیں تو کبھی شگفتہ بیگم کی شگفتہ مزاجی اور باتوں کو ...... ان کے جانے کے بعد حمیدہ خاتون گویا صاحب زادے پر برس پڑیں۔

''دیکھا ...... دیکھا آپ نے ننھے میاں ...... آپ کی دلہن کی جہالت' بدزبانی اور ناسمجھی کہ ہماری بات کو

انہوں نے اپنی ناک پر بیٹھی مکھی کی طرح اڑا دیا اور اب ہمارے لیے پوتا لینے چلی ہیں ...... ہم نمک اور لیموں نچوڑ کر کھائیں گے۔ یا اللہ ہمیں صبر دے ...... سلیم میاں آپ کی ...... ہمارے صبر کا امتحان ہے اور ہمیں ڈر ہے ہمارا صبر جواب نہ دے جائے۔''

والدہ کے اعتراضات سو فیصد درست تھے۔ ان کی بیگم ...... بیگم واقعی ایسی باتیں اور حرکتیں کر جاتی تھیں کہ بندے کا دماغ گھوم جانا ایک طرح سے حق بنتا تھا۔ مگر وہ کیا کرتے وہ تو شگفتہ کی ایک جھلک پر ہی دیوانے ہو گئے تھے۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ شگفتہ بیگم نے میٹرک بھی نہیں کیا مگر آٹھ جماعتیں پاس کی ہیں۔ زبان کی سادہ تھیں مزاج کی شگفتہ تھیں۔ مگر زبان و ثقافت، ان کا سب کچھ ہی تو حمیدہ خاتون سے مختلف تھا۔

اب ایسی صورت حال میں وہ دونوں ان عورتوں کے درمیان بے بس سے کھڑے تھے۔ جو ان سے بے حد پیار بھی کرتی تھیں اور ان دونوں عورتوں سے جو ''ساس' بہو'' کے رشتے میں بندھی آمنے سامنے کھڑی تھیں ان کو بھی بہت محبت تھی۔ کچھ بھی تھا ان کو ان دونوں عورتوں کو ساتھ لے کر چلنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے وہ نوالہ اٹھایا جو شگفتہ نے ان کے ہاتھ سے پکڑ کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''یہ آپ اس کے ساتھ کھائیں۔'' اب وہی نوالہ سلیم میاں والدہ کے منہ میں ڈالنے لگے تو انہوں نے خفگی میں منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ سلیم میاں لجاجت سے بولے۔

''اماں جان! کھانے سے کیسی ناراضی' لیجیے کھائیے نا۔''

''ارے ...... نہیں ننھے میاں! اب تو ہم اپنے پوتے پر نمک اور لیموں نچوڑ کر ہی کھائیں گے، ہونہہ ......''

اس بات پر سلیم الدین کو ہنسی آ گئی۔ تاہم والدہ کی خفگی کے احساس سے دبا گئے۔ لہٰذا ان کا ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے کہنے لگے۔

''اماں جان باخدا میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں کہ آپ ہمارے انتخاب سے خوش نہیں اور نہ ہی شگفتہ بیگم خود کو آپ کی پسند کے سانچے میں ڈھال پائی ہیں۔ مگر اس میں ان کا ذاتی قصور نہیں' وہ الگ زبان' الگ ثقافت' الگ رسم و رواج کے علاقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ پنجاب کے سادہ ماحول میں پلی بڑھی ہیں۔ زیادہ تعلیم

حاصل نہیں کر پائیں...... بس مزاج کی شگفتہ ہیں۔ زبان کی شگفتہ ہیں۔ یقین مانیے سوچ کی بھی انتہائی شگفتہ اور اچھی خاتون ہیں۔ انہوں نے کبھی آپ کے رویوں کی ہم سے شکایت نہیں کی۔"

اور پھر وہی ماں' بہن کا بھابھی' بہو سے ازلی بیر۔ جس نے بیٹے کی اس شگفتہ نامے پر ایسے ایسے منہ بنائے کہ سلیم الدین نے اپنی ہنسی کو ڈانٹ کر ہونٹوں پر نمودار ہونے سے روکا۔

"بہت خوب ننھے میاں' بہت خوب' ہماری برداشت کا سہرا بھی آپ اپنی دلہن کی شگفتگی کے سر باندھنا چاہتے ہیں۔ جب سے وہ بیاہ کر آئی ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ ایسا کون سا برا رویہ اختیار کیا ہے کہ وہ شکایت کنندہ ہوں۔ ہر چند کہ ہماری خواہش ہے کہ کاش ہم کوئی جادوگرنی ہوتے تو شگفتہ بیگم کو چڑیا بنا کر اڑا دیتے۔ مگر آہ...... کیا کیجیے کہ ہم بے بس ہیں۔" حمیدہ خاتون نے اتنی دکھ بھری سرد آہ بھری کہ سلیم میاں کو خنکی محسوس ہونے لگی۔

"ارے! بھئی کیا بات ہے۔ ماں اور بیٹے میں کیا رازداریاں چل رہی ہیں۔ ہمیں سو فیصد یقین ہے۔ برائی کی چھری تلے ہمارے گردن ہوگی یا ہماری بہو بیگم کی...... یا خدا ہمیں تو اپنی بہو بے حد پسند ہیں۔" دونوں ماں' بیٹے نے پلٹ کر علیم الدین کو دیکھا' جو اپنے معمول کے وظائف سے ابھی فارغ ہوئے تھے۔ اپنا موٹا چشمہ انہوں نے اتار' صاف کیا اور پھر لگایا۔ سلیم الدین احتراماً کھڑے ہوگئے۔

"آیئے...... آیئے ابا جان...... ایسی کوئی بات نہیں' اماں جان تو......"

"ارے...... صاحب زادے فضول میں اپنی والدہ کی تعریف میں جھوٹے دلائل مت دیجیے باخدا ہم بہت خوش ہیں بہورانی کے آنے سے کہ کم از کم ان کی ناپسندیدہ بہو آنے کا فائدہ' ہمیں تو ہوا کہ ان کی توپوں کا رخ اب بہو بیگم کی جانب ہو جاتا ہے مگر یہ کچھ بھی کہہ لیں' ہمیں اپنی بہو بیگم بے حد پسند ہیں۔" اس بات پر حمیدہ خاتون تنک کر چنگھاڑیں۔

"جی! جی ہم سب جانتے ہیں۔ علیم الدین صاحب آپ کو ہمیشہ ہی سے ہماری مخالفین پسند رہی ہیں۔ مثلاً ننھے میاں آپ کی دادی جان' آپ کی پھپھیاں...... ہماری مخالفین میں سے تھیں' مگر ان کو بے حد پسند تھیں۔ اب بہو بیگم بھی' ہمیں ناپسند ہے تو ان کو بے حد پسند ہیں۔ ان کی اور ہماری پسند کے راستے ہمیشہ جدا ہی رہے ہیں۔"

"ارے...... بیگم صاحبہ بلاوجہ ہی انگارے چبا رہی ہیں آپ...... ہم اعتراف کرتے ہیں کہ آپ کی مخالف پارٹی سے ہمیں ہمیشہ محبت رہی ہے۔ مگر ہم آپ کی محبت کے سحر سے بھی کبھی آزادی حاصل نہیں کر پائے۔ اب ہمیں چائے کا ایک کپ دیں' ورنہ آپ تو ہمیں ثابت نگل جائیں گی لیموں نچوڑے بغیر' ہاہاہا۔"

یہ علیم الدین ہیں' گھر کے بزرگ' خوش مزاج' معاملہ فہم بیگم کی سخت وسست بات کو مسکرا کر ٹالنے والے۔ حمیدہ خاتون کچھ تنک مزاج نقطہ چینی کے عارضے میں مبتلا تھیں۔ اس لیے دونوں میاں بیوی میں ٹھنی ہی رہتی۔ علیم الدین کی کوشش ہوتی کہ معاملے کی سنگینی کی تپش کو حلیمی اور معاملہ فہمی سے کم یا ختم کیا جائے اور علیم الدین صاحب کے یہی وہ اوصاف تھے جو سلیم منزل کو آباد رکھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

"آ...... آ...... آپا...... جلدی...... جلدی کرو...... جاؤ...... بچاؤ...... اماں...... کو بچاؤ...... ورنہ...... ورنہ وہ......" اسما جو بڑے انہماک سے کتاب پڑھ رہی تھی۔ ثمینہ اکھڑی سانسوں کے ساتھ بھاگتی آئی اور اسما کے بستر پر ڈھیر ہوگئی۔ ثمینہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اوپر کا سانس اوپر تھا' نیچے کا نیچے۔

"ثمینہ...... کیا ہوا ہے...... ثمینہ کہاں ہے۔ تمہارا ان ہیلر......؟" اسما نے گھبراہٹ میں اسے اپنے بستر میں لٹایا اور اٹھ کر ان ہیلر ڈھونڈنے لگی۔ ثمینہ کھینچ کھینچ کر سانس لیتی رہی۔ "اوہو! کہاں رکھ دیتی ہو ان ہیلر جانتی بھی ہو کہ دورے کے وقت کتنا ضروری ہے۔" جھنجلاہٹ اور پریشانی میں اسما ڈھونڈ رہی تھی۔

"ہم! ہم! چھوڑو...... آ...... آپا...... اماں...... اماں...... کو بچاؤ...... اب...... اب...... ابا...... اماں کو

مار...... مار دیں گے۔" وہ اکھڑی سانسوں میں بمشکل بتا پائی۔ اسما نے دروازے کے پیچھے کہیں چھپا ان ہیلر اٹھا کر جلدی سے ثمینہ کے منہ میں لگا دیا۔

"تو...... یہ کون سی نئی بات ہے۔ ابا' اماں کو جان سے ہرگز نہیں ماریں گے۔ اتنا اطمینان رکھو تم' کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی بار مار دیا تو وہ اپنی مردانگی کی اس بے حس سی حس کو بار بار کیسے خوش کر پائیں گے' تسکین پہنچا پائیں گے...... لو پانی پیو اور پرسکون ہو جاؤ۔"

اسما نے پانی اس کی طرف بڑھایا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ منہ میں ان ہیلر رکھے پھٹی آنکھوں سے اسما کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو اسی کی بہن تھی' اماں اس کی اماں تھیں...... پھر...... پھر...... وہ اماں کی ہر مار کو کس طرح سہہ جاتی۔ کسی ردعمل کا اظہار کیے بغیر چپ چاپ ابا کا حکم بھی مان رہی تھی' کام بھی کر رہی تھی یا اسما بے حس تھی یا یہ وہ خود پاگل پنے کی حد تک حساس...... وہ بھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔

"آ...... آپا...... ابا' اماں کا گلا دبا رہے تھے۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا تھا۔ اماں کی آواز تو نہیں نکلی تھی' آنکھیں ضرور تکلیف سے باہر آ رہی تھیں۔ آپا...... جاؤ تو ابا...... آپ...... آپ کا لحاظ کرتے ہیں۔ جاؤ...... اماں کو بچاؤ نا۔ جاؤ آپا۔" ثمینہ اسما کی گود میں رکھ کر شدت سے رونے لگی۔ اسما اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"ہونہہ! یہ کوئی نئی بات تو نہیں ثمینہ! میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے ابا کی انگلیوں کے نشان اماں کی گردن پر دیکھے ہیں اور رہی بات ابا میرا لحاظ کرتے ہیں تو میری بہن 'لحاظ' نامی احساس سے ابا کا کوئی تعلق' واسطہ نہیں' ہوتا تو وہ اماں کا لحاظ نہ کر لیتے جو ہر قسم کے حالات میں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ ہر جگہ ان کی عزت رکھتی ہیں۔"

اسما کے اندر کا کرب اس کی سانس میں اڈ کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ پھر اس نے ثمینہ کے سر میں سرسوں کا تیل ڈالا' جانے کتنی دیر مالش کرتی رہی اور جانے کیسے ثمینہ کی آنکھ لگ گئی۔ وہ اس پر لحاف ڈال کر باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں ابا ٹی وی کی آواز فل کیے خبریں سن اور دیکھ رہے تھے۔ وہ بہرے نہیں تھے۔ مگر ہر اس بات میں ان کو سکون ملتا تھا جو اماں کو تکلیف پہنچاتی تھی...... اور وہ جانتے تھے کہ اونچی آواز سے اماں کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ چڑتی ہیں۔ اسی لیے وہ آواز فل کرتے...... اسما نے ایک ہلکے سے طنز کے ساتھ ابا کو دیکھا...... چہرے پر غصہ اور تناؤ باقی تھا۔ ہاتھ میں ریموٹ تھا۔ سامنے دودھ کا بھرا گلاس رکھا تھا۔ اسما مسکرائی۔

"واہ! ابا...... رعب ہو تا...... یعنی کہ بیوی ہو تو ایسی کہ اتنی دھنائی کے بعد بھی...... میاں کی خدمت میں لگی ہے۔" یہ مشرقیت تھی' محبت تھی یا خوف...... وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تو باورچی خانے میں آ گئی۔ کوکنگ رینج کے تین چولہے آن تھے۔ ہر ایک پر ابا ہی کی پسند کی ڈش بن رہی تھی۔ اماں بڑی پھرتی سے بھاگ بھاگ کر کام کر رہی تھیں۔ ابا کو وقت پر کھانا بھی بے حد ضروری تھا۔ ریٹائرڈ افسر جو تھے۔ ہر کام وقت پر پسند کرتے تھے۔ ہاں...... یہ الگ بات ہے۔ بیگم کو مار پیٹ کا کوئی ٹائم مقرر نہیں تھا۔ جب غصہ آ گیا دھن ڈالتے اور مجال ہے جو شرمندہ ہو جائیں۔

"ارے...... مرد ہیں۔" اور وہ مردوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو عورت کو پاؤں کی جوتی بنا کر زمین پر پاؤں پٹخ پٹخ کے رکھ کر اپنی مردانگی کو منواتے تھے۔

"اماں!" اسما' ماں کے قریب جا کر انہیں غور سے دیکھنے لگی' بیٹی کو متوجہ دیکھ کر رقیہ کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے۔ فریج سے تھے ہوئے کباب نکال کر سلیب پر رکھے۔

"کیا بات ہے بیٹا! کوئی خاص بات ہے۔" وہ نظر چرا رہی تھیں یا واقعی کام میں بہت مصروف تھیں۔

"اماں! یہ اپنی ثمینہ ہے نا' جھوٹ بولنے لگی ہے۔" اسما نے ماں کے گلے پر باپ کی انگلیوں کے نشان دیکھتے ہوئے کہا...... تو ایک پل کو رقیہ نے اسما کو دیکھا۔

"لل...... کیا جھوٹ بولا ہے ثمینہ نے۔" وہ بھگار لگانے کے لیے فرائی پین میں ہری مرچ اور پیاز کاٹ

کرڈالے لگیں۔

"کچھ نہیں، کہہ رہی تھی ابا...... اماں کو مار رہے ہیں۔ اماں کا گلا دبا رہے ہیں۔ جاؤ اماں کو بچاؤ مگر آپ کو دیکھ کر لگتا ہے۔ اس نے جھوٹ بولا ہے یا اپنے وہموں اور وسوسوں کو حقیقت میں دیکھ لیا ہے اور شور مچانا شروع کردیا۔ آپ تو بالکل ٹھیک ہیں۔" بولتے بولتے اسما کے لہجے میں ہلکے سے طنز کی تلخی کی آمیزش محسوس کرکے رقیہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے دیکھے بغیر اپنا کام جاری رکھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں! شاید ایسا ہی ہے۔ جو حساس اور وہمی لوگ ہوتے ہیں نا، بلاوجہ دائیں بائیں کی باتیں سوچ سوچ کر پریشان ہوتے ہیں' ان کو اپنے وہم مجسم نظر آنے لگتے ہیں۔ برتن لگاؤ میز پر بھائی بھی آتے ہوں گے تمہارے کام سے......" اندر سے اٹھتی چیخوں کو دباتے رقیہ نے کرب اور درد کو لاپروائی اور بے نیازی میں لپیٹ کر' ایک طرف ڈال کر اسے مصروف کردیا۔ حکم بجالاتے ہوئے اسما ماں کے احکام پر کام کرتی رہی۔

"اماں ایک بات پوچھوں۔"

"معلوم ہے مجھے تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھتے ہی رہیں گے جب تک پوچھ نہ لوگی۔ پوچھو اور ہاتھ تیزی سے چلاؤ اور ساتھ ساتھ سلاد بھی بناتی جاؤ۔" رقیہ نے گہرا سانس کھینچ کر اسے دیکھے بغیر سبزیاں اس کے سامنے کردیں۔ وہ سلیقے سے سلاد بنانے لگی۔

"امی جان! احتجاج کس کو کہتے ہیں۔" اپنی بات کہہ کر وہ تیزی سے کھیرا کاٹنے لگی۔ رقیہ نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی۔

"احتجاج اور اختلاف کی منزل تباہی ہے۔" اور میں احتجاج اور اختلاف کے راستے کو پسند نہیں کرتی۔ کیوں کہ ہماری تربیت میں شوہر سے اختلاف کو گناہ بتایا گیا ہے۔ احتجاج کو...... خودسری اور بے حیائی اور...... میں نہ خودسر کہلانا چاہتی ہوں نہ ہی بے حیا۔"

"مطلب...... ظلم نسل در نسل منتقل کیا جاتا رہے گا۔"

"وہ ظلم...... کیسا ظلم اور یہ جو تم اور ثمینہ جس کو ظلم سمجھتے ہو نا۔ یہ...... یہ ہماری تربیت کا امتحان ہے اور تم دونوں کیا چاہتی ہو کہ میں اختلاف یا احتجاج کرکے...... اپنی ماں کی تربیت کو داغ دار کردوں...... تو ایسا نہیں ہوگا۔ میری ماں نے میری شخصیت' میری سوچ کے لبادے کو سیتے ہوئے' شوہر سے وفاداری، رواداری، تسلیم و رضا کو ایک ایک ٹانکے میں پرویا ہے۔ احتجاج یا اختلاف کا ہنر میری تربیت کا حصہ نہیں۔ نہ ہی میں تم دونوں کو اس بات کی اجازت دوں گی۔ کام کرو۔" اتنی لمبی بات کرتے ہوئے جانے انہوں نے کس کس کرب کو دبایا ہوگا۔ کس کس احتجاج سے دامن بچایا ہوگا۔ کھیرا ہاتھ میں لیے اسما جانے کب تک سوچے جاتی۔

"السلام علیکم امی جان! کھانا تیار ہے۔" شکیل بھیا کی پرجوش آواز پر اسما چونک کر ماحول میں لوٹ آئی۔ بیٹے کی آواز پر رقیہ کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے۔

"ہاں! ہاں بیٹا...... بس دس منٹ۔"

"اف! ابھی بھی دس منٹ امی جان میں نے اسی لیے فون کردیا تھا کہ میرے آنے تک کھانا میز پر لگ جائے اور ابھی دس منٹ کی بات کررہی ہیں اور بھوک کا یہ عالم کہ بس دماغ کو چڑھ رہی ہے۔ ابا جان بالکل درست ہی کہتے ہیں۔ ہمارے گھر کی خواتین کسی کام کی نہیں۔ کھانا' پینا' سونا' باتیں کرنا اور بس......" اس لمبی چوڑی تقریر پر رقیہ بیگم کے ہاتھ مزید تیزی سے چلنے لگے۔ چہرے پر خفگی ناراضی کے بجائے فکرمندی تھی۔ اسما نے کباب تلنے کے لیے فرائی پین چولہے پر رکھا۔ شکیل بھیا سے سو فیصد اختلاف نے اسے جواب دینے پر مجبور کردیا۔

"مبالغہ آرائی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بھائی جان...... یعنی کہ امی جان فجر کی نماز کے بعد رات تک

انہوں نے بیل کی طرح کاموں میں جتی رہتی ہیں اور آپ پھر بھی...... [illegible]

شکیل نے بھی آڑے ہاتھوں لیا۔

"اماں جان! اسما کی زبان کچھ زیادہ ہی نہیں چل نکلی۔ کیسے اسٹین گن کی طرح ٹھا ٹھا ٹھا بولی ہے۔"

"اسما! کچھ تو خیال کرلیا کرو۔ بڑا بھائی ہے اور اگر ہم گھر کی عورتیں کام کرلیتی ہیں تو اس میں کسی پر احسان تو نہیں ہے نا۔ یہ ہمارے فرائض ہیں۔"

"ہونہہ! فرائض کی کھیتی تو صرف ہمارے لیے ہی اگائی گئی ہے کہ جتے رہو فرائض ادا کرتے رہو۔" یہ سب وہ کہنا چاہتی تھی۔ مگر...... چونکہ حقوق نسواں پر پابندی تھی' اسی لیے اپنی سوچ کو اپنے دماغ کی چار دیواری میں مقید کیے کباب تلنے کے ساتھ ساتھ سلاد بھی بناتی رہی۔

"اچھا! امی جان آپ نے میری کرکٹ کی کٹ دھودی ہے یا وہ بھی دیگر کاموں کی طرح پڑی ہے۔"

"ہاں! بیٹا میں نے ثمینہ سے کہہ دیا تھا۔ اس نے لازماً دھودی ہوگی۔"

"کیا...... کیا...... کہا آپ نے امی جان......؟" وہ کچن سے نکلتے نکلتے واپس پلٹا اور حیرت سے ماں کو دیکھا۔

"آج کے دن کا اچھا مذاق تھا اماں جان۔ یعنی کہ ثمینہ وہ ڈرامہ باز' سائیکو لڑکی وہ کوئی کام کرے گی۔ بات بات پہ تو اسے سانس کے دورے پڑتے ہیں' ایسے سانس کھینچتی ہے کہ حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے' جھانکا تھا میں نے اس کے کمرے میں بھی بے خبر پڑی سورہی ہے' گھوڑے' گدھے بیچ کر۔ اسما صاحبہ فرصت مل جائے تو...... دھو دیجیے گا۔" "اف...... کتنا تلخ لہجہ' کتنا کٹیلا...... اس نے دکھ کا گہرا سانس لیا۔

"جی اچھا...... ابھی دھو دیتی ہوں۔"

☆☆☆

ظہیر درانی ایک سرکاری آفیسر تھے۔ مزاجاً انتہا بدمزاج اکھڑ بات کرتے گویا لٹھ مارتے۔ سرکاری اصولوں کو گھر پر اس طرح لاگو کیا ہوا گویا کوئی فوجی اکیڈمی ہو۔ ہر کام اپنے وقت پر ہو اور اس کام کے لیے رقیہ وہ کردار تھیں۔ جو گھڑی کی سوئی کی طرح گھومتی پھرتیں۔ ذرا جو ایک سیکنڈ کی دیر سویر ہوئی۔ وہیں ان کی بے عزتی شروع ہوجاتی۔ مارکٹائی اور عورت کو بھرے مجمع میں ذلیل کرنے کو مردانہ طاقت اور شوہرانہ حقوق کا نام لے کر اپنے تمام حقوق وصول کرتے۔

رہی بات رقیہ بیگم کی تو رشتے میں وہ ظہیر کی فرسٹ کزن تھیں اور نہ جانے کتنی پیڑیوں سے کزن میرج کا سلسلہ چل رہا تھا اور ہر پیڑی میں ایک نہ ایک مرد ایسا ضرور پیدا ہوتا جو کزن میرج کی اس روایت کو قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتا اور رقیہ بیگم بھی اپنے والد کی جانب سے دیے اس عذاب کو جھیلنے کے لیے اس جہنم میں جھونک دی گئی تھیں۔ گویا اس خاندان کی عورت پر لازم تھا کہ وہ اسی خاندان کے مرد سے شادی کرے گی۔ چونکہ اس خاندان کی لڑکیوں کی تربیت ہی اسی سوچ پر کی جاتی تھی تو انکار کی گنجائش نہ تھی۔

رقیہ بیگم بھی چپ چاپ سہہ رہی تھیں اور اب اپنی بیٹیوں کی بھی یہ ہی تربیت کررہی تھیں کہ ان کو بھی اسی خاندان کی چکی میں پسنا ہے لہٰذا چپ چاپ خود کو تیار کریں۔ ظہیر احمد اور رقیہ کے دو بیٹے' دو بیٹیاں تھیں۔ اسما' ثمینہ' شکیل اور جمیل۔

ہر چند کہ تعلیم حاصل کرنے پر اعتراض تو ظہیر صاحب کو نہیں تھا' لیکن کون سا نوکری کرنی ہے۔ لہٰذا انٹر کافی ہے۔ البتہ لڑکوں نے فیلی چلانی ہیں جو چاہیں پڑھیں' لکھیں۔ شکیل اور جمیل کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا لہٰذا بی۔ اے کرکے والد کا بزنس سنبھال لیا تھا۔ بزنس بہت زیادہ اچھا تو نہیں پھر بھی...... اچھا گزر رہا تھا۔ کیوں کہ گھر کی خواتین صابر شاکر قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں اس لیے۔ معاشی مسائل نے سر ابھارا نہیں۔

ظہیر صاحب کے بڑے بھائی کبیر کچھ مختلف سوچ کے مالک تھے۔ وہ سخت ضرور تھے مگر [illegible] پر ہاتھ اٹھانا

ان کو مرد کی بزدلی اور کمزوری لگتا تھا۔ جس پر ظہیر اکثر ہی الجھ جایا کرتے۔

کبیر صاحب کے دو بیٹے تھے۔ عابد اور ساجد...... اور تین بیٹیاں جن میں سے دو بیٹیاں شکیل اور جمیل کی منگیتر تھیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ بیاہی تھی۔ عابد اور ساجد' اسما اور ثمینہ کے منگیتر تھے۔ یوں سارے رشتے گھر میں موجود ہونے کی وجہ سے باہر کے لوگوں کو گھر میں گھسنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اس گھر کے تمام مردوں کے مزاج کم و بیش ایک جیسے ہی تھے۔ عورت کو دبا کر رکھنا' پاؤں کی جوتی بنا کر ہی رکھنا' خاندانی خون اور تربیت ہی ایسی تھی' لاکھ تعلیم اور ڈگریاں حاصل کرنے کے باوجود تمام مردوں کے مزاج سخت تھے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ کوئی بات بے بات مار پیٹ کر کے اپنی مردانگی دکھاتا کوئی سخت رویے اور سخت مزاجی سے لفظوں کے نشتر چبھو کر دکھاتا۔ اسی لیے اس گھر کی خاندان کی عورتیں تسلیم و رضا کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھیں۔

اسی لیے تو رقیہ بیگم پٹ کر بھی اتنی نارمل ہوتیں کہ اسما چڑ جاتی اور سب سے چھوٹی ثمینہ کی سانس اکھڑ جاتی۔ باپ اور بھائی اسے ڈرامہ قرار دے کر بے بھاؤ کی سنا دیتے۔ وہ مزید ماں کی گود میں چھپ جاتی۔ ثمینہ سب سے چھوٹی تھی۔ اور بہت حساس تھی جن باتوں کو نارمل لینا چاہیے ان کی وجہ سے وہ اپنی جان پر بنا لیتی اور باتیں ...... ماں کو سننا پڑتیں۔

''ثمینہ! میری بیٹی یہ ہی زندگی ہے...... خود کو سنبھالو...... بات بے بات یوں جان پر بنا لینا...... مناسب نہیں بیٹا! تم لڑکی ہو اور تمہیں بھی زندگی کے اس اسٹیج پر یہ ہی کردار ادا کرنا ہے۔ جو میں کر رہی ہوں جو خاندان کی دیگر عورتیں کر رہی ہیں۔''

رات جب سارے دن کی مشقت اور سرد و گرم رویوں کے جنگل سے گزر کر رقیہ بیگم بستر پر آتیں...... تو ثمینہ کسی خوف زدہ بچی کی طرح ان سے لپٹ جاتی۔ تو وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے نرمی سے سمجھاتیں، ممتا کی گرم گود ملائم لہجہ۔ بے شمار آنسو ماں کی آغوش میں جذب ہو جاتے۔

''امی! امی جان میں...... میں ڈر جاتی ہوں۔ ابا...... ابا جان آپ کو کیوں مارتے ہیں آ...... آپ سارے کام تو کرتی ہیں پھر وہ کیوں مارتے ہیں۔ وہ...... وہ جب آپ کا گلا دبا رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا میرا سانس رک جائے گا امی مجھے گھٹن ہو رہی تھی۔''

وہ ماں کے ہاتھ چوم کر شدت سے رو دی۔ تو بے شمار آنسو ان کے آنچل میں جذب ہو گئے بالکل ایسے ہی جیسے ان کی سسکیاں ان کے اندر ہی اندر دم توڑ دیا کرتی تھیں۔

''یا اللہ! کیا بنے گا اس لڑکی کا، یہ تو کانچ پیکر اور کانچ سے زیادہ نازک حساس دل لے کر پیدا ہوئی ہے۔ ساجد جو اس کا جیون ساتھی چن لیا گیا ہے، بالکل اپنے چچا جیسا خود پرست ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینے والا یہ زبان یہ مزاج میری یہ بچی تو کلیوں جیسی ہے۔ کیسے شوہر کے رویوں کے سخت موسم برداشت کر پائے گی۔ کیا کروں میں!''

ایسے بے شمار دسوسے رقیہ بیگم کو گھیرے رہتے۔ اسما اندر آئی ماں کو دیکھا سوچ میں ڈوبی آنکھیں اور آنکھوں سے رواں آنسو۔ ایک کسک سی دل میں اٹھی مگر وہ ماں کی بڑی بیٹی تھی اس نے آہستہ سے ماں کے آنسو اپنے آنچل میں بھر لیے۔ وہ چونک کر سیدھی ہو گئیں۔

''کیا! کیا بات ہے بیٹا کیا کر رہی ہو؟''

''ارے! اماں کچھ نہیں موتیوں کو اپنے آنچل میں بھر کر محفوظ کر رہی ہوں آپ کو تو پتا ہے ناں میں قیمتی چیزوں کو بہت سنبھال کر رکھتی ہوں۔''

''میری! سمجھ دار بیٹی...... رقیہ نے بازو پھیلا کر اسے بھی ساتھ لگا لیا۔ پھر کتنے ہی لمحات دبے پاؤں گزر

گئے۔ ثمینہ کو سکون ملا تھا وہ سو چکی تھی۔

''اسما...... !'' رقیہ کی آواز نے خاموشی کے طلسم کو توڑا اس نے سر اوپر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

''جی!...... امی!''

''بیٹا! تمہارے ابا کہہ رہے تھے کہ بھائی اور بھابھی جان اب تمہاری اور عابد کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''ہائے! سچ امی! جلدی کیجیے ناں...... میرا بھی شوہر کے ہاتھوں پٹنے کا بڑا دل چاہ رہا ہے۔'' ماں کی بات پر اسما نے شوخی سے کہا تو رقیہ نے پیار بھری خفگی سے بیٹی کو دیکھا۔

''شریر لڑکی! اس اتوار کو وہ لوگ تاریخ رکھنے آ رہے ہیں تو تمہارے ابا کہہ رہے تھے کہ تمہاری رخصتی ہو جائے گی اور ثمینہ ساجد کا نکاح کر دیں گے۔''

''چلیے! امی آپ تو ایک جھٹکے میں دو دو بیٹیوں کے بوجھ سے فارغ ہو جائیں گی۔'' اسما نے گہرا سانس لے کر سوئی ہوئی ثمینہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں...... بیٹیاں، ماں ہوتی ہیں خوشی ہوتی ہیں سکون ہوتی ہیں، اعزاز ہوتی ہیں۔ بس یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اس اعزاز کو سنبھالنا نہیں آتا۔''

''جیسے کہ ہمارے ابا'' اک گہرا سانس لے کر وہ بستر میں دبک گئی۔

☆☆☆

''ہاں تو صدیقہ بیگم! کیا خیال ہے اب اپنے بڑے صاحب زادے کو نکیل ڈال دیں۔''

کبیر صاحب نے اخبار تہ کر کے ایک طرف رکھ کر صدیقہ بیگم کو دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ سے چونکیں۔

''کیا! مطلب ہے آپ کا...... یہ تو طے تھا ناں کہ شادی سال بھر میں ہو گی تو اب اتنی جلدی کیوں...... میرا مطلب ہے کہ......'' لہجے کی تندی کو دباتے ہوئے صدیقہ بیگم نے تکیے کا غلاف چڑھاتے ہوئے کہا۔

''ارے! بھئی آپ تو یوں پریشان ہوئی ہیں گویا آج رات ہی کو بارات لے کر جانا ہے۔ ارے آپ تیاری کر لیجیے دو ماہ میں......''

''دو ماہ بھی کم ہیں...... کبیر صاحب صرف بیٹے ہی کا سہرا تو نہیں سجانا...... اپنی بیٹی کو بھی رخصت کرنا ہے۔ آپ شاید بھول رہے ہیں کہ عابد اور شاہدہ کی شادی ایک ساتھ ہی ہونا ہے تو اس کے لیے ہمیں تیاری بھی کرنی ہے اور دو شادیوں کے لیے یہ مدت نہایت کم ہے۔'' صدیقہ بیگم تو بات کہہ کر دروازے کی جانب بڑھیں مگر کبیر صاحب کو شدید تاؤ آ گیا ہے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...... یعنی کہ اب تک آپ جھک مارتی رہی ہیں، کوئی تیاری نہیں کی آپ نے یہیں سے آپ کا پھوہڑ پن اور لاپروائی ثابت ہو رہی ہے۔ ارے بیٹیوں کی مائیں ان کی پیدائش پر ہی ان کی شادی کا سامان جمع کرنا شروع ہو جاتی ہیں اور اس وقت جبکہ بچوں کی شادی کی عمر ہو گئی ہے تو آپ فرما رہی ہیں مزید وقت درکار ہے۔ حد ہے...... حد ہے لاپروائی اور پھوہڑ پن کی۔''

صدیقہ بیگم کے قدم دہلیز پر جم سے گئے۔ اب وہ کیا بتاتیں کہ ان کی تیاری کے باوجود بھی شادی کے لیے دو ماہ ــــ کم تھے دو بچوں کی شادیاں کوئی مذاق نہیں تھا۔ انہوں نے پلٹ کر میاں کو دیکھا جن کے ماتھے پر گہری تیوریاں ان کے اندرونی غصے کو نمایاں کر رہی تھیں اور ہزار لڑائی کے باوجود ان کو اس بات کی فکر تھی کہ غصہ اور دل کا مریض شوہر کے لیے خطرناک ہے۔ دل کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لہٰذا گہرا سانس لیا اور پلٹیں۔

''ٹھیک ہے، کبیر صاحب ...... آپ کہیں رکھ دیجیے تاریخ۔''

☆☆☆

ہوتے ہیں۔ خیر چھڈ چھوٹی چھوٹی باتوں کو برا نہیں ماننا چاہیے۔ وہ کہہ دیتی ہیں تو سن کے گل ختم کر دیا کر۔"

"ہاں! تو پاجی...... ایسا ہی تو کرتی ہوں...... ان کو ہی...... میری "تسی مسی" پر اعتراض ہوتا ہے۔ تے بھی کہتی ہیں۔ ہمارا پہناواں...... پہنو......" آج شگفتہ بھی ٹھان کر آئی تھی کہ...... ساسو ماں کی ساری باتیں پاجی...... اور بھابھی کو بتا دے گی...... مگر گاؤں کے سیدھے سادے ملک غیاث کی سمجھ میں لفظ "پہناواں" نہیں آیا تھا۔

"او! شگو پتر ہن اے "پہناواں" کی بلا ہے؟"

"او...... !او! پاجی...... او جیہڑا او تاں نے تھان لپٹایا۔ وا ہوندا اے او۔ اس خاندان دا خاندانی پہناواں ہے۔" دونوں بہن بھائی کو اس خاندانی پہناوے میں الجھا دیکھا تو ہاجرہ نے منیزہ کو واپس شگفتہ کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔

"آئے ہائے...... تسی وی تاں دونوں بہن بھائی وی تاں جھلے او...... تھان او تاں دا خاندانی لباس غرارہ اے۔" ہاجرہ بھابھی نے حمیدہ خاتون سمیت تمام خاندان بھر کی عورتوں کے لباس کی تشریح کی...... شگفتہ ...... گئی۔

"جو! وی...... اے مجھے تو ایسا لگتا ہے پاجی کہ سفید کفن وچ رو دیاں...... پھر رہی ہیں۔ اماں جان تو پہنتی ہی سفید رنگ کا تمبو ہیں۔"

"بس اتنی سی بات...... اوف کڑیے! سسرال والوں کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور پھر میرا دوست تے اپنا سلیم تو تیرے ساتھ چنگے ہیں ناں۔"

"جی جی پاجی...... !بہت چنگے نے...... تے دونوں آپا جان وی بہت ہی اچھی ہیں...... میرا بڑا ہی خیال رکھتی ہیں...... اپنی اماں ہوراں کا تو وہ بھی منہ توڑ دیتی ہیں۔"

"پھر تے اور تجھے کیا چاہیے...... شگو! اصل وچ تے اے نداں ہی بی بی ہما لوکر دار ہوتی ہیں...... یہ ہی ادھر کی ادھر لگا کر گھر میں فساد پھیلاتی ہیں۔"

ہاجرہ بیگم منیزہ کے کام بھی انجام دے رہی تھیں کان بہن بھائی کی باتوں پر لگے ہوئے تھے۔ ہاجرہ ملک غیاث کی چچازاد تھیں۔ شادی کے بعد انہوں نے بھی گھر کو جنت بنا دیا تھا ہر رشتہ اپنی جگہ خوش رکھا ہوا تھا...... اور ساس سسر کی وفات کے بعد انہوں نے شگفتہ کو بھی بیٹی کی طرح پالا تھا اس کی تربیت کی تھی اور چاہتی تھیں کہ شگفتہ کے سسرال والوں کو بھی اس سے کوئی شکایت نہ ہو...... اور نہ ہی شگفتہ کو ان سے دکھ پہنچے۔ ہاجرہ کی بات پر شگفتہ نے شکایتی سی نظر بھابھی پر ڈالی...... منہ پھلا کر بولی۔

"ہائے! پابی جی (بھابھی) میں کوئی فسادی نند ہوں آپ کی۔" اس جذباتی جملے پر ہاجرہ نے اسے ساتھ لگا لیا۔

"لیہ! دس...... اور شگو تو...... تو میری نند تے نہیں تی (بیٹی) ایں...... تو صرف دس کی تھی جب اماں ہوری تے ابا ہوری فوت ہوئے سن، میں ہی تینوں ماں بن کے پالیا اے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں شگو پتر! تیری اس پابی نے مجھے بھی کوئی شکایت نہیں ہونے دی...... بلکہ تیری شرارتوں پر بھی پردہ ڈال دیا کرتی تھی۔" ملک غیاث نے ممنون نظر سے بیگم کو دیکھا۔ جو شگفتہ کا سر گود میں رکھے سہلا رہی تھیں۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ پابی جی تسی میری ماں او۔" فرط جذبات سے اس نے بھابھی کے ہاتھ چوم لیے۔

☆☆☆

ہر قسم کے اختلاف پر سلیم اور شگفتہ کی محبت حاوی ہو گئی تھی۔ ہر قسم کے اختلاف کے باوجود...... شگفتہ بڑی شگفتگی سے...... ہر رشتہ احسن انداز میں نبھا رہی تھیں۔ اب یہ الگ بات تھی کہ ساس کی ٹھونگے بازی ان کی چونچ کو دعوت فساد دیتی رہتی۔ اب وہ بھی تو عورت تھیں بہو تھیں اور باصلاحیت بھی...... بات بے بات چونچیں الجھ پڑتیں...... تو سلیم میاں کو دونوں کی چونچیں الگ کرنی پڑیں...... ویسے اس کار خیر میں ان کے والد صاحب بھی ان کا ساتھ دیتے۔

"حمیدہ خاتون! آپ ہر وقت دلہن رانی پر انگلی کھڑی رکھتی ہے نالائق ایمپائر کی طرح...... بقیہ جو تین انگلیاں ہیں جن کا رخ آپ کی جانب ہوتا ہے۔ فریاد کر رہی ہوتی ہیں کہ بڑی بی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہو۔ کبھی تو ہماری جانب بھی دیکھ لیا کرو...... سن لیا کرو۔" میاں کی اس بات پر حمیدہ خاتون جھلس ہی تو جاتیں پان کو پوری قوت سے چبائی...... گویا میاں دانتوں تلے ہوں۔

"آپ تو چپ ہی رہا کیجیے علیم الدین صاحب...... !اگر انصاف نہیں کر سکتے تو...... اور سلیم میاں آپ اپنی بیگم صاحبہ کو دیکھ رہے ہیں!" اس دعوت پر سلیم میاں نے کھانے کی میز پر اپنے ساتھ بیٹھی شگفتہ کو دیکھا۔ جو اس وقت بہت حسین لگ رہی تھیں اور معصوم بھی۔ گوشت کی "نلی" کی ہڈی کو اپنی نرم ہتھیلی پر مار مار کر "گودا" نکال کر زبان سے چاٹ رہی تھیں...... سلیم کو بہت اچھی لگیں...... کیونکہ وہ تو محبت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ جبکہ ماں کی آنکھوں پر تنقید کا چشمہ لگا تھا۔ وہ شگفتہ کو دیکھے گئے۔

"ہے، دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔"

اب اماں جان کی دعوت پر ان کا جواب تو یہ بنتا تھا۔ مگر احترام والد اور لحاظ والدہ پیش نظر تھا۔

"جی اماں جان! ہمیں بھی آپ کی طرح اندیشہ لاحق ہے کہ ہڈی شگفتہ کی نرم نازک ہتھیلی کو زخمی نہ کر دے۔ شگفتہ خاتون اپنی ہتھیلی کیوں زخمی کرتی ہیں ہماری...... حاضر ہے۔" بے دھیانی میں انہوں نے اپنی ہتھیلی آگے کر دی...... تو علیم الدین نے کھنکارا۔

"حد ادب ملحوظ رکھا جائے صاحب زادے۔"

والد کے ٹھوکے پر سلیم میاں چونکے گھبرائے ہاتھ پیچھے کیا والدہ کو دیکھا۔ جن کا چہرہ شدت غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

"وہ ہم...... ہم معذرت چاہتے ہیں...... ابا جان...... وہ...... دراصل۔"

"اب، بغلیں مت جھانکیے سلیم میاں! اپنی دلہن کو آداب محفل سکھایئے خصوصاً دسترخوان کے آداب ملاحظہ کر رہے ہیں آپ کہ کھاتے ہوئے ان کے منہ سے کیسی کیسی آوازیں برآمد ہوتی ہیں پچک پچک...... پچک۔ یہ خاتون ہماری برداشت کا امتحان لے رہی ہیں۔" اس سارے وقت میں شگفتہ خاتون نے پہلی بار...... ساس کو دیکھا۔

"ہاں! تو چپ چاپ پر جاعل کریں۔ میری نقل نہ ماریں۔" اس جواب پر علیم الدین اپنی ہنسی چھپاتے اٹھ گئے۔ حمیدہ خاتون کے تو آگ لگ گئی، حمیدہ خاتون خاندان بھر کی تنگ مزاج نفاست پسند...... اور اصول پرست خاتون تھیں۔ وہ اپنے جیسے اوصاف والی بہو ہی چاہتی تھیں۔ ملی تو وہ جس کا ان کے ایک وصف سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اپنا بھاری وجود بمشکل سنبھالتی اٹھیں غرارہ پاؤں میں اٹکا وہ گرنے کو تھیں کہ بیٹے نے سہارا دیا۔ شگفتہ لاپروائی سے ہڈیوں کا "گودا" چوسنے میں مصروف رہیں۔

"دھیان سے اماں جان! اگر آپ کو دسترخوان سے اٹھنا تھا تو ہمیں مطلع کرتیں ہم خود آپ کو اٹھاتے۔" شگفتہ خاتون نے ایک نظر ماں بیٹے پر ڈالی اور گوشت پر اپنا ستم جاری رکھا۔ آخر وہ چنڈ کے کھاتے پیتے گھرانے سے تھیں۔ بیٹے نے ماں کو سہارا دیا انہوں نے بہو کو دیکھا اور بیٹے کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"چھوڑیے...... میاں...... یہ دکھاوے کے چونچلے اب ہم پر لازم ہے کہ اٹھ جائیں۔"

☆☆☆

نبی اور اس کا بوائے فرینڈ مائیکل بھاگتے جا رہے تھے...... نبی بڑھیا کی سارے دن کی کمائی کو دائیں بائیں پھینک دیں گی ہنسے جا رہی تھی۔ بڑھیا نے کچھ دیر تک تو پیچھا کیا۔ مگر پھر ایک جگہ گر گئی۔ تو کسی نے اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر بینچ پر ڈالا اور پولیس کو فون کر دیا۔ اور کچھ دیر میں سارجنٹ موجود تھا۔ فون کرنے والے نے کافی دور نکل گئے نبی ...... مائیکل کی طرف اشارہ کر کے شکایت درج کرائی۔ سارجنٹ اپنی بائیک پر لمحوں میں ان تک پہنچ گیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

PakiBooks.Site

ماورا طلحہ

انکل دیا باعث

وہ ہاتھوں میں ٹرے تھامے دروازے کے بالکل قریب کھڑی تھی، ایک قدم اٹھاتی تو ڈرائنگ روم میں ہوتی مگر وہ اس قدر بدحواس تھی کہ ہاتھوں میں پکڑی ٹرے کانپ رہی تھی اور ٹرے میں رکھے چائے کے کپ تھرک تھرک کر تان سین کا راگ ملہار بجا رہے تھے۔ اس نے بے بسی سے اپنے کانپتے ہاتھوں کو دیکھا، اس کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ کیسے وہ اپنی کپکپاہٹ کو قابو کرے۔ یہ کوئی آج کا واقعہ تھوڑی تھا، اس کے گھر میں ہر دوسرے دن ریڈ کارپٹ بچھ جاتا اور وہ کانپتے قدموں سے کیٹ واک کے لیے تیار ہو جاتی۔

سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ مہمانوں کی لمبی چوڑی خاطر تواضع، اس کی اعلا ڈگریوں کی قصیدہ گوئی اور اس کے سگھڑپن کی تعریفیں...... یہاں تک تو سب ٹھیک تھا مگر ان سب باتوں کے بعد مکمل خاموشی تھی۔ یہ خاموشی ہمیشہ انکار کا پیش خیمہ ہوتی تھی۔ وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ یہاں کھڑی رہے یا اندر جا کر چائے پیش کرے۔ اس نے دل کڑا کیا اور مہمان خانے میں داخل ہو گئی۔

''السلام علیکم'' اس نے ٹرے جلدی سے میز پہ رکھتے ہوئے اجتماعی سلام کیا اور جواباً اک ہلکی سی آواز ابھری تھی۔

اس نے حلیمہ بیگم کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے سرسری نظر سے سب کا جائزہ لیا، سامنے والے صوفے پہ بیٹھی اک لڑکی اور اس کے پہلو میں مرد بیٹھا تھا، جب کہ دائیں ہاتھ پہ کوئی انکل بیٹھے تھے۔ اس نے اک نظر سب کو دیکھ کر دوبارہ سر جھکا لیا، حلیمہ بیگم ہی سب کو چائے سرو کر رہی تھیں۔

اگلے چند لمحے اس کے لیے زیادہ حیرت کا باعث تھے۔ سامنے بیٹھی لڑکی نے ساتھ والے مرد سے کھسر پھسر کی اور مرد نے انکل سے...... تھوڑی دیر کی خفیہ میٹنگ کے بعد ان لوگوں نے ہاں میں جواب دے دیا۔ آج سب کچھ ہی اس کی توقع کے برعکس ہو رہا تھا، کہاں تو لوگ ہفتوں جواب نہیں دیتے اور کہاں ان لوگوں نے بیٹھے بٹھائے اسے پسند کر لیا۔

سامنے والے مرد اور عورت کافی پرجوش تھے، جب کہ ساتھ آئے انکل بے زار صورت لیے بیٹھے تھے۔ اس نے ذرا سی نظر ترچھی کر کے ان صاحب کی طرف دیکھا، وہ نظریں چھت پہ ٹکائے کسی مراقبے میں گم تھے، جیسے یہاں بہو دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ مستریوں کی مہارت پرکھنے آئے ہوں۔

جی ہاں! چند لمحوں میں یہ خوب صورت انکشاف ہوا کہ انکل گم صم اس کے ہونے والے سسر تھے۔ سب بہن بھائی بیرون ممالک مقیم تھے، سب سے چھوٹا بیٹا ان کے پاس رہتا تھا، ان کے لیے ہی انہیں اک سنجیدہ اور سگھڑ لڑکی چاہیے تھی، جو گھر کے ساتھ ساتھ سسر کی خدمت بھی کر سکے۔

حلیمہ بیگم کے شوہر پانچ سال ہوئے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، ایسے میں جوان بیٹی کا بوجھ ان کی پریشانیوں کو دوگنا کیے ہوئے تھا۔ جو بھی رشتہ آتا، وہ اتنی لمبی چوڑی فرمائشی فہرست پکڑا تا کہ انہیں بیٹھے بیٹھے چکر آنے شروع ہو جاتے تھے۔ یہ واحد رشتہ تھا جنہوں نے نہ صرف آمادگی ظاہر کی بلکہ جلد از جلد سادگی سے شادی کا سوال بھی کر دیا۔

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ انہوں نے آتیہ سے رائے لیے بنا ہی حامی بھر لی۔

منگنی کی رسم وہیں بیٹھے بیٹھے ہو گئی تھی۔ اس کی ہونے والی جیٹھانی نے اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر اسے پہنا دی اور جیٹھ نے دس ہزار نکال کر آتیہ کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ چٹ منگنی کر کے پٹ بیاہ کی تاریخ بھی رکھ دی اور وہ ساری شرم و حیا، وقت کا تقاضا اور رسم دنیا بھول کر منہ کھولے حیرت سے سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اس کی زندگی کا فیصلہ روز کی ہنڈیا پکانے کے فیصلے سے بھی زیادہ آسان تھا۔

مہمان عورت عرف اس کی ہونے والی جیٹھانی رخصت ہونے سے قبل اس سے خوب جھپیاں ڈال کے ملی کہ اسے اپنے بند ہوتے سانس کو بچانے کے لیے سارا منہ ہی کھولنا پڑا۔ اسے سارا کچھ ہضم ہو رہا تھا سوائے ساتھ آئے انکل کے جو اس کے ہونے والے سسر بھی تھے۔

''ابو جی! بہو کو پیار کریں۔'' اس کے جیٹھ نے دھیمی آواز سے ساتھ آئے انکل کو کہا، وہ الگ بات کہ دھیمی آواز بخوبی اس کے کانوں تک پہنچی تھی۔

بیٹے کی بات سن کر انکل نے ترچھی نظر آتیہ پہ ڈالی اور دوبارہ نظریں نیچی کرتے ہوئے باہر کو چل دیے، باقی سب بھی ان کی معیت میں نکلتے چلے گئے اور وہ ہکا بکا صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہ گئی۔

''انکل کچھ عجیب سے لگتے ہیں؟'' اس کے دماغ نے دل سے پوچھا، دل نے دھک دھک کر کے دماغ کی بات پہ مہر ثبت کر دی۔

☆☆☆

سارا کمرا سرخ، سفید گلابوں سے سجایا گیا تھا۔ کمرے کے دروازے سے لے کر اینٹیک اسٹائل بیڈ تک پھولوں کی روش بنائی گئی، جس پہ چل کر دلہن مسہری تک پہنچی تھی۔ گلاب کی لڑیوں کا جھنڈ چھت سے بندھا ہوا تھا اور لڑیوں کو اس ترتیب سے پھیلایا

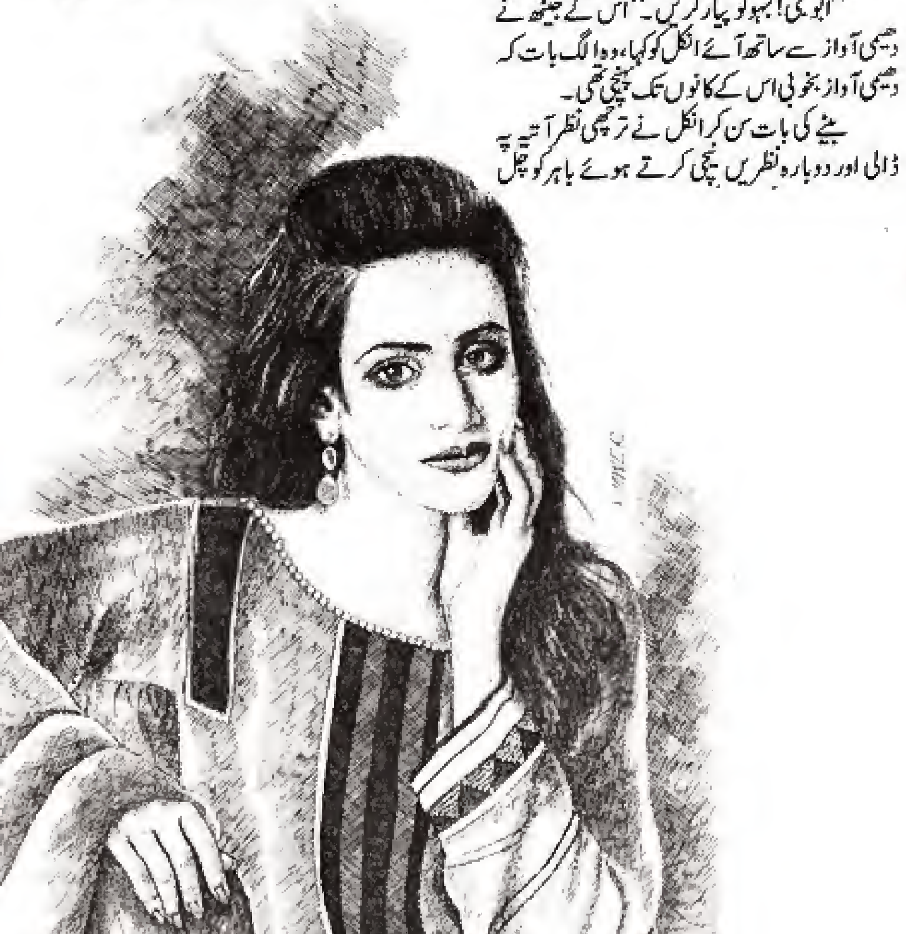

گیا کہ سارا بستر ان کے گھیرے میں تھا۔ گلاب کی تازہ، مہکتی خوشبو سانسوں کو معطر کر رہی تھی۔

وہ کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھی کہ دروازہ کھلا اور آنے والا دبے قدموں چلتا ہوا اس کے سامنے آن بیٹھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی دھڑکنوں کو ڈپٹا اور پلکوں کی چلمن اٹھا کر نو وارد کو دیکھا۔ صبیح چہرے پہ کچھ الجھن رقم تھی۔ اس نے پلکیں جھکائیں اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

"میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کو میری طرف سے کوئی پریشانی نہ ہو، یہ گھر اور اس میں موجود ہر چیز آپ کی دسترس میں دیتا ہوں، آپ بلا شرکت غیرے ہر چیز کی مالک ہیں۔"

اس نے تھوڑا سا توقف کیا، بھید بھری خاموشی تھی۔

"میں آپ سے بدلے میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ ابو جی کا خیال رکھیں۔"

"میں پوری کوشش کروں گی۔" گلے پڑا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے، اس کے دل نے دہائی دی۔

"یقیناً آپ کوشش کریں گی مگر ان کو ہینڈل کرنا آسان نہیں ہے، کافی سال پہلے ان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، جس کے باعث ان کو دماغی مسائل کا سامنا ہے اور اسی وجہ سے وہ عام لوگوں سے تھوڑا ہٹ کے ہیں۔ انہیں ٹریٹ کرنا تھوڑا سا مشکل ہے مگر ناممکن بالکل بھی نہیں۔" وہ اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا اور آتیہ کی نگاہوں میں پہلے دن کا منظر گردش کر رہا تھا۔

"انکل کی خاموشی اور کھوئے ہوئے رہنے کی وجہ یہ تھی، میں بلاوجہ پریشان ہو رہی تھی۔" آتیہ نے سکون کی سانس خارج کی۔ "اچھا ہے دماغ کا مسئلہ خاموشی تک محدود ہے ورنہ پتا نہیں میرا کیا بنتا؟" وہ دل میں ہی سوچ کر رہ گئی۔

"آپ سونا چاہیں تو سو جائیں، مجھے آنے میں تاخیر ہو جائے گی۔"

"لیکن آپ کدھر جا رہے ہیں؟" اسے اٹھتا دیکھ کر بے ساختہ وہ بول اٹھی۔ اچانک احساس ہونے پہ لب دانتوں تلے دبا لیے تھے۔

"ابو جی! میرے بغیر نہیں سوتے، آج ان کی طبیعت ناساز ہے تو شاید مجھے آنے میں وقت لگے۔" اس نے دبی مسکراہٹ سے وضاحت دی تھی۔

"جی ٹھیک۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اب یہ نہ کہہ دینا انہیں لوری بھی سناتے ہو۔" دل نے نئی تان لگائی تھی۔

کپڑے بدلے، منہ ہاتھ دھو کر پندرہ ہزار تالی میں جھونکا، افریقن حسینہ جیسے بال کھولتے ہوئے بازو دکھنے لگے اور یہ سب کرتے اس کی نگاہیں ٹک ٹک کے منبع پہ ہی ٹکی رہیں۔ نہ جانے کس وقت وہ جنستان کی جنتی بی بی ہی محو استراحت ہو گئی۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ آج اس کا مکلاوا تھا اور سارے لوگ اسی رسم کی ادائیگی کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ اس کی تین عدد موٹی موٹی پھپھیاں، دو عدد چاچا اور ایک تایا اپنی پلٹن کے ساتھ اس کے گھر میں دھرنا دیے ہوئے تھے۔ سسرالی خاندان ان کے سامنے ایسا تھا جیسے ہاتھی کے سامنے چیونٹی۔ دو جیٹھ، دو جیٹھانیاں، ایک ایک بچہ اور خاموشی کی اعلا مثال اس کے سسر صاحب۔

وہ تیکھی نظروں سے اپنی پھوپھیوں کا جائزہ لے رہی تھی جو اس کے سسرال کے بارے میں باتیں کرتی ہوئی ہنس رہی تھیں، وہ سب بنا موقع کے بھی ہنس لیتی تھیں اور یہاں تو انہیں پوری فلم فری میں دیکھنے کو مل رہی تھی۔ حدید اور اس کے دونوں بھائی پینٹ شرٹ پہنے ہوئے تھے مگر سونے پہ سہاگا ان کے سروں پہ موجود ٹوپیاں تھیں۔

نماز پڑھنے والی ٹوپیاں ہمہ وقت ان کے سروں پہ رہتی تھیں اور وہ اس قدیم کیس کا راز نہیں پا سکی تھی۔ ایک دو بار اس نے حدید کو آنکھوں کے ذریعے میسج بھیجا مگر وہ اسے سین کیے بغیر مست سا بیٹھا رہا۔ آتیہ نے جیٹھانی کی سمت دیکھا، ہاتھ سے

سر پہ اشارہ کرتے ہوئے معاملے سے آگاہی چاہی تو بولا انہوں نے بھی خاموش رہنے کو کہا۔

اسے عجیب سی کوفت ہونے لگی تھی، سسر صاحب ایسے تن کر صوفے پہ بیٹھے تھے جیسے زبردستی بٹھایا گیا ہو اور ابھی اٹھ کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ چہرے کے تاثرات اتنے ساکت کہ جیسے سامنے سارے مجرم کھڑے ہیں اور وہ پھانسی دینے والے جلاد ہیں۔ ان تین دنوں میں آتیہ نے انہیں بولتے نہیں دیکھا تھا، تو دماغی مسائل کا خاک پتا لگاتی۔

اس نے سسر کو ان کے حال پہ چھوڑا اور خود بڑی جیٹھانی سے باتوں میں مگن ہو گئی۔ اس کی دونوں جیٹھانیاں بیرون ممالک سے شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں اور آج مکلاوے کی رسم کے بعد انہوں نے اپنے اپنے میکے جانا تھا اور وہاں سے ہی رخصت ہو جانا تھا۔ باتوں کے درمیان اس کی نظر سسر پہ پڑی تو ان کے چہرے پہ الجھن بھرے تاثرات تھے، اس نے ان کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو اس سمت بڑی پھوپھو کا بیٹا کھڑا تھا۔

"بیٹا جی! ویسے آپ کتنے بے شرم ہیں، آپ کو پیار محبت والے کپڑے پہننے چاہئیں۔" وہ ان کی طرف دیکھ ہی رہی تھی جب ان کے لب ہلے اور ڈرائنگ روم میں خاموشی چھا گئی۔ سب نے ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا، ذیشان صم بکم ہوا کھڑا تھا۔ ان کا اشارہ شاید اس کے گھٹنوں تک آتے شارٹس کی طرف تھا۔ پھوپھو نے تلملاتے ہوئے سب کو دیکھا اور اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں۔

"بیٹا جی! پیار محبت سے سر بھی ڈھانپ لیا کرو۔" ذیشان کو وہاں سے نکلتے دیکھ کر انہوں نے اک اور نصیحت کی تھی۔

اس کے جاتے ہی سارا کمرا زعفران بن گیا، سب ہنس ہنس کے برا حال ہو چکا تھا۔ وہ خود کئی بار ذیشان کو منع کر چکی تھی مگر وہ اثر لینے والے دن ان میں نہیں ہوا تھا۔ آتیہ نے دوبارہ سسر کی سمت دیکھا تو وہ پھر سے مراقبے میں جا چکے تھے۔ اس کو حدید اور ان کے بھائیوں کا سروں پہ ٹوپیاں پہننے کا راز سمجھ آ گیا تھا۔ کافی دیر تک اس کے لب مسکراتے رہے اور حدید خواہ مخواہ ہی شرمندہ ہوتا رہا۔

☆☆☆

شادی کے اوائل دن تھے۔ سارے مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ زندگی اک دم سے بہت عجیب ہو گئی، امی کے گھر کی اکلوتی ہونے کے باوجود اسے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوا اور یہاں اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلی دیواروں سے سر ٹکراتی رہتی تھی۔

حدید چند دنوں بعد ہی کام پہ جانا شروع ہو گئے تھے۔ آغاز کے کچھ دن تو صبح امی کی طرف چھوڑتے اور رات میں گھر جاتے ہوئے لے لیتے مگر یہ معمول بھی کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ اک دن اس نے خود ہی منع کر دیا کہ اب گھر اس کی توجہ کا متقاضی تھا۔

اس نے سوچا گھر کے کاموں میں الجھ کر وہ تنہائی کو بھول جائے گی اور دوسرا سسر کا آسرا بھی ہو گا مگر سب کچھ اس کی توقع کے برعکس تھا۔ حدید پراپرٹی ڈیلر تھا، جاتے ہوئے ابو کو ساتھ لے جاتا۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ وہ انہیں گھر چھوڑتا اور اس دوران بھی آتیہ کو کتنی ہی کالز ان کی خیریت پوچھنے کے لیے آئی تھیں۔ ان کے سارے کام حدید خود کرتا تھا سوائے کپڑے دھونے اور ہنڈیا بنانے کے۔ آتیہ کی ذمہ داری کھانا بنانے کی تھی۔

اس کے میکے میں سب لڑکیاں اس جیسی قسمت زور و شور سے مانگتی پائی جاتیں، ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ہی اس کی جگہ آ کر بیٹھ جائیں اور وہ اس ساری صورتحال سے بے زار ہوئی بیٹھی تھی۔ اتنے تو اس کے نخرے نہیں اٹھائے گئے تھے جتنے حدید اپنے باپ کے اٹھاتا تھا۔ ان کو سلانا، کھلانا، نہلانا، باتیں کرنا سب کام حدید خود کرتا تھا۔

اس دن حدید کو کام کے سلسلے میں کہیں دور جانا تھا تو سسر صاحب گھر میں ہی تھے۔ آتیہ نے سوچا کہ سارے کام وہ اچھے طریقے سے کرے گی تو حدید کو

اس پہ بھروسا ہوگا اور ایسے شاید اس کی تنہائی بھی ختم ہو جائے۔ وہ گھر کے سارے کام ختم کر کے ان کے پاس آبیٹھی، دو تین مرتبہ بات کا آغاز کیا مگر ان کے تاثرات ”تو کون، میں کون۔“ والے ہی رہے۔

”انکل! آپ کو ٹی وی لگا دوں؟“ آخری حل اسے یہ ہی نظر آیا تھا۔

”نہیں، بیٹا جی! یہ شیطانی ڈبا ہمیں نہیں پسند، ہمارے سونے کا وقت ہوگیا، اب ہم پیار محبت سے سوئیں گے۔“ انہوں نے دوٹوک لہجے میں کہا تو وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔

گھڑی دیکھی تو دو بج چکے تھے اور یقیناً یہ ان کے سونے کا وقت تھا۔ اس نے اک نظر شیطانی ڈبے کو دیکھا اور پھر سسر کو...... جو پیار محبت سے لیٹ چکے تھے۔ اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھے تھے۔ آتیہ نے خاموشی سے باہر کو قدم بڑھا دیے۔

”بیٹا جی! پیار محبت سے ذرا ٹھنڈی مشین تو چلا دیں۔“ انہوں نے پیچھے سے اسے پکارا۔

آتیہ حیرت سے پلٹی اور پریشان نظروں سے ان کی سمت دیکھنے لگی۔ وہ حکم کر کے خود آنکھیں بند کر چکے تھے۔

”اب یہ ٹھنڈی مشین کیا ہے؟“ اس کی الجھن بڑھی تھی۔ ”شاید فریج کا کہہ رہے ہیں، ٹھنڈی مشین وہ ہی ہو سکتی ہے۔“ اس نے سارے کمرے کا جائزہ لیا مگر فریج ندارد تھی۔

”کیا کچن میں فریج آن کرنے کا کہہ رہے ہیں؟“ اس نے کچن کی طرف قدم بڑھائے مگر وہاں تو فریج پہلے ہی آن تھی۔ آتیہ پشیمان سی دوبارہ سسر کے کمرے میں آگئی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اے سی کی طرف گئی، ٹھنڈی مشین اگر فریج نہیں تھی تو یقیناً اے سی ہی تھا۔ بے ساختہ اس کے لب مسکرا اٹھے، وہ اکثر سسر کی باتیں نہیں سمجھ پاتی تھی، چیزوں کی جو اصطلاح وہ استعمال کرتے تھے، وہ عام فہم نہیں ہوتی تھیں۔ آغاز میں جھنجلاہٹ اور غصہ طاری ہوتا مگر اب اکثر ہنسی آتی تھی۔ آتیہ نے خاموشی سے اے سی چلایا اور دروازہ بھیڑتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

☆☆☆

گاڑی سڑک کو روندتے ہوئے تیزی سی منزل کی جانب رواں تھی، دور سے نظر آتے پہاڑ، ٹیڑھا میڑھا راستہ اور بادلوں کی آنکھ مچولی سفر کی دلکشی بڑھائے ہوئے تھے۔ حدید کو اسلام آباد کسی کام کی غرض سے جانا تھا تو ساتھ آتیہ کو بھی آفر کر دی، اگر وہ دونوں جاتے تو ساتھ میں سسر لازمی تھے...... آتیہ کا دل چاہا منع کر دے، وہ پل بھی تنہائی کے میسر نہیں تھے۔ اس کی ساری بے زاری ایک طرف مگر وہ حدید کو منع نہیں کر سکی تھی اور اسی باعث وہ پچھلے تین گھنٹوں سے اسلام آباد کی طرف گامزن تھے۔

سارا راستہ خاموشی سے کٹ رہا تھا۔ حدید ڈرائیونگ سیٹ پہ جب کہ سسر فرنٹ سیٹ پہ براجمان تھے، حدید کے پہلو میں بیٹھ کر ایک لمبے سفر کی خواہش حسرت بن گئی تھی۔ وہ سارے راستے سر شیشے سے ٹکائے باہر کے مناظر دیکھنے میں مگن رہی، اک دو بار حدید کے پکارنے پہ ہوں ہاں میں جواب دے کر دوبارہ نظریں باہر کو کر لیں۔ یہ اس کا خاموش احتجاج تھا مگر مقابل کو چنداں پروا نہیں تھی۔

”بیٹا جی! ہم کب پہنچیں گے پیار محبت سے؟“ سسر کے بولنے پہ وہ بھی چونکی تھی۔ اس نے چہرہ موڑ کر انہیں دیکھا، وہ سارا راستہ سوئے رہے تھے، انہیں خواب خرگوش کے مزے لیتے دیکھ کر وہ کڑھتی رہی تھی...... اگر سونا ہی تھا تو پیچھے مزے سے سو جاتے اور اب اٹھ کر مزے سے پوچھ رہے تھے کہ کب پہنچیں گے۔

”بس ابا جی! زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگیں گے۔“ حدید نے انہیں مطمئن کیا تھا۔

حدید کے بیس منٹ کب کے گزر چکے تھے اور وہ بدترین ٹریفک جام میں پھنسے ہوئے تھے۔ ارد گرد گاڑیوں کا شور، اک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش اور بار بار سگنلز کا سرخ ہونا عجیب افراتفری کا

ماحول تھا۔ آتیہ کا مزاج مزید برہم ہوا۔

”یہ آپ کے بیس منٹ کب گزریں گے، کہا بھی تھا صبح جلدی نکلیں تاکہ سکول اور آفس ٹائم پہ ہونے والے ٹریفک جام سے پہلے پہنچ جائیں، اب پھنسے رہیں دس بجے تک یہاں۔“

”بیٹا جی! آپ نے تو وہ حساب کیا کہ مردہ بولے نہ بولے اگر بولے تو کفن پھاڑے۔ سارا راستہ آپ پیار محبت سے بیٹھی رہی اور اب اک دم چیخ کر ہمارے کانوں کا نقصان کرنے لگ گئیں۔“ انہوں نے آتیہ کو بنا دیکھے اس کی طبیعت صاف کر دی تھی۔

”ہاں! آپ تو یہ ہی چاہیں گے، میں گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی رہوں اور آپ بیٹے کے ساتھ گھس پھس لگا کے رکھیں۔“ وہ جواباً منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے رہ گئی۔

☆☆☆

حدید نے آتیہ اور ابا جی کو اپنے دوست کے گھر ٹھہرایا اور خود کام کی غرض سے نکل گئے۔ دو، تین گھنٹوں بعد واپسی ہوئی تو اس کی بس ہو چکی تھی، ایک تو بالکل انجان لوگوں کے پاس بیٹھنا دشوار تھا اوپر سے سسر جی کی حرکات اسے شرمندہ کیے دے رہی تھیں۔ ان کا رویہ بالکل ویسے تھا جیسا اس کے ساتھ آغاز میں تھا، ساکت نظریں زمین میں گاڑے، انجان سا رویہ کہ میزبان بھی شرمندہ ہوئے جا رہے تھے۔

اس کا انتظار اللہ اللہ کر کے ختم ہوا، جیسے ہی حدید آئے اس نے نکلنے کی تھی۔ اس نے تہ دل سے ارادہ کر لیا تھا کہ آئندہ ایسے بورنگ ٹرپ پہ زندگی بھر نہیں آئے گی۔ جہاں شوہر کا ساتھ کم اور سسر کا زیادہ ملے۔ حدید نے بارہا پوچھا کہ کہاں جایا جائے مگر اس نے منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی تھی۔ آخر تنگ آ کر وہ انہیں سینٹورس مال لے آیا تھا۔

”بیٹا جی! آپ تو پیار محبت سے ان چلتی راہوں پہ چل پڑو گے مگر ہم ابھی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔“ ابا جی کے کہنے پہ حدید کو پھر رکنا پڑا تھا۔

ان کی بات سن کر آتیہ دل مسوس کر رہ گئی، یہ چلتی راہیں یقیناً ایکسیلیٹر کو کہا گیا تھا۔ حدید انہیں قائل کرنے کی کوشش میں تھا جب کہ ان کا پرزور انکار ہجوم کو متوجہ کر رہا تھا۔ جیسے تیسے کر کے انہیں راضی کیا گیا تو آتیہ نے بھی سکون کی سانس لی۔

حدید ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا اور وہ ان کے ساتھ بے تھے بیل کی طرح چلتی جا رہی تھی، جس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ ایک شاپ پہ حدید کو اپنے لیے ڈریس پسند آیا تو وہ ٹرائی روم میں چلا گیا، آتیہ بھی ارد گرد کپڑے دیکھنے میں مگن تھی جب سسر نے آ کے اس کا بازو ہلایا۔

”بیٹا جی!“

اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”یہ لڑکی ہے یا لڑکا؟“ انہوں نے انگلی سے اک سمت اشارہ کیا۔ آتیہ نے اس طرف دیکھا، ایک لڑکی گھٹنوں سے اوپر پینٹ، ٹائٹ شرٹ پہنے شاپنگ میں بزی تھی۔ اس کے چھوٹے بال اسے بھی لمحہ بھر کو کنفیوز کر گئے تھے۔

”لڑکی ہے۔“ انہیں دوٹوک جواب دے کر وہ دوبارہ مصروف ہوگئی۔

”واٹ ڈو یو مین؟“

شاپ میں اک دم ہلچل مچی تو اس نے بھی مڑ دیکھا اور ساکت رہ گئی۔ وہی چھوٹے بالوں والی لڑکی کڑے تیور لیے سسر جی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ فوراً ان تک پہنچی۔

”کیا ہوا ہے؟“

”بیٹا جی! انہوں نے تو میرے کان پھاڑ دیے۔“ انہوں نے آتیہ کو پاس کھڑے دیکھ کر کہا، مقابل کھڑی لڑکی دیدے پھاڑے اب بھی انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

”آپ اپنے ساتھ آئے مینٹل لوگوں کو سنبھال کر رکھا کریں، دوسروں کو ڈسٹرب کرتے رہتے ہیں۔“ اس لڑکی نے آتیہ کو دیکھ کر نہایت کرخت لہجے میں کہا۔

"دیکھیے انہوں نے آپ سے بھی جو بھی کہا، میں اس کے لیے معذرت کرتی ہوں مگر آپ ان کے بارے میں اس طریقے سے بات نہیں کر سکتیں۔ یہ دماغی مسائل کا شکار ہیں یا نہیں مگر آپ اس طرح شاؤٹ کرتی ہوئی بالکل سائیکو پیشنٹ لگ رہی ہیں۔"

اس کے اپنے اختلافات، ناراضی اور تحفظات اپنی جگہ مگر وہ کسی اور کو بولنے کا حق نہیں دے سکتی اور یہ سوچ اک دم سے اس کے دماغ میں ابھری تھی۔ اس لڑکی کا اس طرح بولنا آتیہ کو واقعی ہی شدید ناگوار گزرا تھا۔ وہ اسے دوٹوک جواب دے کر، سسر کا ہاتھ پکڑے شاپ سے باہر نکل آئی تھی۔ حدید کو بھی میسج کر کے باہر آنے کا کہہ دیا۔

"آپ نے کیا کہا تھا اسے؟" اک دم خیال آنے پہ اس نے پوچھا۔

"مجھے وہ بڑی بے حیا لگی تو میں نے کہا، بیٹا جی! پیار محبت والے کپڑے پہنا کرو۔" انہوں نے بے تاثر لہجے میں کہا اور نگاہیں پاس سے گزرتی ایک اور بے حیا کی طرف کر لیں۔

آتیہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ خود کو شاپنگ مال میں موجود سب لڑکیوں سے زیادہ حسین سمجھنے والی پہ ان الفاظ کا کیا اثر ہوا ہوگا، تب ہی تو وہ اس بری طرح چیخی تھی۔

"آپ نے جو کہنا ہو وہ مجھے کہا کریں، باقی کسی کو بھی نہیں۔" اس کے لہجے کی کڑواہٹ اس پل غائب تھی۔

"بیٹا جی! آپ تو پہلے ہی پیار محبت والے کپڑے پہنتی ہو۔" ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔

آتیہ پل بھر کو سن ہو گئی، وہ اس کے پہناوے پہ گہری نگاہ رکھتے تھے اور وہ کبھی محسوس ہی نہیں کر سکی۔ اسے کبھی نہیں لگا تھا کہ انہوں نے کبھی اسے غور سے دیکھا بھی ہو...... اگر وہ اس کے لباس کو جانچ سکتے ہیں تو اس کے رویے، لہجے اور الفاظ کو کیوں نہیں۔ وہ انہیں دماغی مسائل کا شکار سمجھ کر نظر انداز کرتی آئی تھی، اکثر ان کے سامنے امی سے ان کے بارے میں کئی نازیبا باتیں بھی کہہ گئی۔ وہ اس پل خود کو شرمندگی کی کھائی میں گرا ہوا محسوس کر رہی تھی، اس لیے جیسے ہی حدید آئے اس نے واپسی کا مطالبہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

وقت کا کام مخصوص رفتار سے چلنا ہوتا ہے اور وہ چلتا ہی رہتا ہے، وہ الگ بات ہے کہ خوشی کے لمحات میں اس کی رفتار دوگنی ہو جاتی ہے اور غم میں ایک پہر بھی صدیوں سا طویل ہوتا ہے۔

آتیہ کو حدید کی زندگی کا حصہ بنے کئی ماہ گزر گئے، چند خوشی کے پل جو اسے میسر ہوئے تھے ان میں سے ایک سنینا کی پیدائش تھی۔ گھر کے گنے چنے افراد، نہ کوئی اضافی ذمہ داری، نہ خاندانی رنجشیں، پیار کرنے والا شوہر۔۔۔ سب کچھ تھا مگر زندگی پھر بھی بے نام تھی اور اب اسے اپنی حیات کا عنوان سنینا کی شکل میں مل گیا تھا۔

شروع کے چند ماہ سسر کو سمجھنے کی سر توڑ کوشش کی مگر پھر تھک ہار کر سائڈ پہ ہو گئی۔ حدید بھی شاید اس بات پہ نالاں تھے مگر اظہار نہیں کیا تھا۔ آتیہ کو سسر کا حوالہ مذاق لگنے لگا تھا اور کسی حد تک وہ حق بجانب تھی۔ اس کے میکے سسرال ہر جگہ سسر کا حوالہ موجود ہوتا، لڑکے مذاقاً تو پیاں کھینچ پکڑ لیتے، جان بوجھ کر کوئی ٹاپک چھیڑ دیتے اور سسر صاحب تیخ پا ہو کر پیار محبت سے شروع جاتے۔ ان حالات سے لڑتے لڑتے وہ ہار گئی، اس نے خود کو گھر ہی میں محصور کر لیا تھا۔

سنینا کی پیدائش کے بعد چند دن تو امی اس کے پاس رہیں مگر کب تک رہ سکتی تھیں، امی کے جاتے ہی سارے کام اس کے سر پہ آن پڑے تھے۔ گھر کے سارے کام وہی تھے مگر ساتھ میں سنینا کو بہلانا بہت مشکل تھا۔ ملازمہ وہ قطعاً نہیں رکھ سکتی تھی کیونکہ سسر کو غیر محرم عورتیں گھر میں دندناتی اچھی نہیں لگتی تھی اور نہ ہی ملازمہ پیار محبت شفقت کا فارمولا سمجھتی تھی۔

اس وقت بھی وہ کچن میں ہنڈیا بنا رہی تھی اور سنینا گلا پھاڑے رو رہی تھی، اب وہ کروٹ بھی بدل لیتی تھی اور آتیہ کو ہر وقت یہ ہی دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں بیڈ سے نیچے نہ گر جائے۔ اس نے جلدی سے ہنڈیا کو دم دیا، سنینا کا فیڈر ریانی میں بوائل کیا تو یک دم اسے محسوس ہوا سنینا چپ کر گئی ہے۔ سب کچھ چھوڑ کر وہ کمرے کی طرف بھاگی مگر دہلیز پہ ہی اس کے قدم رک گئے تھے۔

سسر سنینا کو گود میں اٹھائے کمرے میں آہستگی سے ٹہل رہے تھے۔ انہیں خود چلنے میں مسئلہ تھا، اکثر حدید ہی انہیں سہارا دیتے تھے مگر اس وقت وہ اپنی تکلیف بھلائے سنینا کو بہلا رہے تھے۔ ان کے چہرے پہ ہلکا سا تکلیف کا تاثر بھی تھا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی اور سنینا کا فیڈر بنانے لگی، اس کے واپس آنے تک وہ اسے اٹھا کر چل رہے تھے، آتیہ کو دیکھتے ہی انہوں نے سنینا اسے پکڑا دی تھی۔

یہ سلسلہ اسی دن تک محدود نہیں رہا بلکہ کئی دن یہ مناظر دیکھنے کو ملتے رہے، حدید کو بھی یہ تبدیلی خوش گوار محسوس ہوئی تھی، تب ہی آتیہ سے پوچھ بیٹھا۔

"ابو جی! میرے علاوہ کم ہی کسی سے مانوس ہوتے ہیں، یہ کایا پلٹ کیسے ہو گئی؟"

"سنینا پیار محبت سے گلا پھاڑ کر روتی ہے، اس لیے شاید انہیں ناگوار گزرتا ہے تو وہ اسے چپ کروا دیتے ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں کڑواہٹ گھل آئی تھی۔ آتیہ خود ان کے رویے سے مطمئن تھی اور کسی حد تک مشکور بھی مگر نہ جانے کیوں زبان سے اقرار مشکل تھا۔

"تمہارے شکوے اپنی جگہ ہیں مگر تم جانتی ہو انہیں چلنے میں مشکل ہوتی ہے، تم جب کام کرتی ہو تو بیا کو کھلونے دے کر ان کے پاس بٹھا دیا کرو تاکہ انہیں چل کر اس کے پاس نہ جانا پڑے، تمہاری مشکل بھی حل ہو جائے گی اور ان کا دل بھی بہل جائے گا۔" حدید نے ہمیشہ کی طرح اس کے شکوے نظر انداز کر کے نیا فرمان جاری کر دیا تھا۔

وہ حدید کی بات سے لاکھ انکار کرتی، اسے ہزاروں مسائل ہوتے مگر اندر سے وہ بھی مطمئن تھی۔

اب وہ کام کے دوران سنینا کو کھلونے، فیڈر دے کر ان کے پاس بٹھا جاتی تھی، ایسا کرنے سے ایک طرح کی بے فکری مل جاتی اور کام بھی سکون سے ہو جاتے تھے۔ کپڑے دھو کر فارغ ہوئی تو نظر گھڑی پہ پڑی، دو بج چکے تھے اور یہ ان کے سونے کا وقت تھا، وہ جلدی سے سنینا کو لینے ان کے کمرے کی طرف آئی تو وہ سکون سے بیٹھے تھے، کسی قسم کی بے زاری نہ دیکھ کر اس نے شکر ادا کیا اور سنینا کو پکڑ کر کمرے سے باہر آنے لگی۔

"بیٹا جی! یہ چھوٹی کا ٹیوب ویل بھی لے جاؤ۔" وہ ابھی دروازے میں ہی تھی کہ پیچھے سے انہوں نے کہا۔

آتیہ نے چونک کر انہیں دیکھا کہ آیا جو اس نے سنا وہ ٹھیک تھا یا انہوں نے کچھ اور بولا۔ اسے اپنی طرف متوجہ پا کر انہوں نے ہاتھ کا اشارہ میز پہ پڑے سنینا کے فیڈر کی طرف کیا تھا۔ وہ یقیناً فیڈر کو ٹیوب ویل کہہ رہے تھے۔

"یہ فیڈر ہے۔" آتیہ نے جتلایا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر وہ جانتی تھی اب سنینا کا فیڈر ٹیوب ویل ہی رہنے والا تھا۔

☆☆☆

موسم نے یک دم انگڑائی لی تو زمین سنہرے پتوں سے بھر گئی، ہلکی ہلکی خنکی نے سردیوں کا مژدہ سنا دیا تھا۔ ہواؤں کی تبدیلی اس پہ بھی اثر انداز ہوئی، زکام اور بخار نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا، ایسے میں حدید نے بھرپور تعاون کیا تھا۔

آج وہ دو دن بعد بستر سے اٹھنے کے قابل ہوئی تھی، حدید نے اپنی طرف سے سارے کام کر دیے تھے مگر جس کا کام اسی کو ساجھے۔ مرد کے ذمے کمانا ہے تو وہ وہی ٹھیک سے کر سکتا اور گھر عورت سے بہتر کوئی نہیں چلا سکتا۔ چھوٹے موٹے کئی کام نظر آ

رہے تھے مگر اس نے نظر انداز کر دیے، کمزوری کے باعث ابھی بھی اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ کچھ کھانے کی غرض سے کمرے سے نکلی تو اسے احساس ہوا ان دو دنوں میں سنیتا کو وہ بالکل نظر انداز کر گئی تھی، اس وقت بھی سنیتا کمرے میں نہیں تھی۔ سسر کے کمرے سے ٹی وی اور باتوں کی آواز آ رہی تھی، یقیناً حدید اور سنیتا وہیں تھے۔ وہ بنا آہٹ کیے ان کے کمرے کی چوکھٹ پہ آ کھڑی ہوئی۔ سامنے کا منظر اسے حیران کرنے کو کافی تھا۔

ایل سی ڈی پہ شاید کوئی ڈرامہ لگا ہوا تھا، سنیتا دادا کی گود میں منہ کو فیڈر لگائے بیٹھی ہوئی تھی، ڈرامے کے کردار خاموش جب کہ سنیتا کے دادا نان اسٹاپ بولتے جا رہے تھے۔ اس نے اوٹ میں سے ہی اک نظر باقی کمرے میں ڈالی، حدید اک کونے میں چپ چاپ بیٹھے اخبار پڑھنے میں مگن تھے۔ اس نے ان دونوں کی طرف دھیان دیا کہ سسر چھوٹی سی بچی سے ایسی کون سی باتیں کر رہے ہیں۔

''چھوٹے بیٹا جی! وہ دیکھیں، سارے مل بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں، یہ ہی تو پیار محبت والی عادت ہے۔''

اس نے سسر کی نظروں کا تعاقب کیا، ڈرامے میں شاید کوئی فیملی سین تھا اور وہ سب کھانے کی میز پہ بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، سسر صاحب کو اس میں بھی پیار محبت نظر آ رہا تھا۔ آتیہ کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے یا کسی دیوار سے مار دے۔

''چھوٹے بیٹا جی! یہ سفید کرتے والی بچی بہت پیار محبت والی ہے، دیکھیں کیسے شفقت سے اس نے دوپٹا لیا ہوا ہے۔'' اس نے بے ساختہ دوبارہ اسکرین پہ دیکھا...... بوڑھی عورت جس نے اپنے سفید بالوں پہ دوپٹا لیا ہوا تھا، انہیں بچی نظر آ رہی تھی۔

''چھوٹے بیٹا جی! اس بچی میں پیار محبت والی بات ہی نہیں، کیسے مردانہ کپڑے پہنے ہوئے۔''

اسی اثنا میں حدید کی نظر اس پہ پڑی تو وہ پل میں اس کی تیور سمجھ گیا، اس نے آنکھوں ہی آنکھوں کچھ نہ بولنے کا اشارہ کیا تو وہ تلملا کے رہ گئی۔ اس نے ہر نصیحت نظر انداز کی اور جارحانہ انداز میں سنیتا کو سسر کی گود سے اٹھایا، پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے نکل کر کمرے میں آ گئی، اس کے پیچھے ہی حدید آ گیا تھا۔

''میں بیمار کیا ہوئی، آپ نے میری بیٹی ان کے حوالے کر دی تاکہ اپنی پیار محبت والی زبان اسے بھی سکھا دیں، ابھی اس کی عمر دیکھیں اور وہ کون سی باتیں سکھا رہے ہیں؟'' وہ اپنی شادی کے ڈیڑھ سال میں پہلی دفعہ یوں چیخی کہ حدید بھی پل کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔

''اپنی آواز آہستہ رکھو، ابو سنیں گے تو انہیں دکھ ہو گا۔'' حدید نے اس کا ہاتھ جھنجوڑ کر اسے تنبیہ کی۔

''آپ ڈیڑھ سال سے مجھے چپ کرواتے آ رہے ہیں اور میں چپ رہی، کیونکہ معاملہ میری ذات کا تھا مگر اب میں چپ نہیں رہوں گی۔ آپ چاہتے ہیں جس طرح سب آپ کے ابو جی کا مذاق اڑاتے ہیں اسی طرح میری بیٹی کے ساتھ بھی ہو، آپ کو میری شکل میں ایک بے وقوف مل گئی مگر میں اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی۔'' اس نے قطعی انداز میں حدید کی تنبیہ رد کی تھی۔

''آتیہ! ابھی اور اسی وقت سنیتا کو لے کر ابو کے پاس جاؤ اور ان سے معافی مانگو۔'' حدید نے دھیمی آواز میں مگر کسی حد تک غراتے ہوئے کہا۔

''میں کسی صورت اپنی بیٹی نہیں دوں گی اور اگر آپ نے مجبور کیا تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا اور سنیتا کو لیے بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی اور یہ خاموشی اسے اپنے حق میں لگی، حدید کبھی بھی اس کا جانا افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے، تم اپنا سامان پیک کر لو، میں تمہیں چھوڑ آؤں گا مگر اس بھول میں نہ رہنا کہ تم سنیتا کو لے کر جا سکتی ہو اور یہ بات بھی یاد رکھنا کہ اگر ایک مرتبہ جاؤ گی تو واپسی کے لیے لینے کوئی نہیں آئے گا۔'' حدید کے لہجے میں دنیا جہان کی کرختگی آسمائی تھی۔

آتیہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی، اسے ایسے لگا جیسے کمرہ سارے سامان کے ساتھ اس پہ آ گرا ہو اور وہ اپنے فخر و غرور کے ساتھ اس ملبے تلے دفن ہو گئی ہو۔

''عورتوں کی ایک قسم ایسی ہوتی ہے جن کے خمیر میں ناشکری شامل ہوتی ہے اور مجھے افسوس رہے گا کہ میری زندگی میں بھی ایسی ہی عورت آئی۔'' حدید نے قہر بھری نگاہ اس پہ ڈالی اور کمرے سے نکل گیا۔

وہ ساکت کسی مجسمے کی طرح بیٹھی رہ گئی، کمرہ حدید کے کہے الفاظ سے گونج رہا تھا۔ وہ ڈیڑھ سال کی رفاقت پہ افسوس کر گیا، وہ اسے اک پل میں ناشکری عورت کہہ گیا تھا۔

''میں نے کبھی بے جا فرمائشیں نہیں کیں، جو ملا اس پہ راضی رہی اور پھر بھی میں اس کی نظر میں ناشکری ٹھہری۔'' اس کے دل میں درد کی ٹیس اٹھی تھی۔

''تمہیں مانگنے کی ضرورت کب پڑی، ہر چیز تو بن مانگے تمہیں ملتی رہی۔ وہ تمہیں ناشکری نہ کہے تو کیا کہے۔'' اس کا عکس سامنے شیشے میں ابھرا اور اس پہ طنزیہ مسکراہٹ اچھال دی۔

''تو اسے فرض بنتا تھا مجھے سب کچھ دینا، وہ کوئی احسان نہیں کرتا رہا مجھ پہ۔'' وہ شیشے کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی تھی۔

''تمہارے بھی کچھ فرائض ہیں، کیا تم نے پورے کیے؟ ایک انسان کی ذمہ داری بھی تم سے سنبھالی نہیں گئی، اس نے تمہارے ہر رشتے کو احترام دیا اور اس کے برعکس تم نے ہر بار اس کے باپ کو دھتکار دیا۔ رشتوں کے ترازو میں ہمیشہ عزت کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔'' شیشے میں نظر آتے عکس نے پچھلے ڈیڑھ سال کا خلاصہ اس کے منہ پہ دے مارا تھا۔

آتیہ نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا، وہ خود کو ہلکا ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ اور آج ضمیر اس کی کاملیت نے پول کھول گیا تھا۔ غلطی کرنا برائی نہیں ہوتا بلکہ غلطی کا احساس ہونے پر اس کا تدارک نہ کرنا برائی ہے۔

بزرگ اونچے تناور درخت کی طرح ہوتے ہیں، جو اگر جھکے تو ٹوٹ جائے اور بچے نوزائیدہ پودے کی طرح جو ہوا کے دوش پہ ہر جانب جھک جاتا ہے۔ اسے جھکنا ہی تھا اور اسی میں اس کی عزت تھی۔

وہ خاموشی سے اٹھی، سنیتا کو گود میں اٹھایا اور سسر کے کمرے کا رخ کیا، وہ ویسے ہی بیٹھے تھے جیسے کچھ دیر قبل وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ اس کی آمد پہ حدید چونکا۔ شاید اسے لگا کہ وہ کوئی سخت فیصلہ کر چکی ہے۔

''ابو جی! مجھے تھوڑا کام ہے، آپ تھوڑی دیر کے لیے سنیتا کو پیار محبت سے اپنے پاس بٹھا لیں، اس کا ٹیوب ویل بھی میز پہ رکھ رہی ہوں مگر یہ ٹھنڈی مشین بند کرنے لگی ہوں، کیونکہ چھوٹی کاکی کو پیار محبت سے فلو ہو رہا ہے۔'' اس نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں کر دیں۔

ابو جی ان ڈیڑھ سالوں میں پہلا دفعہ بولا مگر انکل سے ابو جی کا سفر اتنا آسان ہو گا، اسے معلوم نہیں تھا۔ اگر وہ یہ جان جاتی کہ اس لفظ اور رشتے کو تسلیم کرنے سے اسے اتنا سکون ملے گا تو وہ بہت پہلے مثبت اقدام کر چکی ہوتی۔ حدید بہت آہستگی سے اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔

''بیٹا جی! آپ نے بہت سخت ڈانٹا ہے انہیں، پیار محبت سے رہا کریں۔'' انہوں نے سنیتا کو تھامتے ہوئے کڑی نظروں سے حدید کو دیکھا تھا۔

آتیہ کھلکھلا کے ہنسی تھی اور شاید شادی کے بعد یہ پہلی مسکراہٹ تھی جس میں پیار محبت شامل تھا۔ زندگی میں بہت کچھ پہلی دفعہ ہوتا ہے، بس ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم وہ پہلا اچھا اور مثبت کام کرنے میں بہت دیر نہ کریں۔

اب آپ بتائیے! آپ کی زندگی میں کتنا پیار محبت شامل ہے؟ اور آتیہ نے پیار محبت کو سمجھنے میں کہیں زیادہ دیر تو نہیں کر دی تھی؟

☆☆

PakiBooks.site

صدف ریحان گیلانی

ڈھل گئی دھوپ

نانی اماں کہا کرتی تھیں کہ جب شام ڈھلے مرد گھر آتا ہے تو اس کے ساتھ شیطان بھی گھر میں گھس آتا ہے۔ جو گھر میں پھیلی کھیوں کی طرف اس کا دھیان دلوا کر فساد کرواتا ہے۔ شیطان کے اس کاری وار سے بچنے کے لیے عورت کو چاہیے کہ جب مرد گھر کے دروازے پر دستک دے تو وہ دہلیز پر اس کے قدم رکھنے سے پہلے سات بار پوری بسم اللہ پڑھ لیا کرے۔ یوں شیطان منہ کی کھا کر واپس پلٹ جاتا ہے اور ہمیشہ ہوتا یہ تھا کہ ابا کے گھر آنے سے پہلے اماں ہر حفاظتی تدبیر کرلیا کرتیں۔

"اے منیب! بھاگ کے اپنے ابا کے کپڑے غسل خانے میں لٹکا آ۔ میر دوڑ کے باپ کی جوتی ان کے پلنگ کے پاس رکھ دے۔ ایک تو اس ننھے کو گندی عادت ہے۔ پیروں سے بڑے جوتے پہن کے پھرتا رہتا ہے سارا دن۔" (ننھے کو اک دھمو کا پڑتا اور اس کا بھونپو شروع)۔

"آئے ہائے اماں اس کو کیوں چھیڑ دیا۔ اب یہ باجا ابا کے آنے تک بجتا رہے گا۔" عائزہ ہوم ورک کی کاپی پٹخ کر کہتی اور اماں کا اگلا حملہ اس پر ہوتا۔

"دیکھی باتیں بنائے جائے گی، چل اٹھ۔ جلدی سے ایک گلاس خوب اچھی طرح دھو کر رکھ دے۔ اپنے ابا کے آتے ہی صاف پانی دینا انہیں اور اوئے میرے اللہ! وہ میری ہاتھ والی پنکھی کہاں ہے۔ موئی بتی کا کچھ پتا نہیں ہوتا کس وقت گل ہو جائے۔ کھانا کھاتے تیرے ابا کو ہوا نا جھلی تو پھر تم سب کی خیر نہیں۔" اور پورے گھر میں ڈھنڈیا پچی ہوتی بلکہ سارے کا سارا گھر یوں گھمن گھیری میں آیا ہوتا گویا ابا نا آ رہے ہوں۔ کسی علاقے کا کوئی دبنگ سردار تشریف لا رہا ہو اور اتنے اہتمام کرتے شاید اماں کو نانی کی نصیحت یاد ہی نا رہتی اس لیے تو جب ابا آ کر اپنا تخت شاہی سنبھالتے تو ان کی گھن گرج محلے کے آخری گھر تک جا رہی ہوتی۔

"یہ روٹیاں پکائی ہیں تم نے پھوہڑ عورت! اتنی عمر گزار لی اور کوئی کام ڈھنگ سے کرنا نہیں آیا۔"

کوئی اور وقت ہوتا تو اماں ضرور "اتنی عمر" کا حساب لیتیں لیکن اس پل تو انہیں صرف اچھی بھلی پکائی روٹیوں کے مسترد کیے جانے کا دکھ لگ جاتا۔

"سارا دن پلنگ توڑتی رہتی ہو، کبھی بچوں کو بھی دیکھ لیا کرو کہ بس پیدا ہی کرنا تھا انہیں۔ ننھے کی شکل دیکھو۔ ایک تو ویسے ہی اپنے ننھیال پر چلا گیا ہے کم بخت، اس پر منہ بھی نہیں دھلا ہوتا کبھی۔" ابا اک اور کاری وار کرتے۔ اب ایسے آپا دھاپی کے وقت میں رورو آنسوؤں اور ناک سے شکل بگاڑے کارٹون بنے ننھے کا کسی کو کیا خاک یاد رہتا۔ پھر اسے ابا سے کچھ زیادہ ہی پیار بھی تھا ان کے آتے ہی ان سے لپٹنے کی کوشش میں رہتا اور وہ اس کی حالت سے بے زار اسے پرے دھکیل دیتے اور وہ پھر سے بھاں بھاں کرنے لگتا۔

"یہ گھر ہے کہ کتابوں کی دکان۔ اگر کسی دن میں ان نالائقوں کے اسکول چلا گیا تو ماسٹر سے سوائے شکایتوں کے اور کچھ سننے کو نہیں ملے گا اور گھر سرکاری دفتر بنائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ آئے کہیں کے

...ماں کو ادھر آؤ نا ذرا یہ کتاب اٹھا کر سبق سناؤ مجھے۔"
...چار پائی پر بکھرا پھیلاوا دیکھ کر سیخ پا ہوتے۔ دھاڑ
...کے ساتھ اک نیا حکم جاری ہوتا اور جس دن کسی کو سبق
...آتا تو اس روز سارے کے سارے مرغے بنے
...دھلائی الگ سے ہوتی اور عائزہ کی تو پھر بہن
...بھائی کے ہاتھوں بھی شامت آتی کیونکہ اکثر اس کا
...بکھرا رہتا تھا۔ باقی سارے الٹے سیدھے
...ہاتھ مار کر ہوم ورک کر لیتے تھے وہی عادی تھی۔ خوب

صفائی اور نفاست سے اک اک حرف لکھنے اور اچھی طرح سے سبق یاد کرنے کی۔ اسے تو سارے اسباق بہت اچھے سے یاد ہوتے تھے۔ اسے تو اب تک بوڑھی نانی کی کی گئی نصیحتیں بھی خوب ازبر تھیں اور وہ تو پوری کوشش بھی کرتی تھی ان پر عمل کرنے کی لیکن پھر بھی کہیں نا کہیں گڑبڑ ہو ہی جاتی تھی۔

اپنے بچپن میں وہ گھر میں ہونے والی ہر بدنظمی کا ذمہ دار ماں کو سمجھتی تھی کہ وہی ہر وقت نصیحت بھول

جاتی ہیں۔ مگر جب خود اس اسٹیج تک آئی تو خبر ہوئی کہ اماں بے چاری کا کیا قصور۔ کیا نصیحتیں یاد رکھنا صرف عورت کو ہی ضروری ہے۔ کیا مرد اس سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ کیا گھر کے بڑوں کو صرف بیٹیوں کو ہی نصیحت کرنا آتی ہے۔ وہ بیٹوں کی بھی ویسے ہی تربیت کیوں نہیں کرتے یا پھر وہ تو اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ بس یہ ہے کہ بیٹیاں فلالین جیسی ہوتی ہیں۔ جہاں بھی پھیرو سب جذب کرتی جاتی ہیں۔ جبکہ بیٹے پلاسٹک شیٹ کے جیسے۔ اوپر کچھ بھی ڈال دو۔ سب کا سب بہہ جاتا ہے۔ کسی چیز کا اثر قبول نہیں کرتے۔

اب ہر شام وہ بھی پوری تندہی سے جتی ہوتی تھی۔ کہیں کوئی کمی نا رہ جائے۔ گھر نیٹ اینڈ کلین، ہر چیز سمٹی ہوئی۔ بچے نہائے دھوئے، کھانا تیار، خود بھی بہتر حلیہ لیے ہوئے۔ اب بھی اس نے مڑ کر اک بار پھر کچن کا جائزہ لیا تھا، کچھ رہ تو نہیں گیا۔ سب کچھ مکمل تھا وہاں سے مطمئن ہو کر وہ لاؤنج میں آئی۔ بچے آرام سے ٹی وی دیکھ رہے تھے بس موحد عادت سے مجبور فلور کشن اکٹھے کیے ان پر اوندھا لیٹا تھا۔ دونوں ہتھیلیاں گول سے چہرے کے گرد ٹکا رکھی تھیں اور نظریں اسکرین پر۔

"اف...... موحد بیٹا! یہ کیا حرکت ہے۔ کتنی بار منع کیا ہے۔ اتنے نزدیک سے ٹی وی نہیں دیکھتے۔ آنکھیں خراب ہو جاتی ہے اور پھر دیکھو، میں ابھی سب صاف کر کے گئی تھی آپ نے پھر پھیلاوا کر دیا۔ ابھی بابا آئیں گے تو دیکھ کر غصہ ہوں گے۔ چلو اٹھو جلدی سے ادھر آ کر بیٹھو اور اریزہ بیٹا! آپ نے بھی بھائی کو نہیں سمجھایا۔" وہی ازلی ماؤں والی فطرت اس نے بھی بیٹی کو ہی جا پکڑا تھا لیکن وہ کون سا کل کی عائزہ تھوڑا تھی جو دبک جاتی۔ غلطی ہو یا نا ہو جھاڑیں سن کر کونوں کھدروں میں گھس کر رو لیتی یا پھر نانی تک کی نصیحتیں کس کے پلو میں باندھے پھرتی۔ وہ اریزہ تھی آج کی بچی، اس نے نازک تیکھی سی ناک چڑھا کر ماں کو دیکھا۔

"میں نے سمجھایا تھا مما! منع کیا تھا اسے کہ ابھی سارے لاؤنج کی ڈسٹنگ کی ہے۔ مت پھر سے چیزیں بکھیرو مگر یہ سنتا کب ہے۔ اپنی مرضی کرتا ہے، ہے نا آخر بابا کا بیٹا، ان ہی کے جیسا۔" اور عائزہ نے حد درجے حیران ہو کر بیٹی کی صورت دیکھی۔ یہ کیا کہہ گئی تھی وہ اور قبل اس کے کہ وہ اسے اس بدتمیزی پر فہمائش کرتی کہ گیٹ پر بجتے ہارن نے دھیان بٹا دیا۔

گاڑی کھلے گیٹ سے اندر آ چکی تھی۔ باپ کے گاڑی سے اترتے ہی موحد ان کی گود میں چڑھ گیا۔ سارے دن کی پر مشقت روٹین کے بعد اس پل ان کا دلکش چہرہ دیکھنا عائزہ کے لیے بڑا سکون آمیز لمحہ ہوتا تھا۔ وہ تو سلام کر ان ماں بیٹی پر اک سرسری نظر ڈال موحد کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔ وہ گاڑی میں سے ان کی چیزیں نکالنے کو بڑھی جب اریزہ کی پر فکر آواز سنی۔

"اوہ...... بابا...... آپ کو تو چوٹ لگی ہے۔ یہ کیسے ہوا؟"

"ہاں بس لگ گئی چوٹ، کچھ زیادہ نہیں ہے بس ہلکی سی......" مناقب موحد کو گود میں لیے آگے بڑھ گئے۔

"یہ...... یہ کیسے ہوا؟" عائزہ سب چھوڑ چھاڑ پیچھے لپکی۔ ان کی دائیں پنڈلی سے ہلکا سا خون رس رہا تھا، پینٹ کا پائنچہ پھٹا ہوا۔ اس کا تو دل دہل گیا، وہ لاؤنج میں صوفے پر جا بیٹھے۔ شوز اور سوکس اتار کر زخم کا جائزہ لینے لگے۔ اریزہ بھاگ کر واش روم سے ڈیٹول اور کاٹن لے آئی تھی۔

"اوہ میرے اللہ...... یہ تو کافی لمبی خراش ہے۔ آپ کو فوری ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے تھا۔ آپ گھر کیوں آ گئے؟" عائزہ پنجوں کے بل بیٹھ کر ان کا زخم صاف کرنے لگی تو بے اختیار کہہ گئی۔

"تم تو چاہتی ہی یہ ہو میں گھر نا آؤں۔ اوکے ٹھیک ہے، کل سے گھر نہیں آؤں گا۔ آج غلطی ہو گئی۔" مناقب کا شمار بھی ہمارے معاشرے کے ان ننانوے فیصد شوہروں میں ہوتا تھا جو بیوی کی سیدھی بات کا بھی ہمیشہ الٹا مطلب نکالتے ہیں۔ وہ تڑخ کر

لیتے اس کے ہاتھ سے کاٹن چھین کر خود زخم صاف کرنے لگے۔ وہ ہکا بکا منہ دیکھے گئی۔

"لیکن بابا! آپ کو چوٹ لگی کیسے؟ آپ تو بڑے ہیں نا...... چوٹ تو بچوں کو لگتی ہے۔" باپ کی جیب سے نکلنے والی چاکلیٹ کھا کر موحد ابھی فارغ ہوا تھا اور اپنے عقل مطابق معاملے میں حصہ ڈالا۔ اس کی بات پر وہ مسکرا دیے۔

"ضروری نہیں چوٹ بچوں کو ہی لگے۔ کبھی کبھی چوٹ بڑوں کو بھی لگ جاتی ہے اور یہ لگی کیسے تو میں ٹیلر سے اپنے کپڑے لے کر تیزی سے مال کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ کہیں گرل میں نکلے کیل سے پائنچہ اٹک گیا اور بس......" انہوں نے تو اور بس بڑے آرام سے کہہ دیا جبکہ اسے تصور ہی لرزا گیا۔

"آپ کی تو پینٹ بھی ضائع ہو گئی۔ بہت فیورٹ تھی نا آپ کی۔" ان کے آگے پلیٹ رکھتے وہ افسردہ سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"یہ تو صرف پینٹ تھی اس جیسی اور بھی آ سکتی ہے مگر زندگی میں اور کئی ایسی چیزیں ہاتھ سے نکل جاتی ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ پھر چاہے اک عمر تمام کر دو مگر...... خیر، تم پینٹ کا افسوس کرنے کے بجائے یہ بتاؤ کیا بنایا ہے آج۔ کچھ ڈھنگ کا بھی ہے یا روز کے جیسے کچھ الٹا سیدھا کھول دیا ہے۔" وہ بڑے گہرے انداز سے کچھ کہتے رکے اور بات بدل گئے۔

"بابا آپ نے نیو ڈریس بنوائے ہیں اپنے لیے، وہی ٹیلر سے لے کر آئے ہیں نا۔" ابھی وہ انہیں مینو بتاتی کہ اس سے پہلے اریزہ ان سے پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے سر ہلا دیا۔

"ہماری اسلامیات کی ٹیچر حدیث پاک کا مفہوم بتاتی ہیں کہ جب آپ اپنے لیے نئے کپڑے بنوائیں تو پرانے صدقہ کر دیں تو بابا آپ کو چاہیے تھا کہ آپ نیو ڈریس لینے جانے سے پہلے پرانے کسی ضرورت مند کو دے دیتے۔ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے آپ کی فیورٹ پینٹ بھی ضائع ہونے سے بچ جاتی۔" وہ بڑے مدبرانہ انداز سے بتا رہی تھی۔ عائزہ کو

بے اختیار بیٹی پر پیار آیا۔ مناقب نے ہلکی سی مسکان کے ساتھ اس کا گال تھپکا۔

"اوکے، آئندہ ضرور احتیاط کروں گا اور بھئی لاؤ، کھانے میں کیا ہے؟" اور آج اس نے ان کے لیے بڑے دل اور محنت سے ان کی من پسند ڈش کریلے گوشت بنایا تھا اور جو یقیناً اچھا بھی بنا تھا۔ لیکن وہ شوہر ہی کیا جسے بیوی کے ہاتھ کا کبھی کچھ بھا جائے۔ وہ بھی کبھی مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ اس کے بنائے گئے کھانے کی دنیا تعریف کر سکتی تھی لیکن اک بس وہی تھے جنہیں یہ کام بار گراں لگتا تھا۔ ایک لقمہ لیتے ہی حسب عادت منہ پھلا کر بولے۔

"اونہوں...... یہ کیا ہے بھئی، پتا نہیں کب کچھ سیکھو گی تم۔ میری تو حسرت ہی رہے گی کہ کبھی گھر سے بھی کچھ اچھا کھانے کو مل جائے۔"

"ناشکری اچھی بات نہیں ہوتی ہے بابا! اتنا اچھا تو بنایا ہے مما نے، گوشت بھی بالکل ٹھیک گلا ہوا ہے اور مرچ نمک بھی پرفیکٹ۔" عائزہ بے چاری کو تو اس صدمے سے سکتہ ہی ہو گیا تھا۔ یہ اریزہ تھی جس نے اس کی حمایت کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اس نے فوراً باپ کو ٹوکا۔ جنہوں نے آنکھیں سکیڑ کر بیٹی کے بھولے بھالے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ مگن سی اپنی پلیٹ پر جھکی تھی۔ اگلا تیر نظر بیوی کی طرف پھینکا گیا۔ جو بوکھلا کر تادیبی لہجے میں بولی۔

"اریزہ بیٹا! بری بات، آرام سے کھانا کھاؤ۔" اور اس نے سر اٹھایا تو ماں کی بات سمجھ آ گئی۔ بابا جو شرر بار نگاہیں ان پر جمائے بیٹھے تھے۔ اور خیر رہی وہ اس وقت تو صرف نظروں کے تیر ہی چلاتے رہے۔ ہاں جب کھانے کے بعد وہ چائے لے کے بیڈ روم میں آئی تو وہ تڑختے ہوئے گویا ہوئے۔

"یہ تم کس طرح کی تربیت کر رہی ہو اریزہ کی، مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ بچے اپنی عمر کے مطابق بات کرتے ہی پیارے لگتے ہیں۔ زیادہ سیانا پن ان کے چہرے کی معصومیت چھین لیتا ہے۔ سمجھاؤ اسے بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیتے۔ آئندہ میں یہ حرکت نا

دیکھوں۔"

"جی......" اس کے پاس کہنے کو فقط یہ ہی دو حرف تھے کہ اس سے زیادہ نا وہ کہہ سکتی تھی اور نا وہ سن سکتے تھے۔ بچہ اچھا تو خاندان کا نام۔ بچہ برا تو ماں بدنام۔ یہ کیا خوب اصول ہے اس دنیا کا۔ بچے کی تربیت کا الزام صرف ماں پر ہی کیوں لگتا ہے جبکہ یہ حقیقت ہے۔ بچے کی شخصیت سازی میں صرف ماں ہی نہیں بلکہ باپ سمیت سارا خاندان بھی ذمہ دار ہوتا ہے لیکن کسی کو کوئی سمجھائے کیا۔ بک...... ہاہ...... وہ اک گہرا سانس لیتی اٹھ گئی۔

☆☆☆

فضیلہ آپا، مناقب کی خالہ زاد بہن تھیں جو عرصہ پانچ سال بعد وطن آئی تھیں۔ اماں نے بڑے چاؤ سے ان کی دعوت کا اہتمام کر ڈالا اور دعوت تو واقعی ان ہی کی طرف سے تھی بھانجی اور ان کے بچوں کے لیے مگر اہتمام سارا تن تنہا بے چاری عائزہ کو کرنا پڑا کہ شرمین کی نکھٹو گڑیا نے ہی آج کل اسے کسی کام کے لائق نہیں چھوڑا تھا جبکہ اماں نے تو ان دونوں کے درمیان کام بانٹ دیے تھے مگر جب شرمین کا ایک پاؤں کچن اور ایک پاؤں بیڈ روم میں چکر کھانے لگا تو عائزہ سے ہی برداشت نا ہوا۔

"تم جا کے لائبہ کو سنبھالو۔ میں کر لیتی ہوں سب۔"

"سوری بھابھی...... وہ لائبہ ہی مجھے ٹکنے نہیں دے رہی میں تو......" شرمین شرمساری تو جیسے دینے کو تھی کہ اس نے مسکرا کر شانہ تھپکا۔

"ارے بھئی مجھے کیا صفائی دے رہی ہو۔ میں نے خود دو بچے سنبھالے ہیں۔ جانتی ہوں کیسے تنگ کرتے ہیں یہ چھٹانک بھر کے بچے۔ تم بے فکر ہو کے جاؤ، میں ہوں نا، کرلوں گی۔" اور اس کی تسلی پہ شرمین جو گئی تو پھر لائبہ کے سونے کے بعد بھی روم سے نا نکلی۔ مٹن کڑاہی، کوفتے، چکن شاشلک، چپلی کباب، بریانی، دو طرح کا میٹھا، سلاد، رائتہ اچھا خاصا محنت طلب مینو تھا جو اس نے تیار کیا۔ مہمانوں کے آنے تک اس میں کھڑے ہونے کی ہمت بھی نہیں بچی تھی۔ وہ تو شکر ہوا شرمین نکھری ستھری آ گئی تو اسے بھی اپنا حلیہ سدھارنے کا ٹائم مل گیا۔ اچھی بات یہ ہوئی کھانا فضیلہ آپا اور بچوں کو بے حد پسند آیا۔ انہوں نے خوب رغبت سے کھانے کے علاوہ ڈھیر ساری تعریف بھی کی۔ عائزہ کی ساری تھکن جاتی رہی۔

"یہ سب بھابھی نے بنایا ہے۔ مجھے تو لائبہ نے ہی تنگ کر رکھا تھا۔ میں نے تو بس گوشت دھونے کا ہی کام کیا تھا۔" شرمین فراخ دلی سے بتا رہی تھی۔

"ہاہ...... دیکھا آپا...... کتنے برکت والے ہیں میری بیگم کے ہاتھ۔ صرف گوشت دھویا تھا جناب نے اور دیکھیں ایک ایک چیز میں کیا غضب کی لذت آ گئی، آہاہا...... واہ مزا آ گیا اور اگر یہ کھانا بناتی تو آپ سوچیے کہ وہ کیا شاہکار بنتا۔ اف...... آپ محروم رہ گئیں اس نعمت سے۔ کیوں بھابھی؟" اوصاف کی آنکھوں سے شرارت چھلکی پڑ رہی تھی یعنی سارا کریڈٹ وہ بڑی ہوشیاری سے بیوی کے کھاتے میں ڈال گیا تھا۔ عائزہ مسکرا دی جبکہ سب ہنس دیے فضیلہ آپا نے اس کے گرد بازو پھیلایا۔

"اس بار تو میں نے اپنی پیاری بھابھی کے ہاتھوں کا ذائقہ چکھ لیا۔ اگلی دفعہ تمہاری بیگم کے ہاتھ کا کھائیں گے تب پتا چلے گا اصل ماجرے کا ویسے بھی سچ کہوں مناقب تم بے حد اچھے رہے ہو۔ جو تمہیں عائزہ جیسی بیوی مل گئی، ماشاءاللہ! ظاہری خوبیاں تو اللہ تعالیٰ کی دین ہوتی ہیں لیکن باطنی خوبیوں کی بھی کمی نہیں۔ اللہ تم دونوں کو ہمیشہ ہنستا بستا رکھے۔ میں کل گئی تھی ماموں کی طرف وہاں اتفاق سے سب......"

"ارے آپا! آپ نے ابھی تک لب شیریں تو چکھا ہی نہیں۔ اس کے لیے میوہ بھی میری بیگم نے صاف کیا تھا۔ چلیں جلدی سے کھا کر بتائیں۔" وہ جانے کیا کہنے کو تھیں کہ اوصاف بول پڑا۔

"عائزہ سب کے لیے چائے لے کر آؤ۔"

مناقب کہہ رہے تھے۔ وہ انہیں اک نظر دیکھتی اٹھ آئی۔ سب نے کتنا سراہا تھا لیکن مجال ہے جو ان کے چہرے سے کوئی تاثر چھلکا ہو۔ اوصاف کس طرح بات بات میں بیوی کو گھسیٹ کے لے آتا ہے۔ چھیڑ چھاڑ، تعریفیں، بس بہانے سے کسی نا کسی طور اسی کا تذکرہ۔ اور ایک وہ تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی بیوی کی نہیں بلکہ کسی اور کی بات کر رہے ہوں سارے۔ آپا کی توصیف پر بھی ذرا سا جو مسکرائے ہوں۔ یا کچھ کہا ہو۔ حد ہوتی ہے کم ظرفی کی بھی۔ اسے گلہ تو ہر بار ہی ہوتا تھا۔ آج بھی تکلیف ہوئی تھی۔ مگر کس سے کہتی۔ خود سے ہی کہہ سن کے دل ہلکا کر لینا اب اس کی عادت بن چکی تھی۔ جہاں اسے نانی کی اور بہت سی نصیحتیں یاد تھیں وہاں یہ بھی اچھی طرح ذہن نشین تھا کہ "شوہر کے اچھے سلوک کا چرچا ضرور کرو لیکن اگر کہیں کسی بات پر اس کے مزاج سے اختلاف ہو تو اسے اپنے تک ہی محدود رکھو۔ کسی اور سے دکھ رونا ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے تم نے اپنے لباس میں اپنے ہی ہاتھ سے چھید کر لیا ہے۔" اور ان سالوں میں کئی بار اسے ان کے رویے سے ٹھیس پہنچی تھی لیکن وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اگر ایک بار چھید ہو گیا تو کوئی اسے پروئے گا نہیں بلکہ دوسرے جھانک جھانک کر مزید بدنمائیاں آشکار کریں گے اور دکھے دل کو اور برا کرنے سے حاصل؟ تکلیف تو خود ہی سہنا تھی نا۔ سو ہر بار سر جھٹک کر اگلے مشغلے میں گم ہو جانا ہی اپنے حق میں بہتر لگا۔ مہمان ایک اچھا تاثر لے کر رخصت ہوئے تھے۔ اس کے لیے یہی سرشاری کافی تھی۔

☆☆☆

اماں چوٹی تک پلیٹ بھرے کچن سے نکلی تھیں۔ سامنے سے مناقب آ رہے تھے جن کے پوچھنے سے پہلے ہی بول اٹھیں۔

"میں تو فضیلہ سے باتیں ہی کرتی رہی تھی۔ کھانا، میاں سے کھایا ہی نا تھا۔ اب بھوک لگی تو یہ ذرا سے چاول لیے ہیں۔" اور انہوں نے پوری آنکھیں کھول کر "ذرا سے چاول" پورے غور سے دیکھے اور مسکراہٹ دبائی۔

"تو آپ نے خود کیوں زحمت کی عائزہ یا شرمین سے کہتیں وہ لا دیتیں کھانا اور آپ ٹھنڈے چاول کھائیں گی؟ لائیں مجھے دیں میں عائزہ سے کہتا ہوں، وہ گرم کر دیتی ہے۔"

"ہاں چلو یہ ٹھیک ہے اور مجھے کباب نہیں ملے۔ اللہ جانے فریج کے کس خانے میں رکھے ہیں۔ بہو سے کہو وہ بھی لے آئے۔ ساتھ رائتہ اور کوئی سالن بھی۔" اماں تسلی سے لاؤنج میں جا بیٹھیں۔ کچھ ہی دیر میں ان کی مطلوبہ ٹرے ان کے سامنے آ چکی تھی۔

"ارے...... واہ...... واہ...... بہو جیتی رہو۔ آج تو دل خوش کر دیا تم نے۔ مہمان گھر سے راضی ہو کر جائے تو یہ اللہ کی بڑی رحمت ہوتی ہے۔ فضیلہ کے میاں کا فون آیا تھا تو اس کے سامنے بھی صفتیں کر رہی تھی وہ تمہاری۔ اس کے بچے تو کہہ رہے تھے جس دن ہم جائیں گے مومانی سے کباب بنوا کر لے جائیں گے۔ اگلے ہفتے کی فلائٹ ہے ان کی۔ یاد رکھنا۔ ایسے ہی عمدہ کباب تیار کر دینا ان کے لیے۔" اور اس نے تو زور و شور سے سر ہلایا تھا کہ موصوف بول اٹھے۔

"افوہ اماں! آپ بھی نا...... کیا ضرورت تھی حامی بھرنے کی۔ یہ تو آج اتفاق ہو گیا ہے۔ بھلا معجزات بھی روز روز ہوتے ہیں۔" وہ تو بیان جاری کیے نظریں ٹی وی پر مرکوز کر بیٹھے تھے۔ اس کا دل جلتے توے پر جا پڑا، اماں ہنس دیں۔ اس کی اتری صورت کو دیکھ کر شانہ تھپکا۔

"ارے تم کاہے کو جی جلاتی ہو۔ شوہر ہوتے ہی اسی خصلت کے ہیں۔ میرے بال سفید ہو گئے ان کے ابا نے کبھی تعریف کے دو بول نہیں بولے جب بھی بولے پورا ہی تول دیا۔ یہ بھی ان ہی کا لخت جگر ہے۔ گناہ لازم نہیں ہو جائے گا۔ بیوی کی خوبی مان کر۔ تم چھوڑو اس کی باتوں کو۔ چلو اٹھو میرے لیے

PakiBooks.Site

پانی لے کر آؤ۔"

"میں لے کے آؤں گا دادو کے لیے پانی۔" وہ ابھی اٹھی بھی نہیں تھی کہ موحد کچن کی جانب بھاگ گیا۔ وہ فوراً پیچھے لپکی۔ اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے اک زوردار چھناکا ہوا تھا۔ اس کے جہیز کا قیمتی واٹر سیٹ جو وہ اتنے سالوں سے کسی متاع کی طرح سنبھال کر استعمال کرتی رہی تھی۔ اور جو بہت خاص مہمانوں کے آنے پر ہی الماری سے نکلا کرتا تھا۔ آج اس ننھے نالائق کی وجہ سے عظیم نقصان سے دوچار ہو چکا تھا۔ ایک کڑی ٹوٹنے کا مطلب پوری زنجیر کی بے کاری ہوتا ہے۔ اسے غصہ تو پہلے ہی تھا۔ نکالنے کو وہ معصوم ہاتھ لگ گیا۔ آؤ دیکھا نا تاؤ۔ کس کے ایک تھپڑ اس کے پھولے گال پر دے مارا۔ آواز پر مناقب بھی ادھر ہی آرہے تھے۔ لاڈلے بیٹے کے رخسار پر پڑتا چانٹا ان کے دل پر پڑا تھا۔ انہوں نے جھپٹ کر اسے گود میں لیا۔ وہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

"یہ کیا طریقہ ہے۔ ایک ذرا سے گلاس کے پیچھے تم نے بچے کو اتنی زور سے مارا۔ ہاؤ ڈیئر یو۔ اگر خدانا خواستہ اسے کانچ لگ جاتا تو۔ تو پھر کیا کرلیتیں تم۔ تب بھی اسے ہی مارتیں۔ بچے سے زیادہ قیمتی تمہارے لیے یہ بے جان چیزیں ہیں۔ تو لو پکڑو سنبھالو انہیں......" انہوں نے کاؤنٹر پر رکھا گلاس اٹھا کر پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔ پھر دوسرا۔ اور پھر تیسرا۔

"اب کافی تسلی ہوگئی ہوگی تمہاری۔" شرربار نظروں سے گھورتے ہچکیاں لیتے موحد کو گلے سے لگائے وہ کچن سے جا چکے تھے۔ ہر طرف کانچ ہی کانچ بکھرے تھے۔ وہ بت بنی کھڑی تھی۔ اپنے بالشت بھر کے بچے کا کتنا خیال تھا۔ اور وہ، وہ بھی تو کسی کی بیٹی تھی۔ اس کے احساسات بھی تو اکثر چکنا چور ہوتے تھے۔ ان کی تو کبھی پروا نہیں کی تھی۔ الٹا ضرب پہ ضرب ہی لگائی تھی۔ وہ بھی کاری سے کاری۔ آنکھوں کے کٹورے کب بھرے اور کب پانی چھلکتا رخساروں تک بہہ نکلا اسے خبر ہی نہیں تھی۔

اریزہ دروازے میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر ہونٹ چباتی رہی پھر چپ چاپ جھاڑو پکڑے فرش پہ یہاں سے وہاں تک بکھری کرچیاں سمیٹنے لگی۔ اسے ہوش آیا۔

"چھوڑو، پرے ہٹو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے جھاڑو کھینچی۔ باقی کا غصہ اب ناحق اس پر نکلنا تھا۔ وہ سہم کر دروازے سے جا لگی۔ مرد کے ہاتھوں چوٹ کھائی ہر عورت کے لیے غصہ اتارنے کا آسان ترین ہدف اس کے بچے ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ یکسر بھول جاتی ہے کہ ان بچوں کو نو ماہ اس نے اپنی کوکھ میں رکھا تھا۔ یہ اس کے ہی بچے ہیں۔ اپنے اندر بھری کثافت ان معصوموں پہ انڈیلتے اسے رتی بھر احساس نہیں رہتا۔ کہ جیسے اس کے دل پر لگے زخم ٹیس دے رہے ہیں ایسے ہی ان کے نازک احساسات پہ پڑتے نشان بھی باقی رہیں گے۔

"جاؤ دیکھو اماں نے کھانا کھا لیا ہے تو برتن لے آؤ اور دھیان سے لے کر آنا۔ کوئی نقصان کیا تو دیکھنا کیا حشر کروں گی تمہارا۔" اس کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔ اور یہ نامراد شے ہمیشہ نکلتی بھی کمزوروں پر ہی ہے۔ وہ جانے کو پلٹی پھر کچھ سوچ کر رکی۔

"مما آپ اس روز چاچی کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں نا؟ اور نئے گلاس بھی لائی تھیں۔ آپ کو پتا ہے نئی چیز کے لیے پرانی چیز کو جگہ چھوڑنا پڑتی ہے۔ جب میں کلاس ون میں آئی تھی تو پھپھو نے مجھے نیو بیگ گفٹ کیا تھا تو میں نے پرانا موحد کو دے دیا تھا۔ آپ کو دیگچی میں تازہ سالن بنانا ہوتا ہے تو آپ اس میں سے پہلے والا نکال لیتی ہیں نا۔ آسمان پہ نئے ستارے بنتے ہیں تو پرانے ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر چیزیں تو ٹوٹتی رہتی ہیں۔ جب پہلے والی ٹوٹیں گی نہیں تو آپ نئے والی کو کیسے استعمال میں لائیں گی اور......"

"پلیز...... اریزہ...... پلیز کوائٹ...... میں نے جو کہا ہے وہ سنا نہیں آپ نے۔" اور ناچار اریزہ کو باہر کا رخ کرنا پڑا۔

"یا اللہ...... ایک تو یہ میری سائنسی بچی۔ پتا نہیں کہاں سے سیکھتی ہے اتنی باتیں۔ بالکل باپ پہ پڑی ہے۔" پیچھے وہ بڑبڑا رہی تھی۔

☆☆☆

دروازے پر ہوتی تیز دستک بے دردی کا سبب بنی تھی۔ عائزہ نے سر اٹھا کر بے اختیار سائڈ ٹیبل پہ پڑے ٹائم پیس پر نگاہ کی۔ رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔

"یا اللہ خیر! اس وقت کون ہے؟" وہ جلدی سے بستر سے نکلی۔ مناقب نے بھی چادر سے منہ باہر نکال کر دیکھا وہ دروازہ کھول رہی تھی۔ باہر شرمین کھڑی تھی شانے سے لگی لائبہ کو تھپکتی ہوئی۔

"بھابھی...... مناقب بھائی کو جگا دیں۔ اماں بلا رہی ہیں انہیں۔" اور وہ تو ابھی مڑی بھی نہیں تھی کہ تیر کی سی تیزی سے وہ اسے پرے کرتے شرمین سے آگے چل دیے۔ افتاں وخیزاں وہ بھی پیچھے آئی تھی۔ مارے گھبراہٹ کے ابا کو دیکھا۔ (کہیں ان کی تو طبیعت خراب نہیں) وہ نیم دراز سے کسی سوچ میں گم چھت کو گھور رہے تھے۔ اماں بیڈ پہ پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ اک طرف اوصاف تھا۔ جس کے کندھے پہ سر لٹکائے وہ دھواں دھار رو رہی تھیں۔ بوکھلائے ہوئے مناقب دوسری طرف جا بیٹھے۔

"کیا بات ہے؟ آپ ایسے رو کیوں رہی ہیں آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" انہوں نے بے تابانہ استفسار کیا۔ اماں کی ہچکی بندھی تھی۔ اوصاف کے شانے سے ان کا سر اب ان کی شانے پہ منتقل ہو گیا تھا۔ بولنے کی تو کوشش ہی بے کار گئی تھی۔ اوصاف بتانے لگا۔

"کچھ دیر پہلے خالہ ثریا کا فون آیا تھا۔ عتیق ماموں ہاسپٹلائزڈ ہیں۔ ہارٹ اٹیک ہوا ہے انہیں۔"

"اوہ......" بہت کوشش کے بعد ان کے حلق سے نکلا۔ وہ خود اس اطلاع سے یک دم گم صم ہو گئے تھے۔ کئی ثانیے لگے ہوش میں آتے۔

"ارے تم لوگ کیا ماں کے پاس فوٹو کھچوانے کے لیے بیٹھ گئے ہو۔ سمجھاؤ اسے، اس وقت اس رونے دھونے کا کوئی فائدہ ہے بھلا۔ کہا بھی تھا کہ اس وقت بچوں کو پریشان مت کرو۔ صبح کی صبح دیکھی جائے گی مگر پہلے کوئی میری بات بھی ہے اس کم عقل عورت نے۔ آدھی رات کو مجمع لگا لیا ہے۔ پکڑ کر سارے گھر کو پریشان کر دیا۔ چلو بچو تم لوگ تو جا کے سو جاؤ۔ دیکھو لائبہ کیسے بے چین ہو رہی ہے۔" شرمین بچی کو کبھی ایک شانے پر ڈال رہی تھی کبھی دوسرے۔ ان سے رہا نا گیا۔ دونوں بہوؤں سے کہا۔ اماں اک جھٹکے سے اس رخ مڑیں۔

"ہاں ہاں...... آپ کو تو مجمع ہی لگے گا۔ اپنے بچوں کی پریشانی نظر آئے گی۔ میرے دکھ کا احساس پہلے بھی ہوا ہے اتنے سالوں میں، جواب ہوگا۔ آپ کا تو وہ رشتے دار ہوا۔ آپ کو اس کا اتنا درد تھوڑا ہوگا۔ جو مجھے ہو سکتا ہے۔ ماں جایا ہے وہ میرا۔ سگا بھائی۔ جسے پچھلے کئی سالوں سے میں نے نہیں دیکھا۔ صورت دیکھنے کو ترس گئی میں اس کی۔ اب خبر بھی آئی تو اس کی بیماری کی۔ ہائے اللہ کیسے ناروؤں میں۔" وہ پھر پھپک کر رو پڑیں۔

"تو میں نے تو نہیں روکا تھا۔ اس کی صورت دیکھنے سے۔ جا کر دیکھ لیا کرتیں تم۔ تم بھول گئی ہو گی۔ کیا کیا تھا اس نے ہمارے ساتھ۔ لیکن میں نہیں بھول سکا آج تک۔ اور دکھ کرنا ہے بے شک کرو لیکن میرے سر میں درد مت کرو۔ میں خود مریض آدمی ہوں۔ نیند پوری نا ہوئی تو بلڈ پریشر بڑھ جائے گا میرا۔ تم یہ اپنا شغل صبح تک موقوف کر لو تو عنایت ہو گی۔"

"مجھے تو تکلیف ہے۔ میں تو روؤں گی۔ آپ کو نہیں برداشت تو اٹھ کر کہیں اور چلے جائیں۔" وہ بھی اماں تھیں۔ اکڑ کر جواب دیا۔ ابا بھنا کر اٹھنے لگے کہ اوصاف نے ان کا بازو پکڑا۔

"افوہ ابا! آپ بھی نا...... اب یہ کوئی وقت ہے

اس طرح کی باتیں کرنے لگا۔ آپ اماں کو تسلی دینے کے بجائے ان سے لڑنے بیٹھ گئے ہیں۔ اور اماں پلیز آپ بھی ذرا حوصلے اور ہمت سے کام لیں۔ اللہ نے چاہا تو ماموں بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ ان کے لیے صرف دعا کریں۔" اور ابا جو پاؤں نیچے اتار چکے تھے پھر سے اوپر سمیٹ کر بولے۔

"ہاں تو یہی بات تو میں کب کا سمجھا رہا ہوں۔ کہ بی بی رو دو مت دعا کرو۔ لیکن یہ موٹی عقل کی عورتیں سمجھتی ہیں رونے سے مسئلے کی شدت کم ہو جائے گی۔ اب صبح تم دونوں میں سے کوئی ایک چلا جائے ہسپتال ماں کے ساتھ۔ میرے تو اپنے سر میں درد ہے میں تو نہیں اٹھ سکوں گا۔" انہوں نے چادر سر تک کھینچ لی۔ اماں کا منہ پھر کچھ کہنے کو کھلا تھا کہ مناقب نے ان کا ہاتھ دبا کر چپ رہنے کا اشارہ دیا گویا۔

"فجر کی نماز کے بعد تیار ہو جایے گا۔ میں ثریا خالہ کو فون کر کے ماموں کی کنڈیشن کا پوچھتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو گا۔ اب آپ ارام کریں۔" وہ ان کا ہاتھ تھپک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ باقی سب نے بھی باہر کی راہ لی۔ وہ فون پر مصروف تھے۔ واپس اپنے بستر پر لیٹتے عائزہ ماموں کی صحت اور درازی عمر کے لیے دعا گو تھی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی وہ کسی نا کسی موقعے پر ان کا تذکرہ تو سنتی رہی تھی لیکن آج تک نا ان سے ملی تھی نا ان کی فیملی سے اور اس کی وجہ کیا تھی یہ بھی وہ کئی ایک رشتے داروں کی مہربانی سے جان چکی تھی۔ بس وہی خاندانوں کے روایتی جھگڑے۔ نیند میں جانے تک اس کے دماغ میں کئی بار کی سنی کہانی گردش کر رہی تھی۔ لاؤنج کے صوفے میں دھنسے مناقب نے سیل فون ٹھوڑی تلے ٹکا رکھا تھا۔ نظر سامنے دیوار پر مرتکز تھی۔ وہ ارد گرد سے بے خبر تھے۔ کسی کتاب کے کھلے صفحے تھے جو الٹتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

وہ سرما کی دھوپ جیسی تھی۔ نرم، سنہری، سکون آمیز۔

اسے دیکھنا آنکھوں کو بھلا لگتا تھا۔ یوں گویا ٹھنڈک سی اتر آئے۔ وہ چمکتے چاند کی اجلی کرن جیسی تھی۔ ہنستی تو لگتا دور کہیں جھرنا بہتا ہو۔ اس کا نزاکتوں سے بولنا دل کو بھاتا تھا۔ اس کا ہر روپ دلکش تھا۔ وہ ہر رنگ میں دل فریب دکھتی تھی۔ جیسے جامن سفید کپڑے پر بیچ سے گرے اور داغ چھوڑ جائے ایسے ہی کسی البیلے لمحے میں وہ ان کے دل پر اپنا نقش چھوڑ گئی تھی۔ کہتے ہیں کپڑے کو چڑھے کو یا دل کو پہلا رنگ ہمیشہ پکا ہوتا ہے۔ پھر چاہے لاکھ رنگ کاٹ ڈال ڈال کر بھی رنگ چھڑاؤ تو چھوٹتا نہیں۔ کسر رہ ہی جاتی ہے۔ ان کے سنگ بھی یہی بیتی۔ وہ پہلا رنگ اندر تک اتر گیا تھا اور وہ ان کے دل پر نقش اول بننے والی ماموں عتیق کی لاڈوں پالی سین تھی۔ جس کی بھولی بھالی صورت پر تو اماں بھی فدا تھیں۔ اس لیے تو جب خزینہ آپی کی بات طے ہو رہی تھی تو انہوں نے لگے ہاتھوں بیٹے کا معاملہ بھی نبٹانا چاہا تھا اور بڑے مان سے بھائی کے آگے دست سوال دراز کر دیا۔ وہ ماں تھیں شاید بیٹے کی آنکھوں کے رنگ پہچان گئی تھیں۔ ماموں کو بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ گو کہ ابھی مناقب زیر تعلیم تھے۔ بارہویں جماعت کے طالب علم لیکن کہتے ہیں نا کہ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں تو انہیں بھی بھانجے کی ذہانت و تدبر پر پورا بھروسا تھا۔ پھر صاحبزادے خیر سے خوب رو ئی میں بھی کسی سے کم نا تھے۔ پھر بچپن سے ہی ماموں کی گڈ بک میں رہے تھے۔ تو یوں کسی بھی ظالم سماج کے درمیان میں آئے ان کی من کی مراد پوری ہو گئی تھی۔ وہ خوش تھے، بے حد، بے اندازہ، بے تحاشا۔ ان دنوں لگتا ہر رستہ گلزار ہو گیا ہے۔ تپتی دوپہریں بھی سرما کی بھیگی شام سی لگتیں۔ اور اپنی اس انوکھی کیفیات پر وہ خود پر ہی ہنسا کرتے۔

اور یہ قصہ ہے۔ خزینہ آپی کی شادی کے دنوں کا۔ جہاں سارا خاندان جمع تھا وہیں ماموں بھی فیملی سمیت آچکے تھے۔ سین اور ان کے درمیان اب کیا رشتہ ہے سب کو ہی علم تھا۔ زبانی کلامی بات طے ہو چکی تھی۔ اور شادی تو ظاہر ہے دونوں کی تعلیم مکمل ہونے پر ہی ہونا قرار پائی تھی۔ سین شروع سے ہی بڑی بااعتماد تھی۔ اس لیے ان کے اور اپنے درمیان بننے والے نئے رشتے سے آگاہی رکھنے کے باوجود اس کے رویے میں ذرا بھی جھجک نا تھی۔ بلکہ کسی حد تک وہ لاپروائی دکھا رہی تھی۔ لڑکی تھی نا شاید اس لیے یا پھر اس کا مزاج ہی ایسا تھا اور پھر محبوب کی کج ادائیاں ہی تو وہ پھونکنی ہوتی ہیں۔ جو آتش عشق کو ہوا دیتی ہیں۔ کم عمری کا بانکپن، ادائے دلبرانہ اور انداز تغافل جو اس کے بھولے بھالے چہرے پر خوب جچ رہا تھا۔ وہ سب جانتی تو ہو گی ان کے دل مضطر کے حال مگر وہ شمع ہی کیا جو روشن نا ہو۔ وہ بھی پروانے بنے جل جل گئے۔ نئی نئی امنگوں کے ہاتھوں مجبور ہوئے جہاں وہ ہوتی وہیں اس کی دید کو منڈلاتے رہتے۔ وہ سخت بے چین تھے کب موقع ملے اور اس دلنشیں سے دل کی بات کہہ سکیں۔ وہ سب لڑکیاں اک دوجے کے ہاتھوں پر مہندی لگا رہی تھیں ساتھ ساتھ ہلا گلا بھی جاری تھا۔ ابا کل ہی نیا کیمرا لائے تھے۔ وہ سب کے درمیان جا پہنچے۔ اور لگے ماہر کیمرا مین بننے۔ سب ہی شوق شوق میں نئے کیمرے سے تصویریں بنوا رہی تھیں۔ اک دوسرے پر پھبتیاں کستے ہنسی مذاق کرتے وہ سب مگن تھے۔

"چلو بھئی اب تمہاری اور سین کی بھی اک یادگار پک ہو جائے۔" ثریا خالہ کی مائزہ نے ہاتھ سے کیمرا جھپٹ کر ان کی خواہش کو زبان دی تھی۔ وہ تو ایک کر اس کے قریب ہوئے تھے مگر مہندی لگے ہاتھوں بمشکل دوپٹا سنبھالتی سین اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"نہیں مائزہ پلیز، خبردار پک نہیں بنانا۔"

"ارے بھئی کیوں......"

"کیا ہوا ہے۔"

"شرما گئی ہے بچی...... اوئے...... اوئے۔"

ساری لڑکیاں اسے چھیڑنے لگیں۔ اس نے بوکھلا کر اپنی مہندی لگے ہاتھوں میں منہ دے لیا تھا۔ اس کرکٹ پر لو... تھے اور مزید ہاہا کار مچ گئی۔ وہ بھی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اس شور شرابے پر ہی ماموں ادھر آ نکلے تھے۔ مارے ہنسی کے بے حال ہوتی لڑکیاں اور کسی کے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے مناقب۔

"یہ کیا ہو رہا ہے اور میاں تم ادھر لڑکیوں میں گھسے کیا کر رہے ہو۔ باہر اک ڈھیر پڑا ہے کاموں کا اور تمہیں یہاں ہنسی ٹھٹول سے فرصت نہیں، چلو نکلو۔" انہیں تو غصہ ہی آگیا تھا یا شاید وہ پہلے ہی کسی وجہ سے تپے ہوئے تھے۔ اتنی لڑکیوں میں اس عزت افزائی پر مناقب کے جوان خون کو بھی ابال آیا تھا۔ وہ اک جھٹکے سے سین کے ہاتھ جھٹک کر کمرے سے نکل گئے اور وہ اتنے مجمع میں سین کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ انہیں اس بدتمیزی پر اور غصہ آیا تھا جو باقی کا اس بے قصور پر نکلا۔ انہوں نے بیٹی کو بھی ٹھیک ٹھاک جھاڑ کر رکھ دیا۔

وہ بڑے برے تیوروں کے ساتھ لاؤنج سے گزر رہے تھے۔ اندر آتے ابا ٹھٹکے۔

"اوئے اسے کیا ہوا ہے۔ مناقب ادھر آؤ......" انہوں نے آواز لگائی۔ وہ تو رکے نہیں تھے۔ ان کے پیچھے ہی چھوٹے ماموں کی عفیرہ بھی کھسک آئی تھی۔ جس نے جھٹ آنکھوں دیکھا بیان کر ڈالا۔

"لو بھلا یہ کیا بات ہوئی، عتیق کو غصہ کیوں آیا۔ ارے وہ کون سا محلے کی لڑکیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ساری اپنے ہی خاندان کی بچیاں ہیں اور سین اس کی منگیتر ہونے سے پہلے اس کی کزن بھی ہے۔ اب اس کے ساتھ ہنسنے بولنے پر کیا پابندی۔ اگر اسے کوئی اعتراض تھا تو پھر بیٹی کو یہاں نا لے کر آتا۔" ابا ہمیشہ سے سیدھی اور کھری بات کرنے والے۔ انہوں نے جا کر اماں کو سنائیں جن کے ساتھ اس وقت کم از کم بھی خاندان کی دس پندرہ عورتیں موجود تھیں جن میں ممانی بھی، انہوں نے بھی سنا ابا مزید کہہ رہے تھے۔

"میرے بیٹے کے ہنسنے پر تو بڑا غصہ آیا ہے

اسے۔ اپنی جوانی بھول گیا ہے جب چاچے کے ساتھ ساتھ ہر دوسرے دن ہم بھی تلاش میں نکلا کرتے تھے اس کی۔ وہ پچھلے محلے کی فاخرہ کے ساتھ فلم دیکھتے پکڑا تھا کئی بار اسے اور وہ کیا نام تھا اس شوخی سی لڑکی کا جس کو یہ مال پوڑہ لا کے کھلایا کرتا تھا اور وہ......" وہ کوئی اور بھولا بسرا قصہ یاد کر رہے تھے کہ اماں نے ٹوکا۔

"آئے ہائے چپ بھی کر جائیں اب۔ یہ کوئی موقع ہے ایسی کہانیاں یاد کرنے کا۔ بھیں پرے میں جا کر دیکھتی ہوں کیا ہوا ہے۔" اور ہوتا کیا تھا۔ ماموں ادھر ہی آ رہے تھے جو ابا کے منہ سے اپنے جوانی کے تذکروں پر مزید برا مان گئے۔ سختی سے تردید کی۔ جس پر ابا کو تو جوش ہی آ گیا لگے اور کھدائی کرنے۔ وہ تو ہنسی ہنسی میں بات کر رہے تھے۔ مگر جب مومانی منہ پھلائے واک آؤٹ کر گئیں۔ تب معاملہ اور الجھ گیا۔ ماموں اور ابا کی ٹھیک ٹھاک منہ ماری ہوئی۔ بات تو کچھ ایسی خاص نا تھی مگر جہاں اور بہت سے لوگ درمیان میں آ ملیں تو پھر بگاڑ یقینی ہو جاتا ہے۔ اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ بھانت بھانت کی بولیوں نے رنگ میں بھنگ گھول دیا۔ یہاں تو وہ ہوئی کہ نکلی ہونٹوں، چڑھی کوٹھوں۔ ذرا سے دہی کی ایسی پتلی لسی بنی کہ سنبھالے نا سنبھالی گئی۔ کہاں کی مہندی کیسی خوشی، سب طرف سناٹا چھا گیا۔ جب ماموں بیوی بچوں سمیت یہ کہتے چل دیے کہ......

"بس بہت ہوئی تعلق داری، آج سے سب رشتے ختم۔" اور لو جی پھر تو ابا کا بھی پارہ ایسا چڑھا کہ پھر اس بات کو پتھر پر لکیر مان لیا۔ رشتہ ختم تو بس پھر ختم اور ایسا تو اکثر ہوتا ہے خاندان، گھر، رشتے، تعلق ذرا سی بدگمانی کی ضرب لگنے سے ٹوٹ کر یوں بکھر جاتے ہیں کہ جیسے کچے دھاگے کی مالا اور پھر سے ان موتیوں کو چننے اور جوڑنے میں کتنے دن، مہینے، سال لگ جائیں کوئی نہیں جانتا اور یہ بھی علم نہیں کہ پھر وہ اس ترتیب سے جڑ بھی پائیں گے یا نہیں۔

اماں نے پھر لاکھ جتن کر چھوڑے۔ بس ایک بار جا کر روٹھے بھائی کو منانے دیں۔ کئی بار انہوں نے کوشش کی۔

"ٹھیک ہے، جاؤ منا لو۔" اک بار ابا نے سنجیدگی سے کہہ دیا۔ اماں بے طرح مسرور ہوتی اٹھنے لگیں تو ان کے اگلے الفاظ نے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی۔

"اور جب بھائی کو منا لو تو پھر اس کے گھر ہی ٹھکانا کر لینا۔ میرے گھر واپس پلٹنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اور اماں کی خوشی کے غبارے سے پھس کر کے ہوا نکل گئی۔ انہوں نے ہونق ہو کر میاں کا چہرہ دیکھا۔

"تم بھول سکتی ہو ہاجرہ بی بی کہ اس شخص نے کس موقعے پر فساد اٹھایا تھا۔ میرے بچوں کی پہلی خوشی تھی۔ میری بیٹی کی شادی کا موقع تھا وہ۔ جب اس نے پورے خاندان کے سامنے تماشا لگایا۔ میرے سر میں خاک ڈالی۔ کوئی غیر نہیں تمہاری بیٹی کا سگا ماموں تھا وہ اور کیا کیا اس نے۔ اک ذرا سی بات پر سارے لحاظ، تعلق، رشتے توڑ کے چلا گیا۔ ارے کچھ دینے کی اوقات نہیں تھی تو نا دیتا مگر بھانجی کو پیار تو دے سکتا تھا وہ۔ اس کے سسرال والوں نے بھی پھر کیسی کیسی باتیں سنائی تھیں اسے۔ سب یاد ہی ہوگا تمہیں یا بھائی کی محبت میں وہ بھی بھلا بیٹھی ہو؟" اور اماں چپ۔ کچھ کہنے کو بچا ہی کیا تھا۔ ابا اپنی جگہ سچے تھے۔ وہ کیا جھٹلاتیں۔ وہ مجبور ہو گئی تھیں تو پھر بھائی ہی کسی موقعے پر رنجش ختم کرنے آ جاتا۔ بہن کا گھر تو تھا ہی۔ انہوں نے بیٹی کا رشتہ بھی تو طے کیا تھا نا...... مگر نا جی...... ان کی ناک بھی ایسی اونچی تھی کہ مجال ہے کبھی پلٹ کر دیکھا ہو۔

بس یہ ہوا کہ اس ناچاقی، اور اناؤں کی جنگ میں مناقب کے جذبات بری طرح کچلے گئے، وہ ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ اس دکھ نے ان کے ہونٹوں پر چپ کے تالے ڈال دیے تھے۔ بس وہ ہوتے اور ان کا کمرہ۔ انہوں نے تو کتابوں کے ڈھیر میں خود کو چھپا لیا تھا۔ نا گھر کے کسی معاملے میں دلچسپی تھی نا مشورہ۔

بس ان کی اک اپنی الگ دنیا تھی۔ جس میں وہ کھو گئے تھے۔ اماں بیٹے کا گم صم رویہ دیکھ کر زیادہ پریشان تھیں۔ دیکھ تو ابا بھی رہے تھے۔ اسی لیے تو جس روز وہ اپنی تعلیم مکمل ہونے کا پروانہ لے کر گھر آئے۔ اس شام ابا مٹھائی لائے تھے۔

"لو بھئی ہاجرہ بی بی! بیٹے کی خوشی کی مٹھائی کھاؤ۔" ابا نے ٹوکری ان کے حوالے کی تھی۔

"مناقب بھائی لے کے آئے تھے مٹھائی۔ ہم سب نے کھالی تھی ابا۔ آپ اس کے بجائے کوئی پیزا شیزا لے آتے۔ منہ کا ذائقہ ہی بدل جاتا۔" اوصاف جلدی سے بولا تھا۔ ابا نے جھٹ جیب سے ہزار کا کڑکڑاتا نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر دھر دیا۔

"جاؤ تم پیزا بھی لے آؤ اور ہاجرہ تم یہ مٹھائی سارے محلے میں تقسیم کر دو۔ خیر سے تمہارے بیٹے کی بات پکی کر آیا ہو حاجی صلاح الدین کی بیٹی سے۔ بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔ اللہ ہمارے بچوں کو نیک بخت کرے۔" انہوں نے اپنے اک پرانے جگری دوست کا نام لیتے جو اطلاع دی تھی۔ اماں تو اماں، مناقب یوں حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگے جیسے وہ یکدم ہی کسی اور زبان میں بول رہے ہوں۔ وہ ہنس دیے۔

"ارے یہ تم ماں بیٹا ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے۔ ہاجرہ تم نے دیکھا ہوا ہے صلاح الدین کی چھوٹی بیٹی کو۔ ہم پچھلے مہینے مبارک باد دینے گئے تھے نا جب اس نے بارہویں کے امتحان میں اپنے پورے کالج میں سب سے زیادہ نمبر لیے تھے۔ ماشاء اللہ بہت لائق فائق بچی ہے۔ شروع سے ہی طرہ اونچا کرتی آئی ہے باپ کا۔ ہر کلاس میں اول آتی رہی ہے پھر یہ ڈھیر سارے انعام لگے ہیں اس کے الماریوں میں تمہیں دکھائے تو تھے اس نے۔ عائزہ کی بات کر رہا ہوں اور وہ صرف پڑھائی میں ہی اچھی نہیں ہے۔ بھابھی کے ساتھ گھر بھی سنبھالتی ہے۔ بہت اچھی تربیت کی ہے انہوں نے اس کی۔ گھر داری میں بھی طاق کر دیا ہے اسے۔ میں تو جب بھی جاتا ہوں اسی کے ہاتھ کی چائے پیتا ہوں۔ تم نے بھی کھائے تھے نا اس روز اس کے ہاتھ کے بنے کباب کیسے......" ابا تو جو رطب اللسان ہوئے تو پھر بولتے چلے گئے۔ مناقب جھنجلا کر کہہ گئے۔

"آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر کیسے میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کیا ابا جی۔ مجھے کوئی نہیں کرنا شادی وادی۔ میری طرف سے صاف انکار ہے۔" اور ابا یوں چپ ہوئے جیسے چابی والا کھلونا بند ہو جاتا ہے۔ سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ پیر پٹختے اٹھے۔ جب ابا کی سرد آواز آئی تھی۔

"میں تمہارا باپ ہوتا ہوں۔ اس لیے تم سے پوچھے بنا بڑے مان سے تمہارے لیے ایک اچھا فیصلہ کیا۔ مگر تمہیں انکار ہے تو ٹھیک ہے۔ میں تم پر کوئی زبردستی نہیں کروں گا لیکن میں صلاح الدین کو زبان دے آیا ہوں اور کبھی کاروباری معاملے میں اپنا ریکارڈ خراب نہیں کیا تو اب ایسے معاملے میں، میں کیسے خود پر حرف آنے دوں گا۔ یہ تو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ ہاجرہ تم تیاری کر رکھو۔ کل ہم جا کر بچی کے ہاتھ پر اوصاف کے نام کا شگن رکھ آئیں گے۔" وہ تو اپنا فیصلہ سنا کر اٹھ گئے اماں ہکا بکا، پیزا لیے آتے اوصاف کے ہاتھ سے پیکٹ پھسل گیا۔ اس کی شکل پر صاف لکھا تھا۔ وہ ابھی دھاڑیں مار مار کر رو دے گا۔ مناقب بل کھاتے کمرے میں گئے تھے۔ دھاڑ سے دروازہ بند ہوا۔ ابا نے پلٹ کر دیکھا۔ اوصاف کے قدموں میں پڑا پیکٹ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ شانہ تھپکا۔

"سارا مت کھا جانا۔ میرا حصہ رکھ لینا میں آتا ہوں ابھی نماز پڑھ کے اور ہاجرہ تم بیٹی کو بھی فون کر لو۔ کل وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔ اور اب زیادہ دیر مناسب نہیں۔ ہم کل ہی شادی کی تاریخ پکی کر آئیں گے۔ تمہارے اس مجنوں شہزادے کا بس یہی اک علاج ہے۔ شادی ہوتے ہی پچھلی سب باتیں بھول جائے گا۔ ارے میں نے خود بڑا رولا ڈالا تھا۔ پھوپھی شریفاں کی میراں کے لیے وہ تو تم جیسی

سڑیل مزاج عورت میرے نصیبوں میں لکھی۔

''ہونہہ...... بیٹا! سب باتیں خاک بھول جائے گا جس کے باپ کی عمر گزر گئی۔ پھوپھی شریفاں کی وہ نامراد میراں نا بھولی جسے۔'' اماں جل کر کہہ گئیں۔ ابا ہنستے آگے بڑھ گئے۔ بیوی کو ہمیشہ دوسری عورت کے حوالے سے چڑانا ہر مرد کا ہی دل پسند مشغلہ رہا ہے اور اس کے پیچھے کیا راز ہے۔ اگر عورت سمجھ لے تو جلنا کلسنا بھول کر خوشی سے مور بن کر ناچتی پھرے۔ ویسے تو وہ اظہار محبت کرنے میں سدا کی کنجوس ہوتی ہے۔ منہ سے پھوٹ کر نہیں دیتی۔ گھر اور بچے ہی پہلی ترجیح بن جاتے ہیں۔ اس پر جان نثار کرنے والا شوہر کہیں بہت پیچھے چلا جاتا ہے۔ اب ایسے میں وہ شخص اسے زک پہنچا کر اگر غصہ بھی نا اتارے اور اسی بہانے اس کے اندر کا راز بھی نا اگلوائے تو کیا پھر کرے بے چارہ......

☆☆☆

ماموں دواؤں کے زیر اثر گہری نیند میں تھے۔ مومانی مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ اماں نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اور دلسوزی سے رونے لگیں۔

''سچ ہے ساری دنیا ٹھیک ہی ڈرتی ہے بیٹیوں کے نصیب سے۔ ایسے لاڈوں سے پال پوس کے بڑا کرو۔ پڑھاؤ لکھاؤ۔ ہر نعمت مہیا کرو۔ بس اک مقدر نہیں دے سکتے ماں باپ۔ عتیق نے بھی اپنی جان کو یہی ایک دکھ لگا لیا۔ آپ کو تو پتا ہی ہے آپا سین سے کتنی محبت ہے انہیں۔ انہوں نے تو بیٹی کو کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ ہر خواہش پوری کی۔ اس کا شوق تھا پڑھائی کے بعد جاب کرے گی۔ انہوں نے اس کی بھی اجازت دی۔ پھر خود کو ہی ارمان لگ گیا کہ اب بیٹی کے لیے رشتہ بھی بہترین ہونا چاہیے۔ اور وہ بھی کسی کم پر تو راضی ہی نہیں ہوئی تھی۔ بڑا دیکھ بھال کر اس خاندان کا رشتہ ملا اور پہلے تو بڑے اچھے بنے رہے۔ اب سب قلعی اتر رہی ہے کم بختوں کی۔ ناطقہ بند کر رکھا ہماری معصوم سی بچی کا۔ سو طرح کی تو پابندیاں لگاتے رہے اس پر۔ اس پہ ہی بس نہیں مہینہ بھر پہلے لڑ کر گھر سے نکال دیا، ہائے ایسی ذلت۔ ہمیں تو ایسا پچھتاوا لگا اس دن کا۔ بڑی بھول ہوئی۔ اپنا خاندان پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔ مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالے۔'' انہوں نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑتے سر جھکائے بیٹھے مناقب پر نگاہ ڈالی جو چونک سے گئے۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا جو مہر بالب اک طرف یوں بیٹھی تھی۔ گویا موم کا مجسمہ۔ اماں نے گہری سانس لیتے بھاوج کی پشت سہلائی۔ اب صرف دلاسے کے سوا تھا بھی کیا۔ سین نے ماں کو دیکھا۔ اور ناگواری سے گویا ہوئی۔

''پلیز امی لیوالٹ۔ آپ کیا ہر جگہ ایک ہی قصہ لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ کوئی اور ٹاپک نہیں ہے آپ کے پاس بات کرنے کے لیے؟ بس کریں اب۔ رونا ہے تو باہر چلی جائیں۔ پاپا اس شور سے ڈسٹرب ہوں گے۔ ان کی حالت پر ہی ترس کھا لیں آپ۔'' اور مومانی نے پھر دوپٹے میں منہ دے لیا۔ اماں ان کا سر شانے پر رکھے ہوئے تھیں۔ وہ تھما لائی باہر کو چل دی۔ ہاسپٹل کی مخصوص بو ساری فضا میں رچی تھی۔ افراتفری میں ادھر سے ادھر آتے جاتے ڈاکٹرز، بیمار، پریشان حال چہرے کل سے دیکھ دیکھ کر اسے اپنا غم بھول گیا تھا۔ ساری دنیا بھری پڑی ہے۔ مصائب و آلام سے۔ مگر پتا نہیں امی کو کیا تھا ہر آئے گئے کے سامنے ایک ہی کھاتہ کھول کر بیٹھ جاتیں۔ اب بھلا پھوپھو اور ان کے صاحبزادے کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اس کے پرابلمز سے۔ جو بھی مسائل ہیں اس کے ہیں۔ جو لوگ پہلے اپنے ہو کر اپنے نا بن سکے وہ بھلا اب کیا کر سکتے ہیں۔ اسے ماں پر غصہ آئے جا رہا تھا۔ گرل پر دونوں ہتھیلیاں جمائے سامنے بھاگتے دوڑتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی کوئی پاس آن ٹھہرا۔ وہ نا ہی چونکی اور نا رخ موڑا وہ بن دیکھے ہی جان گئی تھی۔ لیکن تاثر ایسا ہی رکھا جیسے ان کے آنے کا علم ہی نہیں ہوا اور انہوں نے چند ثانیے اس کا لاتعلقی بھرا انداز دیکھا تھا۔ پھر گہرا سانس لیتے گرل سے ٹیک لگا کر سینے پر بازو باندھ لیے۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ آج بھی بالکل ویسی ہی تھی۔ وہی نقش، وہی رنگ، وہی ناز بھری ادا۔ اسے تو وقت جیسے چھوئے بنا گزر گیا تھا۔ ان کے دل سے ہوک سی نکلی۔ دنیا کے امیر سارے سکھ تھے۔ بہت سی کامیابیاں، مگر اک کسک اب بھی تھی۔ نارسائی کا عذاب بڑا جاں گسل ہوتا ہے۔ پھلکنڈے کی جھاڑی جیسا جو پیروں سے الجھ جائے تو کانٹے جان چھڑائے نہیں چھوڑتے۔ ان کے اندر بھی پھانس بھی نکالے نہیں نکلی تھی۔ بہتیرا خود کو سمیٹا ہوا تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر پرانے زخم پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔ ان کی مستقل نظر سے زچ ہو کر اس نے جانے کو پر تولے تھے کہ انہوں نے بے تابی سے گرل پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔ بولنا چاہا لیکن کیا کہتے کوئی لفظ ہی نوک زباں پر نہیں آ رہے تھے۔ گویائی گم ہو چکی تھی۔ بس بچا تھا تو وہ احساس جو پور پور اس کے دکھ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سین نے ان کے ہاتھ کو دیکھا اور آہستگی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیسے ہیں آپ؟'' با دل ناخواستہ اس نے حال پوچھا۔ اس کی آواز نے سکوت بھرے لمحوں پر ضرب لگائی تھی۔ چہرے پر چھائی بر ہمی اب قدرے مفقود تھی۔ وہ پوچھ ان سے رہی تھی اور آنکھیں ہوا سے ملتے پتوں پر لگی تھیں۔ انہوں نے بازو پھر سے سینے پر لپیٹے۔

''کیسا ہو سکتا ہوں؟'' وہ الٹا اسی سے سوال کناں ہوئے۔ سین نے پوری گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر یوں بھنویں اچکائیں گویا کہہ رہی ہو۔ ''مجھے کیا پتا۔'' پھر کچھ توقف سے بولی۔

''دیکھنے میں تو ٹھیک ہی لگ رہے ہیں۔ اگر آپ اپنی تعریف سننا چاہ رہے ہیں۔ تو میں کہوں گی آپ پہلے سے بڑھ کے ہینڈسم ہو گئے ہیں اور میں نے تو بہت تعریف سنی ہے آپ کی مسز کی بھی۔ ابھی پھوپھو نے کوئی دس بار ان کا ذکر کیا اور جس عورت کی ساس اس کی تعریف کر رہی ہو۔ پھر اس کی خوبیوں پر کوئی شک نہیں رہ جاتا۔ بہت خوش نصیب ہوتی ہے وہ عورت اور وہ یقیناً ایک خوش بخت خاتون ہیں۔ جنہیں پھوپھو جیسی ساس کے علاوہ آپ کا ساتھ بھی میسر ہے۔'' وہ جتنے ڈسٹرب ہو چکے تھے اسے دیکھ کر۔ وہ اسی قدر نارمل لہجے و انداز سے بات کر رہی تھی۔ اس بے وقت کے تذکرے پر ان کا ماتھا شکن آلود ہوا۔ کتنے برسوں بعد تو ترسی آنکھوں کو دید نصیب ہوئی تھی اور ان لمحوں میں بس اسے ہی دیکھنا اور سننا چاہ رہے تھے۔ اس نے بغور ان کا رنگ بدلتا چہرہ دیکھا۔ اور لفظوں کا الٹ پھیر کر کے پھر وہی سوال کیا۔

''میری تو جیسی تیسی گزر رہی ہے۔ آپ سنائیں آپ کی کیسی گزر رہی ہے؟'' اور ان کی یقیناً بہت اچھی گزر رہی تھی۔ ایک سلیقہ شعار، سمجھدار، باوفا عورت قدرت کی مہربانی سے ان کی ساتھی تھی۔ پیارے پیارے دو بچے۔ اللہ کی بہت سی نعمتوں سے ان کا دامن بھرا ہوا تھا۔ اتنا کچھ تھا ان کے پاس، کہ جس کا شمار ممکن نا تھا۔ لیکن تھے نا انسان۔ کبھی اس اتنے کچھ پر دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ انہیں تو وہی ایک کمی افسردہ رکھتی تھی۔ جو ان کا نصیب تھی ہی نہیں۔ اک گہرا سانس لیتے انہوں نے اس کے رخ سے نظر ہٹائی تھی۔

''ہوں...... ٹھیک ہی گزر رہی ہے۔ بیوی، بچے گھر، آفس، خاندان بس وہی سب جو ہر دوسرے انسان کی مصروفیات ہوتی ہیں۔ تم اپنی سناؤ؟'' اور اس نے شانے اچکا دیے۔

''میرے پاس کچھ خاص نہیں ہے سنانے کو۔ بس زندگی ہر گزرتی سانس کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ میرے لیے یہی قابل اطمینان ہے۔'' اور انہیں جھٹکا لگا۔ اففف۔ دل پہلے ہی دکھ سے بھرا ہوا تھا کہ اب اس کے آزار محسوس کرتا درد سے بے کل ہو گیا انہیں اس ان دیکھے شخص پر بے طرح غصہ آیا۔ وہ بے اختیار کہہ گئے۔

''نہایت ہی ناقدر شناس ہے وہ آدمی۔'' وہ

ہنس پڑی۔

"بالکل یہی لفظ وہ آدمی میرے لیے کہتا ہے۔ اسے دکھ ہے کہ میں نے اس کی قدر نہیں کی۔ اگر وہ اپنے خاندان کی کسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرتا تو وہ اس کے پیر دھو دھو کر پیتی۔ اس کا تو سارا خاندان اس کی قسمت پر افسوس کرتا ہے کیونکہ اسے مجھ جیسی ناقدری عورت ملی ہے۔ حد ہے نا ویسے۔" وہ جانے خود پر ہنس رہی تھی یا اس شخص پر۔ ان کا درد اور بڑھا۔ وہ بے بس سے پلکیں میچ گئے آخر یہ زندگی امتحان کے لیے ان ہی لوگوں کو کیوں چنتی ہے جو جان سے پیارے ہوتے ہیں۔ اس کا کرب ان کی روح میں اتر رہا تھا۔ کوئی ایسا حرف تسلی نا تھا جو اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔ انہوں نے دھیرے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ گویا حوصلے کی کمک دی۔ یمن چہرہ موڑے ہونٹ کچل رہی تھی۔

☆☆☆

"جلدی سے آجاؤ میرے پیارے بچو! دیکھو میں آپ کے لیے کیا لائی ہوں؟" عائزہ روم میں آئی تھی۔ موحد نے تو لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظر ہٹا کر دیکھا۔ اور ماں کے ہاتھ میں نوڈلز لبالب بھرے پیالے دیکھ کر ایک ہی جست میں اس کے پاس آگیا۔ جبکہ اریزہ جوں کی توں گوتم بدھ بنی بیٹھی تھی۔ آج سالن میں مرچ کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ مناقب کے ہاتھوں ٹھیک ٹھاک کلاس لگی تھی۔ بچے بھی کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے۔ اریزہ تو ویسے ہی جب سے اسکول سے آئی تھی۔ موڈ کچھ آف تھا۔

"اریزہ! آپ میری بات نہیں سن رہی ہیں تو پھر بلاؤں آپ کے بابا کو۔" اس نے حسب سابق دھمکی لگائی تھی۔ خیال واثق تھا کہ زود اثر ہے گی۔ مگر وہ اسی پھولے منہ سے ماں کی سمت مڑی تھی۔

"ہاں بلالیں، بابا کو فون سے فرصت ملے گی تو آپ کی بات بھی سن لیں گے۔ بائے داوے مما! آج کل بابا کچھ زیادہ ہی فون پر بزی ہوتے ہیں۔ میرا مشورہ مانیں آپ بھی ان سے کال پر ہی بات کرلیا کریں۔ کم از کم اس طرح بات کرتے ہنستے تو ہیں وہ۔" اس کی نظر کھلے دروازے سے لاؤنج تک گئی تھی۔ جہاں گلاس وال کے قریب ایزی چیئر پر جھولتے مناقب کسی سے محو گفتگو تھے۔ اور یہ تو عائزہ نے بھی نوٹ کیا تھا۔ وہ اب گھر آکر بھی فون سے ہی چپکے رہتے تھے۔ کبھی کال، کبھی چیٹ۔ اور پھر اتنے مگن اور خوش گوار انداز سے کہ اسے اگلی جانب والے پر رشک آنے لگتا۔ اور حد ہے ان کا یہ انداز بچے بھی بھانپ گئے تھے۔ وہ بھی انہیں دیکھ رہی تھی۔ ہشاش بشاش تروتازہ چہرہ، چمکتی آنکھیں، مسکراتے لب۔ اس کی نظر ساکت ہوئی۔ جانے کتنے دن بعد اس دشمن جاں کو ہنستے دیکھا تھا۔ اور دل چاہ رہا تھا کہ دیکھتی ہی رہے۔

"مما! مجھے اور چاہیے۔" موحد کی آواز اسے طلسماتی سحر سے نکال لائی تھی۔ اریزہ نے اپنا پیالا بھی اس کے آگے کھسکا دیا۔

"آپ کیوں نہیں کھا رہیں۔ کیوں تنگ کر رہی ہو مجھے۔ بات کیا ہے۔ کیوں منہ سوجا رکھا ہے بتا کیوں نہیں رہی ہو؟" اس کی ساری جھنجلاہٹ بچی پر نکلی جو چپ چاپ بیڈ سے اتری۔ عائزہ کا سارا دھیان ہنس ہنس کر فون پر بات کرتے میاں کی طرف تھا جبکہ دیکھ وہ اریزہ کو رہی تھی۔ جو اپنا اسکول بیگ۔ آئی تھی۔ اور اس میں سے کچھ نکالا۔

"مما! میرا جیومیٹری بکس ٹوٹ گیا آج۔" اس کے چہرے پر ایسا بے چارگی بھرا بھولپن تھا کہ شا[ید] غصہ ہونے کے باوجود وہ صرف اسے گھور کر رہ گئی۔ یہ جیومیٹری بکس ایک خوبصورت ڈول ہاؤس کی شکل میں تھا۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ اسے نانو نے ...ڈے پر گفٹ کیا تھا اور جسے وہ جی جان سے عزیز رکھتی تھی۔

"اف...... اتنا تنگ کیا آپ نے مجھے جیومیٹری بکس کے ٹوٹنے پر۔ اریزہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ چیزیں ٹوٹ بھی جاتی ہیں بیٹا۔ ان کے پیچھے پیٹا تو نہیں چھوڑ دیتے۔" تحمل سے سمجھایا۔ اس

صورت پر دکھ جوں کا توں تھا۔

"مگر مما آپ نے تو میرے لیے نیو جیومیٹری بکس لیا بھی نہیں تو پھر یہ کیوں ٹوٹ گیا؟ یاد ہے نا گھر میں ایسا ہی تو ہوتا ہے نئی چیز آتی ہے تو پرانی ٹوٹ جاتی ہے۔" نہایت بے چارگی سے دی گئی وضاحت پر غصہ ہونے کے باوجود عائزہ کو زور کی ہنسی آئی۔

"اوہ میری پیاری گڑیا! کیا کیا یاد رکھتی ہو۔ وہ تو اتفاق تھا میری جان۔ ورنہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ آپ پریشان نا ہو۔ چیزیں تو ٹوٹ ہی جاتی ہیں نا۔ بلکہ آپ خوش ہو جاؤ۔ اب آپ کو اس کے بدلے نئی چیز ملے گی۔ میں کل ہی اپنی بیٹی کے لیے بالکل ایسا ہی جیومیٹری بکس لے آؤں گی۔ اب ٹھیک؟" اس نے اریزہ کو گلے لگا کر اس کا منہ چوم لیا۔ اور وہ بچی ہی تو تھی۔ فورا بہل گئی۔ اب اس کا موڈ نارمل تھا۔ بیٹی کی طرف سے اطمینان ہوا تو پھر سے اس جفا جو کی فکر جاگی۔

"اتنی لمبی کال......؟ آخر یہ کس سے بات کر رہے ہیں۔" اس سے مزید برداشت نہیں ہوا۔ بے چین ہو کر کمرے سے نکلی۔ ان کے آگے رکھا چائے کا مگ ٹھنڈا ٹھار ہو چکا تھا۔ (اتنے مگن اف......) اور اسے دیکھ کر ان کے ہونٹ ساکت ہوئے۔ لفظ تو کیا مسکراہٹ بھی یوں غائب ہوئی کہ جیسے دھوپ کے نکلتے ہی پھول پر پڑی شبنم اڑ جاتی ہے۔

"آپ نے چائے نہیں پی ابھی تک۔ یہ تو ٹھنڈی ہو گئی، تازہ بنالاؤں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ وہ نفی میں سر ہلاتے اٹھے۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے چھت پر جاتی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ صاف ظاہر تھا انہیں یہاں بات کرنا گوارا نہیں۔ اسے ہتک کا احساس ہوا۔ مگر ان کے ایسے رویوں کی عادی تھی۔ سر جھٹک کر کچن کی طرف رخ کیا۔

"یہ بھائی صاحب کدھر گئے ہیں؟" اپنے کمرے سے نکلتا اوصاف سب نظارہ دیکھ چکا تھا۔

"چھت پہ......" وہ ادھر ادھر بکھرے برتن سنک میں ڈال رہی تھی۔

"چھت پہ...... وہ بھی اس وقت......؟ ابھی موسم ایسا گرم تو نہیں ہوا کہ ہوا خوری کی ضرورت پڑے۔ ٹھیک ٹھاک خنکی ہے باہر اور کافی دیر سے مصروف ہیں فون پر۔ کس سے بات کر رہے تھے موصوف۔ کچھ پتا ہے۔" عائزہ نے لاعلمی کے اظہار کو کندھے اچکا دیے۔

"کمال ہے...... کیسی بے خبر بیوی ہیں آپ۔ آپ کے میاں صاحب ڈیڑھ گھنٹہ سے فون کی جان کو چپکے بیٹھے ہیں اور آپ نے ذرا سن گن نہیں لی۔ حد کرتی ہیں بھابھی! ایسا اندھا اعتماد بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اور وہ بھی شوہر پر...... اور پھر خاص طور پر ایسا شوہر...... پوری پوری نظر رکھا کریں ان پر۔ مجھے تو معاملہ کچھ اور لگتا ہے۔ پہلے تو کبھی ایسے چپکو نہیں بنے اور یاد رکھیں شوہر بھی ایک بکرے کی طرح ہی ہوتا ہے۔ ذرا جو رسی ڈھیلی چھوڑ دی جائے تو ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہیں آتا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ اللہ جانے کیا انٹ شنٹ بولتا جا رہا تھا۔ عائزہ نے پوری آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔

"اللہ اللہ...... ایسی بھی کیا سادگی، کچھ ہوشیاری پکڑیں بھابھی جی! ہوشیاری......" وہ جا چکا تھا۔ پیچھے وہ دم سادھے اس کے لفظوں پر غور کرتی رہ گئی۔

☆☆☆

نماز اور تسبیح سے فارغ ہو کر اماں سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔ جب وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔

"ارے آج کہاں سے تمہیں ماں کی یاد آگئی۔ خیر تو ہے نا؟ شرمین تو گھر ہی ہے نا یا میکے چھوڑ آئے ہو اسے۔" اور وہ ان کے ایسے کرارے طنز پر بچوں کی طرح منہ بسور کر رہ گیا۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میں کوئی شرمین سے ڈرتا ہوں کہ اسے میکے پہنچا کر پھر آپ کے پاس آؤں گا۔ اماں آپ بھی نا بس حد کرتی ہیں۔"

"لو بھلا میں نے کیا حد کرتی ہے۔ خود حساب

لگاؤ۔ آج کتنے دن بعد رخ کیا ہے ادھر کا۔ اللہ سلامت رکھے میرے مناقب کو ہر روز وہی آ کر پاؤں دباتا ہے میرے۔ تمہیں تو بیوی کی خدمت گیری سے فرصت نہیں۔'' انہوں نے تو لتے ہی لے ڈالے وہ بھی تپ اٹھا۔

''ہاں...... ہاں! میں تو ہوں ہی ناکارہ، نکما، فارغ انسان۔ آپ کے بڑے صاحبزادے ہی تو خدمت کرتے ہیں آپ کی۔ وہی تو بہت تابعدار ہیں نا آپ کے۔ وہی روز پاؤں دباتے ہیں۔ تو اماں حضور کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گی کہ وہ اس وقت آپ کے پاؤں کیوں نہیں دبا رہے۔ اس سعادت سے محرومی کی وجہ کیا ہے؟''

''ارے ہوگا کسی کام میں مصروف۔ ابھی آجاتا ہے وہ۔ وہ کوئی فارغ تھوڑا ہی ہے سو کام چمٹے ہوتے ہیں اس کی جان کو۔ بتا رہا تھا آج کل آفس میں بھی بہت کام بڑھ گیا ہے۔ اس لیے تو دیر سے آنے لگا ہے۔ بہت تھک جاتا ہے میرا بچہ۔ اتنا سا تو منہ نکل آیا ہے اس کا۔'' اور اس نے سر ہلایا۔ ہونٹوں پہ پراسرار سی مسکان آٹھہری تھی۔

''جی جی...... بہت تھک جاتے ہیں آج کل، مجھے بھی سب پتا ہے۔ جانے آپ لوگ ہی کیوں اتنے بے خبر ہیں اور جب وہ آپ کے فرماں بردار سپوت تشریف لے آئیں تو آپ ان سے ضرور پوچھیے گا کہ وہ پچھلے کئی دن سے آپ کے علاوہ اور کس ہستی کے خدمت گار بنے ہوئے ہیں۔''

''ہائیں کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ اس کے لہجے و انداز پر حیران ہوئیں۔

''اگر میں مطلب بتادوں تو کیا آپ برداشت کر پائیں گی؟'' اوصاف جو بین باہر دیکھ کر آرہا تھا۔ اس کے بعد اب مزید دیر کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے سب اماں کے گوش گزار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ویسے بھی اتنے دن سے تنہا بوجھ اٹھائے اٹھائے اب تو پیٹ میں بھی درد رہنے لگا تھا۔ اس کی صورت پر جیسی سنجیدگی چھائی تھی۔ اس نے اماں کی حسیات کو بھی جھنجوڑ ڈالا۔ دور کہیں کوئی گھنٹی بجی تھی۔

''کہنا کیا چاہ رہے ہو تم۔ کھل کر کہو۔ میری اب پہیلیاں بوجھنے کی عمر نہیں رہی میاں! تم تو دل ہولائے دے رہے ہو میرا بات کیا ہے؟''

''بات تو شاید اب بہت دور تک جا چکی ہے۔ کاش کہ ماموں کو ہارٹ اٹیک نا ہوا ہوتا۔ کچھ لوگ ٹوٹے رشتے پھر سے استوار کرنے کی کوششوں میں ہیں آج کل......'' عائزہ نے کچن سمیٹ کر دودھ گرم کیا تھا۔ اور وہی دینے آئی تھی کہ اوصاف کی آواز پر دروازے میں ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

اسے آتے دیکھ کر وہ مزید بات کلیئر کرنے کا ارادہ کر چکا تھا تاکہ وہ بھی تمام حالات سے باخبر ہو سکے۔ اور اپنی ہچکولے کھاتی کشتی کا چپوار خود اپنے ہاتھوں سے سنبھال سکے۔ پھر جو کچھ وہ بتاتا گیا اس نے ان دونوں کے پیروں تلے سے زمین سرکا دی۔ ماموں کی عیادت کو وہ سب چند ایک بار گئے تھے۔ جبکہ مصدقہ اطلاعات کے مطابق اب مناقب تقریباً روز ہی وہیں پائے جاتے تھے۔ اور راوی نے تو یہاں تک بیان کیا تھا کہ بین کے ساتھ کئی ایک بار پبلک پلیس پر دیکھے گئے ہیں۔ ان کے آفس سے کوئی گھنٹہ بھر کی ڈرائیو بنتی تھی وہاں تک۔ اور جو وہ اکثر پوری دلجمعی سے کر رہے تھے۔ اور یہ سب واقعات یقیناً کسی اچھی علامت کی جانب اشارہ نہیں کر رہے تھے۔

''خاندان بھر میں چہ مگوئیاں ہو رہی ہیں۔ اس قصے کو لے کر۔ سب اپنی اپنی مرضی کی بولیاں بول رہے ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں مجھے کس قدر شرمندگی ہوئی۔ مائرہ آپا کے شوہر سے یہ سب سن کر۔ اب آپ بتایئے کیا یہ سب مناسب ہے؟'' تمام کتھا کہہ کر وہ سوالیہ ہوا تھا۔ دونوں کے چہروں پر نظر ڈالی۔ ایک دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں تیزی سے اترتا آنسوؤں کا ریلا۔ جب کہ دوسرے چہرے نے انڈے کی سی سفیدی کے بعد اب سرخ مرچ کا سا رنگ پکڑ لیا۔

''اللہ کی مار پڑے اس بین کی بچی پر۔ چھی چھی...... ارے بیاہتا ہو کر ایسی گندی حرکتیں۔ اپنا گھر تو سنبھال نہیں سکی کم بخت، اب کیا دوسروں کا گھر بھی اجاڑے گی۔'' اماں کا پارہ آخری نقطے تک جا پہنچا۔

''کسی دوسرے کی اولاد کو کوسنے کے بجائے آپ اپنی اولاد کی کوتاہی بھی نظر میں رکھیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ بھائی کیوں چل کر جاتے ہیں وہاں۔ انہیں اغوا نے کے لیے وہ کرین تو نہیں بھیجتی ہے نا۔ اور یاد رکھیں اللہ کی مار ایسے مردوں پر بھی پڑتی ہے۔ جو نیک اور پاک باز بیوی کو چھوڑ کر پرائی عورتوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں۔'' اوصاف نے جھٹ انہیں ٹوکا۔ عائزہ کے آنسو ٹپ ٹپ کرتے اب دامن میں گر رہے تھے۔ انہوں نے لپک کر اسے گلے لگایا۔

''نا...... نا تم کیوں رو رہی ہو۔ ارے ہم سب ہیں نا تمہارے ساتھ۔ ابھی تمہارے ابا آجائیں تو دیکھنا، مناقب کی طبیعت تو میں آج کے آج ہی کیسے صاف کرواتی ہوں۔ ارے اس کی ہمت کیسے ہوئی ایسی چھچھوری حرکت کرنے کی۔ دکھ سے کلیجہ پھٹ رہا ہے میرا۔ ارے ہمارا خون ہو کر اس نے ایسی بے ہودگی دکھائی۔ بالکل معاف نہیں کریں گے اسے۔ بچوں اور تم سے بڑھ کر تو اب کچھ عزیز نہیں ہمیں اور یہ بین اور بھابھی کی بھی صبح ہی میں خبر لیتی ہوں جا کر۔ تم حوصلہ کرو بس......'' موحد سو گیا تھا۔ اریزہ اپنے جیومیٹری باکس کا قصہ دادو کو سنانے آئی تھی کہ وہاں ماں کو دھواں دھار روتے دیکھ کر پریشان ہو اٹھی۔

''مما...... مما...... کیا ہوا ہے آپ کو؟''

''ارے کچھ نہیں ہوا۔ تم ادھر آؤ میرے پاس۔ یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں۔'' اماں نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اوصاف کو یونہی شرارت سوجھی۔

''ارے پیاری گڑیا۔ یہ تو مما کے خوشی کے آنسو ہیں۔ آپ کے بابا آپ کے لیے دوسری امی لانے والے ہیں نا۔۔۔''

''آئے ہائے خدا کا خوف کرو۔ یہ کیسی بدفال نکال رہے ہو منہ سے۔ بھلا ایسے بات کرتے ہیں بچوں کے ساتھ۔ شرم کرو کچھ۔'' اماں نے جھاڑ پلا دی۔ اریزہ کے چہرے کا رنگ کچھ اور ماند پڑا۔ اس نے دہل کر اوصاف کو دیکھا پھر زار زار روتی ماں کو۔

''چلو اب سنبھالو خود کو۔ بچی پریشان ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر۔ جاؤ اسے سلاؤ اب۔ صبح اسکول بھی جانا ہے اس نے۔ پہلے ہی کافی وقت ہو گیا ہے۔'' انہوں نے عائزہ کا شانہ تھپکتے کہا تو وہ آنسوؤں پر قابو پاتی اٹھ گئی۔ اندر اک اکھاڑ پچھاڑ مچی تھی۔ طوفان بپا تھا۔ ایسی آگہی ملی تھی جس نے اپنی ذات کے مان کو ہی چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی مگر صرف اریزہ کو دیکھتے سسکیاں اندر ہی گھونٹ لیں۔ اس کے سینے سے لگ کر سونے کی کوشش کرتی اریزہ ایسی بھی بے خبر نہیں تھی۔ سب شور سن رہی تھی وہ۔ بے قراری سے سر اٹھایا۔

''مما چاچو کیا کہہ رہے تھے۔''

''کچھ نہیں۔۔ وہ تو ایسے ہی مذاق کر رہے تھے۔'' چہرہ چھپانے کو اس کے گھنے بالوں والے سر پہ منہ رکھ لیا۔

''اچھا، پھر آپ ایسے کیوں روئیں۔ مذاق پہ روتے تھوڑی ہیں۔ مذاق پر تو ہنستے ہیں۔'' وہ بھی اریزہ تھی۔ ہر بات کا جواب تھا اس کے پاس۔ وہ بری طرح چڑی۔

''میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہے اریزہ...... پلیز سو جاؤ۔'' اسے تو ڈپٹ دیا مگر اس دل کا کیا کرتی جو کرلائے جا رہا تھا۔ اسے تو کہہ دیا کہ مذاق تھا۔ دنیا کے سب مذاق سہے جاتے ہیں اور ان پر ہنس بھی لیا جاتا ہے لیکن جب کوئی بہت اپنا آپ کی ذات کو دنیا کے لیے مذاق بنا کر رکھ دے تو پھر اسے سہنا عذاب ہوتا ہے۔ آج اوصاف نے یوں ہی ہنس کر مذاق اڑایا تھا کل کو کچھ اور لوگ بھی آجائیں گے جو کہانی اس گھر تک پہنچی ہے۔ اس میں کچھ تو صداقت ہوگی نا کہ وہ دوسروں کی زبان کا چٹخارہ بنی۔ اف، اگر ایسا کچھ بھی ہوا تو...... اور اس تو کے آگے گہری خندق تھی۔ اریزہ سو چکی تھی۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے

نکل آئی اسے رونے کے لیے کوئی کونا تلاشنا تھا۔

☆☆☆

ابا کی روٹین تھی نماز عشا پڑھ کر کسی بھی دوست کی بیٹھک میں جا بیٹھتے۔ گپ شپ لگاتے۔ رات بھی وہ لیٹ واپس آئے تھے۔ تب تک اماں کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ غصہ، دکھ، رنج، پریشانی سب نے مل کر روح کو جکڑ لیا تھا۔ انہوں نے تو سب سن کر حوصلے سے سہہ لیا تھا۔ لیکن ابا ایسا ظرف نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو اسی وقت طوفان اٹھا دیتے۔ سو اس معاملے کو اب کسی طریق سے ہی حل کرنے کا سوچ کر وہ صبر کر گئی تھیں۔ دیر سے آنکھ لگی تھی۔ صبح وقت پر کیسے کھلتی۔ نماز فجر بھی قضا ہوئی۔ جانے سارا گھر بھی کیوں چپ پڑا تھا۔ وہ اپنے لیے چائے بنانے جا رہی تھیں کہ چھت پر جاتی سیڑھیوں پر انہیں اک گٹھڑی سی پڑی نظر آئی۔ بے اختیار تجسس سی وہ نزدیک سے دیکھنے کو آگے ہوئی تھیں کہ اوسان خطا ہو گئے۔ وہ کوئی گٹھڑی نہیں بلکہ وہ تو عائزہ کا بے ترتیب وجود تھا اور پھر ان کی چیخوں پر سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔

☆☆☆

عورت......رب کی خوب صورت تخلیق۔

آدم کو تو مٹی سے بنایا گیا اور خالق تو اسی طریق سے حوا کو بھی پیدا فرما دیتا۔ اس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے وہ جو چاہتا ہے بس ''کن'' فرما دیتا ہے اور ہو جاتا ہے مگر اس مصور نے دوسرے پتلے کے لیے مٹی نہیں گوندھی تھی بلکہ اسے تو آدم ہی کی پسلی سے پیدا کیا یعنی دل کے قریب سے اور وہ دل جس میں میرے رب نے پیار، محبت، مروت، خلوص، ایثار، وفا جیسے جذبے بھر رکھے تھے اور ان ہی جذبوں سے گندھی مخلوق کو عورت کا نام دیا گیا۔

عورت جس میں حسن اور نزاکت کو جمع کر دیا گیا۔

عورت جسے وفا سے تابناک روح عطا کی گئی۔

عورت جسے سراپا محبت بنایا گیا۔

عورت جس کا دل ایسا موم سا کر دیا۔ جسے جس سانچے میں چاہو ڈھال لو۔

عورت جسے نسلوں کا امین بنایا گیا جس کا حوصلہ اتنا وسیع ہے کہ اولاد کو ہزار مشقتیں جھیل کر پال پوس کے جوان کرتی ہے اور پھر اپنے ہی ہاتھوں بیٹی کسی اور کو سونپ دیتی ہے اور بیٹا بھی ہنسی خوشی کسی اور کے حوالے کر دیتی ہے۔ وہ جانتی ہے۔ خاندانوں کی تکمیل ایسے ہی ممکن ہے۔ کل اس کے لیے کسی نے ایثار کیا تھا۔ آج وہ کرے گی تو پھل پائے گی۔ وہ ساری زندگی دے سکتی ہے، بانٹ سکتی ہے۔ ایثار کر سکتی ہے، لٹا سکتی ہے لیکن اگر کہیں آ کر وہ تنگ دل ہوتی ہے، کم ظرف بنتی ہے، کم حوصلہ ہو جاتی ہے تو وہ ہوتا ہے اس سے جڑا وہ تعلق، وہ رشتہ، وہ محرم جس کے ساتھ اس کا نام ازل سے آسمان پر لکھ دیا جاتا ہے اور جب وہ اس نام کو ایک بار دل کی تختی پر لکھ لیتی ہے تو پھر قطعا برداشت نہیں کر سکتی۔ کہ اب یہ نام کسی اور کے لبوں پر بھی آئے۔ وہ ہر رشتے میں شراکت برداشت کر سکتی ہے۔ مگر ایک عورت ایک بیوی اپنے محرم، اپنے شوہر کو کسی سے نہیں بانٹ سکتی اس معاملے میں وہ ازلوں سے بخیل ہے۔ کیونکہ اس کی پہلی محبت اس کا مرد ہی ہے۔ (باقی محبتوں کا امین تو اسے بعد میں بنایا گیا)۔

اور اسی مرد کے طفیل وہ اپنا گھر بناتی ہے۔ ایک گھر بنانے میں عورت کو زمانے لگتے ہیں۔ اسے سجانے سنوارنے میں وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔ سب ہمتیں صرف کرتی ہے۔ خود سے جڑے سب رشتوں کی قدر کرتی ہے انہیں عزت دیتی ہے تو کس کے لیے۔ اسی مرد کی خوشنودی کے لیے نا۔ جو اس کے دل کے سنگھاسن پر بڑی شان سے براجمان ہوتا ہے۔ اور جب وہ اتنا سب کرتی ہے تو کیا اس لیے کہ کوئی بھی اس کے راج پاٹ میں گھس آئے۔ اپنے گھونسلے میں تو چڑیا بھی کسی کو پر نہیں مارنے دیتی۔ عورت تو پھر عورت ہوتی ہے اور وہ تو دہرے وبال میں گھری تھی۔ اس کے مرنے کو تو یہ خیال ہی کافی تھا۔ کہ زندگی کے سات سال سے وہ جس شخص کے ساتھ ایک چھت تلے رہ رہی ہے۔ وہ تو دراصل اس کا ہے ہی نہیں۔ وہ اتنے عرصے سے جسے محبت سمجھ رہی ہے وہ تو ایک بیگار ہے۔ جسے وہ نا چاہتے ہوئے بھی ادا کر رہا ہے۔ اور اپنی ارزانی سے باخبری کیسی کٹھن ہوتی ہے۔ یہ تو اسے اب پتا چلا۔ وہ تو اس صدمے سے نڈھال جیسے صدیوں کا سفر طے کر آئی تھی۔ برہنہ پا، دل فگار، پھٹا دامن، الجھی سانسیں...... ابھی ڈاکٹر چیک اپ کر کے گیا تھا۔ رات بھر کھلی فضا اور بے تحاشا گریہ زاری نے اسے شدید اذیت میں مبتلا کیا تھا۔ وہ ہوش میں تو تھی۔ لیکن بے ہوشوں جیسی۔ وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اور نا ہی کسی کو دیکھنا۔ وہ خود سے ہی نہیں اب سب سے بے زار تھی۔

ڈاکٹر کے جاتے ہی ابا نے مناقب کو بلا بھیجا تھا۔

''کیوں میاں......؟ ایسی بھی کیا آفت آن پڑی تھی کہ تمہاری بیوی ساری رات کمرے سے باہر پڑی رہی اور تم ایسے غافل کہ کچھ پتا ہی نہیں۔ ارے ایسی لاپروائی، ایسا سلوک تو کوئی پالتو جانور کے ساتھ نہیں کرتا جو تم نے کیا۔ کیا رات گدھے بیچ کہ سوئے تھے؟''

''وہ بے چاری دن رات چاکری بھی کرے، بچے پالے، گھر سنبھالے، ان کے سارے کنبے کی خدمت کرے پھر بھی اس درجے پر نہیں چڑھی جس درجے پر یہ اوروں کو چڑھائے بیٹھے ہیں۔ یہ پہلے ان کی تو خبریں لے لے۔ مفت کی باندی اپنی جان سے جاتی ہے تو جائے ان کی بلا سے۔ انہیں کیا لگے۔'' اماں الگ جلی بھنی بیٹھی تھیں۔ بس بہت لحاظ کر لیا تھا۔ مگر اس حرکت کے بعد تو ایک ماشے کی بھی گنجائش نہیں بچی تھی۔ وہ جو سوچ چکی تھیں کہ بڑے طریقے سے ابا کو اس سارے معاملے سے آگاہی دیں گی۔ اس پل بے دھڑک بول اٹھیں۔ تمام داستان حرف بہ حرف کہہ سنائی۔ وہ حیران پریشان بیٹھے کے دیکھتے رہ گئے۔ یہ کس حاسد نے ان کی ہمدردیوں کے فسانے گھر تک پہنچا دیے تھے اور کس انداز سے۔ ابا تو گویا جلتے توے پر جا بیٹھے پھر ان کی وہ گوشمالی ہوئی کہ اللہ دے اور بندہ لے، یہاں تک کہ انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا۔

''عائزہ مجھے اپنی بیٹی سے بڑھ کر عزیز ہے۔ اگر تم اس جیسی صابرہ اور شاکرہ بیوی کے ساتھ مخلص نہیں۔ تو پھر میرے گھر میں بھی تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ابھی میں اور تمہاری ماں زندہ ہیں۔ اتنا دم خم ہے ہم میں کہ اپنے پوتا اور پوتی کو پال لیں گے۔ تمہارا جدھر منہ اٹھتا ہے وہاں دفع ہو جاؤ اور ہم سے کوئی واسطہ نا رکھنا پھر ان بچوں کی شکل کو ترسو گے تم۔ تمہارے جیسے ہی مرد ہوتے ہیں جو اللہ کی دی گئی نعمت وفا شعار بیوی کی قدر نہیں کرتے تو پھر وہ دوسری بد قماش عورتوں کے ہاتھوں زمانے میں ذلیل کروائے جاتے ہیں۔ مجھے تم سے قطعا ایسی امید نہیں تھی مناقب! تم نے بہت دکھی کیا ہے ہمیں۔ چلے جاؤ یہاں سے...... جاؤ......'' وہ بول بول کر ہانپنے لگے تھے۔ اماں اور اوصاف نے بمشکل قابو کیا۔ مناقب سر جھکائے کمرے سے نکل آئے۔ ان حالات میں اپنی صفائی میں کچھ بھی کہنا بے کار تھا۔ کون سا کسی نے سننا یا سمجھنا تھا۔ اریزہ پلر کے پیچھے کھڑی سب دیکھ رہی تھی۔ انہیں آتے دیکھا تو دوڑ کر کمرے میں جا گھسی۔ تھاپ سے دروازہ بند، ان کا ایک پیر زمین پر تھا۔ ایک فضا میں معلق۔ وہ فریز ہو گئے۔ اف، ایک تو یہ اریزہ...... انہیں لگا دروازہ ان کے منہ پر مارا گیا ہے۔ دماغ تو پہلے ہی جلتی بھٹی بنا ہوا تھا۔ اب تو لپک کر کوئلے کی طرح دھواں چھوڑ گیا۔ وہ پلٹ کر گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

سکین...... یہ نام اوائل عمری میں ان کے دل پر لکھا گیا تھا۔ ان کی پہلی محبت۔ جسے وہ آخری بھی قرار دیے بیٹھے تھے۔ جس سے بچھڑ کر انہیں لگتا تھا۔ زندگی بے رنگ ہو گئی ہے۔ سب لطافتیں بے مزا ہو چکی ہیں۔ وہ بس عمر تمام کر رہے تھے۔ وہ دکھی تھے

پھر سبین ملی۔ جو دکھی ترین تھی۔ دنیا کی مظلوم عورت جس پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے تھے اور جب دل کے مکین غم زدہ ہوں تو وجود کیسے سکون پا سکتا ہے۔ پھر تو بس وہ اک پھوڑے کی طرح درد کرتا ہے، ٹیس دیتا ہے۔ بے حد، بے پناہ۔ وہ اس کے ہر آزار پر اپنی محبت کا مرہم رکھنا چاہتے تھے۔ اسے دکھوں کے چنگل سے نکالنے کا عزم صمیم کر چکے تھے۔ اور اس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔ وہ اس کا دکھ بانٹنے کو اب اکثر ماموں کے ہاں چلے جاتے تھے۔ اس روز بھی گئے تھے کہ ماموں نے انہیں ایک نہایت ڈیسنٹ سے صاحب سے متعارف کروایا۔

"ان سے ملو بیٹا یہ عدیل عاصم ہیں اور عدیل بیٹا! یہ مناقب ہیں میرے بہت پیارے بھانجے۔ تذکرہ کیا تھا نا میں نے آپ سے۔"

"جی...... جی انکل! بتایا تھا آپ نے، کیسے ہیں آپ مسٹر مناقب۔" وہ خوش دلی سے کہتا مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے ہوئے تھا اور ان کا دل چاہ رہا تھا اس کی گردن دبوچ لیں۔ یہ وہی شقی القلب دیو تھا جس نے اپنے محل میں ایک معصوم اور مظلوم شہزادی کو قید کر رکھا تھا۔ شکل و حلیے سے معقول دکھتا وہ آدمی نامعقولیت کی حدوں سے کہیں آگے تھا۔ وہ بڑے نپے تلے انداز سے ملے۔ سبین آئی تھی اور ان سے باتیں مٹھارنے لگی۔ اگر اس نے شوہر کو گھاس نہیں ڈالی تھی تو اس نے بھی اسے لفٹ نہیں کروائی تھی۔ دونوں آمنے سامنے اجنبیوں کی طرح بیٹھے تھے، وہ ماموں سے باتیں کر رہا تھا پھر انہیں اپنا ڈھیر سارا خیال رکھنے کی تاکید کرتا رخصت ہوا۔ وہ اس کے نقش پا گھور رہے تھے۔ ماموں انہیں دیکھ رہے تھے۔

"بہت دن ہوئے کمرے میں بند رہتے رہتے دل گھبرا گیا ہے میرا۔ مناقب بیٹا اگر تمہارے پاس وقت ہے تو مجھے کچھ دیر کے لیے باہر لے چلو۔"

"جی ضرور کیوں نہیں۔" وہ تابعداری کی عمدہ مثال قائم کرتے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ ماموں کو سہارا دینے کو ہاتھ بڑھایا۔

"ارے نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے بیٹا۔ میں اب بہت بہتر ہوں۔ خود چل سکتا ہوں۔ ویسے بھی انسانی فطرت ہے۔ جب اسے سہارا دکھ رہا ہوتا ہے۔ تو وہ اپنی طاقت پر بھروسا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ بلا ضرورت کے آسرے اسے کمزور کر دیتے ہیں۔ مجھے تمہاری محبت پر کوئی شک نہیں۔ لیکن ایسی محبت میرے کس کام کی جو مجھے اپنے ہی ہاتھ پاؤں کو آزمانے سے روک دے۔" وہ مسکرائے تھے۔ اور وہ ان کا مطمع نظر سمجھے تھے یا نہیں۔ بس سر ہلا دیا۔ وہ ماموں کو قریبی پارک میں لے آئے تھے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ ان سے پوچھ رہے تھے۔

"عدیل سے مل کر کیسا لگا تمہیں؟" اور جو انہوں نے محسوس کیا تھا۔ اب وہ ان سے تو شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ شانے اچکا دیے۔

"عدیل بلاشبہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ سبین کے لیے میں نے اس کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ تمہیں پتا ہے سبین کو شروع سے ہی میں نے کتنے لاڈوں سے رکھا تھا۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ شروع سے ہی ضدی اور خود پسند رہی ہے۔ پھر جب آپا کی خواہش پر ہم نے اک نئے رشتے کا اعلان کیا۔ مگر اک ذرا سی بات کے پیچھے جو کچھ ہوا۔ پھر میرے دل سے وہ گلٹ نہیں جاتا تھا۔ مجھے لگتا تھا وہ سب میری غلطی تھی۔ یا تو مجھے اس وقت کہ جب سبین کی اتنی عمر بھی نہیں تھی۔ اس کے لیے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یا پھر وہ سب نا ہوا ہوتا۔ اور میں باپ ہوں۔ سو اپنے گلٹ کو مٹانے کے لیے اسے مزید توجہ دینے لگا۔ اس نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد جاب کا ارادہ کیا۔ میں نے بخوشی اجازت دی۔ اس کے لیے خاندان سے بہت سے رشتے آئے۔ اس نے کہا میں خاندان میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ ان میں سے کوئی میرے معیار کا نہیں۔ میں نے یہ بھی مان لیا۔ عدیل کا رشتہ آیا تو مجھے ہر لحاظ سے مناسب لگا۔ مجھے لگا کہ جو دکھ میں اپنی جلد بازی سے

بیٹی کو دے چکا ہوں۔ اب اس کا ازالہ ہو جائے گا۔ اور الحمدللہ عدیل میرے اندازوں سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ اس نے سبین کو کوئی کمی نہیں آنے دی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ لیکن۔۔۔" ماموں اک لمحے کو چپ ہوئے۔ اور وہ متحیر سے تھے۔ یہ کس نگر کی کہانی سن رہے تھے وہ۔ مومانی اور سبین تو۔۔۔ اور ماموں نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"بہن سے بگاڑ کر، پھر سارے خاندان کو نا کر کے بیٹی کا رشتہ باہر کے لوگوں میں کیا تھا۔ اب اپنا بھرم رکھنے کو کیا کریں ہم۔ کیا سب کو یہ بتائیں کہ اپنا ہی سکہ کھوٹا ہے۔ تمہاری مومانی بیٹی کا پردہ رکھنے کو اس کے سسرال والوں میں کیڑے نکال دیتی ہیں۔ جبکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ اصل قصوروار ہماری اپنی اولاد ہے۔ ضرورت سے زیادہ توجہ دیتے میں بھول گیا۔ کہ اس طرح تو میں اس کی فطرت کو اور زیادہ مضبوط کر رہا ہوں۔ اسے اب خود سے بڑھ کر اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ عدیل چاہتا ہے۔ بہت عرصہ سبین نے اپنا شوق پورا کیا ہے۔ اب وہ گھر سنبھالے۔ اور اس کی ضد ہے کہ ابھی چند سال مزید نا وہ جاب چھوڑے گی۔ اور نا ہی بچے کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے گی۔ اور جانتے ہو اس نے اسی ضد میں کیا کیا؟" وہ اک دم چپ ہوئے۔ لب دانتوں میں داب لیا۔ مناقب نے دیکھا ان کی آنکھوں کی سطح تیزی سے گیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے بے اختیار ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلایا۔

"اس بے وقوف لڑکی نے اسی لڑائی اور ضد میں بہت سالوں کے بعد ملنے والی خوشی کو اپنے ہی ہاتھوں مار ڈالا۔ بامشکل اس کی جان بچائی گئی۔ اب اس سب کے بعد عدیل اس پر غصہ بھی نا ہوتا۔ جب اس نے بازپرس کی تو مزید بدتمیزی کا مظاہرہ کرتی گھر چھوڑ آئی۔ اف۔۔۔ مجھے میری ہی نظر میں کتنا شرمسار کیا ہے اس نے۔۔۔ میں تو کسی سے اپنا دکھ رو بھی نہیں سکتا۔ اب تم خود فیصلہ کرو بیٹا۔ کیا یہ سب ٹھیک ہے؟ اور اس پر ہی بس نہیں۔ اب اس نے عدیل کو ٹارچر کرنے کا ایک اور طریقہ نکالا ہے۔ اس کے سامنے خاص طور پر تم سے ملنا جلنا۔ جبکہ وہ جانتا ہے۔ ماضی میں کیا رشتہ رہ چکا ہے تم دونوں کے درمیان۔" اور وہ جو سبین کے منہ سے اس کی خود ساختہ بے بسی کی کہانیاں سن سن کے عدیل کی گردن تک دبوچنے کو تھے۔ اس وقت صحیح معنوں میں سمجھ گئے کہ گھڑوں پانی پڑنا کیسا ہوتا ہے۔ وہ بدتمیز لڑکی اپنی جنگ میں انہیں استعمال کر رہی تھی۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ اس فقرے کا کچھ زیادہ ہی غلط مطلب لے لیا تھا اس نے۔ اور وہ اتنے سیانے اور سمجھ دار آدمی کیسے اس کے ہاتھوں اب تک کھلونا بنے رہے تھے۔ اس کے عشق میں گوڈوں تک ڈوبے پورا ہی ڈوبنے کی تیاریوں میں تھے۔ اوہ۔۔۔ خدا کیسے کیسے لوگ بھرے ہیں تیری اس دنیا میں۔ وہ تو پچھلی محبت کو ابھی تک سینے سے لگائے اس کے لیے رانجھا ثانی بنے دنیا تک تیاگنے کو تیار تھے۔ اور وہ تھی کہ ان ہی کی دنیا اجاڑنے کے درپے تھی۔ اپنی اس بے وقوفی کی وجہ سے نا جانے وہ اور کیا کیا زک اٹھاتے۔ وہ تو بھلا ہو ماموں کا جنہوں نے بیٹی کی محبت پر بھانجے کو فوقیت دیتے انہیں مزید آزاری سے بچا لیا تھا۔ ان کا سر نہیں اٹھ رہا تھا۔ اور وہ مجبور سے تھے۔ بازو ان کے گرد پھیلایا۔

"بے شک میرے رب کے ہر حکم میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ وہ جو کرتا ہے وہی بہتر ہوتا ہے۔ اب اگر یہی حالات آپا کے گھر میں پیش آتے تو میں تو تمام عمر ان کے سامنے سر اٹھانے جوگا نا رہتا۔ کتنی سبکی ہوتی سارے خاندان میں۔ اب کم از کم ہم پر بیتی داستان زبان زد عام تو نہیں۔ بس اللہ میری نا سمجھ بیٹی کو تھوڑی سی عقل دے دے تو کتنے سکھی ہو جائیں ہم۔ بیٹا میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ اگر تم کسی طرح سے سبین کو سمجھا سکو۔ وہ کیوں اپنے اچھے بھلے جیتے بستے گھر کے پیچھے پڑی ہے۔ عورت کا کیریئر اس کا گھر، شوہر اور اس کی اولاد ہی ہوتی ہے۔ پڑھ لکھ کر جاب کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ

PakiBooks.Site

خود کو فطری خوشیوں سے محروم رکھا جائے۔ اب تمہاری بیوی بھی تو پڑھی لکھی ہے نا۔ وہ بھی تو تمہارا گھر سنبھالے ہوئے ہے۔ بلکہ تمہاری ساری فیملی کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اور سب کو جس طرح عزت اور تکریم دیتی ہے۔ اپنے بچوں کو پال رہی ہے۔ یہی تو ایک عورت کا اصل روپ ہوتا ہے۔ یہی اس کا حسن ہے۔ یقین مانو مجھے عائزہ بیٹی کو دیکھ کر اس سے مل کر بہت اچھا لگا۔ اللہ تم دونوں کا ساتھ سلامت رکھے۔ خوش نصیب ہو۔ دنیا میں ہی جنت مل گئی ہے تمہیں۔ ایک اچھی عورت، مرد کی نسلیں سنوار دیتی ہے۔ لیکن یہ مت سمجھنا کہ اولاد کی تربیت میں صرف وہی ذمہ دار ہوتی ہے۔ باپ کا بھی اتنا ہی فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اچھا ماحول دے۔ انہیں صحیح خطوط پر لے کے چلے۔ باپ گھر کا ستون ہوتا ہے۔ اگر اس کے مزاج میں ہی ٹیڑھا پن ہوگا۔ تو باقی کی عمارت بھی نقص سے بھری ہوگی۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے معاشرے کے ننانوے فیصد مرد اس مرض کا شکار ہیں۔ اکثر وہ حاکم ہونے کے زعم میں اپنے خوب صورت چمن کی ترتیب ہی بگاڑ لیتے ہیں۔'' اور ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے وہ۔ یہ مرض تو انہیں بھی لاحق تھا۔ اسی حاکمانہ فطرت نے تو انہیں بھی جکڑ رکھا تھا۔ مگر شکر ہے وقت پر تشخیص ہو گئی تھی۔ ابھی دوا ہو سکتی ہے۔ ان کے اندر کے جالے اترے تھے تو بہت کچھ اجلا نظر آ رہا تھا۔ وہ بہت سرشار سے گھر آئے تھے مگر......

☆☆☆

وہ سارا دن بے مقصد گاڑی دوڑاتے پھرے تھے۔ صبح کا منظر آنکھوں کے آگے سے ہٹتا ہی نا تھا۔ بات ایسا رخ اختیار کر سکتی ہے۔ انہیں تو اندازہ ہی نا تھا۔ وہ تو ماموں کی تاکید مطابق سبین کو سمجھانے کے لیے تگ و دو کر رہے تھے۔ کئی بار اس سے ملنا پڑا۔ اور صد شکر کہ وہ سمجھ بھی گئی تھی۔ اور واپس اپنے آشیانے کو سدھاری تھی۔ عدیل کی کال تھی رات، وہ ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ اس سے ہی گپ شپ لگاتے کتنا وقت بیتا پتا ہی نا چلا۔ وہ کمرے میں آ کر سیدھا اپنے بستر پر گئے تھے۔ عائزہ اکثر بچوں کے ساتھ سو جاتی تھی۔ انہوں نے یہ ہی سمجھا کہ وہ ادھر ہو گی باقی تھے کی تو انہیں خبر ہی نہیں تھی۔ وہ تو صبح سویرے جو کچھ ہوا۔ مانو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس پر اریزہ کا ردعمل...... گھر سے نکلے تھے تو مارے غصے کے سیل پاورڈ آف پر کر دیا تھا۔ سارا دن جلتے کلستے گزرا۔ اب دھیان بھٹک بھٹک کر عائزہ کی طرف جا رہا تھا۔ جانے وہ کس حال میں تھی۔ یہی سوچ ہولائے دے رہی تھی۔ برداشت ختم ہوئی۔ آخر کار واپسی کی راہ لی کہ یہ ہی بہتر تھا۔

ابا نے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ اماں نے سر ہلا کر سلام کا جواب دیا۔ حسب معمول موحد بھاگتا ہوا آ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور آج پہلی بار محسوس ہوا کہ اریزہ ان کی آمد پر کبھی یوں بھاگی نہیں آئی تھی۔ اور کیوں؟ اب اس کی وجہ تو انہیں خود ہی تلاشنا تھی۔ وہ تو انہیں کمرے میں آتے دیکھ کر بھی آگے نہیں بڑھتی تھی۔ انہوں نے ہی بڑے پیار سے پوچھا۔

''کیسا ہے میرا جانو بچہ؟'' اور جانو بچے کی آنکھیں ماتھے پر جا لگی تھیں۔ اس بھرپور ناراضی کے اظہار پر وہ زیر لب مسکرا دیے۔ پیار سے اس کے سنورے بال بگاڑے۔ غبارہ پکڑا اور کپا ہوا۔ وہ اپنی نصف بہتر کو دیکھ رہے تھے۔ ستا چہرہ، اندر کو دھنسی آنکھیں، بکھرے بال، بے ترتیب حلیہ، ایک ہی رات نے جیسے اس کا لہو نچوڑ لیا تھا۔ وہ عرق ندامت میں ڈوب گئے۔ عائزہ گھبرا کر اٹھی۔ وہ ان کے آتے ہی انہیں پانی پیش کرتی تھی اور اگر ذرا جو دیر ہو جاتی تو...... اور اس تو کے آگے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ قدم بڑھانے کو تھی۔ کہ انہوں نے ہاتھ تھام لیا۔

''وہ...... میں...... پانی......'' اس سے پوری وضاحت بھی نا دی گئی۔ انہوں نے نرمی سے کھینچ کر پاس بٹھا لیا۔

''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟''

''مما سارا دن بہت روتی رہی ہیں۔ اتنی طبیعت خراب ہے ان کی لیکن آپ کو کیا۔ آپ تو انہیں بیمار چھوڑ کر چلے گئے تھے، آپ کو ان کی فکر تھوڑا ہے۔ آپ کی طرف سے تو یہ مر جائیں۔'' وہ تو ابھی کچھ بولی بھی نہیں تھی کہ اریزہ پھٹ پڑی۔ عائزہ نے بوکھلا کر روکنا چاہا۔

''اریزہ...... بری بات، ایسے بولتے......''

''اوں ہو، مت ٹوکو بولنے دو اسے۔'' مناقب نے ہاتھ دبا کر وہیں چپ کروا دیا۔ اریزہ ایک ہی سانس میں بولے جا رہی تھی۔

''آپ کی طرف سے تو یہ مر جائیں، آپ تو چاہتے ہی یہ ہی ہیں۔ اس روز چاچو کہہ رہے تھے آپ ہمارے لیے نئی امی لے کر آئیں گے۔ آج چاچی بھی کہہ رہی تھیں آپ سبین آنٹی سے شادی کریں گے تو جب آپ دوسری بیوی لے آئیں گے تو ہماری مما تو ٹوٹ جائیں گی نا۔ یہ مر جائیں گی۔ ہر بار ایسا ہی تو ہوتا ہے نئی چیز آتی ہے تو پرانی ٹوٹ جاتی ہے۔ آپ نہیں ہیں ہمارے بابا! آپ اچھے بابا نہیں ہیں، آپ گندے بابا ہیں......'' وہ بولتے بولتے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ ان کے دل میں جیسے کوئی تیر پیوست ہوا تھا۔ اف خدا...... ان کی ننھی سی پری ان سے اس قدر بدگمان تھی۔ وہ یوں ہی روتے ہوئے باہر بھاگ گئی۔ عائزہ پریشان سی کہہ رہی تھی۔

''ایک تو اس لڑکی کی باتیں۔ پتا نہیں اس کے دماغ میں کس نے ڈال دیا ہے ایسا وہم۔ اس قدر وہمی ہو گئی ہے۔ اتنی بار سمجھایا ہے۔ کہ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔''

''ہوتا ہے ایسا ہی ہوتا ہے۔ بچے تو اسفنج کی طرح ہوتے ہیں۔ اپنے بڑوں کے رویے ہی جذب کرتے ہیں۔ یہ تو ہمارا آئینہ ہیں۔ ہمارا روپ ہی تو ان میں سے جھلکتا ہے۔ یہ اس کا وہم نہیں ہے۔ یہ اس کے اندر کا خوف ہے اور میں جانتا ہوں اسے یہ خوف کیسے لاحق ہوا ہے۔ یہ سب میرے رویوں کا شاخسانہ ہے۔ سب میری کوتاہی ہے۔'' وہ بڑا بے تھے۔

''آپ کی کوتاہی......'' عائزہ نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔

''ہاں میری کوتاہی بلکہ کوتاہی نہیں کوتاہیاں۔ ہم مرد جب بیٹے ہوتے ہیں نا عائزہ۔ تو ہمارے مزاج میں لاپروائی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اور کیوں ہو رہا ہے ہمیں اس کی اتنی فکر نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہماری زندگیوں کا بہت سا وقت تو گھر سے باہر گزرتا ہے۔ اور جب ہم شوہر بن جاتے ہیں ہم پہلے سے اس زعم میں ہوتے ہیں کہ آنے والی ہماری ملکیت ہے اور اسی احساس کے باعث ہمارے اندر کا بے ضمیر حاکم انگڑائی لے کر بے دار ہو جاتا ہے۔ تب بیوی کو بے دام کی غلام تصور کرتے ہوئے ہم اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے ہیں۔ اس وقت بھول جاتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے بچے بھی دیکھ رہے ہیں اور بیٹے تو وہی سب سیکھ لیتے ہیں مگر بیٹیاں...... ان کے لاشعور میں پھر اک ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ فطرتاً وہ ماں سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ گھر میں ہونے والی ہر چپقلش ان پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ ماں کے ساتھ برتا جانے والا سلوک بیٹی بہت قریب سے دیکھ رہی ہوتی ہے اور وہ سب اس کے شعور پر نقش ہوتا جاتا ہے۔ جو پھر اسے کبھی تم جیسی دبو عورت بنا دیتا ہے اور کبھی وہ اسے اریزہ جیسی چڑچڑی اور خوف زدہ بچی کے روپ میں ڈھال دیتا ہے۔ میری بیٹی بے حد حساس ہے۔ وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ اور تم سے محبت تو مجھے بھی بہت ہے مگر آج سے پہلے مجھے اس کا ایسا ادراک ہی نا تھا۔ آئی لو یو سو مچ مائے ڈیئر وائف۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ لبوں سے چھو لیا اور اس اچانک التفات پر وہ بک دک تھی۔ یہ اتنا سنجیدہ بولتے بولتے وہ یک دم کس لے میں بہہ گئے تھے۔ انہوں نے اس کے رخ پر آوارگی کرتی لٹوں کو سمیٹ کر کان کے پیچھے اڑسا۔

''زندگی بہت سے امتحان لیتی ہے اور کئی ان مٹ سبق دیتی ہے۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ دور سے گلاب نظر آنے والی حقیقتیں اکثر قریب آنے پر سراب ثابت ہوتی ہیں۔ میں اس قابل نہیں کہ تم سے

اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگ سکوں کیونکہ معافی کا لفظ تو بہت چھوٹا ہے۔ جو وقت گزر گیا۔ اس کی تلافی ممکن ہے نا واپسی۔ میں نے بہت دل دکھایا ہے تمہارا۔ بے حد ہرٹ کرتا رہا ہوں تمہیں اور تم کیا ہو یار۔ یہ تمہاری اعلا ظرفی ہے کہ تم ہر رویے کو چپ چاپ سہتی رہیں۔ میری بے اعتنائیوں پر بھی لب سیے رکھے۔ کچھ تو احتجاج کرتیں شاید کہ مجھے احساس ہوتا۔ میں نے تو سمجھا کہ بس بیوی مل گئی ہے اور یہ اسی سلوک کی حق دار ہے۔ اپنے تئیں میں تمہیں تمہاری اوقات سے زیادہ نواز رہا تھا۔ اف، استغفراللہ...... جبکہ ہم کون ہوتے ہیں کسی کو دینے والے۔ یہ تو وہی ہے جو سب کے لیے ان کے حصے مقرر کرتا ہے۔ تم اس لائق تھیں تب ہی تو تمہارے توسط سے مجھے بھی اتنے سکھ ملے۔ اور ایک وہ سین ہے (عائزہ نے جھٹ ان کے شانے سے سر اٹھایا) وہ بھی عورت ہے۔ لیکن اف۔ تو۔ اس سے جب بھی ملا۔ اسے اپنے انتہائی شریف النفس شوہر کی بدخوئیوں سے ہی فرصت نا تھی۔ اپنی خود ساختہ مظلومیت کے قصے سنا سنا کر اس نے میرے کان اس حد تک پکا دیے کہ میں اس کے ہر بیان کو سچ مان بیٹھا اور ایک تم ہو جس کا شوہر ہے ہی اس لائق مگر حد ہے تم نے کبھی کسی کے بھی سامنے اس کی برائی نہیں کی اور کیوں؟" وہ یہ کیا پوچھ رہے تھے۔ اور کس کے ذکر کے ساتھ۔ اس کی آنکھ سے پانی چھلکا تھا۔ جسے انہوں نے گرنے سے پہلے ہی اپنی پور پر سمیٹ لیا۔

"ہشت...... رونا نہیں، میں مانتا ہوں جہاں اور بہت سی خطاؤں کا مرتکب ہوا۔ وہیں سین سے ملنا بھی غلطی میں ہی شمار ہوگا۔ اور پھر بار بار ملنا، کیا کروں میری جان بندہ بشر ہوں نا اور پھر ہم انسان خود کو اتنی اسپیس بہت سی توجیہات کے بعد دھڑلے سے دے ہی لیتے ہیں۔ لیکن یہ غلطیاں ہی ہوتی ہیں جو ہمیں اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہیں۔ ایک بار گر کر سنبھلنے والا ہی پھر اگلا قدم سنبھل کر اٹھاتا ہے۔ میرا بھی سین سے ملنا ہمارے لیے نیک شگون ثابت ہوا۔ میرے اندر کے سارے جالے اتر گئے۔" وہ بڑے شانت سے مسکرا رہے تھے اور اس کا دم گھٹنے کو تھا۔ گردن پر کسی نے کند چھری رکھ دی تھی۔ وہ اس کی کیفیت خوب سمجھ رہے تھے۔ پھر سے سر شانے پر ٹکایا۔

"میں تمہارا تھا۔ تمہارا ہوں، اور بے فکر رہو زندگی کی آخری سانس تک اب تمہارا ہی رہوں گا۔ اب چاہے ہزار سین بھی آ جائیں۔ مگر میرے لیے میری عائزہ کافی ہے۔ وہ خاص نعمت، وہ پاکیزہ عورت جسے اللہ نے میرے لیے دنیا میں اتارا۔ اور جس کا دل بھی اسی کے جیسا خوب صورت ہے۔ جس پر مجھے اتنا مان ہے کہ وہ اپنی وفا کے صدقے میں میری ہر جفا کو معاف کر سکتی ہے۔ کیوں کر سکتی ہے نا......؟" وہ اس کا چہرہ اونچا کیے کھلی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔ اور وہ۔ جس نے ہمیشہ صبر اور حوصلے کا دامن تھامے رکھا تھا۔ کبھی کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ تو آج شوہر کے ہونٹوں سے ایسا دلنشیں اعتراف سن کر کیسے کوئی شکوہ کر سکتی تھی۔ اس کا دل تو احساس تشکر سے لبالب بھرا پیالہ بن گیا تھا۔ روتی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اس نے سر ہلا دیا۔ مناقب نے طمانیت میں گھرتے اپنی قیمتی متاع کو پوری شدتوں سے سینے میں چھپا لیا۔

☆☆☆

وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ وہ بھی پاس بیٹھ گئے۔

"جب آپ کی موحد سے لڑائی ہوتی ہے تو آپ کی مما کیا کہہ کر صلح کرواتی ہیں۔ ہاں یاد آیا، وہ کہتی ہیں، لڑائی لڑائی معاف کرو۔ اللہ کا گھر صاف کرو اور جانتی ہو۔ اللہ کا گھر کہاں ہوتا ہے؟ اللہ کا گھر ہوتا ہے ہمارا دل۔ اس میں غصہ، کینہ، بدگمانی نہیں رکھتے بلکہ اسے ان سب آلائشوں سے پاک کر کے محبت اور خلوص سے سجا کر رکھتے ہیں تب ہی زندگی خوب صورت ہوتی ہے۔ تو چلو جلدی سے غصہ تھوکو اور بابا سے ہمیشہ والی پکی کر لو۔ میرا اپنی گڑیا سے وعدہ ہے، اب کبھی بابا اور بیٹی کی لڑائی نہیں ہوگی۔" اس نے سر اٹھایا۔ نرم رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ سنہری بال چہرے کے گرد بکھرے تھے۔ انہوں نے بے اختیار اسے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

"یاد رکھو۔ کبھی کسی سنی سنائی پر اس وقت تک یقین نہیں کرتے جب تک خود اس کی تصدیق نا کر لو۔ آپ کے بابا آپ سے موحد سے اور آپ کی مما سے بہت پیار کرتے ہیں اور......"

"تو پھر آپ مما کو ڈانٹتے کیوں ہیں۔ ان سے ہمیشہ لڑتے کیوں ہیں۔ آپ کو کیا پتا پھر وہ چھپ کر روتی رہتی ہیں۔" اس نے بے تابی سے ان کی بات قطع کی تھی۔

"ارے وہ سب تو کبھی کبھی مجھے غصہ آ جاتا ہے اور پھر میری جان لڑائی بھی تو ان ہی سے ہوتی ہے جن سے آپ پیار کرتے ہیں۔ آپ بھی تو بھائی سے لڑتی ہو نا پھر اس کا خیال بھی رکھتی ہو۔ یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔"

"لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ آئندہ مما سے نہیں لڑیں گے نا ان پر غصہ ہوں گے۔" وہ اپنی بات پر اڑی تھی۔ انہیں سر تسلیم خم کرتے ہی بنی۔

"اوکے، ڈن ہو گیا، نا میں آئندہ لڑوں گا اور نا کبھی غصہ کروں گا۔ اب تو ناراضی ختم ہو سکتی ہے نا؟" بڑا امید بھرا لہجہ تھا۔ اس نے انہیں دیکھا۔ اور مسکرا دی۔

"آپ میرے سو بابا ہیں۔ میں آپ سے خفا تو نہیں۔ بس وہ کیا ہے کہ کبھی کبھی مجھے غصہ آ جاتا ہے۔ اور پھر جہاں پیار ہوتا ہے وہاں تو یہ سب چلتا رہتا ہے نا۔" اس کی چمکتی آنکھوں میں شرارت تھی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر پیار بھری چپت لگائی۔

"اچھا سنو، کل آپ کی مما کی برتھ ڈے ہے۔ اور ہم اسے اچھا سا سلیبریٹ کریں گے۔ اس کی تیاری ہم ابھی سے شروع کر رہے ہیں۔ لیکن خیال رہے یہ سیکرٹ صرف بابا اور بیٹی کے درمیان ہے۔ آپ کی مما کو اس کی خبر نا ہو ورنہ سارا سرپرائز خراب ہو جائے گا۔"

"اوہ، اوہ مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ ہاں ٹھیک ہے اچھا سا سلیبریٹ کرتے ہیں۔ اور میں مما کو بالکل بھی نہیں بتاؤں گی۔" وہ ایک دم پرجوش ہوئی تھی۔ پھر کچھ یاد آنے پر دھیمے سے بولی۔

"ویسے بابا کیا سالگرہ منانا ٹھیک ہوتا ہے۔ ہماری ٹیچر کہہ رہی تھیں کہ انسان کی زندگی کا ایک سال کم ہو جاتا ہے۔ اس بات پر کیسی خوشی؟" وہ اریزہ تھی اس کی پٹاری سے کسی لمحے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ اب اس بات کے لیے انہیں خود کو تیار رکھنا پڑے گا۔ انہوں نے کان کھجایا۔

"ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ آپ کی ٹیچر نے غلط نہیں کہا۔ لیکن بیٹا ہم کون سا بہت بڑی پارٹی ارینج کر رہے ہیں۔ ایک کیک، اچھا سا گفٹ، مزے دار سا کھانا کھانے سے آپ کی مما خوش ہو جائیں گی اور کسی کو خوشی دینا تو بہت بڑی نیکی ہے نا۔ اس میں تو کچھ غلط نہیں۔"

"تو پھر چلیں گفٹ لینے۔" وہ اچھل کر کھڑی ہوئی تھی۔

"ہاں چلو۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے اٹھ گئے۔

"جسٹ آ منٹ۔ میں مما کو بتا کر آتی ہوں کہ ہم آئسکریم کھانے جا رہے ہیں۔ پھر واپسی پر ان کے لیے بھی آئسکریم لیتے آئیں گے۔ اس طرح انہیں شک بھی نہیں ہوگا۔"

"ہوں جینئس گرل۔" انہوں نے سراہا۔ وہ تیزی سے اندر کو بڑھی تھی۔ پھر کچھ یاد آنے پر رکی۔

"ویسے بابا کیا ایسا کہنا جھوٹ نہیں ہوگا؟" اب وہ ایک بار پھر کان کھجا رہے تھے۔ اور یقین واثق ہے کہ اب یہ حرکت وہ دن میں کئی بار دہرایا کریں گے۔

"آں...... وہ کیا ہے کہ ہم شاپنگ پر آنے کے بعد ڈسکس کریں گے۔ ابھی آپ مما کو بتا آؤ بس...... ٹھیک ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔" وہ با آسانی مان گئی تھی۔ وہ اسے جاتا دیکھتے رہے۔ پھر مسکرا کر کار پورچ کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

وہ رات

عائشہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بہت زور سے دروازہ بند کیا۔ آج ورکشاپ کے مالک کو بھی اس نے اچھی خاصی سنادی تھی۔ آئے روز گاڑی میں کوئی نہ کوئی مسئلہ رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے گاڑی ورکشاپ چھوڑنی پڑتی تھی اور پھر اسے پبلک ٹرانسپورٹ کے دھکے کھانے پڑتے تھے۔ پچھلے کچھ عرصے سے اسے لگنے لگا تھا کہ ورکشاپ کا مالک جان بوجھ کر گاڑی میں کوئی نہ کوئی نقص چھوڑ دیتا ہے کہ وہ تو عورت ذات ہے 'اسے ان باریکیوں کا کیا پتا ہے۔ بار بار گاڑی ٹھیک کروانے آتی رہے گی اور اس کے پیسے بنتے رہیں گے۔ عائشہ نے اپنے نادر خیالات کا اظہار اس کے سامنے بھی کر دیا تھا اور اسے دھمکی دی تھی کہ وہ اس پر دھوکا دہی کا کیس کرے گی کورٹ میں۔

ورکشاپ کا مالک پچھلے چھ سالوں سے انہیں جانتا تھا۔ فیصل ملک سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس لیے وہ عائشہ کی ڈانٹ سر جھکا کر سنتا رہا۔ جب بول بول کر وہ تھک گئی تو اس نے چھوٹو کو آواز دے کر جلدی سے ٹھنڈی بوتل لانے کو کہا۔

"بھابھی! آپ فکر مت کریں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ دوبارہ کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو مگر وہ کیا ہے کہ یہ مشینری ہے تو کچھ کہا نہیں جاسکتا۔" استاد سلیم نے ڈرتے ہوئے کہا کہ کہیں پھر وہ بولنا نہ شروع کر دے۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بچوں کو اسکول سے لینا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔" عائشہ نے اپنے لہجے میں نرمی لانے کی ناکام کوشش کی اور کوئی بھی بات سنے بغیر، تیز تیز قدم اٹھاتی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اتنی غائب دماغ تھی کہ اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ اس نے گاڑی کا دروازہ کتنی زور سے بند کیا ہے۔

"لگتا ہے فیصل بھائی سے لڑائی ہوئی ہے بھابھی کی ....!" استاد سلیم نے اس کے جانے کے بعد سکھ کا سانس لیتے ہوئے چھوٹے کے ہاتھ سے بوتل پکڑ کر گھونٹ بھرا اور خود کلامی کرتا ہوا کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بچوں کو اسکول سے پک کر کے وہ گھر آنے تک کسی نہ کسی بات پر جھنجلاتی رہی ـــــ بلاوجہ بچوں کو ڈانٹتی اور انہیں ٹوکتی رہی کہ تنگ آکر آٹھ سالہ ولید بول پڑا۔

"مما! آپ اتنا غصہ کیوں کرتی ہیں؟ پہلے تو آپ ایسی نہیں تھیں۔" ولید 'عائشہ کی طرح ہی بہت منہ پھٹ اور جذباتی تھا۔ اس لیے ہر بات کا اظہار فوراً" کر دیتا تھا۔

"مما کو نانو امی یاد آرہی ہیں۔ اس لیے وہ پریشان ہیں۔" چھ سالہ دانیہ نے سمجھ داری سے جواب دیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" ولید نے بہن سے پوچھا تھا۔

"میں نے سنا تھا۔ مما کل رو رہی تھیں اور بابا سے کہہ رہی تھیں کہ مجھے نانو کے گھر جانا ہے۔ ہر حال میں۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" دانیہ نے کل رات جو بھی سنا تھا۔ فوراً" اسے بتا دیا۔ جبکہ عائشہ گم صم سی اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

"اف میرے خدایا! کیا اب ہمارے بچے بھی 'ہماری لڑائیوں سے متاثر ہوں گے۔" اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ دانیہ نے ان دونوں کی بحث کا صرف آخر حصہ ہی سنا تھا۔ اگر وہ ساری بات جان لیتے تو ان کے ننھے سے ذہن متاثر ہوتے۔ عائشہ نے 'او مائی گاڈ' کہتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ ولید اور دانیہ فوراً" ماں کی طرف لپکے۔

"مما کیا آپ کے سر میں درد ہے؟ میں دبا دوں۔" ولید نے کہتے ہوئے ماں کے سر پر ہاتھ رکھا تو عائشہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"نہیں میرے بچوں! میں ٹھیک ہوں۔ چلو جلدی سے یونیفارم تبدیل کر کے آؤ۔ میں کھانا گرم کرلوں۔" عائشہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے، بچوں کو ان کے کمرے میں بھیجا اور خود اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کھانا گرم کرتے ہوئے بھی وہ خود کو سرزنش کرتی رہی تھی۔ اس کا جذباتی پن 'بچوں کے ذہنوں کو متاثر کر سکتا تھا۔

"میں اگلی بار احتیاط کروں گی۔" اس نے خود کو بودا دلاسا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فیصل سے اس کی شادی مکمل ارینج میرج تھی۔ منگنی اور شادی کے درمیان چھ مہینے کا وقفہ تھا۔ اس دوران ان دونوں کی کبھی ایک دوسرے سے فون پر بات نہیں ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو شادی کے بعد جانا اور سمجھا تھا۔ شادی کے بعد ہر گزرتا دن ان کے مقدس رشتے کو محبت کے سنہری دھاگوں سے باندھنے لگا تھا۔ ہنی مون پر فیصل اسے ناردرن ایریاز کی سیر پر لے گیا تھا۔ یہاں آکر عائشہ اکثر سوچ میں پڑ جاتی تھی کہ پاکستان کے یہ پوشیدہ گوشے سچ میں اتنے حسین اور خوب صورت تھے یا اسے فیصل کی سنگت میں یہ سب بہت الگ اور خوب صورت لگتا تھا۔ وہ فیصل کی سنگت میں 'محبت کی لے پر گنگناتی' جھومتی ہر وقت مسکراتی رہتی تھی۔

بہتی ندی کے ٹھنڈے پانی میں پتھروں پر احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے جب وہ اس کا ہاتھ تھام لیتا تھا تو اسے لگتا تھا کہ اس سے زیادہ محفوظ اور مکمل کچھ نہیں ہے۔ مست ہوا کی چھیڑ خانی میں مگن جب وہ شام ڈھلے وہ خود سے بے پروا وادی کے حسن میں کھوئی برفانی ہواؤں کی ٹھنڈک سے کانپتی خود میں سمٹنے لگتی تو وہ مہربان ہاتھ نرمی سے شال اس کے کندھوں پر پھیلا دیتے۔ وہ سوچتی کہ زندگی میں اس سے زیادہ مہربان لمحہ بھی کوئی نہیں ہوگا۔

ایسا وہ ہر اس مہربان لمحے کے لمس پر سوچتی جو احساس اور محبت کے سنہرے دھاگوں سے بندھ کر اس کے وجود کو سنہرے بنانے لگا تھا۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ وہ اتنا خوب صورت ساتھ ملنے پر اپنے رب کی شکر گزار تھی۔

اسے آج بھی یاد ہے کہ اس کی کزنز اور سہیلیوں نے اس کا کتنا مذاق اڑایا تھا۔ اسے ڈرایا تھا۔ اسے آج کے دور کا عجوبہ کہا تھا کہ وہ صرف والدین کی پسند پر شادی کر رہی ہے۔ ایک انجان شخص کو جانے سمجھے

PakiBooks.Site

بغیر اسے اپنی زندگی میں شامل کر رہی ہے۔ ان سب کی باتوں پر اکثر وہ بھی گھبرا جاتی کہ جیون ساتھی سے "انڈر اسٹینڈنگ" کے نام پر اس کے پاس کیا ہے؟ وہ سب کہتے تھے کہ وہ اندھے کنویں میں چھلانگ لگا رہی ہے یا کسی گھپ غار میں قدم رکھ رہی ہے۔ جہاں اس کے ساتھ کچھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔ مگر آج عائشہ کا دل کرتا تھا کہ وہ ان سب لوگوں پر ہنسے' ان کا ایسے ہی مذاق اڑائے' جیسا وہ اس کے ساتھ کرتے تھے۔

اس کا دل کرتا تھا کہ وہ ان سب ماڈرن اور آزاد خیال لڑکے' لڑکیوں کو سمجھائے کہ آزادی اور انڈر اسٹینڈنگ کے نام پر اپنی شرم و حیا کو سرعام عیاں کرنا یا کسی نامحرم کے لیے گروی رکھنا دنیا کی سب سے بڑی بے وقوفی ہوتی ہے۔ احتیاط' لحاظ' شرم و حیا سے رشتوں میں آنے والی پاکیزگی اور انفرادیت کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ذات کو جاننے اور کھوجنے کے سفر پر ایک ساتھ نکلے تھے اور محبت اور اعتماد کے زینوں پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ عائشہ کے لیے یہ رشتہ اندھا کنواں یا گھپ غار کے بجائے "ایک نایاب اور قیمتی خزانے کی طرح ثابت ہوا تھا۔ وہ خوش تھی اور وہ اسے خوش دیکھ کر وہ خوش ہوتا تھا۔ فیصل بہت سمجھ دار اور ذہین مرد تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا۔ جبکہ عائشہ اس کی نسبت بہت شوخ اور جذباتی تھی۔ وہ بیس دن ان کی زندگی کے یادگار دن تھے۔ جہاں صرف وہ تھے اور قدرت کے حسین نظارے قدم قدم پر ان کا ساتھ دینے کے لیے موجود تھے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد کچھ دن لگے روٹین سیٹ کرنے میں۔ عائشہ کا میکا اور سسرال دونوں لاہور میں تھے۔ جبکہ فیصل کی جاب اسلام آباد میں ہونے کی وجہ سے اسے یہاں آنا پڑا تھا۔

فیصل ایک ٹی۔ وی چینل میں آئی۔ ٹی انجینئر تھا۔ اس کی پوسٹ بہت اچھی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ ذمہ داری بھی بہت زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے اس کی ٹائمنگ فکسڈ نہیں تھی۔ شادی کے بعد عائشہ کا زیادہ تر وقت اس کے انتظار میں گزرتا تھا۔ مگر اس انتظار میں بھی ایک احساس' ایک خیال اسے خوشی دیتا تھا کہ فیصل کی محبت ہر قدم پر اس کے ساتھ ساتھ ہے۔

☼ ☼ ☼

"کمال کر دیا آج تم نے بہت مزے کا کھانا بنایا ہے۔" فرائیڈ فش سے پوری طرح انصاف کرنے کے بعد' فیصل نے ہمیشہ کی طرح اس کی تعریف کرتے ہوئے اس کی کوکنگ کو سراہا تھا۔ جبکہ یہ بھی سچ تھا کہ عائشہ ابھی بہت کچھ سیکھ رہی تھی۔ فارغ وقت اپنی امی یا بڑی بھابھی سے فون پر ٹپس لیتی رہتی تھی۔ وہ بہت دل لگا کر فیصل کے لیے کھانا تیار کرتی تھی اور جب فیصل اس کی محنت کو سراہتا تھا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی۔

"یہ لیجیے آپ کی گرین ٹی۔" خوشبودار قہوے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ خوش گوار موڈ میں بولی تھی۔ وہ دونوں اس وقت ٹیرس پر کھڑے تھے اور سامنے سڑک پر اکا دکا گزرتی گاڑیوں پر نظر دوڑاتے ہوئے' بدلتے موسم پر تبصرے کر رہے تھے۔

"آپ نہیں جانتے فیصل! اس طرح انتظار کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ کل رات بھی آپ بارہ بجے کے بعد آئے تھے اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ مزید کچھ دن اور یہ روٹین رہے گی۔ یہ کیا بات ہوئی بھلا۔" فیصل نے اگلے آنے والے دنوں کی مصروفیت کا بتایا تو وہ پریشان ہو کر بولی تھی۔

"تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے...! آج کل کے دور میں کمانا اور اچھا لائف اسٹائل ملنا آسان نہیں ہوتا میری جان! اس کے لیے اپنا آپ قربان کرنا پڑتا ہے اور تم تو جانتی ہو کہ پرائیویٹ جابز میں خون نچوڑا جاتا ہے۔" فیصل نے اسے سمجھایا تھا۔ عائشہ پر سوچ انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ فیصل کی جاب ایسی تھی۔ ورنہ تو اس کی کوشش ہوتی تھی کہ آفس کے بعد کا سارا وقت عائشہ کے ساتھ ہی گزارے۔

دن اسی طرح تیزی سے گزرنے لگے۔ عائشہ کا زیادہ تر وقت گھر کو سجانے سنوارنے' اچھا کھانا بنانے اور پھر فیصل کا انتظار کرنے میں گزر جاتا تھا۔ آس پاس کے گھروں سے اس کی کوئی خاص واقفیت نہیں تھی۔ اس لیے وہ بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی۔ اکثر کھانا میز سجا کر فیصل کا انتظار کرتے کرتے سو جاتی۔ فیصل جس چینل میں کام کر رہا تھا' وہاں ٹیکنیکل کے مسائل اکثر و بیشتر ہوتے رہتے تھے۔ اس فالٹ کو ٹھیک کرنے میں اکثر فیصل کا اضافی وقت لگ جاتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ گھر دیر سے آتا اور عائشہ کو وقت بھی نہیں دے پا رہا تھا۔ ان دنوں ہی انہیں ننھے مہمان کی آمد کی پہلی خوش خبری ملی۔ دونوں کی خوشی کا کوئی عالم نہیں رہا مگر اصل مسئلہ عائشہ کا تھا۔ اسے اکیلا چھوڑنا ممکن نہیں رہا تھا۔ آفس جا کر فیصل اب اسے بار بار فون کرتا اور اس حالت سے باخبر رہتا۔ جب دن قریب آئے تو فیصل اسے لاہور چھوڑ آیا۔ جہاں اس کا خیال رکھنے والے بہت لوگ موجود تھے۔ کچھ دن سسرال میں رہنے کے بعد وہ اپنے میکے چلی گئی۔ جہاں بڑی اور چھوٹی بھابھی کے ساتھ ساتھ' اس کی چھوٹی بہن بھی پوری طرح اس کا خیال رکھتے تھے۔ ماں کے پاس آ کر وہ بہت پرسکون ہو گئی تھی۔ بس اسے فیصل کے اکیلے رہ جانے کی فکر لاحق رہتی۔ اسے آج بھی یاد ہے کہ جب وہ درد سے بے حال ہوتی ہسپتال جا رہی تھی تو تب بھی وہ فیصل کی آمد کی منتظر تھی۔ مگر جب تک اسے اطلاع ملی اور وہ لاہور آیا' ننھا ولید دنیا میں تشریف لا چکا تھا۔ ماں باپ بننے کی خوشی دونوں کے چہروں پر اجالا بکھیر رہی تھی۔ تین دن کے بعد فیصل واپس چلا گیا کیونکہ اس سے زیادہ چھٹی اسے نہیں مل سکتی تھی۔

"کچھ دن اور رک جاتا' بچے کا عقیقہ تو اپنے سامنے کرتا۔" بڑی بھابھی نے حیرت سے کہا تھا۔

"بھابھی! انہیں بہت ضروری کام تھا' اس لیے نہیں رک سکے۔ ویسے بھی وہ ذیشان (دیور) کو سب سمجھا گئے ہیں۔ وہ سارا انتظام کر لے گا۔" عائشہ نے فیصل کی سائیڈ لی تھی۔

"مگر پھر بھی...!" چھوٹی بھابھی نے کچھ کہنا چاہا پر چپ کر گئیں۔ اگلے دن اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔

عائشہ کے سسرال سے سب لوگ بار بار چکر لگا رہے تھے۔ ولید کی آمد پر سب نے پرجوش انداز میں اسے ویلکم کیا تھا۔ مٹھائیاں بانٹی گئی تھیں۔ عائشہ کی ساس اور چھوٹی نند بار بار اسے اپنے پاس رہنے پر زور دے رہے تھے مگر عائشہ نے نرمی سے منع کر دیا تھا کہ وہ اپنے میکے میں رہنا چاہتی ہے۔ کسی نے اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ عائشہ نے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے' طبیعت بحال ہوتے ہی کچھ دن سسرال میں بھی گزار لیے۔ اس طرح وہ بھی خوش ہو گئے اور ننھے ولید کے ساتھ انہیں بھی وقت گزارنے کا وقت مل گیا۔ پھر فیصل کے کہنے پر عائشہ کو ذیشان اسلام آباد چھوڑ آیا تھا۔ فیصل کی وہ ہی مصروفیت اور بہانے تھے جس سے عائشہ اب چڑنے لگی تھی۔ وہ لاہور سے لوٹی تو ننھے ولید کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی تھا جو وہ وہاں سے لے کر آئی تھی۔ وہ تھی اس کی وہ نئی سوچ' جس میں وہ اپنی زندگی کا تقابل دوسروں سے کرنے لگی تھی۔ جس نے آنے والے دنوں میں اس کے لیے بہت سے مسئلے پیدا کر دیے۔ وہ جتنے دن میکے میں رہی ایسی باتیں ہی نوٹ کرتی رہی۔ بڑی بھابھی اور بھائی ایک دوسرے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چلتے تھے۔ چھوٹی بھابھی بھی شوہر اور بچوں کے ساتھ آئے روز میکے گئی ہوتی تھیں۔ اسی طرح سسرال میں بھی تھا۔ اس کی جیٹھانی اور نندیں بھی شوہر کے ساتھ ہر جگہ آتی اور جاتی تھیں۔ غرض بچوں کے معاملات سے لے کر خاندان میں ہونے والی مختلف تقریبات اور روز مرہ کی شاپنگ میں وہ سب ایک ساتھ ہوتے تھے۔ عائشہ کو لگنے لگا تھا کہ ان سب میں وہ ہی ایک عجوبہ ہے۔ جو اپنے شوہر کی مصروفیت کی وجہ سے دنیا سے کٹ کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"فیصل خاندان میں اتنے عرصے کے بعد شادی کے فنکشن آئے ہیں۔ جہاں سب خاندان والے اکٹھے

PakiBooks.Site

ہوں گے۔ ہم سب سے مل لیں گے مگر آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نہیں جاسکتے۔"

عائشہ کے میکے اور سسرال میں آگے پیچھے شادیوں کی تقریبات آرہی تھیں۔ عائشہ بہت پرجوش تھی۔ مگر فیصل نے جب بتایا کہ اسے چھٹی ملنی مشکل ہے تو وہ چڑ گئی۔ جب سے ان کی شادی ہوئی تھی ہر موقع پر ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ یا تو عائشہ جانے سے معذرت کر لیتی تھی یا پھر اسے اکیلے ہی جانا پڑتا تھا۔ اکثر اس بات پر وہ لوگوں کے مذاق کا نشانہ بھی بن جاتی تھی۔ اس لیے اب کی بار وہ فیصل کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ ننھی دانیہ کی پیدائش کی دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ فیصل سب سے آخر میں پہنچا تھا۔ اب کی بار عائشہ اس سے بہت خفا ہوئی تھی۔ بچوں کی مصروفیات میں پڑنے کے باوجود اسے قدم قدم پر فیصل کی ضرورت اور ساتھ کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ آنے والے وقت میں جہاں فیصل کی ترقی ہوئی تھی، اس کی مصروفیات میں بھی بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ ہر چینل کی ایک دوڑ تھی "سب سے پہلے ہم" اور اسی کے چکر میں ہر وقت الرٹ رہنا پڑتا تھا۔ نئی نئی ٹیکنالوجی اور اس کا استعمال کرنا بہت محنت طلب کام تھا۔

"تمہیں پتا تو ہے آج کل کی صورت حال کا۔ ساری ٹیم کے ساتھ ہر وقت الرٹ رہنا پڑتا ہے۔ میں خود بہت تھک جاتا ہوں مگر یہ کرنا بھی ضروری ہے۔" فیصل نے ہمیشہ کی طرح اسے نرمی سے سمجھایا تھا مگر عائشہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھی۔

"میں تنگ آگئی ہوں فیصل! آپ کے پاس اپنی فیملی کے لیے کوئی وقت نہیں ہے!" عائشہ نے شکوہ کیا تھا۔

"میں یہ سب کس کے لیے کر رہا ہوں یار! اپنی فیملی کے لیے نا۔ اچھا میں کوشش کروں گا کہ شادی والے دن ضرور پہنچ جاؤں۔ پلیز اب تم موڈ ٹھیک کرو۔" فیصل نے اسے بہت مشکل سے راضی کیا تھا۔ عائشہ اس کی بات سن کر چپ کر گئی۔ اپنی جگہ وہ بھی مجبور تھا۔

☼ ☼ ☼

وقت تیزی کے ساتھ گزرنے لگا۔ بچے اسکول جانے لگے۔ جن کی زیادہ تر ذمہ داری بھی عائشہ کے سر تھی۔ فیصل نے اسے گاڑی لے دی تھی کہ اسے کہیں بھی آنے جانے یا بچوں کو لے جانے میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ مگر عائشہ پھر بھی دوسروں کو دیکھ دیکھ کر جلتی کڑھتی رہتی۔ وہ اپنا موازنہ ہر بات میں دوسروں سے کرتی۔ اپنے میکے میں اپنی بھابھیوں اور بہنوں کو دیکھتی یا کبھی اپنے سسرال میں سب کو دیکھتی جو آؤٹنگ پر مل کر جاتے ہیں۔ خاندان میں ہونے والی تقریبات میں شریک ہوتے ہیں۔ اسے وہ سب لوگ خود سے زیادہ خوش نصیب لگتے تھے۔ جبکہ دوسری طرف سب لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے، ایک دوسرے کو ان کا نام لے کر مثالیں دیتے کہ دونوں میں کتنی انڈر اسٹینڈنگ اور محبت ہے۔ دونوں کتنی خوشی اور آزادی سے رہ رہے ہیں۔ جبکہ وہ سسرال کے جھنجٹ اور مسئلوں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ فیصل جس طرح اس کے بنائے معمولی سے معمولی کھانے کی تعریف کرتا، اس کی محنت کو سراہتا، وہ سب خواتین حیران رہ جاتی تھیں کہ اکثر شوہروں کے سامنے اعلا سے اعلا کھانا بھی بنا کر رکھ دو تو وہ صرف رغبت سے "کھاتے" ہی ہیں، تعریف کے دو لفظ بولنا بھی ان کے لیے دشوار ہوتا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم سب ایک دوسرے کو آئینوں میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہتے ہیں، جبکہ جو آئینہ ہمارے ہاتھ میں اور صرف ہمارا ہوتا ہے، ہم اسے معمولی جان کر کسی کونے میں ڈال کر ساری زندگی بے چہرہ اور ادھوری شکلوں کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ دوسروں کی زندگی کا عکس، کبھی بھی ہماری زندگی سے جڑے چہرے سے خوب صورت نہیں ہوتا مگر صرف ہماری سوچ کی وجہ سے ہمیں لگتا ضرور ہے۔ یہی حال عائشہ کا تھا۔ دوسروں کے عکس کو دیکھتے ہوئے، وہ اپنی زندگی کا اصل چہرہ گنوانے لگی تھی۔

روز بروز فیصل کی بڑھتی مصروفیات سے وہ چڑنے لگی تھی۔ یہ چڑچڑاہٹ اب روز کے بحث و مباحثے میں تبدیل ہو کر تلخ کلامی میں ڈھل گئی تھی۔ مگر وہ دونوں احتیاط کرتے تھے کہ بچوں کے سامنے ان کے اختلاف نہ آئیں۔ وہ دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں بہت دھیان سے چل رہے تھے۔ کل رات عائشہ بہت غصے میں آکر فیصل کو گھر چھوڑنے کی دھمکی دے چکی تھی۔ فیصل بھی روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آگیا تھا۔ عائشہ کسی بھی طرح اس کی بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ تھا کہ بیوی اور نوکری کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو نائلہ! تم نے کیسے یاد کرلیا آج؟ شادی کے بعد تو تم غائب ہی ہوگئی ہو۔" عائشہ کی پرانی دوست کی کافی دنوں کے بعد کال آئی تو وہ پیار سے شکوہ کرنے لگی۔ جواباً نائلہ کی کھوکھلی ہنسی گونجی تھی۔

"بس کیا بتاؤں تمہیں! گھر، بچے، شوہر اور پھر جاب! اپنے لیے بھی وقت نہیں ملتا ہے۔ کسی اور کی کیا خبر رہتی ہے۔" نائلہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"مگر جاب کرنا تو تمہاری اپنی چوائس ہے نا!" عائشہ نے اشارے سے دانیہ کو سبق یاد کرنے کا کہا اور اٹھ کر ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ یہ دونوں بچوں کے پڑھنے کا وقت تھا۔ دونوں کو ہوم ورک کرنے میں مصروف دیکھ کر وہ ٹیرس پر چلی آئی۔ وہ اندر سے اتنی بھری ہوئی تھی کہ اس کا دل بھی سب کچھ بھول کر اپنی دوست سے باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔

"پہلے چوائس تھی، پھر مجبوری بن گئی ہے! بچوں کی اسکولنگ اور بڑھتے ہوئے اخراجات، سب کچھ علی کی تنخواہ سے پورا نہیں ہو رہا۔ اس لیے مجھے بھی اس کے ساتھ چلنا نہیں بھاگنا پڑ رہا ہے۔ تم جانتی ہو عائشہ! جب ایک عورت گھر کی فل ٹائم جاب کو چھوڑ کر اپنی آزادی اور حقوق کی خود ساختہ جنگ لڑنے کے لیے مرد کے شانہ بشانہ چلنے اور کام کرنے کی بات کرتی ہے تو ایسی عورت کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسے مرد کا ساتھ دینے کے لیے تیز رفتاری سے چلنا نہیں، اندھا دھند بھاگنا پڑے گا۔ مرد کے ساتھ برابری کا اصول تب ہی لاگو ہوتا ہے، جب اپنی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے، اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے، ایک دوسرے کی عزت اور احترام کیا جائے۔ مگر ہم اس بات کو سمجھنے کے بجائے، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور مات دینے میں ضائع کر دیتے ہیں۔" آج نائلہ اپنی دس سالہ ازدواجی زندگی کا نچوڑ بتا رہی تھی۔ عائشہ کا دل افسردہ ہو گیا۔

"اگر تم خوش نہیں ہو تو جاب چھوڑ دو۔ علی بھائی سے کہہ دو کہ گھر چلانا ان کی ذمہ داری ہے، تمہاری نہیں۔" عائشہ نے جذباتی پن سے کہا۔

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ سب مرد فیصل بھائی کی طرح نہیں ہوتے ہیں میری بہن۔! جو اپنے بیوی بچوں کو ایک بہتر لائف اسٹائل دینے، ان کی سب خواہشات پوری کرنے کے لیے کولہو کے بیل کی طرح دن رات کام کر رہے ہیں۔ تو تم جانتی ہو ناں کہ ان کا کام کتنا ذہنی اور جسمانی مشقت رکھتا ہے۔ ہر وقت بائی الرٹ۔ کسی وقت بھی ایمرجنسی۔ ہمت ہے ان کی۔" نائلہ کے کہنے پر عائشہ ٹھٹک گئی۔ اسے کچھ کلک کیا تھا۔

"ہاں یہ تو ہے مگر وہ فیملی کے لیے وقت نہیں نکال پاتے۔ بچے بھی ان کی کمی محسوس کرتے ہیں۔" عائشہ نے سرسری سے لہجے میں کہا تھا۔

"کم آن یار! کیا بچکانہ باتیں ہیں یہ! کیا وہ یہ سب اپنے لیے کر رہے ہیں؟ نہیں نا۔! پھر یہ شکوے فضول ہیں۔" نائلہ نے لاپروائی سے کہا۔ عائشہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ نائلہ سے بات کر کے وہ اور بھی الجھ گئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی اور ان دنوں ہی اس کی چھوٹی بہن کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی اور یہ سنتے ہی گھر میں نئی لڑائی کا آغاز ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"اف عائشہ تم مجھے پاگل کرو گی! کتنی بار ایک بات تمہیں سمجھاؤں۔ اسلام آباد کی سیاسی صورت حال تمہارے سامنے ہے۔ دھرنے کی وجہ سے کام کا لوڈ بڑھ گیا ہے۔ سارا سارا دن اور رات وہاں سے کوریج کرنے میں لگ جاتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں کھانا کھانے بھی بمشکل گھر آتا ہوں اور تم کہہ رہی ہو کہ میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر تمہاری بہن کی شادی پہ دو ہفتے پہلے لاہور چلا جاؤں تاکہ مجھے آرام سے نوکری سے نکال دیا جائے۔" اتنے دن کی تھکاوٹ اور بے آرامی کی وجہ سے فیصل کا مزاج بھی چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اس لیے عائشہ کے بات شروع کرتے ہی وہ پھٹ پڑا۔

"تو کیا ہم اس نوکری کی وجہ سے دنیا ہی چھوڑ دیں گے۔ میں بھی تنگ آ گئی ہوں۔ روز روز کے بہانوں سے!" عائشہ نے کمرے کے ساتھ ملحق لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے بچوں کی بھی پروا نہیں کی تھی اور چلا کر بولی تھی۔ دونوں بچوں نے ڈر کر کمرے کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھے اور کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ ابھی شام کے چھ بجے تھے۔ کل صبح کا گیا فیصل آج شام صرف کپڑے بدلنے اور تھوڑی دیر آرام کرنے گھر آیا تھا مگر عائشہ کی بات نے اس کا پارہ ہائی کر دیا تھا۔

"تو کس کے لیے کر رہا ہوں میں یہ سب کچھ؟ کبھی یہ سوچا ہے کہ میں اپنی تفریح اور خوشی کے لیے کیا کر رہا ہوں؟ اپنی صحت پر کتنا دھیان دیتا ہوں۔ دن رات تم لوگوں کے لیے محنت کر رہا ہوں مگر پھر بھی دو گھڑی کا سکون نہیں۔" فیصل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"بس بہت ہو گیا ہے۔ یہ سن سن کر تنگ آ گئی ہوں۔ آپ دنیا کے پہلے اور آخری مرد نہیں ہیں جو کما کر لا رہے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ اپنے کام کے ساتھ بزی رہیں۔ میں اور میرے بچے کل صبح ہوتے ہی لاہور چلے جائیں گے۔ آپ کی خاطر ہم اپنی خوشیاں قربان نہیں کر سکتے ہیں۔ نہیں رہ سکتی میں آپ کے ساتھ اور.....!" کئی دنوں کا غصہ اور لاوا ایک دم سے راستہ پا کر باہر نکلا تو اپنے ساتھ بہت کچھ بہا کر لے گیا۔ فیصل نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر دروازے کے ساتھ لگے 'ڈرے سہمے' نم آنکھوں والے اپنے بچوں کو دیکھ کر لب بھینچ کر رہ گیا۔ سائڈ ٹیبل سے کار کی چابی اور اپنا والٹ اٹھایا اور پاس رکھی جیکٹ اٹھا کر بازو پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو! تم کیوں میری خاطر اپنی خوشیاں اور سکون قربان کرو گی۔ یہ حوصلہ اور فرض تو صرف میرا ہی ہے اور میں ہی اسے اپنی آخری سانس تک نبھاؤں گا۔ بچوں کا خیال رکھنا۔ زندگی ہوئی تو پھر ملیں گے۔"

فیصل نے تیزی سے کہا اور بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گیا۔ اس کے لفظوں پر غور کرتی 'وہ بے ساختہ چونکی تھی اور دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی سلامتی کی دعا کرنے لگی۔ دونوں بچے آ کر ماں سے لپٹ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

لاہور جانے کے لیے بیگ تیار کر کے 'اس نے بچوں کو کھانا کھلایا۔ کچھ دیر ان سے باتیں کرتی رہی۔ پھر انہیں سونے کی تلقین کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسی وقت اس کے موبائل کی ٹون بجی۔ اس نے دیکھا۔ گھر سے فون تھا۔

"السلام علیکم عائشہ بیٹا کیسی ہو؟" بڑے بھائی کی آواز سن کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"معذرت اس وقت کال کی تمکنی۔ ٹی وی پہ شہر کی بگڑتی صورت حال دیکھی تو رہا نہیں گیا۔ کب سے کوشش کر رہا تھا۔ بمشکل فون ملا ہے۔ میرے خیال سے نیٹ ورک پرابلم کر رہا ہو گا۔ آخر سارا شہر ہی زیر عتاب آیا ہوا ہے۔ ان دھرنوں کی وجہ سے۔" بڑے بھائی کی بات سن کر عائشہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اپنی تیاریوں میں وہ بھول ہی گئی تھی کہ شہر کی کیا صورت حال ہے۔ بڑے بھائی کو تسلی دے کر اس نے فون بند کیا اور فوراً" فیصل کا نمبر ملایا۔ جو بند ملا۔ عائشہ نے پریشانی کے عالم میں ٹی وی آن کیا۔ ہر نیوز چینل پر ایک

سی خبریں ہی چل رہی تھیں۔ دھرنے کے شرکاء اور پولیس کی کاروائی۔ کہیں لاٹھی چارج 'کہیں شیلنگ غرض ایک افراتفری کا عالم تھا۔ کہیں ٹی وی چینل کے لوگوں پر تشدد اور حملے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی کیمرہ مین زخمی حالت میں پڑا ہوا تھا 'کہیں کوئی رپورٹر اپنے زخم دکھا رہا تھا۔ عائشہ کا دل خوف سے کانپنے لگا۔ پچھلے ایک ہفتے سے فیصل بھی اپنے ٹی۔ وی چینل کی ٹیم کے ساتھ یہاں مصروف تھا۔ عائشہ نے دوبارہ اسے کال ملائی مگر جواب میں ٹیپ بولنے لگی۔ عائشہ بے قراری سے ٹی۔ وی کے آگے بیٹھ گئی اور اس کے لب بے اختیار فیصل کے لیے دعا مانگنے لگے۔ اپنی طرف سے ہر کوشش کرنے کے بعد 'وہ وضو کر کے جائے نماز پر بیٹھ گئی اور رو رو کر فیصل کی خیریت کی دعا کرنے لگی۔

رات کا ایک بج گیا تھا۔ شہر کی صورت حال قابو میں آ گئی تھی۔ اسی وقت فیصل کی کال آ گئی۔ عائشہ نے بے تابی سے اس کا حال پوچھا۔ فیصل نے اسے تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے۔ میں کام ختم کر کے ایک گھنٹے تک گھر پہنچ رہا ہوں۔ عائشہ نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اس کا انتظار کرنے لگی۔ اسے رہ رہ کر اپنے رویے اور لفظوں پر شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ بے چینی سے اندر باہر کے چکر کاٹنے لگی۔ ایک گھنٹے سے دو گھنٹے بھی گزر گئے مگر فیصل کا کوئی اتا پتا نہیں چلا۔ عائشہ پھر پریشان ہو گئی۔ فیصل کا تھکاوٹ زدہ چہرہ اور بڑھی ہوئی شیو بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اس نے کال ملائی مگر بیل جاتی رہی اور کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔ عائشہ کا دل انجانے اندیشوں سے لرزنے لگا۔ فیصل کی کال کے مطابق اگر دیکھا جاتا تو وہ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ جاتا مگر اب ڈیڑھ گھنٹہ اوپر ہو چکے تھے۔ عائشہ نے اس کے آفس کال کر کے پوچھا تو وہاں سے بھی یہ ہی پتا چلا کہ وہ تو پیک اپ کروا کے کب کا گھر جا چکا ہے۔ عائشہ کا دل خوف سے کانپنے لگا اور وہ موبائل ہاتھ میں پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اسی وقت اسے فیصل کے کولیگ اور دوست اظہر کا خیال آیا۔ اس نے جلدی سے اسے فون ملایا۔ اس

www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site
www.PakiBooks.Site

کے فون اٹھاتے ہی وہ رونے لگی۔ اظہر ساری بات سن کر اسے تسلی دینے لگا۔ وہ خود بھی تھوڑی دیر کے لیے پریشان ہو گیا تھا۔

"بھابھی آپ پریشان مت ہوں۔ میں ابھی پتا کرتا ہوں۔" اظہر نے اسے تسلی دی اور فون بند کر کے جلدی سے اپنے کولیگز کے نمبر ملانے لگا۔ جن کے ساتھ فیصل آخری بار دیکھا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کب کی بیت چکی تھی۔ عائشہ سوجی آنکھوں کے ساتھ، ٹھنڈ سے بے پروا پورچ کی سیڑھیوں پر دونوں ہاتھوں میں چہرہ سجائے گیٹ پر نظریں جمائے بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے اظہر کا فون آیا تھا کہ فیصل خیریت سے ہے اور پندرہ منٹ میں گھر پہنچ رہا ہے۔ تب سے عائشہ کے پندرہ منٹ نہیں گزر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد گیٹ پھر کھلا اور فیصل گاڑی اندر کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ گاڑی کھڑی کر کے تھکے تھکے قدموں سے اندر کی طرف بڑھا، عائشہ آگے بڑھی اور اس کے بازو سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فیصل نے اس کا سر تھپکا۔ وہ دونوں پورچ کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ سے ساری فضا میں ایک شور تھا۔ جب عائشہ اچھی طرح رو چکی تو فیصل کی طرف دیکھنے لگی۔ فیصل کے چہرے پر تھکاوٹ تھی۔ کپڑے ملگجے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟ یہی کہ تمہارا شوہر ہر حال میں اچھا لگتا ہے نا!" فیصل کے کہنے پر عائشہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ فیصل مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ اس صبح کی طرح، اس کی مسکراہٹ میں بھی تازگی اور اجلا پن تھا۔ عائشہ اس کے اس طرح دیکھنے پر کنفیوز ہو گئی اور سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ فیصل نے اپنی جیکٹ اتار کر اس کے کندھوں پر رکھی تو وہ بے اختیار چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ آج بھی وہ اس سے بے خبر اور لاپروا نہیں تھا۔ اسے اپنی تھکن اور تکلیف میں بھی، عائشہ کا خیال تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی اتنا کیئرنگ تھا۔

"تمہیں فون کرنے کے بعد میں وہاں سے نکلا تو راستے میں ایک دوست کو ڈراپ کرنے اس کے گھر چلا گیا۔ اس نے زبردستی اندر بلا لیا کہ چائے پی کر جانا۔ جب تک چائے بن کر آئی، میں تھکاوٹ کی وجہ سے صوفے پر بیٹھا بیٹھا سو گیا۔ اس نے بھی مجھے جگانا مناسب نہیں سمجھا میرا موبائل بھی گاڑی میں پڑا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے تمہارے کالز کے بارے میں پتا نہیں چل سکا۔ مگر جب اظہر کی کال آئی اس دوست کے نمبر پر۔ تب اس نے مجھے جگا کر انفارم کیا۔ میں فوراً وہاں سے نکلا اور گھر کی طرف بھاگا۔ مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں کتنی ذہنی اذیت اٹھانی پڑی ہو گی۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔" فیصل نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ مسلسل جاگنے اور آنسو گیس کی شیلنگ کے دھواں کے باعث اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"پتا نہیں کیوں! میں ان سے اتنی بدگمان ہو گئی اور قدم قدم پر ان کا دل دکھانے لگی تھی۔" عائشہ کے سامنے کل شام کا منظر گھومنے لگا، جب وہ کھانا کھائے بغیر گھر سے چلا گیا تھا۔ عائشہ نے اس کا سر دبا تھ تھاما اور اس پر سر رکھ کر رو پڑی۔

یہ آنسو کہانی تھے اس گزری رات کی پل پل کی اذیت اور انتظار کے۔

یہ آنسو کہانی تھے، ہر لمحے، ہر پل اس دل دکھانے اور زچ کرنے کے۔

یہ آنسو کہانی تھے، اس کے اپنے بدصورت رویے پر پچھتاوے کے۔

"مجھے معاف کر دیں فیصل! میں نے آپ کو سمجھنے، آپ کا ساتھ دینے کے بجائے، لڑنے جھگڑنے میں وقت گزارا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔" عائشہ نے ہمت کر کے اپنی غلطی کا اعتراف کر ہی لیا تھا۔ فیصل نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ عائشہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ فیصل نے مسکراتے ہوئے اپنا بازو اس کے کندھے پر پھیلایا۔ جیسے وہ اسے اپنی پناہ میں لے رہا ہو۔ عائشہ نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔ کچھ دیر دونوں ایسے ہی بیٹھے رہے۔

"چلو جلدی کرو! دیر ہو رہی ہے۔" اچانک فیصل نے رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے عجلت بھرے لہجے میں کہا۔ عائشہ چونک کر سیدھی ہوئی اور پریشانی سے گویا ہوئی۔

"کیا آپ پھر آفس جا رہے ہیں مگر ابھی تو آپ آئے ہیں!" فیصل اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اندر کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔

"میں نہیں! تم لاہور جا رہی ہو نا۔ بچوں سمیت! مجھے کے لیے مجھے چھوڑ کر..." عائشہ اس کی شرارت سمجھ گئی تھی۔ اس لیے وہ بھی مسکرا کر بولی۔

"میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے!"

"اچھا محترمہ! وہ کیوں؟ کیا میں اس مہربانی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" فیصل کا انداز کھوجتا ہوا سا تھا۔

"جی کیوں نہیں...!" عائشہ کا انداز شاہانہ تھا۔ فیصل اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ارادہ تو میرا ابھی یہ ہی تھا مگر...!" عائشہ نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا پھر بولی۔

"جس شخص کی فکر اور پریشانی میں مبتلا ہو کر، میں ایک رات نہیں گزار سکی ہوں۔ اس کے بغیر ساری زندگی کیسے گزاروں گی!"

"ناچیز مشکور ہے آپ کا...!" فیصل نے سر خم کرتے ہوئے کہا تو عائشہ جھینپ کر رہ گئی۔ دونوں ہنستے مسکراتے ہوئے اندر کی طرف چل پڑے۔ اجلے سویروں کے کسی گم نام کونے میں کھڑی "وہ رات" مسکرا رہی تھی۔ وہ رات جو محبت کے سب اجالوں کو اپنے ساتھ لائی تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔

☼ ☼

ماہنامہ
حنا
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
لاہور

اپریل 2018 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

اپریل 2018 کے شمارہ کی ایک جھلک

☆ "اے وقت گواہی دے" ثنا کنول کا مکمل ناول،

☆ "دعائیں مستجاب ہونیں" حنا بشریٰ کا مکمل ناول،

☆ "آئیڈیل" وجیہہ بخاری کا مکمل ناول،

☆ "ڈھل گیا ہجر کا دن" عماطل عباس کا مکمل ناولٹ،

☆ "من رقصم" بشریٰ سیال کا ناولٹ،

☆ "شہر دل کے راستے" تحسین اختر کا ناولٹ،

☆ "دل گزیدہ" ام مریم کا سلسلے وار ناول،

☆ "پربت کے اس پار کہیں" نایاب جیلانی کا سلسلے وار ناول،

☆ سارا بھٹی، مریم ماہ منیر، حنا اصغر، سویرا فلک اور حیا بخاری کے افسانے،

پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشا نامہ، اور مستقل سلسلوں کے علاوہ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

اپریل 2018 کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں

ام طیفور

من عاجزم تن بےکسم

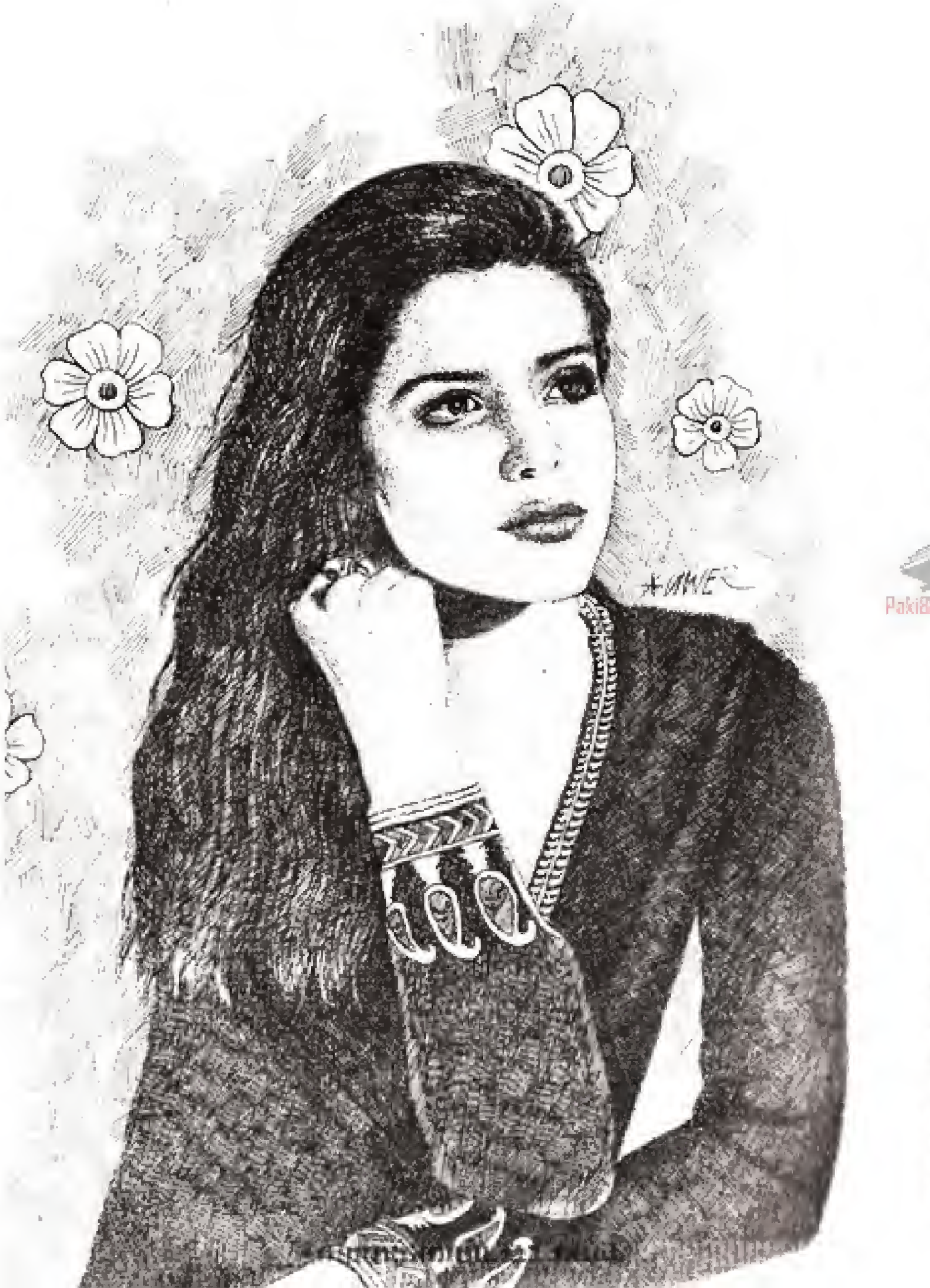

رات بے حد سرد اور تاریک تھی' تارے کہرے کے لبادے میں منہ چھپائے پڑے تھے' گیدڑوں کی بھبکارتی آوازیں بے حد قریب محسوس ہورہی تھیں' پر اس کے پیر تھمے نہیں تھے، وہ بے خودی آگے بڑھتی جارہی تھی' اس کے ہر احساس پہ اس وقت بے حسی غالب تھی' سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں اس کے بے کل پیروں سے کچلی گھسٹتی جارہی تھیں، جیسے اس کے پیر پڑ کے اسے انتہائی قدم اٹھانے سے روک لینا چاہتی ہوں' سرد ہوائیں اس کے لباس کو چیرتی ہوئی سرسرارہی تھیں لیکن وہ وول کے سیاہ لباس میں، ہلکی سی سیاہ شال اوڑھے ٹھنڈ سے یوں بے نیاز تھی جیسے قبر میں پڑنے والا مردہ۔

اونچے نیچے راستے سے ہوتی وہ قدم بہ قدم اس کھائی کی جانب بڑھ رہی تھی' جس کے عین سرے پہ وہ زندگی کے مفہوم سے آشنا ہوئی تھی اور اب وہیں پر موت ہاتھ باندھے اسے اپنے اسرار سے آشنا کروانے کے لیے کھڑی تھی' وہ پہنچ چکی تھی۔ بے دم، بے روح، وہ ہرگز بھی حواسوں میں نہیں لگتی تھی۔ یوں جیسے ایک ٹرانس کی کیفیت طاری تھی اس پر، جس کے زیر اثر وہ یہاں تک چلی آئی تھی' کھائی کے کنارے کھڑی وہ کسی ادھ جلی چتا کی طرح دکھائی دے رہی تھی، جس کا انتم سنسکار کرنے کے بعد اس کی راکھ اڑائی جانے والی تھی۔

نیم وا سفید ہونٹ، زرد چہرہ، بنجر آنکھیں اور سیاہ لباس' وہ سچ میں زندہ چنوائی گئی لاش کا پنجر تھی' معاً اس کی نگاہوں میں کوئی احساس جاگا تھا، اس نے دھیرے سے اپنے سن ہوتے دماغ کو ہوش کی طنابیں تھامتے محسوس کیا' اس مقام کو وہ بھلا کیسے بھول سکتی تھی، اس کی ان کہی داستاں کی نشانی' اس کی آنکھ کا کونا ذرا سا نم ہوا، اس نے بڑی طاقت صرف کرتے ہوئے دونوں بازو وا کیے، بائیں فضا میں معلق کیے' بھینی بھینی سی پُر اسرار خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسنے لگی' اب وہ ایسی کیفیت میں تھی کہ جی جاہ رہا تھا فوراً پلٹ لے یا کبھی نا پلٹے' اس کی تقدیر نے کبھی نا پلٹنے کا فیصلہ کرلیا' کھائی کے کنارے اگے فلک بوس درخت پہ بیٹھا الو یک دم اپنی جگہ سے اڑا اور تیزی سے جھپٹنے والے انداز میں اس کی طرف آیا تھا' اس کے پروں کی تیز اور زوردار پھڑپھڑاہٹ پہ اس نے سراسیمگی سے پوری آنکھیں کھول کر چہرہ اونچا کرکے آواز کا تعین کرنے کی کوشش کی' ذرا سا رخ موڑ کر خود کو کھائی کی مخالف سمت کیا' بازو ابھی بھی معلق تھے' الو تیزی سے اس کی جانب آرہا تھا، اس سے پہلے کہ اس کے پنجے، اس کے چہرے کو نوچتے ہوئے گزر جاتے، وہ ایک قدم پیچھے ہوئی اور دونوں بازو یوں ہی اٹھائے وہ کسی بے جان پتلے کی طرح الٹ گئی۔ الو ایک جھٹکے سے واپس آسمان کی طرف رخ کرگیا' کھائی نے تفاخر سے اپنے پیٹ کے بھرے جانے پر ایک دلدوز گونج کی صورت نعرہ مارا تھا۔ ''اوزئے رحمانی'' اپنی کہانی سمیت اندھی کھائی کی نذر ہوگئی' صبح ساری وادی میں یہ خبر پھیل گئی کہ اوزئے رحمانی نے خودکشی کر

لی۔

☆☆☆

''فیڈ اپ' ٹوٹلی فیڈ اپ۔'' امیر حمزہ نے اکتا کے فائل ٹیبل کے گلاس ٹاپ پر پھینکی تھی جو چکنی میز سے پھسلتی ہوئی دوسری جانب گود میں لیپ ٹاپ رکھ کے بیٹھے برہان کے پیروں میں آکر گری تھی۔

''اواو......'' امیر حمزہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا' سب پیپرز فائل سے نکل کر رونمائی کروا رہے تھے اور برہان اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورے جا رہا تھا' یک دم تنک کے بولا ئے۔

''بیٹا! خود ہی اٹھا ادھر آکر۔ چل شاباش۔''

''پڑے رہنے دے یار' ابھی خالد اندر آئے گا تو اٹھا دے گا۔'' اس نے پیون کا نام لیا اور لاپروائی سے سر ٹیبل پر دھرے اپنے دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ وہ تھکا تھکا لگ رہا تھا اور سچ میں کئی دنوں سے کام کے بے تحاشا بوجھ نے اسے واقعی اکتاہٹ کی آخری اسٹیج پر لا کھڑا کیا تھا' اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سامنے دھرا پورا کا پورا گلاس ٹاپ الٹا دے' برہان نے اس پر سے دھیان ہٹا کر دوبارہ نگاہ لیپ ٹاپ پر مرکوز کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا' زچ سا ہوتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھا۔

''تمہیں تکلیف کیا ہے میر! جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے ہمیں تمہارے پاپا کی فرم جوائن کیے اور تم یوں بی ہیو کر رہے ہو جیسے اس فرم کو پیروں پہ کھڑا کرنا تمہارا ہی کمال ٹھہرا ہو اور اب موصوف اتنے بڑے گول کو اچیو کرنے کے بعد ایک لمبا بریک لینا چاہ رہے ہیں' صدقے نا جاؤں میں تمہارے۔''

برہان نے بھگو بھگو کے مارنے کے بعد آخری جملہ بھرپور طنز سے ادا کیا تو امیر حمزہ نے چڑ کے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور سڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میری امی نا بنا کر' تو سمجھا اور میرے صدقے جانے سے بہتر ہے کہ مجھے کہیں لے جا یار۔''

اس کے بے بس التجائیہ انداز پہ برہان اونچا قہقہہ لگاتا کھڑا ہو گیا۔ لیپ ٹاپ ٹیبل پر دھر کر اپنی چیئر کی بیک سے لٹکے کوٹ کو اتار کر بازو پر ڈالا اور ہاتھ اونچا کر کے چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔

''چل اٹھ' لے کر چلوں تجھے۔''

''سچ میں' سیریسلی۔ مذاق تو نہیں کر رہا تو۔'' امیر حمزہ بے حد ایکسائٹڈ ہوتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں نا' لے چلتا ہوں اور سچ میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں واقعی تجھے انکل کے آفس میں لے جا رہا ہوں تاکہ تیری طبیعت بحال ہو سکے۔'' بے حد سکون سے بولتا وہ امیر حمزہ کا دماغ گھما گیا' وہ چیخ کے بولا۔

''کمینگی کی آخری اسٹیج چل رہی ہے تیری' عنقریب تیری رگ رگ میں کمینگی دوڑے گی۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کدھر چلنے کا بول رہا ہوں اور وہاں بھیجنے کے لیے پاپا کو تو منائے گا' سمجھا۔''

''تیری اپنی عزت تو ہے نہیں میر! اور میری سے تو سڑتا ہے جب ہی اس کا فالودہ بنوا تا رہتا ہے۔ میں کسی سے بات نہیں کر رہا' سمجھا۔ ہاں تیرے لیے یہ کر سکتا ہوں کہ اپنے بڑے بابا سے بات کر لوں' خود کے پاپا سے تجھے خود ہی بات کرنا ہو گی' ڈن۔''

اس نے دوٹوک کہتے ہوئے اپنا ہاتھ امیر حمزہ کے آگے پھیلایا' جواباً امیر حمزہ نے چند ثانیے کچھ سوچا اور پھر اپنا ہاتھ برہان کے پھیلے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''ڈن! لیکن ٹور کم از کم پندرہ دن اور زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کا ہونا چاہیے تاکہ یہ جو کام کر کر کے دماغ کا ''مارجرین'' بن گیا ہے نا' اس کو مکھن فارم میں لایا جا سکے۔'' امیر حمزہ نے بڑے دانش مندانہ انداز میں دماغ کی حالت پہ روشنی ڈالی تھی اور برہان کو واقعی یقین ہو گیا کہ امیر حمزہ کی دماغی حالت مخدوش ہو چکی تھی' اس نے مصنوعی نخوت سے اس کا ہاتھ پرے جھٹکا اور بولا۔

''فٹے منہ' تمہاری مثال پہ میر! اب اگلے کئی دن تک میرا ناشتے میں مارجرین کھانے کو دل نہیں کرتا۔ تیرا مکھن جیسا دماغ میرے حواسوں پر سوار

رہے گا۔ تیرے جیسے ممی ڈیڈی بچوں کے لیے بڑے بابا کہا کرتے ہیں کہ یہ بچے ممی کی گود سے نکل کر ڈیڈی کی گود میں جا چڑھتے ہیں تب ہی تو ممی ڈیڈی بچے ہوتے ہیں۔ انگلش بولتے ہوئے منہ چگالی کرتے اونٹ جیسا دکھے گا' لیکن جب اردو بولیں گے تو منہ ہلنا ہی بھول جائے گا اور......''

''اب اگر تیرا منہ بند نا ہوا تو ایک مکا ماروں گا اور اونٹ سا کر دوں گا' سمجھا......'' امیر حمزہ نے برہان کی بات کاٹتے ہوئے کڑے تیوروں کے ساتھ اسے وارن کیا' جواباً برہان نے بھنویں اچکائیں اور گلا کھنکارتے ہوئے بولا۔

''اچھا ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ زیادہ تڑیاں نا دے' ابھی گھر جا کر بڑے بابا سے بات کرتا ہوں' اگر وہ مان گئے تو ٹھیک' بصورت دیگر شرافت سے کام پہ آتے رہیں گے ہم دونوں کیونکہ اگر ان دونوں دوستوں کا گٹھ جوڑ ہو گیا تو بیٹا بھول جا سیر سپاٹے۔''

برہان کا اشارہ اپنے بڑے بابا اور امیر حمزہ کے پاپا کی طرف تھا جو بے حد قریبی دوست تھے۔

''میں کچھ نہیں جانتا' مجھے بریک چاہیے اور وہ تو مجھے دلوائے گا۔ دیکھ تیرے بڑے بابا تیری کوئی بات ٹالتے نہیں اور میرے پاپا میری کوئی بات مانتے نہیں' اس لیے اب جو کرنا ہے تجھے ہی کرنا ہے۔''

''ہم...... چلتا ہوں پھر' ویسے بھی ابھی راستے میں سے حور کو بھی پک کرنا ہے' بڑے بابا کا میسج آیا تھا کہ آج ان کی گاڑی فری نہیں ہو گی۔'' برہان نے ٹیبل سے اپنا سیل اٹھاتے ہوئے سرسری انداز میں کہا' حور اس کی منگیتر بھی تھی۔

''اللہ اللہ...... توبہ! لوگوں کو دنیا میں ہی حوریں مل گئی ہیں' ایک ہم ہیں کہ رات کو تصور جاناں کر کے سوتے ہیں' صبح سرہانے شفیق اپنا جینگی چہرہ قریب لا کر نیند سے جگا رہا ہوتا ہے' حق ہا۔''

امیر حمزہ نے ایک لمبا سا ہوکا بھرا تھا' برہان قہقہہ لگا کر اپنی گاڑی کی چابی ڈریس پینٹ کی سائیڈ پاکٹ سے نکالتا' چلتا ہوا آفس کے داخلی دروازے تک گیا اور دروازہ کھول کر امیر حمزہ کو چڑاتا ہوا بولا۔

''کرتوت اچھے ہوں تو حور ملا کرتی ہے بیٹا! ورنہ حورے (لتر) پڑا کرتے ہیں۔''

''تیری تو......'' امیر حمزہ فوراً اپنی سیٹ سے اٹھا تھا اسے پکڑنے کو' مگر وہ زوردار قہقہہ لگاتا تیزی سے دروازہ بند کرتا نکل گیا تھا۔

☆☆☆

''میں اندر آ سکتا ہوں بڑے بابا!''

اس نے ذرا سا دروازہ کھول کے احتیاط سے پہلے سیٹ پہ براجمان ارمغان مشہدی کا جائزہ لیا اور پھر اندر آنے کی اجازت چاہی' ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے بھی تھام رکھی تھی' جس میں کافی کے دو مگ تھے۔

''برخوردار! کبھی باپ سمجھ کے مان کے ساتھ بغیر اجازت کے بھی اندر آ جایا کرو۔ یقین جانو کہ میں خوشی محسوس کروں گا۔'' ارمغان مشہدی نے ہاتھ میں تھامی کتاب کا مکمل انہماک سے مطالعہ کرتے ہوئے عام انداز میں خاص بات کی۔ برہان جھینپ سا گیا' دھیمے قدموں سے چلتا ان کے قریب صوفے پر ٹک گیا' ٹرے کو چھوٹی سی نفیس روم ٹیبل پر رکھ کے شہادت کی انگلی سے کان کھجاتا ہوا بولا۔

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول

دستِ مسیحا
نگہت سیما

قیمت -/400 روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار' کراچی۔ فون نمبر: 32735021

"بڑے بابا! کیا کروں۔ عادت ہے، میں دستک دیے بغیر نہیں رہ پاتا۔"

"تو میری جان! اپنوں کے ساتھ غیریت برتیں تو کئی پردے بیچ میں حائل ہو جاتے ہیں' جو بلاشبہ احساسات کی ترسیل میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ خیر چھوڑو' یہ بتاؤ کہ تم دونوں دوستوں کے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ ہمایوں کا فون آیا تھا، شدید غصے میں تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ان لڑکوں کو چار دن آفس آتے نہیں ہوئے اور سیر سپاٹوں کی فکر پڑ گئی، کیا معاملہ ہے یہ؟"

تفصیل سے بتاتے ہوئے ارمغان مشہدی نے کافی کا مگ اٹھایا اور ہلکے پھلکے انداز میں دریافت کیا۔

"ایک تو یہ میر بھی نا......" برہان ہولے سے بڑبڑایا۔ "بولا بھی تھا اس خبیث کو کہ پہلے مجھے بات کرنے دے بڑے بابا سے پھر اپنے پاپا سے کرے، پر حد سے زیادہ بے صبرا ہے۔"

"اصل میں بڑے بابا! وہ کچھ دن کا بریک چاہ رہا ہے' میں نے تو کہا بھی تھا کہ ابھی ذرا سانس لو پر آپ میر کو جانتے ہیں نا، جو طے کر لے اس سے نہیں ہٹتا۔ اسی کے سر پر تفریح کا بھوت سوار ہوا ہے ورنہ میرا تو آپ کو پتا ہی ہے کہ میں ایسے شوق نہیں پالتا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا' اس کی طبیعت میں چونچالی ہرگز نہیں تھی بلکہ اسے تو آفس کے علاوہ کہیں بھی بھیجنے کے لیے باقاعدہ منتیں کرنی پڑتی تھیں۔ حور کو اس سے ہمیشہ سے یہی شکایت تھی کہ وہ کبھی بھی اسے لے کر کہیں نہیں گیا جب کہ حور سیر و تفریح کی دلدادہ......

اور ارمغان مشہدی کو اچھا لگتا تھا جب برہان، امیر حمزہ کے ساتھ ہی سہی، کہیں کی خاک چھاننے نکلتا تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے پوری بات تحمل سے سن کر اسے عینک کے پیچھے سے مسکراتی نظروں سے گھورا اور بولے۔

"تو پالو نا ایسے شوق، یہ کون سا ہاتھی پالنے جیسا ہے۔ برہان بیٹا آیا جایا کرو کہیں، نہیں تو تمہیں یوں کام میں مگن اور گم چپ سادھ کر مجھے یہ احساس ہوتا ہے جیسے میرے پیار میں کوئی کمی رہ گئی۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کی اولاد کو وہ محبت نہیں دے سکا جیسی اس کے ماں باپ دیتے۔" وہ آبدیدہ سے خاموش ہو گئے تو برہان فوراً اپنی جگہ چھوڑ کر ان کے پیروں کے پاس آ بیٹھا اور گھٹنے تھام کر رسان سے بولا۔

"آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے بڑے بابا! میری تو ساری ہستی آپ کے گرد منڈلاتی ہے۔ میں فیضان بھیا سے اس قدر قریب نہیں جتنا آپ سے' آپ کی بے لوث چاہتوں کا میں قرض دار ہوں۔ ہاں میں اپنے مزاج کا کیا کروں جس میں میر جیسے آدمی کی صحبت کے باوجود جولانی پیدا نہیں ہو سکی۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ خود بھی ہنس دیا اور ارمغان مشہدی بھی، وہ دونوں ایسے ہی تھے۔ ایک ان دیکھے سوت میں بندھے جس نے دل کو دل سے جوڑ رکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بے حد قریب تھے تو بلاشبہ اس میں زیادہ ہاتھ ارمغان مشہدی کا تھا لیکن برہان کی ان کے لیے محبت پہ بھی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"بس تو پھر یہ طے ہوا کہ تم بھی یہ مہینہ سیر و سیاحت کو دو' کام ساری عمر ہوتے ہی رہتے ہیں برہان! میں نے ہمایوں سے بھی کہہ دیا ہے، تھوڑی بک بک کی اس نے پھر چپ ہو گیا، ویسے بھی اس کی فکر مت کرو اسے سنبھالنے کے لیے میں اکیلا کافی ہوں۔ اس کا بس چلے تو سوتے میں بھی نئے کانٹریکٹ سائن کرتا رہے' تم دونوں تیاری پکڑو۔ ہاں جانا کہاں ہے وہ فائنل کر کے مجھے بتا دو، میں پہلے سے ہی انتظامات کروا دوں گا۔ اب جاؤ برخوردار! آرام کرو اور کل تک سب طے کر کے مجھے رپورٹ کرو' مجھے یہ کتاب پڑھنی ہے۔" انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہتے ہوئے گویا اس سارے پروگرام پر مہر لگائی تھی' برہان کے اکتائے ہوئے تاثرات انہیں باور کروا رہے تھے کہ وہ ٹال مٹول سے کام لے گا۔ اسی لیے انہوں نے بات مکمل کر کے کتاب چہرے کے آگے کر لی تھی، یہ اشارہ تھا کہ وہ اب مزید بحث نہیں سنیں گے۔ برہان ایک لمبی سانس خارج کرتا اٹھ کھڑا ہوا، اس کا کافی کا مگ جوں کا توں پڑا رہ گیا۔ جی ہی جی میں امیر حمزہ کو کوستا وہ ڈھیلے قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا' ارمغان مشہدی نے کتاب کی اوٹ سے بند دروازے کی جانب دیکھا، مسکرا کر کتاب اور خالی مگ ٹیبل پر رکھا اور سونے کی غرض سے اپنے بیڈ کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

وہ ابھی ابھی شام کی واک کر کے آیا تھا اور اب سکون سے آنکھیں موندے لان چیئر پر بیٹھا موسم کا مزا لے رہا تھا، جو اچانک سے خوش گوار ہو گیا تھا۔ آج آفس سے بھی وہ جلدی لوٹ آیا تھا حالانکہ اس کا موڈ ابھی مزید بیٹھنے کا تھا لیکن انکل ہمایوں نے ان دونوں کی اپنے آفس میں بلوا کر طنز کے شیرے میں ڈوبے جملوں سے تواضع کی اور ٹھیک آج سے لے کر پورے ایک ماہ تک کی رخصت عنایت کر دی۔ اب بھلے وہ اسی وقت آوارگی کرنے نکل پڑتے یا ہفتے بعد' ہمایوں انکل کی نظر میں ان کی "چھٹی" شروع ہو چکی تھی امیر حمزہ تو چھلانگیں مارتا آفس سے باہر آیا تھا جب کہ وہ خود بے حد بدمزا ہوا تھا' وہ شروع سے خاصا ذمہ دار تھا اور کسی کی غیر ذمہ داری یا لاپروائی کا سہرا اس کے سر بھی باندھا جائے تو یہ کبھی بھی اس کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ پڑھائی ختم کرنے کے بعد اس کا ارادہ جاب کرنے کا تھا، ارمغان مشہدی نے اسے فری ہینڈ دیا تھا، بھلے وہ ان کا کاروبار سنبھالے یا تجربے کی غرض سے نوکری کرے۔ انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن یہاں پہ ہمایوں انکل آڑے آ گئے۔ امیر حمزہ نے بھی اس کی دیکھا دیکھی جب جاب کا شوشا چھوڑا تو ہمایوں انکل کو یہ ہرگز گوارا نا ہوا کہ اپنی فرم کے ہوتے ہوئے ان کا اکلوتا بیٹا کسی اور کی نوکری کرے جبکہ امیر حمزہ، برہان کے ساتھ ہی جاب کرنے پہ بضد تھا۔ ایسے میں وہ ان دونوں کو ہی زبردستی گھسیٹ کے اپنی فرم میں لے گئے' ہمایوں

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

Emale: id@khawateendigest.com

اپریل 2018 کے شمارے کی ایک جھلک

سالگرہ نمبر

آزادی

قدم قدم مصوبتیں' لمحہ لمحہ موت کا خوف' سانحہ 1971 کے پس منظر میں لکھی گئی ایک جنگی قیدی کی داستان

دفاعی تجزیہ نگار اکرام سہگل کے سلسلے کی ایک اور کڑی۔

سراب

جرم کا راستہ اختیار کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ ان سے اس راستے میں کوئی بھول بھی ہو سکتی ہے

ایم اے راحت کی ایک بہترین تخلیق۔

گردش دوراں

خوش حالی اور طاقت کا گھمنڈ انسان کو مغرور اور ظالم بنا رہا ہے

جاوید راہی کی موثر کاوش۔

آرزوئے بہار

محبت میں انسان فرشتہ بھی بن سکتا ہے اور سرے پیر تک انتقام بھی

مبین شیخ کا خوب صورت انداز۔

تلاش رنگ رائگاں

محبت کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے ایک شخص کا سفرنامہ

سید محمد اشرف کی ایک رومانوی تحریر۔

اس کے علاوہ دیس بدیس کی رومینس، سسپنس اور تجسس سے بھرپور مشہور و معروف مصنفین کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

اپریل 2018 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

انکل، بڑے بابا کے بے حد قریبی دوستوں میں سے ایک تھے۔ اس لیے برہان کے لیے ان کی بات ٹالنا مشکل تھا جبکہ ارمغان مشہدی بھی ان کے ہمنوا ہو گئے لہٰذا سب کے زور دینے پر برہان کو ہار ماننا پڑی۔ یوں تب سے وہ اور امیر حمزہ ہمایوں انکل کی فرم جوائن کیے ہوئے تھے' کچھ وقت جاتا تو وہ ارمغان مشہدی کا کاروبار سنبھال لیتا مگر فی الوقت وہ ہمایوں انکل کے زیر سایہ تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں گم کہیں کا کہیں نکلا ہوا تھا جب نسوانی وجود کی موجودگی کے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ حور اس کے بالکل سامنے والی چیئر پر بیٹھی اسے گھورے جا رہی تھی۔ قریب ہی چھوٹی سی ٹیبل پر چائے اور لوازمات کی ٹرے بھی موجود تھی جو یقیناً وہی لائی تھی' برہان نے آنکھوں کے اشارے سے اس کے جارحانہ تیوروں کی وجہ پوچھی' وہ جلبلا کر بولی۔

''شرم تو نہیں آتی تم دونوں کو۔''

''نہیں...... مجھے تو آتی ہے۔ ہاں میر کو شرم سے کوئی شغف نہیں۔'' وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے مزا لینے والے انداز میں بولا۔

''تم دونوں ہی پرلے درجے کے بے مروت ہو' میر کو میں کیا کہوں برہان! لیکن تم...... تم میرے بغیر کوئی پروگرام کیسے بنا سکتے ہو۔ جانتے نہیں کہ میں کتنی ایکسائٹڈ ہوتی ہوں ایسے ایڈونچرز کو لے کے۔''

وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولی' اس کا خوب صورت چہرہ جوش سے لال ہو رہا تھا حالانکہ ابھی وہ دور دور تک اس سارے میں شامل نہیں تھی' نا ہی برہان نے اسے لے جانے کا سوچا تھا۔ وہ جی ہی جی میں جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

''حور! ہم ایڈونچر کرنے نہیں جا رہے' میر کا دماغ الٹ گیا ہے۔ اسے ہوا خوری کی ضرورت ہے اس لیے ذرا گھومنے پھرنے جا رہے ہیں۔'' وہ ذرا تیز لہجے میں بولا تو حور برا مان گئی۔

''تو مجھے بھی لے جاؤ نا گھمانے پھرانے، میں کیا کاٹتی ہوں؟''

''مم...... یہ تو مجھے نہیں پتا کہ تم کاٹو گی یا نہیں ہاں بڈی ضرور ساتھ ہوگا۔''

''بڈی کون؟'' حور نے اشتیاق سے پوچھا۔

''میر کا پالتو کتا ہے' اسے لیے بغیر وہ کہیں نہیں جاتا۔'' جواب بے حد اطمینان سے دیا گیا تھا' بات سمجھ میں آتے ہی حور ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور ناراض ہو کر جانے لگی تھی کہ برہان نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا اور پچکارتے ہوئے بولا۔

''کیا یار حور! سینس آف ہیومر بھی کسی بلا کا نام ہے' اچھا اب ناراض نا ہو۔ بیٹھو یہاں اور میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔''

اس کے دلآویز خدوخال خفا خفا سے مزید دل میں کھبتے تھے' برہان نے اس کے چہرے سے نظر چرا کر ٹیبل پر پڑا اپنا سیل اٹھایا اور بلا وجہ اسے دیکھنے لگا۔ حور نے ایک جھٹکے سے اگلے ہی لمحے سیل فون اس کے ہاتھ سے اچک لیا اور اسے لہراتے ہوئے بولی۔

''میں تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گی تو بس جاؤں گی...... اور اگر تم نے آنا کانی کی تو میں بابا سے کہہ کر تم دونوں کا جانا بھی کینسل کروا دوں گی سمجھے۔''

''شوق سے کروا دو' میرا تو پہلے ہی موڈ نہیں۔ میں تو میر کے بچے کی وجہ سے جا رہا ہوں، ہاں تمہیں میں پھر بھی یہ ہی کہوں گا کہ تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتیں' مناسب نہیں لگتا' اوکے۔''

''کیوں مناسب نہیں لگتا کھڑوس۔'' عقب سے آتی امیر حمزہ کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا' وہ بلیک اپر اور ٹراؤزر میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھے پیچھے کھڑا تادیبی نگاہوں سے برہان کو گھور رہا تھا۔ سر جھٹکتا کرسی پر آ بیٹھا اور اپنا رخ ڈائریکٹ حور کی طرف پھیرتے ہوئے صاف لہجے میں بولا۔

''آپ ہمارے ساتھ چل سکتی ہیں حور جی! یہ لنگور آپ کو روک کے دکھائے کیونکہ آپ کو لے جانے کا پرمٹ میں ابھی ابھی جم خانہ سے لے کر آ رہا ہوں۔ جہاں آپ کے بابا اور میرے پاپا دونوں بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے بے ایمانیوں کے ریکارڈ قائم کر رہے ہیں۔''

حور نے بے ساختہ خوش ہوتے ہوئے جتاتی نظروں سے برہان کو گھورا اور ذرا سا آگے کو میز پر جھک کے امیر حمزہ کے لیے چائے بنانے لگی۔

''میں خود بات کروں گا بڑے بابا سے' حور کے جانے کی آخر تک ہی کیا ہے۔ دو لڑکوں میں اس کا کیا کام بھلا۔'' برہان کو برا لگا تھا۔

''وہ ہی تک جو کسی بھی خاتون کے قافلے کے ہمراہ ہونے میں ہوتی ہے' یار بندہ کوئی چائے شائے، پانی لسی ہی بنوا لیتا ہے' ہاہاہا......'' حور کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھامتے ہوئے امیر حمزہ نے خود ہی اپنی بات کا مزا لیا۔

''ہم کالا پانی نہیں جا رہے میر! اب کون سا زمانہ ہے چائے لسیاں رستے میں خود بنا کے پینے کا۔ سب کچھ ریڈی میڈ ملتا ہے' سمجھے۔'' وہ چڑ رہا تھا یہ صاف صاف محسوس کیا جا سکتا تھا اور حور کو اب کوئی پروا نہیں تھی۔ ارمغان مشہدی نے اجازت دے دی سو دے دی' اب تو یا یہ دونوں بھی نا جاتے یا پھر اسے لے کر جاتے، وہ سکون سے چائے کے سپ لے رہی تھی۔

''اچھا اب فالتو کی باتیں چھوڑو اور بتاؤ جانا مرنا کہاں ہے؟'' بے زاری کی انتہا پر پہنچے برہان نے محض دھیان بٹانے کی غرض سے پوچھا تھا۔

''اوئے' اوئے اللہ کے بندے' جانے کی بات کر، مرنے کی نہیں' سمجھا اور اس دفعہ میرا ارادہ دور کسی وادی میں جانے کا ہے۔'' خواب ناک لہجے میں کہتے ہوئے اور لفظ دور کو لہک کے ادا کرتے ہوئے امیر حمزہ نے ''سڑوک'' کی آواز کے ساتھ چائے کی سڑکی لی تھی۔ حور کے منہ سے ہنسی کا فوارہ نکلا تھا جبکہ برہان کا دل کیا کہ ہاتھ میں تھاما کپ امیر حمزہ کے منہ پہ انڈیل دے' وہ غصہ دباتے ہوئے بس ذرا غراتے ہوئے بولا۔

''یہ جو آپ جناب دور کی کوڑی لا رہے ہیں نا' تو بڑے بابا سے خود ہی بات کرو اس بارے میں۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ بڑے بابا کے وہ فرینڈ خاصے مزاج دار آدمی ہیں۔ وادی کی ساری ٹھنڈک ان کے لہجے میں سرایت کیے رہتی ہے' ان کے گھر جا کے رہنا ایسے ہی ہے جیسے کیڈٹ اکیڈمی میں بھرتی ہونا۔''

''فکر مت کر یار! ہم کوئی کمینے، ذلیل، بے غیرت......''

''لچے، لفنگے......'' امیر حمزہ کی بات کاٹ کے برہان نے دو القابات اضافی ادا کیے۔ امیر حمزہ محظوظ ہوتی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے شرارت سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

''واللہ...... تیرے منہ سے ایسے لفظ سن کے میرے جی کو بے حد راحت میسر ہوتی ہے کہ اس جہان میں بس ایک میں ہی بدتہذیب نہیں' بلکہ میرے حلقۂ احباب کا انمول رتن میرا بھی باپ ہے۔'' امیر حمزہ کا اشارہ برہان کی طرف تھا' حور کے حلق سے خوب صورت قہقہہ برآمد ہوا' امیر حمزہ خوش ہوتے ہوئے آداب بجا لایا۔

''اب اگر تمہارا ارادہ کام کی بات کرنے کا ہے تو ٹھیک ورنہ میں کچھ دیر اپنے کمرے میں تنہا گزارنا چاہتا ہوں۔''

''کیوں اکیلا کیوں، کیا ڈانس پریکٹس کرنی ہے؟'' امیر حمزہ ابھی بھی اسے چھیڑنے سے باز نا آیا۔

''کل میرے ماما، بابا کی برسی ہے۔ سترہ سال ہو جائیں گے انہیں اس دنیا سے گئے' میں خود کو بہت آزردہ محسوس کر رہا ہوں۔'' ہنستا بولتا ماحول ایک دم بدل گیا' برہان کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ ہو گیا تھا۔ امیر حمزہ بھی سنبھل کر بیٹھ گیا، ٹیبل پر چائے کی پیالی رکھ کر اپنے گھٹنوں پر کہنیاں ٹکا کر بغور برہان کو ہمدردی سے دیکھنے لگا۔ حور نے فوراً برتن اٹھائے اور تیز قدموں سے اندر چلی گئی' برہان جانتا تھا کہ وہ خانساماں سے ابھی بہترین کھانا بنوائے گی تھوڑا اسجد

میں بھجوائے گی باقی خود ڈرائیور اور خانساماں کے ساتھ جا کر کچھ دور واقع کچی بستی میں بانٹ آئے گی۔ یہ اس کا ہر سال کا معمول تھا جو وہ خاص برہان کے لیے اپنائے ہوئے تھی۔

"یار میں سوچ رہا ہوں کہ دور کسی وادی میں جانے کے بجائے یہ ہمسائے میں نا جایا جائے' ایڈونچر بھی ہو جائے گا۔ کب کی یہ کوٹھی خالی پڑی ہے' اب تو اس کوٹھی کا چوکیدار بھی نوکری چھوڑ گیا' عجیب بے فکرے لوگ ہیں۔ اتنی پرشکوہ رہائش کو ویران ہونے کے لیے رکھ چھوڑا ہے' کاش' کاش مجھے پتا چل جاتا کہ یہ کوٹھی تم لوگ بیچنے والے ہو تو کبھی بھی ہاتھ سے نا جانے دیتا' ایسی شان دار کوٹھی اور ناقدروں کے ہاتھ لگ گئی۔"

برہان کے اندرونی احساسات سے بے خبر امیر حمزہ محض اس کا دھیان بٹانے کی خاطر انجانے میں اسے ایک اور تکلیف دہ سانحے کی یاد دلا گیا تھا۔ اس کی لال بھیگی آنکھیں بالکل ساتھ والی کوٹھی کے لان میں آگے پیچی کے پیڑ پر جمی تھیں' بہت سے بھاگتے دوڑتے مناظر اس کا دماغ چکرانے لگے۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور معذرتی کلمات ادا کیے بغیر گھر کے اندر چلا گیا، راستے میں کسی کام سے آتی حور اس کے سرد تاثرات دیکھتی فوراً پرے ہوئی تھی' امیر حمزہ نے پرملال نگاہوں سے جاتے ہوئے برہان کو دیکھا' اس کے دل کو افسوس نے گھیر لیا۔ ناحق یہ موضوع چھیڑ دیا' اب کل صبح سے پہلے برہان کمرے سے نکلنے والا نہیں تھا' اس نے ٹیبل سے گاڑی کی چابی اور اپنا سیل فون اٹھایا اور بوجھل دل کے ساتھ واپسی کے لیے اٹھ گیا' اپنی گاڑی میں بیٹھنے تک اس کی نظریں کوٹھی سے نہیں ہٹی تھیں' جو اپنی خوب صورتی کی گود میں ہولناکی سموئے ہوئے تھی۔

☆☆☆

کسی زمانے میں یہ دو نہیں ایک ہی بڑی سی کوٹھی لگا کرتی تھی، شان دار اور پرشکوہ، سفید اور سیاہ پتھروں کے امتزاج سے بنیں یہ کوٹھیاں دیکھنے والے کو مبہوت کیا کرتی تھیں' ایک ہی گیٹ تھا لیکن اندر دو خاندان آباد تھے' مشترکہ پورٹیکو میں گاڑیاں ایک قطار میں کھڑی رہا کرتیں۔ شام ڈھلتے ہی سب لوگوں کا لان میں اکٹھے ہونا معمول تھا' یہ نوشابہ بیگم کا حکم تھا جسے بجالانے میں ان کے بیٹوں اور بہوؤں کو کبھی عار محسوس نہیں ہوا تھا' ان عالی شان کوٹھیوں میں نوشابہ بیگم کے بیٹے آباد تھے۔ ارمغان مشہدی اور ان سے چھوٹے افنان مشہدی۔

بزنس ٹائیکون لیکن بلا کے عاجز دونوں بھائی اب تک ساتھ تھے تو یہ محض نوشابہ بیگم کا کمال نہیں تھا بلکہ فطری طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ خوش قسمتی بیویاں بھی ایسی ملیں کہ شادیوں کو کئی سال بیت گئے لیکن الگ ہونے کی نوبت نا آئی۔ ہوسکتا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ دونوں دیورانی جیٹھانی سگی بہنیں تھیں' نوشابہ بیگم کو سطوت اس قدر بھائیں کہ سال دو بعد ہی افنان مشہدی کے لیے عفت کو بھی بیاہ لائیں۔

قدرت کے کام کہ سطوت کے ہاں کئی سال تک اولاد نا ہوسکی' اس دوران عفت کے ہاں دو لڑکے ہو چکے تھے۔

شادی کے سات سال بعد اللہ نے سطوت کی گود میں حوروں سی بیٹی اتار دی' وہ سچ میں اتنی خوب صورت تھی کہ اس کو دیکھتے ہی نوشابہ بیگم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "میرے ارمغان کو تو اللہ نے حور سے نواز دیا۔" اور ارمغان مشہدی نے اپنی بیٹی کو یہ ہی نام دے دیا۔ "حور مشہدی۔"

حور گھر بھر کی جان تھی کہ ایک تو واحد بچی اور پر سے بلا کی دلکش' عفت کے دونوں بیٹے اس ننھی سی گڑیا کے دیوانے تھے' بڑا بیٹا فیضان چھ سال کا اور چھوٹا برہان تین سال کا تھا۔ دونوں کے ہاتھ چابی والی گڑیا آ گئی تھی' جی بھرتا ہی نا تھا ان دونوں کا' حور بھی ان دونوں سے اس قدر ہل گئی تھی کہ ہمک ہمک انہی کے پاس جاتی' ماں کے پاس تو وہ بس رات میں پائی جاتی۔

بڑے بھلے دن تھے جو اپنا پتا دیے بغیر نکل گئے' اور چار سال کی ہو چکی تھی جب سطوت دوبارہ امید سے ہوئیں۔ نوشابہ بیگم کے تو پاؤں زمیں پہ نا ٹکتے تھے۔ اس دفعہ پوتے کے لیے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں' خود سطوت بھی فطری طور پر بیٹے کی خواہش مند تھیں۔ ہاں ارمغان مشہدی کو ابھی بھی حور کے علاوہ کچھ نہیں دکھتا تھا' وہ ایک ان دیکھے وجود کے لیے بیٹی کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے تھے' اس میں ہی ان کی جان بند تھی۔

بقر عید سر پر تھی' برہان کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ لوگ قربانی کے جانور لانے کے لیے کتنے بے چین تھے' افنان مشہدی بدلتے موسم کی لپیٹ میں آئے ہوئے تھے۔ کیے دن ہو گئے تھے نا بخار جان چھوڑتا تھا نا نزلہ زکام' ان ہی کی وجہ سے ابھی تک وہ لوگ جانور نہیں خرید کے لا سکے تھے، ورنہ عید سے دس پندرہ دن پہلے ان کوٹھیوں کے مشترکہ لان میں قربانی کے جانوروں کی رونق لگ جاتی تھی' اب تو عید میں بھی صرف چار روز رہ گئے تھے' بچوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا تھا' مجبوراً ارمغان مشہدی، نوشابہ بیگم کے مجبور کرنے پر بچوں کے ہمراہ منڈی چلے گئے' ساتھ میں گارڈ کو بھی گاڑی میں بٹھا لیا اور یہ ہی ان کی زندگی کی فاش غلطی تھی۔

پانچ، چھ گھنٹوں کے بعد جب ان کی واپسی قربانی کے جانوروں کے ہمراہ ہوئی تو ان کا اپنا گھر ذبح خانہ بنا ہوا تھا' ان کے سب پیارے قربان ہو چکے تھے' گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی ان سب کو خون ہی خون دکھا تھا' برہان نے اتنا خون اس وقت بھی نہیں دیکھا تھا جب کھٹا کھٹ ان کے قربانی کے جانوروں کی گردنوں پر چھریاں چلا کرتی تھیں' اس وقت وہ محض سات سال کا بچہ تھا، لیکن صورت حال کا پورا ادراک رکھتا تھا۔ اس کے ذہن میں آج بھی ایک ایک منظر تمام جزئیات کے ہمراہ نقش تھا۔ لمبے چوڑے کار پورچ میں خون سے لتھڑے جوتوں کے نشان' سب سے پہلے ڈیک پر پڑی کل وقتی ملازمہ آسیہ کی لاش' اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے کیسے پھلانگا تھا اسے اور اپنی ماں کی تلاش میں اندر آیا تھا۔ وہ مارے خوف کے اس قدر تھرتھرا رہا تھا کہ فوری طور پر اپنی ماں کی گود میں چھپ جانا چاہتا تھا' اس کی آواز حلق میں گھٹی ہوئی تھی' اندر لاؤنج میں داخل ہوتے ہی آنکھیں چوپٹ کھولے، اذیت کے گہرے احساس سے چیختی ہوئی اس کی تائی کی لاش' جن کے زخمی سر سے خون ابھی بھی رس رہا تھا' وہ بدک کے پرے ہوا تھا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ماما بابا کے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک طمانیت سی اس کے ننھے دل میں سرایت کر گئی' جیسے اب وہ محفوظ ہو گیا ہو۔

ایک لمبا سانس اس کے سینے سے خارج ہوا اور وہ رو پڑا' ویسی ہی خوشی کے احساس سے مغلوب ہو کر جیسی بازار میں چند پل کے لیے ماں کے کھو جانے کے بعد دوبارہ مل جانے پہ ہوتی ہے۔ اس کی ماں بھی اس کی نظروں کے سامنے تھی' بابا کی ٹانگوں پہ سر رکھے سوئی ہوئی' وہ بھاگتا ہوا ماں سے لپٹ گیا تھا اور اونچا اونچا روتے ہوئے پیچھے آئی قیامت کے بارے میں بتا رہا تھا لیکن ماں کوئی جواب ہی نہیں دے رہی تھی۔ نا ہی بابا نے اس کے اس قدر اونچا رونے پر بھی آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کا دل یک دم سکڑ کر پھیلا ہوا تھا' وہ دو قدم پیچھے ہوا...... اور پیچھے ہوا، غور سے باپ کے ٹانگوں پہ سر رکھے ماں اور بے حس سی نیند اوڑھے باپ کو تکا' پھر آگے ہوا اور ماں کو کندھے سے تھام کے سیدھا کیا۔ ایک جھٹکے سے اس کا بے جان وزنی سر اس کے کمزور بازوؤں میں آن سمایا۔ پیشانی کے عین وسط میں خون سے بھرا گڑھا دیکھ کے بھی اس نے اپنی ماں کا سر نہیں چھوڑا تھا بلکہ اسے اور شدت سے بھینچ لیا تھا' اس کے بابا سو نہیں رہے تھے۔ ان کے پیٹ پر شگاف تھے۔ برہان کے اعصاب کے لیے یہ سب بے حد کڑا تھا بلکہ کسی کے لیے بھی ہو سکتا تھا، وہ تو پھر سات سال کا چھوٹا بچہ تھا۔ وہ پہلے سسکا پھر بلکا اور پھر حلق پھاڑ کے چیخا تھا، اتنی شدت سے کہ اس کے گلے میں لمحے میں خراش پڑ گئی تھی۔ اس کے چیخنے کی

آواز ارمغان مشہدی کے کانوں میں پڑی تھی اور وہ جو دونوں کوٹھیوں کے مشترکہ لان کے بیچ کی باڑھ میں پھنسی اپنی بوڑھی اور کمزور ماں کی لاش نکال رہے تھے، یک دم بے بسی سے آنکھیں میچ گئے۔ برہان کی چیخوں نے ثابت کیا تھا کہ اس گھر کا ایک بھی فرد زندہ نہیں بچا تھا' وہ نوشابہ بیگم کو بھینچ کر پھپک پھپک کر رو دیے۔

ان کی پیاری بیوی ان کی نشانی سمیت کس بے دردی سے ماری گئی تھی' وہ کس کس کا ماتم کرتے' خود کو سنبھالتے یا تینوں بچوں کو جو اپنے گھر میں اپنے ماں باپ کی لاشیں دیکھ کر جیسے سکتہ زدہ ہو گئے تھے۔ خاص طور پر برہان جس کے جسم کی کپکپی نہیں جاتی تھی نا ہی اعصاب نارمل ہو پا رہے تھے۔ اس کا بڑا بھائی فیضان گو کہ خود بھی چھوٹا ہی تھا لیکن اس نے حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بھائی اور حور کو بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ ارمغان مشہدی کی کڑی ہدایت کے بعد حور کو فیضان فوری طور پر اس کے کمرے میں لے گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حور لاشوں کو دیکھے، ابھی تک اس کی نگاہ سے اپنی ماں کی لاش اوجھل تھی' کمرے میں لا کر فیضان نے اسے اور برہان کو سلانے کی کوشش کی' حور سہمی ہوئی تھی یا پھر ڈر سے چھٹکارا پانے کی خاطر کچھ ہی دیر میں سو گئی لیکن برہان کیسے سوتا' اس کے ننھے ہاتھوں میں تو ابھی تک اپنے ماں باپ کا خون لگا تھا' اتنا ضرور تھا کہ وہ خاموشی سے کمفرٹر اوڑھ کر لیٹ گیا تھا' اے سی کی خنکی میں بھی اسے پسینے آ رہے تھے' فیضان اس کی حالت سمجھ رہا تھا لیکن اس وقت وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ خود ابھی بچہ تھا' بس کھڑکی سے باہر نیچے جھانک جھانک کے دیکھتا رہا جہاں اب ہر طرف پولیس کے ہرکارے پھرتے دکھائی دے رہے تھے' ارمغان مشہدی اپنے بال نوچتے اور کھڑے کھڑے اپنی رانوں پہ ہاتھ مارتے، ساتھ اونچی آواز میں روتے پتا نہیں کیا بول رہے تھے' فیضان بس یک ٹک انہیں دیکھے جا رہا تھا' پھر اس نے باری باری سب لاشیں گیٹ سے باہر لے جاتی دیکھیں' لاشوں سے ٹپکتا لکیر کی صورت خون دیکھ کر اس نے خوف سے پردہ چھوڑ دیا' اسے ماما اور بابا یاد آنے لگے، یکدم بہت شدت کے ساتھ' وہ وہیں دیوار کے ساتھ کمر ٹیک کر بیٹھ گیا اور گھٹ گھٹ کر روتا چلا گیا' یہ سانحہ فیضان اور برہان کی شخصیت پر بری طرح اثر انداز ہوا تھا۔

☆☆☆

پولیس کی تحقیقات کے مطابق یہ دشمنی کا شاخسانہ تھا' گو کہ گھر کا قیمتی سامان بھی غائب تھا لیکن صاف محسوس ہوتا تھا کہ محض اس واردات کو ڈاکے کا رنگ دینے کی خاطر قیمتی اشیاء پر ہاتھ صاف کیا گیا ہے' وگرنہ آنے والوں کا اصل مقصد قتل و غارت ہی تھا۔ ارمغان مشہدی کے دماغ کی رگ رگ دکھ چکی لیکن انہیں اپنا کوئی ایسا دشمن نظر نہیں آ رہا تھا جو اتنی سفاکیت سے ان کے گھر والوں کو موت کے گھاٹ اتارتا' بزنس رائیول ہوتا تو کاروبار میں ڈبوتا' خاندانی دشمنی ان کی کسی سے نا تھی' تو پھر کون...... کیوں......؟ اور ان سوالوں کے جواب پتا کرنے میں پولیس کو ایک طویل عرصہ لگا۔ جن دنوں افنان مشہدی شدید بیماری کی لپیٹ میں تھے، در حقیقت وہ بالا ہی بالا بہت خطرناک بندوں سے الجھ بیٹھے تھے، معاملہ فیکٹری کے لیے خریدی جانے والی زمین سے شروع ہو کر ان کی موت پر ختم ہوا۔ جس جگہ افنان مشہدی فیکٹری لگانا چاہ رہے تھے اس زمین کی پوری قیمت کی ادائیگی کے باوجود اس کے دعوے دار پیدا ہو گئے تھے۔ بقول ان کے یہ زمین وہ کب کے خرید چکے ہیں، انہوں نے افنان مشہدی کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ یہ جگہ فوراً خالی کی جائے یا انہیں اس کی قیمت چکائی جائے۔ افنان مشہدی ڈٹ گئے اور دونوں آپشنز پر عمل درآمد سے انکار دشمنی کو ہوا دے گیا۔ بات اس حد تک بگڑی کہ ایک دفعہ گھر واپسی پر افنان مشہدی پر قاتلانہ حملہ کروایا گیا مگر وہ بچ گئے۔ اس کے بعد شدید بیماری نے انہیں بہت دن تک گھر

بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ دشمن جو باہر تاک میں بیٹھا اکتا رہا تھا' گھر کے اندر گھس کر سب کو مار گیا۔ ارمغان مشہدی اور بچے قسمت سے بچ گئے۔

یہ تمام قصہ کھلنے سے ارمغان مشہدی کے زخم کھل گئے تھے، جن پر بمشکل کھرنڈ جمی تھی۔ انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا ڈالا۔ تمام اختیارات استعمال کر ڈالے مگر قاتل اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے اور سفاک دل بھی۔ ارمغان مشہدی کو تینوں بچوں کی زندگی عزیز تھی، جو ان کی کل کائنات تھے، بھلا اب ان کے پاس بچا ہی کیا تھا؟ اور یوں اس قصہ پر گرد پڑتی چلی گئی۔ ارمغان مشہدی کو بھی آتے آتے قرار آ ہی گیا۔ وہ بچوں کے وجود میں گم ہوتے چلے گئے' بچے چھوٹے تھے اور مدتوں سہمے بھی رہے' بڑا وقت لگا انہیں دوبارہ نارمل زندگی کی طرف لوٹنے میں' حور کے پاس تو پھر باپ تھا۔ فیضان اور برہان تو دونوں کے سائے سے محروم گم صم ہو چکے تھے' ارمغان مشہدی کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ دفتر سے جلدی اٹھ کر گھر پہنچیں اور زیادہ سے زیادہ وقت بچوں کے ساتھ بتا سکیں، لیکن جب بھی وہ گھر پہنچتے، برہان ہمیشہ انہیں اپنی کوٹھی کے ہی کسی کونے کھدرے میں بیٹھا ہوا ملتا، اپنے ماں باپ کے کمرے میں دو زانو بیٹھ کر بیڈ سے سر ٹیکے زار و زار روتا' جبکہ ارمغان مشہدی نے سختی سے منع کر رکھا تھا دونوں بھائیوں کو اس حصے میں جانے سے' فیضان تو نہیں جاتا تھا اور برہان باز نہیں آتا تھا' یہ صورتحال ارمغان مشہدی کے لیے بہت تکلیف دہ تھی، انہیں ڈر تھا کہ کہیں برہان نفسیاتی مریض نا بن جائے' اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ افنان مشہدی مرحوم کی کوٹھی بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔

کوٹھی بک گئی' دونوں کوٹھیوں کے درمیان دیوار اٹھوا دی گئی اور برہان کا وہاں جانا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا کیونکہ مالکان کوٹھی خرید کر خود کینیڈا واپس چلے گئے۔ ارمغان مشہدی نے سارا پیسہ دونوں بھائیوں کے نام سے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیا اور یوں اس خوف ناک اور ہول ناک حادثے کی آخری کڑی بھی ٹوٹ کر وقت کی ریت میں کھو گئی۔

کہنے کو سترہ سال بیت گئے لیکن وقت ہمیشہ ثبت کرتا ہے اپنے تمام نقوش' جو اس قدر پائیدار ہوتے ہیں کہ روندے ہوئے مسافر پہ گزری واردات کا تا عمر پتا دیتے ہیں۔ ارمغان مشہدی نے اپنا آپ بھلا کے اس گزرے زمانے کی باقیات کو کفن اوڑھایا تھا لیکن نا جانے کہاں کمی تھی کہ کفن میلا نہیں ہوتا تھا' بظاہر سب کچھ پرسکون تھا، سیٹ تھا پر "کچھ" تھا اور وہ کچھ سب سے زیادہ برہان کو ستاتا تھا۔ آج بھی ارمغان مشہدی آدھی رات کو لان کی تاریکی میں اک ہیولہ دیکھتے تھے جو بے چین سا ٹہلے جاتا تھا اور پھر تھک ہار کر سنگی بنچ پر بیٹھ جاتا جس کا رخ افنان مشہدی مرحوم کی سابقہ کوٹھی کی طرف تھا۔ وہ رات ارمغان مشہدی کی بھی کانٹوں پہ لوٹتے گزرتی' انہوں نے اپنے دونوں بھتیجوں کی پرورش میں رتی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ دونوں اعلا تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل تھے' جیسا چاہا پڑھا، جو چاہا پڑھا' فیضان ایم بی بی ایس کر کے اسپیشلائزیشن کے لیے باہر چلا گیا تھا اور اب وہیں پریکٹس کر رہا تھا' وہ بے حد سوبر اور مربوط شخصیت کا مالک تھا۔ بچپن کے بیتے حادثے نے اس پہ جو بد اثرات چھوڑے تھے، وہ بڑے ہونے تک کافی حد تک ان پر قابو پا چکا تھا۔ کچھ اس کی فیلڈ اتنی ٹف تھی کہ اسے دھیان بٹانے کے لیے بہت محنت نہیں کرنی پڑی' لیکن برہان کے ساتھ معاملہ بالکل الٹ تھا۔ برہان چوبیس سال کا بھرپور مرد ہوتے ہوئے بھی آج تک اس حادثے کی لپیٹ میں تھا' اس سانحے کے ساتھ نفسیاتی طور پر بندھ گیا تھا' گو کہ اب وہ محسوس کم کرواتا تھا لیکن جو ایک مخصوص خلا اس کی ذات میں پیدا ہو چکا تھا۔ اس خلا میں اب بھی سسکیوں اور آہوں کی بازگشت تھی' دونوں بھائی بے حد جاذب نظر اور ہینڈسم تھے' اوپر سے بہترین جامہ زیبی چار چاند لگاتی تھی۔ ارمغان مشہدی تینوں کو دیکھ دیکھ جیتے تھے اور اس مثلث کا تیسرا کونا حقیقی حور کی شکل میں سارے گھر کی رونق

مٹھی میں لیے ہوئے تھا' حور مجسم خوب صورتی تھی۔ وہ اب ننھی پری نہیں بلکہ سراپا رعنائی تھی' ایڈونچرز کی دلدادہ تھی اور سیر و سیاحت کی شوقین' ہر وقت کہیں نا کہیں کا پروگرام بنائے رکھتی تھی اپنی دوستوں کے ساتھ' کبھی کبھار تو ارمغان مشہدی اجازت دے دیتے تو کبھی ہری جھنڈی دکھا دیتے۔ ایسے میں حور کے پاس ایک ہی ہتھیار ہوتا اور وہ برہان کی معیت میں درخواست لے کر حاضر خدمت ہو جاتی اور اپنی منوا کے دم لیتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ارمغان مشہدی اپنے دونوں بھتیجوں کی کبھی نہیں ٹالتے۔ برہان ویسے بھی کم گو تھا' اگر وہ کسی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بولتا تھا تو وہ صرف دو انسان تھا' ایک ارمغان مشہدی تو دوسرا اس کے بچپن کا دوست امیر حمزہ۔

دونوں بچپن سے ساتھ تھے' والد بھی دوست تھے اس لیے گھروں میں بھی آنا جانا تھا۔ ایک ہی تعلیمی ادارے سے ایم بی آئی ٹی کر کے جاب کرنے کے خواہاں تھے لیکن بھلا ہو امیر حمزہ کے والد صاحب کا' جنہیں ہرگز یہ گوارا نہیں ہوا کہ اپنی فرم کے ہوتے ہوئے ان کا لاڈلا کسی اور کی جی حضوری کرے' بقول امیر حمزہ کے ''پاپا کو یہ برداشت نہیں ہوا کہ میں ان کے بجائے کسی اور کے جوتے کھاؤں۔''

اور امیر حمزہ کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنے ساتھ برہان کو بھی گھسیٹے' سو آج کل دونوں ہمایوں ہمدانی کی فرم کو رونق بخشے ہوئے تھے۔ چار دن لگے تھے اور برہان کے مزاج کو آفس کا ماحول موافق آنے لگا' ویسے بھی وہ فطرتاً ذمہ دار تھا' جس کام کو اپناتا تو پھر پوری تندہی کے ساتھ کرتا تھا' جبکہ امیر حمزہ اس سے الٹ تھا' کسی بھی چیز سے یکدم جی اچاٹ ہوتا تھا اس کا' پھر نا وہ موقع محل دیکھتا تھا اور نا مصلحت سے کام لیتا' فوراً سے پیشتر جان چھڑاتا تھا' جیسا کہ یہاں کام کرتے کرتے اس کا جی اکتا گیا تھا اور وہ کڑیاں تڑوا کر بس نکل بھاگنے کو تھا' حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاپا اتنی جلدی ریلیف دینے والوں میں سے نہیں لیکن وہ بھی انہی کا بیٹا تھا' واپس بھلے نہیں آتا تھا پر فی الحال وہ جا رہا تھا ہر قسم کی ٹینشن سے پاک' دور پہاڑوں سے گھری خوب صورت وادی کی اور جہاں تقدیر اسے کسی کی زندگی کے لیے بہت بڑا امتحان بنا کے لے جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ جب پیدا ہوئی تو اس کی ماں کینسر کی لاسٹ اسٹیج پر تھی' کچھ اس کی ماں کی کاوشیں اور کچھ قدرت کی منظوری کہ وہ اس دنیا میں چلی آئی ورنہ ڈاکٹرز نے تو سختی سے منع کیا تھا۔ ایک ایسی مریضہ جسے کینسر تشخیص ہوا ہو اور وہ بھی لاسٹ اسٹیج کا' اس کا بچہ پیدا کرنا وہ بھی بالکل صحت مند' یہ بات ڈاکٹرز کے لیے بھی بے حد حیرت انگیز تھی۔ میڈیکل سائنس کرشمات سے بھلے بھری پڑی ہے مگر ایسے رسک پھر بھی لیتے ہوئے کتراتی ہے۔

لیکن یہ رسک مدیحہ رحمانی نے لیا تھا' اپنے بیمار' کینسر زدہ وجود سے ایک صحت مند اور خوب صورت وجود سینچ کر حیدر رحمانی کے حوالے کیا تھا۔ جس کی چاہ وہ دونوں گزشتہ کئی سال سے کر رہے تھے اور جب قدرت مہربان ہوئی تو مدیحہ کی سانسیں دغا دینے والی تھیں۔ کتنے خواب دیکھ رکھے تھے ان دونوں نے اپنی اولاد کے لیے' شادی کو کئی برس گزر جانے کے باوجود اس جوڑے کی شدتوں میں کمی نہیں آئی تھی' دونوں کو بچے کی چاہ تھی پر آس نہیں بندھتی تھی' اس کے باوجود حیدر رحمانی اپنی قسمت پہ نازاں تھے کیونکہ مدیحہ جیسی شریک حیات پا لینے کے بعد انہیں زندگی مکمل لگتی تھی' وہ تو مدیحہ کو بھی بچے کے لیے اداس نہیں ہونے دیتے تھے اور پھر یکدم ہی جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑا تھا۔ معمول کی واک کرتے سر چکرایا' لڑکھڑانے سے پہلے ہی حیدر رحمانی نے تھام لیا۔ فکر مند سے وہیں سے اپنے دوست کے گھر لے گئے' جو چند فرلانگ کے فاصلے پر تھا' ان کی بیگم لیڈی ڈاکٹر تھیں اور گھر میں بھی کلینک چلاتی تھیں' حیدر رحمانی نے ابھی چائے کا کپ ختم نہیں کیا تھا کہ دوست کی بیگم' مدیحہ کو تھامے ان کے پاس لے

تیں اور جو خوش خبری سنائی اس کی تصدیق مدیحہ کا ماہتاب چہرہ کر رہا تھا' دوست نے اٹھ کر حیدر رحمانی کو گلے سے لگا لیا تو بے ساختہ ان کی پلکیں بھیگ ہی گئیں۔ گھر لاتے ہی حیدر رحمانی نے مدیحہ کو پھولوں سے بنا کر بیڈ پہ لٹا دیا اور پھر جس طرح اچانک ہی راہ چلتے انہیں یہ خوش خبری ملی تھی بالکل ویسے ہی حمل کا دوسرا ماہ شروع ہوتے ہی انہیں مدیحہ کی بیماری کا پتا چلا تھا۔ معمول کے چیک اپ کو جانے والی مدیحہ نے ڈاکٹر شمع زبیر کو ٹھٹکا دیا تھا' انہوں نے فوراً سے پہلے کچھ ٹیسٹ لیے تھے اور رپورٹس دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں جو تشویش اتری تھی اس نے مدیحہ کو اپنے بچے کے حوالے سے فکر مند کر دیا تھا۔ ان کی سبک اور نرم رو مدیحہ کی خوشیوں کو موت کا گرہن لگ گیا تھا۔

☆☆☆

مدیحہ کا کینسر آخری اسٹیج پر تھا' یہ بات اس سے چھپانے کا کوئی فائدہ نا تھا' اسے بتانا ناگزیر تھا تب ہی تو علاج کے لیے اسے رضامند کیا جا سکتا تھا اور اس سے بھی پہلے اابارشن کے لیے۔

ریڈی ایشن تھراپی بچے کے لیے بے حد نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے بچے کو ضائع کرنا ضروری تھا اور یہ بات جب مدیحہ کو پتا چلی تو اس نے واویلا کرنے کے بجائے پرسکون رہتے ہوئے ڈاکٹر سے صاف صاف لفظوں میں پوچھا تھا کہ اس علاج کے باوجود اس کے زندہ رہنے کے کتنے فیصد چانسز ہیں اور جواب میں ڈاکٹر کی آنکھوں میں اترتے مایوسی کے رنگوں کو پرکھ لیا تھا' وہ اس کی لفاظی پہ نہیں گئی تھی۔ وہ کسی بھی جھوٹی تسلی کے پیچھے اپنی اولاد نہیں مار سکتی اور یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

حیدر رحمانی کی ناراضی کے باوجود مدیحہ ڈٹ گئی اور پوری توجہ سے اس ننھی کونپل کی آبیاری میں جت گئی' جس کے اس دنیا میں آنے میں ابھی چھ ماہ باقی تھے۔

جس دن مدیحہ کے ہاں ولادت متوقع تھی' حیدر رحمانی جیسے برہنہ پا انگاروں پہ کھڑے تھے۔ ڈاکٹر زبیر آفاق سے انہوں نے پہلے ہی بات کر رکھی تھی کہ آپریشن کے فوراً بعد مدیحہ کا علاج شروع کر دیا جائے' جواب میں وہ بے چارے ایک بے چارگی سی مسکان ہونٹوں پہ سجائے انہیں دیکھ کر رہ گئے' وہ ان کی آس نہیں توڑ پائے تھے۔

اور پھر انتظار کے جان گسل لمحات کے بعد حیدر رحمانی کے ہاتھوں میں گلابی شام سا نرم وجود تھما دیا گیا۔ وہ ایک بچی کے باپ بن گئے تھے' مدیحہ اپنی دھن کی پکی نکلی' ان کی ہتھیلیوں کو محسوس ہوتا اچھوتا لمس ان ہی کے خون کا تھا' انہیں یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

بچی ان کے ہاتھ میں کسمسائی' اور ذرا سی آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا' اس کی گہری سیاہ آنکھوں کی چمک دیکھ کر سب سے پہلا جو خیال ان کے دل میں اترا وہ ہرن کے بچے کا تھا' انہیں سچ میں وہ ہرن کا بچہ لگی۔ نرم نازک' سبک اور معصوم اور اسی خیال کے زیر اثر حیدر رحمانی نے اپنی بیٹی کا نام لبوں سے ادا کیا۔ ''اوزے رحمانی۔''

☆☆☆

تین ماہ اور تین دن اوزے رحمانی کو اپنی ماں کی گود میسر رہی تھی' وہ تین ماہ اور تین دن مدیحہ رحمانی کی زندگی کا حاصل تھے۔ اس نے اس شدت سے اوزے پہ اپنی ممتا واری تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے ساری تشنگی سیراب ہو گئی ہو۔

جب بھی وہ نماز کے لیے نیت باندھتی تو آنسوؤں کا سمندر بند توڑ کر اس کا گریبان بھگو دیتا' سجدے میں گر کر وہ رو رو کر ایک ہی فریاد کیے جاتی۔

''اللہ بس تھوڑا سا وقت اور...... اللہ بس تھوڑا سا وقت اور......''

لیکن مشیت کے آگے کل خلقت بے بس ہے' اس کی سانسیں گنی جا چکی تھیں۔ حیدر رحمانی کی اس کے علاج کے سلسلے میں کی جانے والی ساری بھاگ دوڑ لاحاصل ٹھہری۔ کینسر پورے جسم کو لپیٹ میں لیے اپنی فتح کا جھنڈا گاڑے کھڑا تھا' حیدر رحمانی کا

بس چلتا تو وہ اپنی سانسیں مستعار دے دیتے' پر بس ہی تو نہیں تھا۔

ہسپتال کے بیڈ پر وینٹی لیٹر کے ذریعے آخری سانسیں لیتی مدیحہ رحمانی کی آنکھوں کی حسرت دیکھی نا جاتی تھی' جن کے کناروں سے آنسو قطار در قطار نکل کر بالوں میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔ ڈاکٹرز درد کی شدت میں کمی لانے والی ادویات کا استعمال کر رہے تھے پر جو اذیت اسے کاٹے دے رہی تھی وہ تو اوزئے سے دوری کی۔ حیدر رحمانی نے اس کا ہاتھ زور سے تھام رکھا تھا' آنکھیں متورم تھیں اور لب اک دوجے میں سختی سے پیوست۔ مدیحہ کے جسم کو لگنے والے جھٹکوں کی شدت میں اضافہ ہوا تو انہوں نے اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں قیمتی متاع کی طرح دبا لیا' مدیحہ نے دوسرے ہاتھ کے اشارے سے وینٹی لیٹر ہٹانے کو کہا' حیدر رحمانی نے اسے سرکا دیا پر مکمل ہٹایا نہیں، وہ بمشکل کچھ بول پا رہی تھی' حیدر رحمانی نے اپنا چہرہ اس کے قریب تر کر لیا۔

''حیدر...... حیدر...... پلیز کچھ کریں...... پلیز حیدر...... پلیز میری بچی ابھی بہت چھو...... چھوٹی ہے...... وہ رویا کرے گی...... مم...... میں قبر میں رو دیا کروں گی...... پلیز مجھے کچھ دن کے لیے بچا لیں...... میں اسے بہلا لوں...... پھر مر جاؤں گی...... ابھی بچا لیں...... وہ بڑا روئے گی حیدر...... مجھے نہیں مرنا ابھی...... پلیز...... کچھ دن' پلیز......''

مدیحہ کی سانسیں تیزی سے اکھڑنا شروع ہو چکی تھیں، وہ رو رہی تھی اب بول بھی نہیں پا رہی تھی' حیدر رحمانی نے آنکھیں سختی سے میچ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام کے سینے سے لگایا اور تب تک انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں جب تک اس کے ہاتھ ان کے ہاتھوں میں ڈھیلے نہیں پڑ گئے اور پھر انہوں نے دیکھا کہ مدیحہ کی بے جان آنکھوں کی پتلیاں ان پہ حسرت سے جمی ہیں تو وہ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو دیے۔ وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے' ایک آخری آنسو آہ بن کر مدیحہ رحمانی کی پلکوں سے ٹپک گیا۔

☆☆☆

دھند میں لپٹی صبح کا سرد جھونکا کمرے میں در آیا تو دو لحاف اوپر تلے اوڑھے، جگنو نے ذرا سی درز بنا کر ایک آنکھ سے ماحول کا جائزہ لیا' بابی جان کھڑکی کھول کے جا چکی تھیں' انہیں معلوم تھا کہ اسے ٹھنڈ نہیں، کھڑکی کھلی ہونے کی کوفت اٹھائے گی۔ اسے اس بات سے الجھن ہوتی تھی' وہ تو سر شام ہی کھڑکیاں بند کر دیا کرتی تھی حالانکہ قانتہ اس کی کھڑکی سے نظر آنے والے مناظر کو دیکھ کر ہمیشہ مبہوت ہوا کرتی تھی اور اسے ایسی بدذوقی پہ لتاڑا کرتی تھی لیکن وہ باز نہیں آتی تھی۔ شام پڑتے ہی درختوں اور پہاڑوں کے لمبے ہوتے سائے اور پھر اندھیرا پھیلتے ہی ہر منظر کا مدغم ہو جانا اس کے دل کو وحشت میں مبتلا کرتا تھا۔ اس کا جی کرتا کہ وہ دن کے اجالے کو کسی عطر کی طرح شیشی میں بھر سکتی تو روز رات پڑتے ہی وہ اس شیشی کا ڈھکن کھول دیتی۔ اجالا مہکتی خوشبو کی مانند پھیل کر اس کی کھڑکی سے باہر کا منظر بدل دیتا' اندھیرے فنا ہو جاتے۔

کچھ دیر بعد آبنوسی سنگھار میز کے آگے نزاکت سے بیٹھ کر اپنے لچھے دار گھنگریالے، سنہری تاریں لیے خوب صورت بالوں کو سنوارتے اس کی خواب ناک آنکھوں میں ابھی تک نیند کے گلابی ڈورے مہک رہے تھے۔ غلافی پپوٹے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے سورج کے اوپری کنارے پہ بادل کی ڈلی رکھی ہو، اس نے کاجل اٹھایا اور ایک باریک سیاہ لکیر نے گلابی ڈوروں کو گھیرے میں لے لیا۔ لپ گلوس نے چمکتے سرخ لبوں کو مزید جلا دی' سفید دودھیا چہرے کی جلد انار کے رس میں ڈوبی تھی۔ اتنی سرخی تھی کہ جیسے لہو ناخن رگڑنے سے رس آئے گا' اس نے آنکھیں پٹپٹائے اور پھر ذرا سا میچ کے اپنے چہرے کا جائزہ لیا' تسلی ہونے پر ایک ابرو اچکا کر مسکرا دی۔ وہ سچ میں مکمل تھی' اس کا چہرہ بے عیب تھا' اس کا حسن گہرے بھنور سا تھا کہ ہر پڑنے والی نگاہ کو نگل لیتا تھا' اپنے

بالوں کو ڈھیلا سا باندھ کر داہنے کندھے پر ڈالا اور کھڑی ہو گئی' اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ اپنے جوتے تلاش کر رہی تھی۔

''یہ رہے جگنو بیٹا! لو پہنو اور جلدی سے آ جاؤ۔ حیدر بیٹا کب سے راہ تک رہے ہیں' آپ کے نئے جوتوں کی چار جوڑیاں آئی رکھی ہیں' میں حبیبہ سے کہوں گی کمرے میں رکھ جائے' اب آپ جلدی سے آؤ۔''

اس نے ایک اچٹتی نگاہ اس خوب صورت سینڈل پر ڈالی، جس کی بناوٹ عام جوتوں سے ہٹ کر تھی۔ دوسری نظر اس نے اپنے پیروں پہ ڈالی جن کی بناوٹ عام پیروں جیسی ہی تھی، ہاں ان کا اجلا پن اور خوب صورتی اضافی خوبی تھی' اس نے تنگی سے سر کو جھٹکا اور ہلکا سا لنگڑا کر چلتی جوتوں کی سمت آئی اور ان میں اپنے پیر پھنسا کے استہزائیہ ہنس دیے۔

''بابا بھی نا' خواہ مخواہ میں میرے لیے اتنی مصیبت مول لیتے ہیں' بھلا ایسے جوتے پہن لینے سے میں لنگڑی نہیں رہوں گی کیا۔''

بابی جان کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا، وہ فوراً اس کے کندھے پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولیں۔

''مت بے کار کی باتیں کیا کرو جگنو! اللہ کا شکر ادا کیا کرو بیٹا کہ اس نے پورے اعضاء دے رکھے ہیں۔ ایک ذرا سی لنگڑاہٹ ہی تو ہے وہ بھی ان جوتوں کی وجہ سے محسوس بھی نہیں ہوتی' مت جی کو جلایا کرو' لاکھوں نہیں کروڑوں میں ایک ہے ہماری جگنو۔''

انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر ماتھا چوما اور اسے پچکارتے ہوئے ڈائننگ روم کی طرف لے آئیں' ڈھیلے پن سے چلتی وہ ان کے ہمراہ وہاں داخل ہوئی تو انگریزی اخبار کا مطالعہ کرتے حیدر رحمانی نے اخبار فوراً رول کر کے سائیڈ پر رکھا اور بیٹی کے سلام کا جواب اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اور اس کا ماتھا چوم کر دیا' یہ ان کا ہمیشگی معمول تھا، وہ جگنو کو دن کے آغاز میں یوں ہی ملتے تھے' وہ ان کی زندگی کا نور تھی' ان کا غرور تھی۔

''تو جناب اوزئے رحمانی یونی جانے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ ویسے اے ریمارک ایبل چینج' میں یہ ہی چاہتا تھا کہ اپنا ماسٹرز تم ریگولر اسٹوڈنٹ کے طور پر مکمل کرو۔ تمہارا کانفیڈنس بڑھے گا تو تم عملی میدان میں ترقی کر سکو گی بیٹا! اور ویسے بھی گھبرانے والی بات ہی کیا ہے' یونی تمہارے باپ کی ہے۔''

آخری جملہ انہوں نے گردن اکڑا کر محض اسے ایزی کرنے کے لیے بولا تھا لیکن وہ کھلکھلا کے ہنس دی' سامنے والی کرسی پہ خاموشی سے ناشتا کرتی بابی جان بھی ہنس دیں۔

حیدر رحمانی اس وادی کی واحد یونیورسٹی میں تب سے تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے جب سے اس کا آغاز ہوا تھا اور اس بات کو لگ بھگ پندرہ سال ہو چکے تھے۔

جگنو کی شکل پہ کوفت صاف دیکھی جا سکتی تھی مگر اسے ان دیکھا کرنا پروفیسر حیدر رحمانی کی مجبوری تھا، ورنہ اپنی ایک کمی کو لے کر جس طرح جگنو کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی، وہ ان کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں تھا' آخر کمی تھی ہی کیا۔ وہ مکمل تھی، اس کے اعضاء پورے تھے۔ وہ حسن کا مجسمہ تھی، صرف ایک چھوٹا سا ہی تو نقص تھا جس کو سر پر سوار جگنو نے خود کر رکھا تھا ورنہ اگر چاہتی تو پورے اعتماد سے سب کے شانہ بشانہ کھڑی ہوتی۔

مدیحہ رحمانی کی موت نے جس دوراہے پہ حیدر رحمانی کو لا کھڑا کیا تھا وہاں انہیں محض بے بسی کی دھند چھائی دکھائی دیتی تھی۔ انہیں کتنا وقت لگا سنبھلنے میں' چھوٹی سی بچی اور اس کی چھوٹی چھوٹی ان گنت ضروریات' تین ماہ مدیحہ نے کلیجے سے لگائے رکھا' کچھ اندازہ ہی نا تھا کہ کیسے اتنی سی بچی کی دیکھ بھال کریں۔

ان کی ملاقات اپنے پرانے کلاس فیلو سے ہو گئی اتفاق سے ایک دن بات چیت شروع ہوئی تو وہ دوست حیدر رحمانی کو اصرار کے ساتھ گھر لے آئے

اُن کی بیگم بھی بے حد تپاک سے ملیں' یہیں حیدر رحمانی کی ملاقات اماں خانم سے ہوئی۔ اماں خانم حالات کی ستائی ہوئی اور زمانے کی ٹھکرائی ہوئی بیوہ خاتون تھیں' ایک ہی بیٹا تھا' غیر قانونی طریقے سے انگلینڈ گیا' شروع کا کچھ عرصہ رابطے میں رہا اس کے بعد وہ گمشدہ ہو گیا' جان بوجھ کر یا جیسے بھی' پر اماں خانم کو اس کی کبھی کوئی خبر نہیں ملی' جس گھر میں رہائش تھی وہ دیور جیٹھ نے ہتھیا لیا' دفاع کون کرتا' بوڑھی عورت میں کہاں اتنا دم خم' دو جوڑوں کی پوٹلی بنا کے نکل پڑیں اور ڈھونڈتی ڈھانڈتی پہنچ گئیں باقر احمد کے گھر' جو دور سے ان کے سسرالی رشتے داروں میں سے تھے' باقر احمد شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ تھے' گھر میں بزرگ کے طور پر والد صاحب تھے جو خاصے موڈی آدمی تھے۔ باقر احمد کو کوئی اعتراض نہیں ہوا اماں خانم کی آمد پر بلکہ ان کی بیگم تو خوش ہوئی تھیں کہ سارا دن اکیلے وقت نہیں کٹتا تھا کہ اچانک باقر احمد کے ابا جی کو اپنے اکیلے پن کا احساس شدت سے جاگ اٹھا اور اس میں دگنی شدت آجاتی جب ان کی نگاہ اماں خانم پڑتی' گو کہ اماں خانم بے حد سادہ تھیں' انہوں نے خود پر بڑھاپا اوڑھ رکھا تھا۔ سیدھا بہو کو کہہ ڈالا کہ میرا نکاح ان بی بی سے کروا چھوڑو۔

گھر میں گویا بھونچال ہی آ گیا' سب ہی بوکھلا گئے۔

ایسے میں حیدر رحمانی کا ان کے گھر آنا رحمت کا باعث بنا' وہ اپنی جگہ بچی کے لیے پریشان تھے۔ دونوں دوستوں نے اپنی اپنی پریشانی کا ایک دوسرے سے ذکر کیا مانو ہر مسئلے کا حل نکل آیا۔ حیدر رحمانی کو اوزے کے لیے کسی خاتون کی اشد ضرورت تھی اور باقر احمد کو اماں خانم کے لیے کسی قابل اعتبار رہائش کی تاکہ انہیں وہاں شفٹ کر کے ابا میاں سے ان کی خلاصی کرائی جا سکے۔

بہت کم وقت میں اماں خانم' حیدر رحمانی کے گھر میں ایڈجسٹ کر گئیں' اوزے کی طرف سے بے فکری ہوئی سو ہوئی' گھر کی دیکھ ریکھ بھی اماں خانم نے اپنے ذمے لے لی' سب کچھ نارمل روٹین میں سیٹ ہوتا چلا گیا۔

اوزے ساڑھے تین سال کی ہو چکی تھی' اماں خانم میں دادی اور نانی دونوں رشتے ملے تھے اسے' اسی لیے چھوٹی سی نے ہی اپنی توتلی زبان میں نانی بلانا چاہا تھا یا دادی' لیکن وہ اس کی زبان سے بابی کی صورت ادا ہوا۔ اماں خانم کو یہ لفظ اس قدر بھایا کہ اس کے بعد اوزے کے منہ سے اپنے لیے بابی جان ہی کہلوایا۔ وہ ان سے بے حد اٹیچ تھی' ان ہی کے ساتھ سوتی تھی' نہلانا دھلانا سب بابی جان کے ذمے تھا اور کسی سے سنبھلتی بھی نہیں تھی اور پھر ان ہی دنوں سخت سردی نے بابی جان کو اپنی لپیٹ میں لیا تو وہ سدھ بدھ کھو کر بستر پر پڑ رہیں۔ اوزے کو بڑی مشکل سے حیدر رحمانی نے بہلا پھسلا کے اپنے ساتھ سلایا' کیونکہ بابی جان اس کو سنبھالنے کی حالت میں ہرگز نہیں تھیں' لیکن یہ ٹاسک حیدر رحمانی کے لیے خاصا مشکل ثابت ہوا' اوزے نے پہلی ہی رات ناکوں چنے چبوا دیے' رو رو کر جان ایک کیے رکھی اور جب ہچکیاں بندھ گئیں تو تھک ہار کر سو تو گئی مگر حیدر رحمانی کو چونکہ تجربہ نہیں تھا سو اس کو واش روم نا لے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے بستر گیلا کر دیا' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے' پر کتنی دیر' آخر کار اٹھے اور سب سے پہلے اوزے کو واش روم لے جا کر اس کو دھویا' سخت سردی اوپر سے پانی بھی کچھ خاص گرم نا تھا۔ سونے پہ سہاگا کہ اسے گیلی حالت میں سائیڈ پر کھڑا کر چھوڑا اور خود بستر صاف کرنے لگے' اس کام میں خاصا وقت صرف ہو گیا' بچی تب تک ٹھٹھر ٹھٹھر کر نڈھال ہو چکی تھی' اس کے نیلے پڑتے ہونٹ اور برف کی سِل جیسی ٹانگیں دیکھ کر حیدر رحمانی نے سچ میں اپنی عقل پر ماتم کیا۔ دکھ اور افسوس میں گھرے انہوں نے فٹافٹ اس کے کپڑے بدلے اور فوراً گرم کمبل میں لپیٹ کر لٹا دیا۔ اوزے نے اس دفعہ تنگ نہیں کیا تھا بلکہ وہ کانپ کانپ کے اس قدر نڈھال ہو چکی تھی کہ جلد ہی غنودگی میں چلی گئی۔ حیدر رحمانی نے شکر کا کلمہ پڑھا

PakiBooks.Site

تھا' مگر اس رات کی' کی گئی ایک غلطی کا خمیازہ انہیں اس صورت بھرنا پڑا کہ پچھتاوا آج تک ان سے لپٹا پڑا تھا' اور مداوا کچھ بھی نا تھا۔

اوزے کو فجر کے قریب شدید بخار نے لپیٹ میں لے لیا' جو دن چڑھے مزید شدت اختیار کر گیا' کپکپی تھی کہ جاتی نا تھی' ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگے تو اس نے نمونیہ کا اٹیک قرار دیا۔

بخار اتر گیا پر اثرات چھوڑ گیا' اوزے کی دائیں ٹانگ کے پٹھے سکڑ گئے' اس کی چال میں معمولی سی لنگڑاہٹ آ گئی۔

ڈاکٹر کے مطابق فزیوتھراپی سے کچھ فرق ضرور پڑ جاتا لیکن مکمل طور پر لنگڑاہٹ ختم ہونے کے امکان واضح نہیں تھے۔

جوں جوں اوزے بڑی ہوتی گئی وہ اپنی اس کمی کو محسوس کرنے لگی تھی' وہ اس قدر خوب صورت تھی کہ لوگوں کی نگاہ جیسے ہی اس کے انتہائی حسین چہرے سے ہٹ کر اس کی چال پر پڑتی وہ تاسف میں گھر جاتے' انہیں اتنے مکمل حسن کے ساتھ جڑا یہ عیب افسردہ کر دیتا اور پھر ان کا اظہار افسوس اوزے کو احساس کمتری کی طرف دھکیل دیتا' وہ دوست پہلے بھی نہیں بناتی تھی' مزید تنہائی پسند ہوتی چلی گئی' رفتہ رفتہ اس نے اسکول جانا ترک کر دیا۔ حیدر رحمانی اور بابی جان نے سر توڑ کوشش کر ڈالی اسے سمجھانے کی لیکن وہ کافی حد تک ضدی واقع ہوئی تھی' اس کی نا ہاں میں نا بدلی۔ حیدر رحمانی نے تنگ آ کر اسے گھر پر ٹیوٹر کا انتظام کر دیا۔ یوں اوزے نے پرائیوٹ تعلیم جاری رکھتے ہوئے تمام مدارج طے کیے' حیدر رحمانی میتھمیٹکس کے جانے مانے پروفیسر تھے اور بیٹی نے واجبی سے نمبرز کے ساتھ بی اے کیا تھا' پڑھائی کی طرف اس کا رجحان بس اسی قدر تھا کہ تھرو آؤٹ نارمل گریڈز کے ساتھ کلیئر ہوتی آئی تھی' ہاں ادب سے شغف تھا اور کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا اس کے پاس' حیدر رحمانی بھی ہر آتے جاتے کے ہاتھ اس کے لیے کتابیں منگواتے رہتے تھے' یقیناً پوری وادی میں اس سے زیادہ کسی کے پاس اتنی کتابیں نہیں تھیں۔ حیدر رحمان کا خیال تھا کہ ماحول کی تبدیلی سے اوزے میں مثبت تبدیلیاں پیدا ہوں گی لیکن یہاں آ کر بھی اس کا وہی چلن رہا' نا کہیں آنا جانا اور نا ملنا ملانا' کافی عرصہ بیت جانے کے بعد بس ایک ہی دوست بن پائی تھی اس کی' قانتہ۔

اس دوستی کی پائیداری میں بھی زیادہ ہاتھ قانتہ کا اپنا تھا' وہ حیدر رحمانی کے خوب صورت ولا سے دو گھر چھوڑ کر ہی رہتی تھی۔ بے حد سرخ و سفید چہرے پہ چھوٹے چھوٹے بھورے تل لیے وہ قدرے موٹے نین نقشوں کی باتونی سی لڑکی تھی جو باتوں سے کسی کے بھی دل میں جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی' اپنی اسی خوبی کی بنیاد پر آج وہ اوزے رحمانی کی واحد اور بہترین دوست تھی۔

اوزے نے اس وادی میں آ کر بھی ریگولر اسٹوڈنٹ کے طور پر نہیں پڑھا تھا' حیدر رحمانی اتنے حیلے کر کے بھی اسے اس کے خول سے باہر نہیں نکال پائے تھے۔ اوزے لوگوں کو فیس کرنے سے ڈرتی تھی' بابی جان سے اور حیدر رحمانی سے وہ بے حد قریب تھی لیکن ایک دوست کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور یہ کمی قانتہ نے بھرپور طریقے سے پوری کی تھی' وہ زیادہ تر ''رحمانی ولا'' میں ہی پائی جاتی تھی۔ دونوں نے ایک سے ہی مضامین میں گریجویشن کیا تھا' قانتہ یونی کی ریگولر اسٹوڈنٹ تھی اس لیے وہ اپنے نوٹس اوزے کے ساتھ شیئر کرتی تھی۔ روزانہ شام کو چھوٹے سے باغیچے میں گلابوں کے جھنڈ کے قریب بیٹھ کر قانتہ اونچی اونچی آواز میں رٹے مارتی جبکہ اوزے اپنی فطرت کے عین مطابق اردگرد کے نظاروں میں کھوئی رہتی۔ ''رحمانی ولا'' جس جگہ واقع تھا وہاں سے قدرت کے حسین مناظر چہار اطراف سے دل لبھاتے تھے' اونچی نیچی ڈھلانوں سے پرے اونچے پربت اور ان کی چوٹیوں پہ جمی برف' جنگلی پھولوں اور پھلوں سے لدے خوبصورت پیڑ' ساری فضا ایک عجیب سی خوشبو سے مہکتی تھی اور یہ خوشبو

اوزے کو مدہوش کرتی تھی' وہ آنکھیں بند کیے کتنی ہی دیر اس مہک کو اپنے اندر اتارتی تھی اور اس کام سے وہ کبھی بھی بور نہیں ہوتی تھی' اسے چھوٹی سی عمر سے پھول، تتلی اور جگنو اپنی اور کھینچتے تھے۔ پرانے گھر کے لان میں وہ برسات کے موسم میں اکثر جگنو پکڑ کر اپنی فراک کے دامن میں بھر لاتی اور پاکس روم کے اندھیرے میں گھس کر انہیں تکتی رہتی تھی اور جب بابی جان اسے ڈھونڈتی ڈھانڈتی وہاں پہنچتیں تو وہ انہیں پسینے میں شرابور خوشی کے انوکھے رنگ چہرے پہ لیے ملتی۔ حیدر رحمانی نے اسے پیار سے جگنو بلانا شروع کر دیا' دھیرے دھیرے بابی جان اور ملازم بھی اسے اسی نام سے پکارنے لگے، یوں اوزے رحمانی گھر بھر کا وہ چمکتا جگنو بن گئی جس کا دلربا چہرہ ان کی بے رنگ زندگیوں میں روشنی کی ضمانت بن چکا تھا۔

☆☆☆

قانتہ اور بابی جان کی ملی بھگت کی وجہ سے گریجویشن کے بعد حیدر رحمانی نے اس کا ایڈمیشن زبردستی ''قراقرم انٹرنیشنل یونیورسٹی'' میں کروا دیا۔ اس دفعہ وہ اسے کسی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھے اور اس میں قانتہ اور بابی جان ان کا بھرپور ساتھ دے رہی تھیں' دونوں چاہتی تھیں کہ وہ بھی نارمل لوگوں کی طرح تعلیم حاصل کرے' حیدر رحمانی نے اس کے ہوش سنبھالتے ہی اس کے لیے اس طرز کے جوتے بنوانے شروع کر دیے تھے' جس کے داہنے جوتے کی ہیل دوسرے سے قدرے اونچی تھی، انہیں پہن کر جگنو کی ٹانگ کا نقص اسی فیصد چھپ جاتا تھا' لیکن جگنو ایسا نہیں سوچتی تھی وہ خود کو نارمل ہی تو نہیں لیتی تھی، جس وقت چلتے ہوئے اس کی ٹانگ کی معمولی سی لنگڑاہٹ پہ کسی کی سرسری نگاہ بھی پڑ جاتی اور وہ نگاہ جگنو کی نظروں میں آ جاتی۔ اسی وقت اس کا مشکل سے بحال کیا ہوا اعتماد بھاپ بن کے اڑ جاتا' اور کنفیوژن میں اسے لگتا جیسے اس کی ٹانگ مزید کھنچ گئی ہو اور یہ عیب پہلے سے زیادہ شدت سے ظاہر ہو رہا ہو' قانتہ اسے اس کی خام خیالی کہتی تھی، اس کا حوصلہ بڑھائے رکھتی۔ اسی کی کارروائیوں کا نتیجہ تھا کہ اس بار حیدر رحمانی نے جگنو کے ہر قسم کے احتجاج کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کا ایڈمیشن اردو ڈیپارٹمنٹ میں کروا دیا تھا اور ایسا صرف اس کے رجحان کو دیکھتے ہوئے کیا تھا۔ بے چاری قانتہ کو بھی یہیں سر کھسیڑنا پڑا تھا حالانکہ اسے مرزا غالب کو چچا غالب کہنے کی عادت تھی اور علامہ اقبال کو وہ ''منڈیا سیالکوٹیا'' پکارا کرتی تھی۔ آباؤ اجداد پنجابی تھے لہٰذا پنجابی میں زبان خاصی صاف تھی' اب مجبوراً اردو ادب پڑھنا تھا اور سر دھنا تھا۔ آج اس کا اور جگنو کا پہلا دن تھا اور جگنو کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی' ان کی دوستی انمول تھی۔

☆☆☆

''یار! ابھی کتنا سفر باقی ہے' میری تو ہڈیاں ہل ہل کے ڈنڈیاں بن گئی ہیں اب۔''

امیر حمزہ نے اکتا کر چہرے پر سے ہیٹ ہٹا کر اردگرد کے نظاروں کو دیکھا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے بولا' اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ وادی تک کا سفر اس قدر طویل ہوگا۔ برہان نے اس کے سگریٹ کا پیکٹ تھامے ہاتھ کو چپت رسید کی اور اسے تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے حور کی طرف اشارہ کیا' مطلب وہ خاتون کی موجودگی میں اس شغل سے پرہیز کرے۔ امیر حمزہ نے قدرے اچک کر حور کو دیکھا اور منہ پہ ہیٹ رکھ کر ہنس دیا۔

''جس کے لیے تم مجھے سگریٹ سے منع کر رہے ہو ذرا ایک نظر اس پہ بھی تو ڈالو۔ بڑا شوق تھا محترمہ کو حسین نظارے دیکھنے کا' سارے نظارے ان کی نیند کی نذر ہو گئے۔''

برہان نے چہرہ ترچھا کر کے حور کو دیکھا تو وہ سیٹ بیک سے سر ٹکائے، آنکھوں پہ اسٹائلش گلاسز لگائے، ادھ کھلے منہ کے ساتھ ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ اس حال میں بھی وہ بلا کی پرکشش دکھ رہی تھی، برہان نے نگاہ پھیر لی جبکہ امیر حمزہ ابھی بھی اسے دیکھتا ہوا اب سگریٹ سلگا رہا تھا۔ وہ بے حد قیمتی

برانڈ پیتا تھا اور بڑے اسٹائل سے پیتا تھا۔ اس نے ڈرائیور سے شاید پوچھا تھا کہ وہ لوگ مزید کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے۔ جواب میں ڈرائیور نے اپنی ہی زبان میں اللہ جانے کیا کہا جو کش لیتے ہوئے امیر حمزہ کے سر پہ سے گزر گیا۔

''اس نے یقیناً ہمیں گالی دی ہے یار! جیسے ہم لوگ فارنرز متھے لگ جائے تو اسے پنجابی میں دیتے ہیں۔'' اس نے بے حد یقین کے ساتھ برہان کے کان میں گھس کے کہا' برہان نے اس کے منہ سے خارج شدہ دھوئیں کو ہاتھ سے اڑایا اور بولا۔

''تم...... صرف تم...... ہر کام میں ہم نہیں ہوتے میر! میں ایسی فضول حرکات سے پرہیز ہی کرتا ہوں اور یہ ڈرائیور اپنی مقامی زبان بول رہا ہے' جسے بروشسکی کہتے ہیں' دنیا کی تنہا اور مشکل زبان بھی جانی ہے یہ۔''

''ہونہہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس نے بولا کیا۔ کیا ارمغان انکل کے دوست بھی یہی زبان بولتے ہیں' اگر ایسا ہے تو بیٹا یہیں سے واپس ہو لیتے ہیں' اب ان کی زبان کون ٹرانسلیٹ کرے گا بھلا۔''

''بکواس بند کرو اور انسان بن کے ان کے گھر رہنا' ورنہ بڑے بابا تمہاری پسلیاں تمہارے پاپا سے سینکوانے کا پرمٹ لیے بیٹھے ہوں گے واپسی پر' انکل حیدر اردو اسپیکنگ ہیں اور یہاں اب اکثریت اردو سمجھتی بھی ہے اور بولتی بھی ہے' یہ ڈرائیور سیدھا سادہ آدمی ہے اس لیے اپنی زبان کے علاوہ دوسری کسی زبان سے نابلد ہے۔ میں اور فیضان بھائی بڑے بابا کے ہمراہ دو تین دفعہ یہاں آ چکے ہیں لیکن تب ہم دونوں کافی چھوٹے تھے، اب تو یہاں کافی مثبت تبدیلیاں دکھائی دے رہی ہیں۔''

''ہاں یار...... کافی مثبت۔''

امیر حمزہ کی کھوئی کھوئی آواز پہ برہان نے اس کی طرف دیکھا تو وہ باہر پیدل گزرنے والی مقامی لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا' ایک لمبا سانس بھر کر اس نے اسے ٹہوکا دیا اور دھیان اپنی جانب کروایا۔ امیر حمزہ فوراً الرٹ ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ویسے یہ کون سا علاقہ ہے جہاں سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اور ہمیں کتنا وقت اور لگے گا یار! پرسوں اسلام آباد سے گلگت ہم جہاز سے پہنچے۔ چلو کوئی دشواری نہیں ہوئی، ایک دن گلگت میں تمہاری ان منگیتر صاحبہ نے برباد کیا، مقصد بے کار کی شاپنگ اور الم غلم اکٹھا کرنا۔ اب گلگت سے نکلے ہوئے بھی ہمیں کتنا ہی وقت بیت گیا یار! کب پہنچیں گے ہم۔''

اچھل کر پہلو بدلتے ہوئے ساتھ میں سب کے انجر پنجر ہلا گیا' حور نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں اور منہ بند کیا۔ ڈرائیور نے بھی بیک ویو مرر سے اسے گھورا تو وہ انجان بن کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا' برہان نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافے کی خاطر تفصیلاً جواب دیا۔

''ہم وادی ہنزہ کے خوب صورت ترین قصبے کریم آباد جا رہے ہیں جو اونچی اونچی چوٹیوں سے گھرا ہے، جس کے نظارے دنیا بھر میں مشہور ہیں اور یہ گلگت سے سو کلو میٹر کے فاصلے پر ہے جو تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کا سفر بنتا ہے۔ تم ایک دفعہ پہنچ لو پھر تمہیں اندازہ ہوگا یہاں کی دلفریبی کا' یہاں ایک قلعہ ہے جو تقریباً سات سو سال پرانا ہے اور یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے' خیر یہاں کے سبھی مناظر بے حد دلکش ہیں' جنہیں دیکھ لینے کے بعد جی ہی نہیں چاہتا واپس جانے کو' سیاحت کے اعتبار سے مشہور ترین قصبہ ہے کریم آباد۔''

اس نے بات مکمل کر کے امیر حمزہ کو دیکھا جو شیشے سے سر ٹکائے اونگھ رہا تھا' دوسری طرف حور بھی دوبارہ سے نیند میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ برہان بے حد بدمزا ہوا' بھلا ایسے فطرت کے نظارے دیکھنے کو ملیں تو کوئی سوتا ہے کیا۔ ایک طویل سانس خارج کر کے اس نے دل جمعی سے باہر دیکھنا شروع کیا' لیکن ایک خیال اس کے دماغ میں لمحے بھر کو ضرور آیا۔

''امیر حمزہ اور حور کے مزاج میں کس قدر

مماثلت ہے۔"

☆☆☆

وہ بڑی دیر سے باغیچے میں بیٹھی پین ہاتھ میں لیے اسے انگلیوں میں گھمائے جا رہی تھی' گود میں رکھے رجسٹر پر ایک لفظ نہیں لکھا تھا اس نے' حیدر رحمانی کافی وقت سے اسے اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہے تھے۔ آخر باہر اس کے پاس چلے آئے' آج قانتہ نہیں آئی تھی، اس کی بڑی بہن کو لوگ دیکھنے آ رہے تھے اس لیے ورنہ تو اس وقت پورا باغیچہ پرندوں کی آوازوں سے کم اور اس کی چہچہاہٹ سے زیادہ گونجا کرتا تھا۔

"جگنو! کیا سوچ رہا ہے میرا بچہ' کب کا دیکھ رہا ہوں' ایک ہی نقطے کو گھورے جا رہی ہو۔ اپنے باپ کو بھی بتاؤ تاکہ میں بھی اس نقطے کا اسرار جان سکوں۔"

ہلکے پھلکے انداز میں بولتے وہ بالکل دوست لگتے تھے' جگنو نے ایک آنکھ میچ کے ان کو تاڑا' سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لینے کے بعد مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہمم...... آپ میں ابھی وہ اہلیت نہیں ہے جناب جو ایک نقطے کا اسرار سمجھ سکے' اس کے لیے جگنو ہونا پڑتا ہے' آپ پہلے جلنا سیکھیں، پھر اس جلن کو نس نس میں پرو کے روشنی پیدا کریں۔ اس روشنی کو ملکیت نا بنائیں' دے دیں اسے، جن کے لیے وہ ہے' تب کہیں جا کر نقطے کا اسرار جانیں گے آپ۔"

اس کی شرارتاً کی گئی طویل بات کی گہرائی نے حیدر رحمانی کو ٹھٹکا دیا تھا' انہوں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا' وہ کہیں سے بھی سنجیدہ نہیں دکھائی دے رہی تھی' لیکن پھر بھی انہیں مخمصے میں ڈال گئی تھی' انہوں نے سر جھٹک کے دھیان ہٹایا اور اسے دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولے۔

"آج کا دن کیسا رہا یونی میں' کوئی دشواری تو نہیں ہوئی میرے بچے کو؟"

"قانتہ کے ہوتے ہوئے آپ جانتے ہیں کہ مجھے کوئی دشواری نہیں ہو سکتی۔ وہ تو بجلی کی طرح ٹینشن کو چبا کے پٹاخے بجاتی ہے' میرے پاس تو وہ کوئی بندہ نہیں پھڑکنے دیتی، دشواری کی سواری کیسے گزرنے دے گی بھلا۔"

حیدر رحمانی اس کا جواب سن کر کھلکھلا کر ہنس دیے' وہ قانتہ کو بخوبی جانتے تھے، وہ سچ میں ایسی ہی تھی' انہوں نے ہنسی روک کر ایک نگاہ سارے میں ڈالی اور لمبا سانس پھیپھڑوں میں بھرا۔

"ارمغان مشہدی کا بھتیجا آ رہا ہے یہاں' ساتھ اس کا بچپن کا دوست اور مشہدی کی بیٹی بھی ہے۔ چند دن رہیں گے، تفریح کی غرض سے' بابی جان سے کہو حبیبہ کو کہہ کر اوپر کے دونوں کمرے صاف کروا لیں۔ ایک میں دونوں لڑکے رہ لیں گے اور دوسرے میں اس بچی کو ٹھہرا دینا' مشہدی نے بیٹی کی منگنی بھتیجے سے کر رکھی ہے۔ ویسے اچھا ہے ایک تو ذرا گھر میں رونق بھی ہو جائے گی اور دوسرا تمہیں بھی کمپنی ملے گی، ورنہ قانتہ کے علاوہ تو تمہیں شاید وادی کی کسی لڑکی کا نام بھی نا پتا ہو' اس سے دوستی کرنا تاکہ تمہارے بھی من کا ٹیسٹ بدلے' ٹھیک ہے نا؟"

وہ اسے شرارت سے دیکھ رہے تھے' جبکہ اس کا چہرہ سنجیدہ تھا، وہ پین کا کیپ لگاتے ہوئے بولی۔

"ضروری تو نہیں کہ انکل مشہدی کی بیٹی بھی ٹیسٹ بدلنے میں انٹرسٹڈ ہو' ہو سکتا ہے ایک لنگڑی لڑکی اس کی چوائس ہی نا ہو' ٹھیک ہے نا بابا؟"

ان ہی کے انداز میں بولتی وہ حیدر رحمانی کو بے حد ظالم لگی' وہ کبھی بھی اسے خدا ترسی کی کیفیت سے نکال نہیں پائے تھے' ابھی بھی انہیں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"جگنو! بچے مت بولا کرو ایسا' یہ ناشکری ہے۔ رب ناراض ہوتا ہے، کہیں پکڑ نا کر لے۔ کس بات کی کمی ہے بیٹا تم میں' لوگ مجھے کہتے ہیں کہ پروفیسر صاحب اللہ نے پریوں سی بیٹی دی ہے آپ کو۔ مجھے چھوڑو، سب تمہارے منہ پر کہتے ہیں' کیا کبھی تم نے اس بات پہ شکر ادا کیا؟ تم ہمیشہ اسی بات پہ رنجیدہ کیوں رہتی ہو جو تمہاری پیٹھ پیچھے ہوتی ہے اور نا

جانے ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ میرے بچے! میں تمہاری یہ کمی تو پوری نہیں کر سکتا لیکن تمہاری صلاحیتوں کی نشاندہی ضرور کر سکتا ہوں' تم ان کو دیکھو اور آگے بڑھو۔ آج کی دنیا میں جسمانی عیب کی کوئی اہمیت نہیں' لیکن تب تک جب تک آپ خود اسے اہم نا جانو' بالکل ویسے ہی جیسے آپ کی صلاحیت تب ہی ابھر کر سامنے آتی ہے جب آپ خود اس کی پرکھ کرتے ہو۔"

"میں کیا کروں بابا! مجھے ہمیشہ ایسا ہی لگتا ہے کہ سب میرے لنگڑا کر چلنے کو ہنس کر دیکھتے ہیں۔ میری نقل کرتے ہیں' میرا مذاق بناتے ہیں' جب یہ خیال آتا ہے تو میں اندر سے ڈھے جاتی ہوں۔"

سر جھکا کر اعتراف کرتی وہ بہت معصوم لگ رہی تھی' غلافی آنکھوں پہ پلکیں کسی آبشار کی مانند دکھائی دیتی تھیں' حیدر رحمانی کو اس پہ بے طرح پیار آیا' کاش وہ اسے ثابت کر سکتے کہ وہ کتنی پیاری اور مکمل ہے۔

"یہ سب میرے بچے کا وہم ہے' اس کا علاج میرے پاس ہے' وہ یہ کہ وہم کا سینہ تان کر اور ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ وہم اور خوف ایک ہی کیفیت کے دو رخ ہیں' وہم پختہ ہو جائے تو خوف کا روپ دھار لیتا ہے اور ان دونوں کا ایک ہی حل ہے کہ انہیں اپنے اعصاب پر حاوی نا ہونے دیا جائے۔ پچھاڑ کر رکھ دیا جائے اور ایسا کرنے کے لیے طاقت آپ کو خود سے ہی مستعار لینی پڑتی ہے' سو میں امید کرتا ہوں کہ میری بہادر اور نئے مہمانوں کے سامنے اپنے وہم پہ قابو پاتے ہوئے انہیں مکمل اعتماد کے ساتھ ریسیو کرے گی، ہیں نا؟"

انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بڑے مان کے ساتھ دریافت کیا' جواب میں اس نے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ حیدر رحمانی بشاش سے اس کا ماتھا چوم کر گھر کے اندر چل دیے' جبکہ جگنو نے اپنی نگاہیں سامنے سیاہ پربت کے پار ڈوبتے سورج پہ گاڑ دیں' ایسے میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ ایک بار پھر پھیکی پڑ چکی تھی۔

☆☆☆

حیدر رحمانی کا بھیجا ہوا ڈرائیور مہمانوں کو لے کر پہنچ گیا تھا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے اس نے مہمانوں کا جائزہ لیا' وہ تین تھے' حیدر رحمانی اور بابی جان ان سے گیٹ پہ مل رہے تھے' اس نے ذرا سا اچک کر ان لوگوں کو دیکھا' دو لڑکے تھے، ہینڈسم اور دراز قد، لیکن ایک کی ہائیٹ ذرا زیادہ ہی لمبی تھی اور وہ مسلسل جگالی کرتے ہوئے ارد گرد دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے سر پہ ہیٹ ڈال رکھا تھا اس لیے بال دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن اس کی آنکھوں کی خیرہ کن چمک اسے فاصلے سے بھی محسوس ہوئی تھی اور وہ سیاہ تو ہرگز نہیں تھیں۔ اس کی خوب صورت کھڑی ناک اور گولڈن براؤن مونچھوں تلے بھرے بھرے گلابی لب' اس نے شیو بڑھا رکھی تھی اور اس کی داڑھی کے بال ہلکی سنہری دھوپ میں سونے کی تاروں کی طرح جگمگا رہے تھے' وہ مرد بلا کا حسین تھا۔ جگنو نے دل میں اعتراف کیا' اس نے ایک اچٹتی نگاہ لڑکی پہ ڈالی، جو آف وائٹ پونچو اور فلیپر میں بالکل مکھن کی ڈلی لگ رہی تھی' اس کی جلد بے حد تر و تازہ اور شفاف تھی۔ جگنو یقین سے کہہ سکتی تھی کہ جب یہ لڑکی چہرہ دھوتی ہو گی تو پانی چہرے پہ نہیں ٹھہرتا ہو گا اور اس کے پہلو میں کھڑا وہ دوسرا مرد۔ وہ سوچ رہا تھا اس کے ساتھ' اسے یاد آیا کہ بابا نے بتایا تھا کہ ساتھ میں ان کے دوست کی بیٹی، ان کے بھتیجے کی منگیتر بھی ہے، تو یقیناً یہ ہی دونوں ہوں گے جب ہی اتنے قریب کھڑے ہیں' اس لڑکے کی رنگت بھی بہت سفید تھی اور جسم کسرتی۔ نین نقش بھی کھڑے اور بال ایک دم سیاہ اور سلکی' اس نے بھی شیو بڑھا رکھی تھی' بائیں بازو پہ لانگ کوٹ ڈال رکھا تھا۔

ایک تفصیلی نظر میں مکمل جائزے کے بعد جگنو کا دل کوفت سے بھر گیا۔ "اور بابا کہتے ہیں کہ میں ان سے گھلوں ملوں، یہ تینوں کس قدر مکمل اور خوب

صورت ہیں، بھلا مجھ میں ان کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی یہ کون سا مجھ سے دوستی کرنے آئے ہیں، سیر سپاٹا کریں گے اور نکل لیں گے' مجھے قاتنہ ہی بہت ہے۔"

وہ قنوطیت میں مبتلا اور بے دھیانی میں انہیں دیکھتی یہ ہی سب سوچ رہی تھی جب یک دم آنے والوں میں سے ایک کی نگاہ اس پر پڑی اور اس کے ہونٹ میکانکی انداز میں سیٹی بجانے والے انداز میں سکڑ گئے یعنی یہ جگہ دلچسپی کے سامان سے خالی نہیں' ایک خوش گوار احساس کے تحت وہ مسکرایا اور اپنے میزبان کی معیت میں گھر کے اندر کا رخ کیا۔

☆☆☆

دوپہر کو کھانے کی میز پر وہ بابی جان کے تقریباً دھکے دے دے کر لانے پر کمرے سے باہر آئی تھی' ڈائننگ روم میں اس کے داخل ہوتے ہی یک دم سناٹا چھا گیا۔ وہ چہرے سے ہی بے حد گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی' اس کی لڑکھڑاہٹ کو مہمانوں نے اس کی گھبراہٹ سے منسوب کیا بلکہ وہ تینوں تو مبہوت سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ وہ چاندی کی گڑیا کی طرح تھی، ڈھالی ہوئی تخلیں مورت، اتنا مکمل حسن کہ نظر سیر نا ہو اور نظر سیر ہو تو جی نا بھرے۔

جب کہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ سب اس کا جسمانی عیب بھانپ چکے جب ہی اسے دیکھے جا رہے ہیں۔ اس کی پراگندگی محسوس کرتے ہوئے سب سے پہلے حور اٹھی تھی اور پورے جوش کے ساتھ اس کی طرف بڑھی تھی، کمرے میں چھایا فسوں تحلیل ہو گیا اور سب نارمل دکھائی دینے لگا۔ حور نے بھرپور طریقے سے اس سے معانقہ کیا تھا اور اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر اسے یوں کرسی کی طرف لے کر آئی جیسے وہ مہمان نہیں میزبان ہے، حیدر رحمانی نے اس کے اس عمل کو ستائشی نظر سے دیکھا اور لڑکوں سے مخاطب ہوئے۔

"ہاں بھئی جنٹلمین! یہ ہے میری پیاری اور اکلوتی بیٹی اوزے رحمانی، جسے میں پیار سے جگنو بلاتا ہوں۔"

خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا، حور بہت باتونی اور ہنس مکھ لڑکی تھی، منٹوں میں اجنبیت ختم کیے وہ اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے کب سے آتی جاتی رہی ہو۔ بابی جان نے حبیبہ کی مدد سے بہترین کھانا تیار کیا تھا' وہ تینوں رغبت سے کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد قہوے کے لیے بابی جان نے ہال میں بلوالیا، جہاں فرشی نشستیں بہت منفرد تاثر پیش کر رہی تھیں۔ کرسیاں چھوڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے امیر حمزہ اور برہان نے احتراماً حیدر رحمانی اور دونوں لڑکیوں کو راہ پیش کی کہ وہ پہلے آگے بڑھیں پھر وہ دونوں ان کی تقلید کریں اور ایسے ہی کسی لمحے سے جگنو کی جان جاتی تھی مگر وہ کب تک پردہ ڈال سکتی تھی۔ آنکھیں میچ کے ایک گہرا لمبا سانس اس نے اپنے اندر کھینچا اور سب سے پہلے قدم بڑھائے' وہ ایک ٹانگ کھینچ کر چل رہی تھی، لنگڑاہٹ اس نوعیت کی تھی کہ غور کرنے پر پتا چلتی کیونکہ اس نے اس وقت اپنے مخصوص جوتے پہن رکھے تھے، نا پہنے ہوتی تو قدرے زیادہ ہوتی، پیچھے وہ تینوں ساکت کھڑے اس چاندی کی گڑیا کو تک رہے تھے۔ تینوں کے چہرے پر بے یقینی کی کیفیت تھی، حور بڑبولی تو تھی، جگنو کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے حیدر رحمانی سے پوچھ بھی لیا۔

"میری بیٹی بچپن میں میری کوتاہی کی نذر ہو گئی' اسے ایسی ٹھنڈ لگی کہ ٹانگ کے پٹھے سکڑ گئے اور یہ ٹانگ معمولی لنگ کا شکار ہو گئی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میری جگنو میں کوئی کمی نہیں۔ وہ مکمل ہے کیونکہ وہ بے حد ٹیلنٹڈ ہے۔"

تفصیل سے جواب دے کر حور کے افسردہ چہرے کو دیکھ کر وہ بشاشت سے مسکرائے اور اس کا گال پیار سے تھپتھپایا، جسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر دلکشی اور رعنائی سے بھرپور حسن مگر ایک عیب کے ساتھ۔

برہان نے امیر حمزہ کو ٹہوکا مار کر ہوش دلایا' حیدر رحمانی لاؤنج کے رخ پر بازو پھیلا کر اشارہ کرتے

آگے بڑھ گئے ان تینوں نے بھی اپنے تاثرات کو نارمل کرتے ہوئے ان کی تقلید کی تھی۔

☆☆☆

"اوہ گاڈ! واٹ آ بیوٹی، اینڈ واٹ آ مزری۔"

وہ دھپ سے بیڈ پہ چت لیٹتے ہوئے بولا تھا' نگاہیں چھت پر ٹکی تھیں اور ہونٹوں پہ بھینچی بھینچی مسکراہٹ تھی' لانگ بوٹ اتارتے برہان کے ہاتھ یک دم تھمے اور وہ اسی پوزیشن میں بھنویں اچکائے امیر حمزہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کھویا کھویا سا ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی پر پڑے بال سہلا رہا تھا۔ برہان نے لمبی سانس بھری اور اپنی جرابیں اتار کر اس کے چہرے پر اچھالیں' امیر حمزہ نے چند ثانیے آنکھوں کے آگے چھائے اندھیرے میں روشنی کو کھوجا پھر اس نے ناک سکوڑ کر دو بار سانس کھینچا اور تیسرے سے پہلے وہ کرنٹ کھا کے اٹھ بیٹھا۔

"واٹ دا ہیل، خبیث ہے تو بڑا' ایسا کر اپنی سانس کسی ہاسپٹل میں دان کر۔ وہاں اینستھیزیا کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ یہ ہی سنگھا کے مریض کو مار گرائیں گے' اف......"

"شکر کر ابھی سردیاں ہیں، ورنہ کبھی گرمیاں ہوتیں تو پھر میں تجھے اپنی جرابوں سے فیض یاب ہونے کا موقع دیتا تو میرے رشکِ قمر' مزا آجاتا۔"

"بکواس بند کر' سارا فسوں توڑ دیا' ابھی تک میں قدرت کی ستم ظریفی کی رمزیں سلجھا رہا تھا۔ یار کیا صورت ہے اور کیا مورت ہے لیکن اتنی خوب صورتی کو ٹانگ کھینچ کھینچ کر گھسیٹنا کتنا مزرایبل (قابلِ رحم) ہے یار۔ پھر بھی میں قدرت کے حسین جلووں کی تاب لانے کی کوشش میں تھا، تو نے سارا تصور برباد کر کے رکھ دیا۔"

"بیٹا جی اسی لیے کیا کہ ہم یہاں مہمان ہیں اور یہ بڑے بابا کے بہت بہت قریبی دوست کا گھر ہے، کوئی بھی ایسی ویسی حرکت ہوئی تو میر! تم سوچ سکتے ہو بات کہاں تک جائے گی' لہٰذا جس کام کے لیے آئے ہو وہ کرو اور چلتے ہو۔ یہاں اسکینڈل بنانے کی ضرورت نہیں' سمجھے۔" برہان نے شہادت کی انگلی کو تنبیہی انداز میں اٹھا کر امیر حمزہ کو وارن کیا' وہ امیر حمزہ کی فطرت سے واقف تھا۔ ہر حسین چہرہ اس کو اپنی گرفت میں لیتا تھا، وہ اچھا خاصا فلرٹی تھا، بلا کا دلکش تھا اس لیے لڑکیاں بھی دام میں آہی جاتی تھیں، لیکن یہاں برہان ایسی کوئی بھی حرکت برداشت نہیں کر سکتا تھا' یہ اس کے بڑے بابا کی ریپوٹیشن کا سوال تھا۔

"سمجھ گیا جانی! فکر نا کر، میں جو بھی کروں گا پوری سنجیدگی کے ساتھ کروں گا یعنی فلرٹ نہیں کروں گا محبت کروں گا' آئی سوئیر۔" اپنے حلق پر دو انگلیاں رکھ کر قسم اٹھاتے ہوئے وہ بلا کا معصوم دکھائی دے رہا تھا' برہان کی نظروں سے نظر جمائے وہ چند پل دیکھتا رہا اور پھر مسکراہٹ چھپانے کی غرض سے ہاتھ پشت کی جانب بڑھا کر اپنا ہیٹ تھاما اور اپنے چہرے کو اس کی آڑ میں کرتے ہوئے دوبارہ لیٹ گیا۔ برہان نے اس کے رویے کو دیکھتے ہوئے سر جھٹک کے اٹھ کر واش روم کا رخ کیا لیکن اس کے چہرے پر فکر کی لکیریں واضح تھیں۔"

☆☆☆

وہ کچ کچ سیڑھیوں کے اسٹیپس اتر رہی تھی جب نیچے سے تیزی کے ساتھ اوپر آتا امیر حمزہ اس کی راہ میں حائل ہوا تھا' دونوں کی نظر سے نظر ملی' وہ دونوں ایک دوسرے کو راستہ دینے کے لیے پہلے بائیں ہوئے پھر دائیں پھر بائیں اور پھر دونوں تھم گئے۔

"آپ گزر جائیں پلیز' لیڈیز فرسٹ۔" امیر حمزہ نے ایک طرف ہو کر بالآخر اسے راہ دی۔ وہ ذرا سا ہچکچاتے ہوئے اس پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالتی دو اسٹیپ نیچے اتری تھی جب پشت سے امیر حمزہ کی آواز ابھری۔

"ویسے آپ اچھی میزبان ثابت نہیں ہوئیں مس...... کیا آپ کو ہمارا آنا اچھا نہیں لگا جو آپ یوں کھنچی کھنچی سی رہتی ہیں' اگر ایسا ہے تو ہمیں حکم کیجیے ہم

کوچ کیے لیتے ہیں۔" وہ لفظوں کو لہجے کی مٹھاس سے ہانکتا تھا، اس کے بھاری لہجے کے فسوں نے جیسے یکلدم جگنو کے قدموں کو زنجیر کیا تھا' اس کے دل پہ ویسی دھمک پڑی تھی، جیسے ڈھول کی پہلی تھاپ پہ پڑا کرتی ہے اس نے ہاتھ کو مضبوطی سے ریلنگ پر ٹکایا اور رواں لہجے میں گویا ہوئی۔

"ہماری وادی بہت مہمان نواز ہے، یہاں کے کوہسار تک مہمانوں کو جھک کے سلام پیش کیا کرتے ہیں۔ آپ تو ہمارے گھر میں ٹھہرے ہیں تو ایسا کیسے ہوسکتا ہے بھلا کہ مجھے آپ کا آنا برا لگا ہو۔ ہاں میرا مزاج کچھ الگ ہے، اس لیے گھلنے ملنے میں وقت لیتی ہوں۔"

"بندہ تو میں بھی ذرا اور ہی طبیعت کا ہوں، جب ہی تو جہاں قدرت کی صناعی کا شاہکار دیکھتا ہوں، اسے جکڑ لیتا ہوں، باندھ لیتا ہوں۔ میری گرفت بڑی منفرد ہے مس جگنو!" وہ دو اسٹیپ نیچے اتر کر جگنو کی آنکھوں میں اپنی گہری نیلگوں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا اور جگنو کو لگا کہ وہ جکڑی جارہی ہے، بندھ رہی ہے۔ وہ کسی کی گرفت میں سمارہی ہے' جو سچ میں منفرد ہے' وہ چاہ کے بھی کسمسا نہیں پارہی تھی۔ امیر حمزہ نے اس کو بے بس سا دیکھتے ہوئے خود ہی اپنے سحر کا توڑ کیا اور بولا۔

"کل ہمارا ارادہ آپ کی وادی گھومنے کا ہے لیکن میرا ارادہ آپ کے بغیر جانے کا ہرگز نہیں۔ مجھے شدت سے اپنی میزبان کا انتظار رہے گا' امید ہے آپ اپنے مہمان کو مایوس نہیں کریں گی مس جگنو!"

اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا ننھا سا ڈیزی کا پھول بہت نرمی سے جگنو کے گلابی گال کی طرف اچھالا، جو اس سے مس ہوتا ہوا اس کے پیروں میں آگرا اور واپس سیڑھیاں چڑھتا اپنے روم میں اوجھل ہوگیا لیکن جگنو جیسے جم سی گئی تھی۔ اسے اپنے حواس سلب سے محسوس ہورہے تھے' پہلی ملاقات اور یہ شخص اس کے دل کے کواڑ جھنجھنا گیا تھا۔ اندر داخل ہونے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے' مستانے ہنس نے ساکن پانی میں پہلا کنکر پھینک دیا تھا، اب طغیانی کا منظر بڑا دلکش ہوتا۔

جگنو نے جھرجھری سی لے کر خود کو نارمل کیا اور ایک ملامتی نظر ڈیزی کے پھول پر ڈال کر امیر حمزہ کی جرأت کو کوسا۔ وہ تو محبت کا بیمار لگتا تھا اور محبت کوڑھ ہے، خود کو چھونے والے کو کوڑھی کر ڈالتی ہے، جو دنیا کی نظر میں متروک ٹھہرتا ہے۔

☆☆☆

وہ تینوں تاش کی بازی لگائے بیٹھے تھے، یہ بھی امیر حمزہ کا شوق تھا جس میں برہان اس کا ساتھ ضرور دیتا تھا مگر اسے یہ کھیل بھاتا نہیں تھا۔ آج حور بھی ان کے بیچ بیٹھی بڑی مدبرانہ نظروں سے چال جانچ رہی تھی' اسے یہ کھیل پسند تھا' حیدر رحمانی جلدی سو جانے کے عادی تھے، اسی حساب سے جگنو اور بابی جان بھی۔ اب یہ لوگ شہر کے پروردہ، جن کی رات دو بجے سے پہلے نہیں ہوتی، بھلا کیسے سو پاتے، اسی لیے حور خاموشی سے نکل کر برہان اور امیر حمزہ کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ برہان کو اس کا آنا ناگوار گزرا تھا لیکن وہ کب کسی کی سنتی تھی بھلا' اور امیر حمزہ بھی اس کی کمپنی انجوائے کرتا تھا' اس وقت بھی برہان زبردستی اس کھیل میں شریک بس پتے تھامے بیٹھا تھا اور ان دونوں کے گھومنے پھرنے کے پلانز سن رہا تھا' جب بات کا رخ اچانک سے جگنو کی طرف مڑ گیا۔

"بھئی بڑی بور لڑکی ہے، جتنی خوب صورت اتنی ہی روکھی۔ اصل میں مجھے کمپلیکس کا شکار لگتی ہے ہاں البتہ میری اس کی بہن فاتحہ سے خوب دوستی ہوگئی ہے۔"

وہ پتے ٹھوڑی پہ ٹکاتے ہوئے پرسوچ انداز میں بتا رہی تھی، امیر حمزہ نے آنکھوں میں شوخی بھر کے۔ پاس پڑے ڈرائی فروٹ میں سے تین نمکین بادام اکٹھے منہ میں ڈالے اور بولا۔

"حسن ہو تو نزاکت آ ہی جاتی ہے اور یہ لڑکی تو حسن کی کان ہے۔"

برہان نے ناگواری سے اسے دیکھا اور ٹوکنے

ہی لگا تھا کہ حور نے چمک کر جواب دیا۔

"آہا ہا...... نزاکت تو نا کہو' نزاکت چال ڈھال میں ہوتی ہے، خدوخال میں نہیں۔ بیٹھی رہے تو کمال ہے، چل پڑے تو صفر ہوجاتی ہے۔" اسے شاید جگنو کی تعریف اچھی نہیں لگی تھی، جب ہی لہجے میں حقارت آمیز چبھن تھی جب کہ برہان کو اس کا انداز بہت برا لگا تھا۔

"واٹ نان سینس حور! اتنی گندی بات کیسے کر دی تم نے' وہ معذور نہیں ہے، ایک معمولی سی کمی ہے اس کی چال میں، جس کو نظر انداز کیا جاتا تو بخوبی ہو جاتا ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے' ہر ایک کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔"

برہان کے ناصحانہ انداز میں سمجھانے پر وہ یک دم چڑ گئی تھی، اسے برہان کا جگنو کی سائڈ لینا ہرگز نہیں اچھا لگا تھا' پتے کارپٹ پر پٹختے ہوئے بولی۔

"میرا بھی اپنا مزاج ہے برہان! مجھے ایسے مزاج دار لوگ زہر لگتے ہیں۔ مجھے ہلا گلا کرنے والے اور پرجوش لوگوں کا ساتھ اچھا لگتا ہے' ایسے لوگ زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتے بلکہ وہ کسی کا بھی ساتھ نہیں دے سکتے، اسی لیے تو کوئی انہیں منہ نہیں لگانا پسند کرتا۔"

"ارے ظالم ایسا تو نا کہو' میں تو لگانے کا پکا ارادہ کرچکا ہوں۔" بڑی محویت سے حور کی بات سنتے امیر حمزہ نے آخری فقرے پہ تڑپ کر دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا جی! تو ان محترمہ کے ارادے بھی معلوم کر لیتے تھے نا۔ پتا چلے کہ اس نے آپ جیسے "لیڈی کلر" کا منہ ہی دیکھنے سے انکار کردیا ہے' ہونہہ!"

حور استہزائیہ کہتی ہوا میں اپنا مومی ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔

"واٹ دا ہیل! انکار اور مجھے...... نیور' مجھے تو ان کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے کچے دھاگے کی بھی ضرورت نہیں' نظروں کی ڈور ہی کافی ہے' آپ کس غلط فہمی میں ہیں محترمہ۔"

امیر حمزہ کی مردانگی پر چوٹ پڑی تھی، وہ پتے پھینک کر سیدھا ہو کر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اپنی صفائی میں یوں بولا تھا جیسے حور اس کی اہلیت جانچ کر سرٹیفکیٹ جاری کرنے والی ہو' جواب میں وہ بھی اسی انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی تو اس کی آواز میں سرسراہٹ تھی۔

"تو دور کرو میری غلط فہمی کو' ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ بیس دن ہیں لیکن تمہارے پاس دس۔ باندھو اسے اپنی نظروں کی ڈور سے' میں بھی تو دیکھوں کہ اس کے تیوروں میں کتنا دم ہے اور تمہارے اپنے بارے میں اندازے کتنے درست ہیں۔ صرف دس دن اور جگنو تمہاری محبت میں گوڈے گوڈے ڈوبی نظر آئے مجھے' اٹس آ چیلنج اینڈ ایڈونچر ایز ویل' ڈن۔" وہ اس کے آگے ساری پلاننگ دھرنے کے بعد اپنے ہاتھ کا انگوٹھا دکھا کر تصدیق چاہ رہی تھی' جوش سے امیر حمزہ کا تمتماتا چہرہ کسی بازی گر جیسا دکھائی دے رہا تھا' اس نے بھی اپنے ہاتھ کا انگوٹھا کھڑا کرتے ہوئے "ڈن" کیا تھا۔

"شٹ اپ یو بوتھ!" برہان قدرے اونچی آواز میں دونوں پر چلایا۔ "پاگل تو نہیں ہوگئے تم دونوں' شرم آتی ہے کیا؟ خبردار میر! جو تم نے ایسی کوئی حرکت کی تو......"

"اور تم حور! تمہیں تو میں لا کر پچھتا رہا ہوں، ایک لڑکی کی طبیعت تم سے نہیں ملی تو اس بات کو انا کا مسئلہ نا بناؤ۔ تم دونوں کے ایڈونچر میں وہ کیوں ماری جائے' چلو اٹھو، جاؤ اپنے کمرے میں اور خبردار! جو دوبارہ ایسی گھٹیا بات سوچی تو' چلو جاؤ' ابھی۔" اسے سختی سے کہتے ہوئے اٹھایا اور ہاتھ پکڑ کر دروازے تک چھوڑا' حور کے چہرے کے زاویے بگڑے ہوئے تھے۔ دروازہ بند کر کے برہان امیر حمزہ کی جانب مڑا ہی تھا کہ اس کی پشت پہ بغیر آواز پیدا کیے دروازہ دوبارہ کھلا اور حور کا انگوٹھا دکھائی دیا' جسے دیکھ کر امیر حمزہ نے وہیں سے ہانک لگائی۔

"ڈن" اور دروازہ دھڑام سے بند ہو گیا،

برہان کے واپس پلٹنے تک حور جا چکی تھی۔ وہ اب خشمگیں نظروں سے امیر حمزہ کو دیکھ رہا تھا، جبکہ وہ ہنسی دباتے ہوئے کندھے اچکاتا فوراً چھلانگ مار کے بستر میں گھس گیا اور لحاف سر تک تان لیا' برہان بے بسی سے وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

وادی ہنزہ پاکستان کی جھولی میں پڑا انمول رتن ہے' یہ گلگت بلتستان کا ایک ضلع ہے۔ وادی کے علاقے کریم آباد میں موجود میر آف ہنزہ کا پرانا گھر قلعہ بلتت کے نام سے موجود ہے جو سات سو سال پرانا ہے اور اس کی خوب صورتی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

آج یہ سارا ٹولہ قلعہ بلتت اور اردگرد کے مناظر سے لطف اندوز ہونے نکلا تھا، کریم آباد سیاحت کے اعتبار سے بے حد معروف ہے، یہاں کا بازار ثقافتی اشیاء سے بھرا پڑا ہے۔ قلعہ بلتت دیکھنے کا پلان قانتہ کا دیا ہوا تھا، جو حور سے دوستی اور امیر حمزہ سے اچھی علیک سلیک کی بنیاد پر ان کے ساتھ چل رہی تھی، ویسے بھی حور جانتی تھی کہ جگنو قانتہ کے بغیر ان کے کسی پروگرام میں شامل نہیں ہوگی۔ صبح صبح جب یہ چاروں بالکل تیار ہو کر ڈائننگ روم میں ناشتا کر رہے تھے۔ قانتہ کی بے تکی باتوں اور حور کے قہقہوں سے ایک شور سا برپا تھا، عین اسی وقت اورنج کرتے اور مہندی رنگ کے ٹراؤزر پر میرون لانگ کوٹ پہنے، سر کو نفیس فر والے میرون اسٹالر سے لپیٹے، مخصوص طرز کے بند جوتے پہنے جگنو داخل ہوئی تو سب کو گویا بریک لگ گیا' امیر حمزہ تو امیر حمزہ۔ برہان بھی لمحے بھر کو مبہوت سا ہو کر گیا' میرون فر کے بیچ اس کا چمکتا چہرہ اس قدر دلربا تھا گویا راکا پوشی کی برف پر ڈوبتے سورج کی کرنیں سیال بن کر بہہ رہی ہوں۔ حور کو اپنی تیاری نامکمل سی محسوس ہوئی، اس نے حسب سابق مونگیا پونچو کے ہمراہ ٹائٹس پہن رکھی تھیں۔ ساتھ میں گرم فر والی جیکٹ تھی جسے اس نے ابھی پہنا نہیں تھا' حیدر رحمانی کا چہرہ یکدم کھل اٹھا، انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ جگنو ایسی کسی ایکٹیوٹی میں شامل ہوگی، یہ واقعی اچنبھے کی بات تھی' بابی جان نے آگے بڑھ کر اس کی بلائیں لیں اور جلدی سے اس کے لیے سلائس پر مکھن لگانے لگیں، ساتھ وہ گرم دودھ بھی لیتی تھیں' قانتہ نے گلا کھنکار کے سب کو متوجہ کیا اور شوخ نگاہوں سے جگنو کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"آج تو راکا پوشی، دیران پیک، التر پیک، گولڈن پیک اور لیڈی فنگر پیک...... ہر پربت سے وادی کے لوگوں نے سورج کو مخالف سمت سے ابھرتا دیکھ لیا ہوگا کہ آخر اوزے رحمانی ہمارے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے وادی میں قدم رنجہ فرمانے والی ہیں۔" اس نے شرارت سے وادی کے گرد موجود تمام چوٹیوں کے نام گنواتے ہوئے کہا۔ جگنو نے ٹیبل کے نیچے سے اس کے پیر کو اپنے پیر سے دبایا، یہ اشارہ تھا منہ بند کرنے کا اور وہ قانتہ ہی کیا جو جگنو کے انداز نا جانے' امیر حمزہ نے بار بار جگنو کے چہرے پر پھسلتی نظروں کو قابو کیا اور حور کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا جو کچھ بجھ سی گئی تھی، شاید اسے جگنو کا ماحول پر یوں چھا جانا نہیں بھایا تھا' پھر بھی اس نے مسکرا کر سب سے نظر بچاتے ہوئے اسے انگوٹھا دکھایا تھا۔

حیدر رحمانی نے ان کے لیے اسی ڈرائیور کا بندوبست کر رکھا تھا جو ان تینوں کو گلگت سے یہاں لایا تھا' قانتہ نے تمام رستہ اپنی پرشور گفتگو سے سب کو خوب محظوظ کیے رکھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ امیر حمزہ اور برہان تک کو اس کی کمپنی میں لطف آ رہا تھا۔ وہ ویسے بھی بہترین گائیڈ تھی، ہر خاص مقام کی تفصیلات اسے ازبر تھیں۔ راستے میں وہ لوگ جدھر جدھر سے گزرتے، قانتہ تمام جزئیات ان کے گوش گزار کرتی جاتی۔ اس دوران جگنو کا بایاں ہاتھ مسلسل اس کی ہتھیلی میں دبا رہا' اب پتا نہیں اس کے پیچھے وجہ کیا تھی لیکن اس بات کو باقی افراد نے بھی نوٹس ضرور کر لیا تھا' جگنو اس کے کان میں بڑبڑائی۔

"تم کچھ زیادہ ہی اوور نہیں ہو رہی قانتہ! ذرا حور سے فاصلہ رکھو، میری دوست ہو تم، میری رہو ورنہ یہیں کسی کھائی میں دھکیل دوں گی' سمجھی۔" اس کی

PakiBooks.Site

غراتی ہوئی دھمکی بے اختیار قانتہ کو ہنسنے پہ مجبور کر گئی، جگنو کی عادت کے خلاف تھا وہ کبھی بھی اتنا کھل کے اظہار نہیں کرتی تھی، قانتہ نے اگلی سیٹ کی پشت سے لگے اپنے بازو میں منہ دے کر اپنی ہنسی دبائی اور پھر آواز دباتے ہوئے پراسرار انداز میں اس کے کان میں جواب دیا۔

"پاگل، تمہیں نہیں پتا میں یہ سب کیوں کر رہی ہوں' اس کے پیچھے بڑی اہم وجہ ہے۔"

"وہ کیا؟" جگنو نے بھنویں اچکائیں۔

"تم دیکھ لینا جب حور یہاں سے جائے گی نا تو اپنے یہ سارے لبادے، جنہیں یہ پونچو کہتی ہے حالانکہ ان کی جگہ جگہ سے نکلی چونچیں دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے کہ ان کا نام "چونچو" ہونا چاہیے۔ خیر یہ سب کے سب میرے حوالے کر کے جائے گی اور پھر میں نہیں پہن کے پوری وادی میں اٹھلا اٹھلا کے گھوما کروں گی۔ یونی بھی پہن کے جاؤں گی تو دیکھنا کیسی دھاک بیٹھتی ہے میری' میں تو کہتی ہوں تم اپنے بابا سے کہہ کر شہر سے اپنے لیے منگوا لو۔ وہ تو جاتے رہتے ہیں اور تم کہو تو تمہارے لیے وہ آسمان سے تارے لانے کے بجائے آسمان ہی اکھاڑ لائیں' حق ہا۔"

قانتہ نے اپنی لمبی چوڑی بکواس کے بعد ایک ٹھنڈی حسرت زدہ سانس چھوڑی تو جگنو کو ہنسی روکنا دشوار محسوس ہوا۔ قانتہ کے پہلو میں زوردار چٹکی بھر کر چہرے کا ایک رخ اپنے اسٹالر سے چھپاتے ہوئے اپنے تئیں ہنسی کو چھپایا تھا اور ساتھ ہی کن انکھیوں سے برہان اور حور کو دیکھا۔ وہ دونوں متوجہ نہیں تھے بلکہ وہ تو ہر منظر کو کیمرے کی آنکھ تلے دباتے چلے جا رہے تھے اور ساتھ ہلکی آواز میں باتیں بھی کر رہے تھے لیکن امیر حمزہ کا مکمل دھیان جگنو کی طرف تھا، وہ اسے آنے بہانے اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ تھا اس لڑکی میں جو اسے مائل کیے چلا جا رہا تھا، وہ خود کو کسی ایسے بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا جو جگنو کی روشنی دیکھتے ہی اس کو پکڑنے کے لیے لپکتا ہے، اس کا بھی من اس جگنو کو مٹھی میں کرنے کا تھا' اس کی محویت تھی جس نے جگنو کو اس کی طرف نگاہ کرنے پر مجبور کیا تھا۔ نظر سے نظر ملی اور جگنو کے دل نے ہچکولا سا کھایا تھا، اس نے فوراً نظر پھیرنی چاہی تھی لیکن عین اسی لمحے امیر حمزہ کے ہونٹوں سے بے آواز "تھینک یو" کا لفظ ادا ہوا تھا، یقیناً وہ اس کی بات مان لینے اور ان کے ساتھ چلنے کے لیے اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ جگنو کے لبوں پر ایک مدبری مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی اور اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر گویا اس کے شکریہ کا جواب دیا تھا' امیر حمزہ نے ایک معنی خیز سی سانس چھوڑ کر اپنے سنہری تاروں سے بنے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور رخ موڑ کر باہر چھب دکھاتے حسین نظاروں سے آنکھیں سیر کرنے لگا۔

☆☆☆

قلعہ بلتت وادی کی تاریخ کا بڑا قیمتی پنا ہے' سات سو سالہ ماضی اس قلعے سے وابستہ ہے' یہ قدرے اونچائی پر بنی ایسی یادگار ہے جو اپنے مہمانوں کو چپے چپے سے باندھ لیتی ہے۔ اس کی شان و شوکت اس کی سربلندی دیکھنے والوں کو مرعوب کیا کرتی ہے۔

وہ سب بھی ایسے ہی مرعوب سے قلعے میں داخل ہوئے تھے' جگنو تو دیوانی تھی ایسی جگہوں کی جہاں بیتا وقت سانس لیتا ہو، جہاں کبھی کوئی سیماب فطرت کھوجی بن کے قدرت کے اسرار ٹٹولتا رہا ہو، شاید اس قلعے میں بھی کبھی کوئی جگنو پیدا ہوئی ہو۔ جسے فلک بوس پہاڑوں سے، گہری کھائیوں سے اور عشق ہوئے گہرا سناٹا بھاتا ہو۔ وہ اب سے پہلے یہاں کبھی نہیں آئی تھی لیکن اسے ایسا نجانے کیوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس قلعے کے اندر بستی رہی ہو۔ وہ سب سے کٹی کٹی سی الگ الگ سی نرم ہاتھوں سے قلعے کی دیواروں کو ٹٹولتی بائیں جانب بنی مضبوط لکڑی کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، یہاں روشنی کا انتظام عمدہ نہیں تھا، باہر کی روشنی قلعے کے اندرونی کمروں کا اندھیرا نگلنے کو ناکافی تھی لیکن غنیمت تھی' وہ سب مبہوت

تھے، سانس بھی اونچا نہیں لے رہے تھے گویا کسی دربار میں آئے ہوں۔

وہ چلتی چلتی قلعے کی فصیلی دیوار تک چلی آئی، یہ بہت بڑی صحن نما چھت تھی جس کے ایک جانب پتھر کی سیڑھیاں نیچے کہیں اترتی چلی جاتی تھیں' یہاں دیواریں بے حد موٹی تھیں اور ان کے پار صرف کھائیاں، گہری کھائیاں، وہ گہری گہری مرتعش سانسیں لیتی ایک دیوار پہ آ کر تک گئی اور یک ٹک نیچے دیکھتی چلی گئی' ان کھائیوں کے دامن میں درخت یوں ساتھ ساتھ جڑے تھے گویا انہیں ایک دوسرے کے اوپر گاڑا گیا ہو۔ اس قدر بہتات تھی سبزے کی کہ ایک ریلا سا محسوس ہوتا تھا جو بہتا چلا جا رہا ہو اور اس کا کوئی انت نا ہو۔ جگنو بڑی محویت سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی، اس کے دل کو عجیب سی بے چینی لاحق ہو رہی تھی، جی چاہتا ان کھائیوں سے نگاہ ہٹا لے مگر نگاہ پھر بھٹک بھٹک وہیں ٹھہر جاتی' کوئی راز تھا جسے کھوج کی تلاش تھی، کوئی ادھوری داستاں تھی جو حرفوں میں نا ڈھلی تھی، ایک پیاس تھی جسے سیرابی کی چاہ تھی۔ یہ کھائیاں اور گھنا جنگل ادھورے قصے گود میں دھرے بیٹھی تھیں۔ اس کے تخیل میں سرسراہٹ ہوئی۔

"اب سے کئی سو سال پہلے کسی پری وش نے آدھی رات کے وقت اس دیوار پہ بیٹھ کے آدھے چاند کو تکتے ہوئے اپنی بے بسی کا رونا رویا ہوگا، اس کی ادھوری محبت آنسو بن کے اس کی آنکھ سے بہی ہوگی۔ اس نے ان کھائیوں میں رات کے اندھیرے میں کسی کی بے وفائی کا زہر اگل کر تھوکا ہوگا، جسے یہ بے پروا کھائیاں نگل کر ہرے کانچ کی مانند چٹخی پڑی تھیں' شاید اس پری وش نے اس دیوار پر چڑھ کر اپنے محبوب کے دھوکے میں چاند کو چھونا چاہا ہو اور' اور ان کھائیوں نے اسے کسی اژدھے کی مانند جھپٹ لیا ہو۔

جگنو کے پورے بدن میں سنسناہٹ کسی پارے کی طرح مچلی تھی' اس نے تھوک نگل کر آنکھیں بند کیں۔ چند پل یونہی بیٹھی رہی اور اپنے ذہن سے یہ کر یہہ منظر جھٹکنے کی کوشش کرنے لگی جسے ابھی بیٹھے بیٹھے اس کے تخیل نے ابھارا تھا۔ ایک کپکپاتی سانس چھوڑنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے امیر حمزہ کو بیٹھا پایا' وہ سٹپٹا سی گئی۔ اسے اس بات کی ہرگز توقع نہیں تھی' وہ سچ میں پر اعتماد تھا' اس نے اردگرد کا سرسری سا جائزہ لیا۔ وہاں اور کوئی بھی نا تھا، وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی جیسے اس کے بولنے کی منتظر ہو۔

"آپ کو پتا ہے مس جگنو! کہ یہاں اس سارے منظر میں مجھے اس قدر کوئی شے اپیل نہیں کر رہی جس قدر آپ کے گال کا مخملیں بھنور' اس وقت ہر رنگ، ہر نظارہ اس کے آگے ہیچ ہے۔" وہ بولا بھی تو کیا' جگنو کے ہاتھ کپکپا اٹھے تھے۔ ایسی بات اور ایسا انداز' اوپر سے ظالم کی گمبھیر آواز' اسے اپنے لہجے کے پیچ و خم پہ پوری دسترس حاصل تھی۔ جگنو نے تھوک نگل کر کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ناکام ہو کر اپنا نچلا لب دانتوں تلے لے لیا، دھیان ہٹانے کو جنگل کی طرف منہ پھیر لیا' امیر حمزہ کے دل کی دھڑکن الگ ہی تال پہ مچلی۔ اس کی آنکھوں میں یک دم عجیب سی مستی بے دار ہو کر انگڑائیاں لینے لگی۔ وہ نا تو نیا تھا اور نا ہی کچا' وہ پکا کھلاڑی تھا لیکن یہاں پہلی بار اس کا داؤ بار بار بھٹک سا رہا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ الجھ رہا ہے' جیسے کسی ساحر کی ساحرہ سے ٹھن گئی ہو' دونوں کا سحر ایک دوسرے پہ اثر انداز ہو رہا ہو اور کاٹ نہیں ہو پا رہی' یہ بھی مزے کی مڈبھیڑ تھی' دلنشین معرکہ تھا جس میں ہر زخم میٹھا اور دوا خمار ہا تھا' سرور بھرا انشاط آگیں۔

"آپ نے میرا مان رکھا مس جگنو! جبکہ میں خاصا خود سر واقع ہوا ہوں، کبھی خود سے بھی تقاضا نہیں کرتا، کجا کہ کسی اور سے گزارش کرتا لیکن وہ کیا ہے نا کہ جب کوئی ایک دم، اچانک سے، بنا اجازت دل سے چھیڑ خانی کرنے لگے تو اسے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے۔ اب باہر تو نہیں کھڑا رکھا جا سکتا نا "دل کے مہمان" کو اور یہاں بھی میں نے حساب برابر کر لیا۔ میں آپ کے گھر میں ٹھہرا ہوں اور آپ کو اپنے دل کا مکیں کر لیا' کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں' جگنو۔"

اس دفعہ اسے مس جگنو کے بجائے صرف جگنو کہہ کر مخاطب کیا اور اس کے رہے سہے حواسوں پر وار کیا تھا' وہ بھلا کہاں عادی تھی ایسی باتوں کی۔ ایسے لہجوں کی' وہ تو خوابوں کی بنت کرتے کرتے جوان ہوئی تھی اور اس کے خوابوں کا شہزادہ تو ہمیشہ سفید براق گھوڑے کو دوڑاتا آتا اور اس کے قریب آئے بغیر گھوڑے کے سموں سے دھول اڑاتا چلا جاتا۔ وہ صرف اس کی خوشبو کا بادل اپنے گرد کسی ہیولے کی مانند پھیلا پاتی اور ملن کے گیت گاتی۔ ان خوابوں کا ذکر اس نے کبھی قانتہ سے بھی نہیں کیا تھا، یہ خواب اس کے تھے اور ان خوابوں پہ گرفت اس کے باگ بان کی تھی۔

"آپ بولتی بہت کم ہیں' شاید آپ کو احساس ہے کہ آپ کو سننے والا ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے، ویسی کیفیت جیسی کسی عادی نشہ باز کی ہوتی ہے۔ ہر کش آخری کش کی نیت سے لیتا ہے لیکن ہر کش پچھلے کی نسبت زیادہ سرور دیتا ہے' آپ کی آواز میں بھی نشہ ہے جگنو' جو حواسوں کو ادھ موا سا کرتا ہے' مجھے آپ کو سننے میں سرور سا آنے لگا ہے' مجھ پہ نشہ سا چھانے لگا ہے۔"

امیر حمزہ بول نہیں رہا تھا بلکہ وہ جگنو کے حواس معطل کر رہا تھا' جگنو کا دل دھڑک دھڑک کے بند ہونے کے قریب تھا' اس نے نظر چرا کر سامنے دیکھا، کسی بلند و بالا درخت کی پوشیدہ شاخ سے یکدم باز اڑا تھا اور ایک ننھے سے پرندے کو اپنے نوکیلے پنجوں میں جھپٹ کے لے گیا تھا۔ اسے کسمسانے کی مہلت بھی نا ملی اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا' جگنو کی آنکھوں میں تاسف آمیز نمی لہراتے دیکھ کر امیر حمزہ نے اس کا دھیان سامنے نظر آتے سیاہ پربتوں کی جانب مبذول کروایا' وہ اس کے ساتھ ان فلک بوس چوٹیوں کی رعنائی و دلکشی پہ سیر حاصل گفتگو شروع کرنے والا تھا کہ باقی کا سارا ٹولا اونچی اونچی، پرجوش آوازوں میں بات کرتا وہیں چلا آیا۔ وہ دل ہی دل میں "دھت تیرے کی" بول کر رہ گیا، جبکہ جگنو نے شکر کا کلمہ پڑھا تھا' وہ پوری جان سے قانتہ کے یہاں آ جانے کی دعا کر رہی تھی، اسے امیر حمزہ کی قربت ان دیکھے حصار میں جکڑے جا رہی تھی' وہ بے نام سا تعلق محسوس کر رہی تھی خود کے اور اس کے درمیان۔

"نہیں نہیں...... یہ نہیں ہونا چاہئے، بھلا میں اسے جانتی ہی کتنا ہوں۔ بابا کے دوست کے بھتیجے کا دوست' لو بھلا بتاؤ' مفت میں گلے پڑ رہا ہے' مجھے اسے نظر انداز کرنا چاہیے۔"

جگنو نے جی ہی جی میں خود کو تنبیہ کی تھی' قانتہ کی مسکراتی معنی خیز نظروں سے نظر چراتی وہ واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی' ابھی انہیں قلعے کے علاوہ بھی چند مقامات دیکھنے تھے۔ برہان اپنے کیمرہ کا لینس درست کرتے ہوئے خدا جانے ہلکی آواز میں امیر حمزہ سے کیا کہہ رہا تھا اور وہ جھنجلاتا ہوا دبی دبی آواز میں کچھ بول رہا تھا' حور اس دوران قانتہ اور جگنو کے پاس کھڑی قدرے اونچی آواز میں باتیں کیے جا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ نہیں چاہتی کہ ان کے کانوں میں کوئی بات پڑے' وہ دونوں بات ختم کر کے ان کے قریب چلے آئے تو حور کی زبان کو بھی بریک لگا۔ برہان اب یہاں سے کریم آباد کے بازار جانا چاہ رہا تھا' کسی کو کیا اعتراض ہوتا' سب اپنے ہلکے پھلکے ہینڈ کیریز لے کر چل پڑے۔ جگنو نے ایک بار پھر کھڑے ہو کر بھرپور نظر قلعے کی دیوار کے پار نظر آتی کھائیوں اور گھنے جنگل پر ڈالی' ایک کثیف سانس خارج کیا اور رخ موڑ لیا' نظر اسی کو دیکھتے امیر حمزہ کی نظر سے جا ملی، جس نے بڑی ادا سے دائیں ہاتھ سے سر پہ پہنے ہیٹ کو ذرا سا ترچھا کر کے اسے مبہم سا کوئی اشارہ کیا تھا جسے اس نے ایک بار پھر شکریے سے تعبیر کیا' اس نے فوراً نگاہیں پھیر لی تھیں لیکن وائے قسمت'! وہ ٹھگ لی گئی تھی' جس وقت وہ قلعے سے باہر آئی تھی اس کی روح کسی کی محبت کے مضبوط قلعے میں قید کر لی گئی تھی۔

☆☆☆

وادیٔ ہنزہ ایسی جگہ ہے جس کا چپا چپا اپنے اندر جنت نظیر دلکشی سموئے ہوئے ہے' یہاں آنے والا کبھی بھی ان نظاروں سے سیر نہیں ہوتا۔ ایک ہی منظر دوبارہ دیکھنے پر پہلے سے بھی زیادہ حسین اور دلنشین لگتا ہے۔

جگنو کا آج ان لوگوں کے ساتھ آنے کا ہرگز ارادہ نا تھا' اسے اپنی طبیعت میں پژمردگی محسوس ہو رہی تھی، لیکن قانتہ اس کے بغیر جانے کو راضی نا تھی، وہ لوگ جگنو اور حیدر رحمانی کے مہمان تھے، قانتہ کے نہیں، قانتہ کا تعلق تو جگنو کے حوالے سے ہی بنا تھا، اس لیے اس کے زبردستی کرنے پر وہ ان کا ساتھ آ گئی تھی' حالانکہ حور کی کوشش تھی کہ جگنو نا آئے، وہ اس سے خائف تھی، اس کا بے تحاشا حسن اسے سہما رہا تھا، اس نے کئی ایک بار برہان کو بھی دزدیدہ نگاہوں سے جگنو کو تکتے دیکھا تھا' امیر حمزہ تو تھا ہی تاسک پرایسے میں وہ نہیں چاہتی تھی کہ جگنو ساتھ چلے، لیکن اس کے بنا قانتہ چلنے کو تیار نا تھی اور حور کو قانتہ کی کمپنی اچھی لگتی تھی' مزے کی بات اس نے قانتہ کو بطور خاص اپنا ایک سلور اور رائل بلو پونچو گفٹ کیا تھا جسے وہ بڑے شوق سے پہن کر آئی تھی اور اس کے ناز و انداز دیکھنے والے تھے، جگنو کو اس کا پاگل پن دیکھ کے ہنسی آ رہی تھی۔

قدرتی آفت کے نتیجے میں دریائے ہنزہ پر بن جانے والی جھیل عطاء آباد اب ایک ایسا تفریحی مقام بن چکی ہے جہاں سیاحوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ ٹوٹے پڑتے ہیں' سرمئی اور خاکی پہاڑوں کے گھیرے میں اس جھیل کا پانی کسی تاج میں جڑے ہیرے کی طرح چمکتا ہے' اس کا پانی دو رنگا ہے، کبھی اس قدر شفاف نیلا کہ جیسے فلک کی نیلاہٹیں قطرہ قطرہ جذب ہو رہی ہوں اور کبھی خیرہ کن سبز ترا وٹ دیتا اور دل کو لبھاتا۔

حور اور قانتہ بھی کشتی میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کرنے کو مچل گئی تھیں جبکہ جگنو متامل تھی کیونکہ رش خاصا تھا اور وہ اتنے سارے لوگوں کے بیچ بیٹھنے میں ہرگز اچھا محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ یہ اس کے مزاج سے الٹ تھا' لیکن قانتہ کے بے حد زور دینے پہ صرف نیم رضامندی کا اظہار ہی کیا تھا ابھی کہ حور نے ہرے کا زوردار نعرہ لگا کر جیسے مہر ثبت کر دی، جگنو بوکھلا گئی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی حور نے اس کا ہاتھ تھاما اور کشتی کی طرف چل پڑی' برہان اور امیر حمزہ بھی پرجوش سے ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ وہاں دو کشتیاں ابھی کھڑی تھیں جو سیاحوں کو بٹھا رہی تھیں' جس کشتی کی طرف حور، جگنو کو لے کے گئی تھی وہ تقریباً بھر چکی تھی' قریب پہنچ کر حور نے جگنو کا ہاتھ چھوڑ کر یکدم قانتہ کا ہاتھ تھاما اور دوسرا ہاتھ برہان کے بازو میں ڈالا اور جھٹ سے کشتی میں سوار ہو گئی' اس کی اس حرکت سے جگنو بری طرح لڑکھڑائی تھی۔ وہ سراسیمہ سی سیاحوں کے رش میں جگہ بناتی دو قدم پیچھے ہٹی تھی جب اچانک امیر حمزہ نے اس کا ہاتھ نرمی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پوری سنجیدگی کے ساتھ اسے لیے دوسری کشتی میں سوار ہونے لگا جہاں رش نسبتاً کم تھا۔

قانتہ جو جگنو کے بغیر بے حد بے چین ہو رہی تھی اور اس کوشش میں تھی کہ کسی طرح کشتی سے اتر جائے' امیر حمزہ کے ساتھ اسے دوسری کشتی میں سوار ہوتے دیکھا تو اطمینان کی سانس لیتی واپس بیٹھ گئی' صرف برہان جانتا تھا کہ حور نے یہ ساری ترتیب جان بوجھ کے مرتب کی ہے، اس نے اسے امیر حمزہ کو اشارہ کرتے دیکھ لیا تھا' یعنی کہ وہ ان دونوں کو الگ سے ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع فراہم کر رہی تھی۔ ناگواری کے احساس نے برہان کو لپیٹ میں لیا تھا اور اب وہ جگنو کی طرف سے فکرمند تھا' اس نے ہاتھ میں تھامی دوربین سے گاہے بگاہے دوسری کشتی کو نظروں میں کر رکھا تھا تاکہ امیر حمزہ کی حرکتوں پر نظر رکھ سکے' اس نے مصمم ارادہ باندھ لیا تھا کہ آج واپسی پر وہ اسے فائنل وارننگ دے گا ورنہ دوسری صورت میں واپسی کا اعلان کر دے گا۔

وہاں جگنو کے چہرے پر یوں ہوائیاں اڑ رہی تھیں جیسے اس نے جھیل میں شارک مچھلی دیکھ لی ہو۔

امیر حمزہ نے اس کا ہاتھ مسلسل تھام رکھا تھا اور بظاہر لاپروا سا جھیل کے پانی کی دلفریبی دیکھ کے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جگنو کو خود اپنے محسوسات کا ادراک نہیں ہو پا رہا تھا' بیک وقت وہ گھبرائی بھی ہوئی تھی اور امیر حمزہ کی آڑ میں اسے اپنا آپ محفوظ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ امیر حمزہ نے اس کے لیے باقی لوگوں سے بالکل ہٹ کر جگہ بنائی تھی کہ اس کے بائیں پہلو میں کوئی بھی نا بیٹھ سکے اور دائیں جانب وہ خود تھا' اس کا اپنے کندھے سے مس ہوتا مضبوط اور کسرتی بازو اور اس کے مردانہ کلون کی دلکش مہک جگنو کے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی، بلکہ وہ مکمل ہی اس کے اعصاب پر قابو پاتا جا رہا تھا' ایک حسین اور مختصر سفر کے بعد جس وقت سب کشتی سے اترے تو جگنو کا وجود اس کے دل سے خالی تھا' وہ کسی بے بس پرندے کی طرح صیاد کی قید میں جا چکا تھا' امیر حمزہ نے سب مسافروں کو پہلے کشتی سے اتر جانے دیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ لنگڑاتی چال کے ساتھ جگنو کبھی بھی اترنے میں پہل نہیں کرے گی، وہ اسے اسی حد تک جان چکا تھا' کسی آبگینے کی طرح وہ اسے سنبھالتے ہوئے کشتی کے کنارے تک لایا' اس کا ہاتھ تھامے تھامے ہی جست لگا کر پہلے خود باہر کودا پھر اسے اترنے میں مدد دینے لگا' خفیف لنگڑاہٹ تو ہمیشگی تھی اوپر سے مسلسل جذباتی شکست و ریخت نے اسے اس قدر حواس باختہ کر رکھا تھا کہ قدم ٹھیک سے اٹھانا محال ہوا جاتا تھا' امیر حمزہ کے ہاتھ کی گرمی اور سبز آنکھوں کی نرمی اسے کسی اور ہی جہان میں پہنچائے دے رہی تھیں' اور پھر اس کا پاؤں معاً رپٹ گیا، کسی خاتون سیاح کا ہینڈ بیگ کشتی میں ہی رہ گیا تھا، اس کے جھولتے اسٹریپ میں پاؤں اٹکا اور جگنو پورے قد سے منہ کے بل پانی میں جانے ہی والی تھی جب سرعت سے امیر حمزہ نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام کے اپنی طرف کھینچا، وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی' اس کا سر زور سے امیر حمزہ کے سینے سے ٹکرایا' ایک مصنوعی آہ امیر حمزہ کے منہ سے نکلی اور جگنو کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے' وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے اس کے چہرے کو وارفتگی سے دیکھنے لگا، یوں جیسے دنیا بھلا بیٹھا ہو' اس کی نگاہوں سے نگاہیں چار ہوئیں اور جگنو بھی اسی دنیا میں پہنچ گئی جہاں وہ اسے لے جانا چاہتا تھا' زمان و مکاں بھلائے بس دید کا امرت پیا جا رہا تھا' لیکن سیرابی نہیں ہو رہی تھی' ہر رگ جاں تشنگی سے تشنج میں مبتلا ہو جیسے۔

"جگنو...... جگنو" قانتہ دور سے اسے آوازیں دیتی بھاگی چلی آ رہی تھی، پیچھے پیچھے حور اور برہان بھی تھے' انہوں نے جگنو کو گرنے سے بمشکل بچتے دیکھا تھا۔ قانتہ تو اسی وقت سے بے چین تھی جب جگنو امیر حمزہ کے ساتھ الگ کشتی میں سوار ہوئی تھی، وہ بھی اس صورت میں کہ وہ جانتی تھی کہ جگنو کتنی جلدی گھبرا جاتی ہے۔ قانتہ قریب پہنچ کر یوں اس کے گلے لگی جیسے مدتوں کی بچھڑی ہوئی کی دوبارہ ملاقات ہوئی ہو۔ وہ بار بار دونوں ہاتھوں میں جگنو کا چہرہ تھام کر دیکھتی تھی' وہ اسے کچھ نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ کھوئی کھوئی اور بدحواس' قانتہ نے یہی سمجھا کہ وہ کشتی سے اترتے ہوئے جو گرنے لگی تھی یہ اسی کی دہشت ہے جو چہرے پہ چھائی ہے۔

امیر حمزہ نے ان سب کو دیکھ کر ایک بھرپور انگڑائی لی تھی، اس کے ایسا کرنے میں ایک فتح کا سا احساس تھا، یوں جیسے بازو پھیلا کر یہ دکھانا چاہتا ہو کہ "سب میری مٹھی میں سما گیا، میں آیا اور چھا گیا۔"

حور نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا، ہلکی دھوپ میں سفید برف کے پس منظر میں وہ حسن و وجاہت کا ایسا مکمل شاہکار دکھائی دے رہا تھا کہ اپالو بھی اسے تک لیتا تو آنکھیں پھوڑ لیتا۔ وہ سچ میں سکندر تھا، تن تنہا جنگ جیت لینے کا گر جانتا تھا۔ اس کی محویت کو برہان کی سرد آواز نے توڑا، وہ ان سب سے مخاطب تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں یہیں سے واپس ہو لینا چاہیے، اوزے صاحب کی طبیعت بھی کچھ بہتر نہیں لگ رہی۔ مجھے لگتا ہے کہ پانی میں گرنے کے خوف نے ان کے اعصاب پر اچھا اثر نہیں ڈالا، مناسب یہ

ہی ہوگا کہ ہم آج کا بقیہ پروگرام پوسٹ پون کریں اور واپس چلیں۔" پھر اس نے امیر حمزہ پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"کیوں میر! ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟"

اور جواب میں امیر حمزہ پورے دل سے ہنس دیا' وہ برہان کے تیور سمجھ رہا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر گھومنے پھرنے کا پروگرام ملتوی کر رہا ہے تاکہ واپس جا کر اسے آڑے ہاتھوں لے سکے۔ وہ بھی اس کا یار تھا اور یار کی ہر نگاہ یار سے آر پار ہوتی ہے، اس سے دل کا بھید نہیں چھپتا۔

وہ سب وہیں سے واپس ہو لیے' گاڑی میں بیٹھ کر بھی قانتہ نے جگنو کو مسلسل کسی ماں کی طرح خود سے لگا رکھا تھا' حور بے زار اور غائب دماغ سی گاڑی کے شیشے سے پار بھاگتے دلکش مناظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار وہ سین گھوم رہا تھا جب امیر حمزہ نے ایک جھٹکے سے جگنو کو اپنی طرف کھینچا تھا اور اس کا سر امیر حمزہ کے سینے سے آلگا تھا۔ کتنا مکمل اور چھا جانے والا مرد ہے یہ امیر حمزہ بھی، عورت کی ہر کمزوری سے واقف' اسے معلوم ہے کہ عورت کو کیسے ہینڈل کیا جاتا ہے۔ وہ یہ سب برہان سے چاہتی تھی، وہ کتنی کوشش کرتی تھی اس کے قریب ہونے کی مگر وہ کبھی بھی رومانٹک نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی پوری شخصیت میں رومینس ہے ہی نہیں تھا۔ وہ بہت ہینڈسم تھا، لڑکیوں کی نگاہ اس پر ٹھہر جاتی تھی۔ وہ مخلوط تعلیمی ادارے میں پڑھا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امیر حمزہ جیسے رنگین مزاج کا دوست تھا مگر اس سب کے باوجود وہ عورت ذات کے معاملے میں انتہائی روکھا تھا یا حور کو لگتا تھا۔ حور کی سماعتیں بوڑھی ہو چکی تھیں یہ سن سن کر کہ وہ بہت حسین ہے، دلکش ہے، دلربا ہے' اس کی فرینڈز اور سرکل کی دیگر لڑکیاں اس پر رشک کرتی تھیں تو کچھ ایسا عجب بھی نا تھا۔ ان کے نظر میں وہ بے حد خوش قسمت تھی جو نا صرف خود رعنائی کا پیکر تھی بلکہ منگیتر بھی غضب کا پایا تھا۔ یہ ایک پرفیکٹ میچ تھا' لیکن حور کے دل میں یہ خواہش کسک بن کے گزر چکی تھی کہ برہان اسے سراہے، اس کے حسن کے قصیدے پڑھے اور دیوانہ وار اس کے گرد منڈلائے۔ اسے سامنے بٹھا کر بنا پلک جھپکے تکا کرے اور یہ سب وہ امیر حمزہ کو کرتے دیکھ رہی تھی' اندر کھاتے جو بھی کھیل کھیلا جا رہا تھا مگر بظاہر وہ جگنو کی پور پور پر فدا ہو رہا تھا، اس کو تکنے پر آتا تو قرب و جوار فراموش کیے دیکھے چلے جاتا۔ ذومعنی فقرے اور جگنو کی راہ روکنا تو حور ان چند دنوں میں کئی بار کرتے دیکھ چکی تھی اور بارہا اسے برہان کے روکھے اور سپاٹ رویے کا خیال آیا تھا۔ وہ دونوں اب سے نہیں پچھلے چھ سال سے منگیتر تھے اور یہ رشتہ ارمغان مشہدی نے دونوں کی مرضی سے طے کیا تھا لیکن حور کو کبھی بھی برہان کے انداز نئے نہیں لگے تھے۔ وہی گھسے پٹے روز و شب تھے جو گزرتے آئے تھے اور آگے بھی گزر جاتے' حور واپسی کا تمام سفر انہی باتوں کو سوچتی رہی تھی اور کن انکھیوں سے جگنو کے چہرے کو دیکھتی آئی تھی جو اسے ایک عجیب طرح کے احساس کمتری میں مبتلا کر رہا تھا' اس نے آخری متنفرانہ نگاہ جگنو پر ڈالی اور موبائل نکال کر امیر حمزہ کو میسج ٹائپ کیا۔

"یو ڈاٹ! اب بس کرو، کھیل ختم۔"

ایک جلن سے بھرپور سانس خارج کر کے اس نے میسج سینڈ کیا اور آنکھوں پہ سن گلاسز چڑھا کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

وہ طیش سے بھرا ہوا تن فن کرتا کمرے میں داخل ہوا تھا' آتے ہی اس نے ہاتھ میں پکڑی تمام چیزیں بیڈ پر اچھال دی تھیں' جن میں اس کا موبائل بھی شامل تھا۔ وہ اتنے شدید غصے میں تھا کہ نیچے اسٹڈی میں بیٹھے انکل حیدر کو بھی ملنے نہیں گیا تھا جو کھڑکی سے ان سب کو واپس آتا دیکھ چکے تھے اور یقیناً ان کی اتنی جلد واپسی پر حیران بھی تھے لیکن وہ نظر چراتا فوراً اوپر آگیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ امیر حمزہ بس چند ہی پل میں اس کے پیچھے آنے والا ہے اور وہ اس وقت اس سے کسی قسم کی کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا

تھا لیکن بے بس تھا۔ امیر حمزہ بھلا کب اسے ناراض ہونے دیتا تھا، جب تک اس کی خفگی دور نا کر لیتا چپکا رہتا تھا۔ زچ ہو کر برہان خود ہی مان جاتا' ابھی بھی ایسا ہی ہونے والا تھا لیکن یہ معاملہ سگریٹ کے کش جیسا ہلکا نہیں تھا بلکہ اس کے ذائقے جیسا کثیف تھا۔ جگنو اس میں انوالو ہو چکی تھی اور اس بات کا برہان کو کوئی ثبوت درکار نہیں تھا' یہ بالکل صاف تھا' وہ لڑکی ہر حساب میں بے حد اجلی تھی' اس کے کردار کا اجلا پن یوں ہی اس کے وجود کے گرد چھایا تھا جیسے چاند کے گرد ہالہ۔

جب کہ امیر حمزہ کو اس سے بہتر کون جانے گا، اس کا تو اپنا باپ اس پر بھروسا نا کرے' وہ اس قدر لاابالی تھا' اس کے دل میں عورت ذات کی وقعت محض اتنی تھی کہ اس کی ماں ایک عورت ہے اور اس کی بھابھی ایک عورت ہے' بس۔ اس کے آگے سب کھیل تماشا ہے' وہ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، لاڈلا تھا اور بے فکرا بھی۔ بڑے آرام سے اپنے سرکل کی لڑکیوں کو الو بنائے رکھتا تھا اور لڑکیاں بھی ایسی عقل کی اندھی تھیں جانتے بوجھتے کہ امیر حمزہ ابھی چار دن پہلے فلاں فلاں کے ساتھ بھرپور چکر چلا کے ہٹا ہے، اس کے باوجود اگلے دن ان ہی میں سے کوئی اس کے پہلو میں ہوتی جو چار دن پہلے کسی اور حسینہ کو اس کے ساتھ چپکے دیکھ کر زہر اگلتی رہی تھی لیکن برہان جانتا تھا کہ او نزے ایسی لڑکی نہیں ہے اور امیر حمزہ کی زندگی کی ان رنگینیوں کو کیسے جان سکتی تھی۔ ایسے میں امیر حمزہ اس کے جذبات کے ساتھ کھیل کر واپس اپنی دنیا میں چلا جاتا اور وہ ساری عمر کے لیے دل میں ناسور پال بیٹھتی۔

ان ہی سوچوں میں گم وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں گرائے بیڈ سے ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا، جب آہستگی سے دروازہ کھول کر امیر حمزہ اندر داخل ہوا تھا۔ برہان نے جھٹکے سے سر اٹھا کر ایک خفا سی نظر اس کے کھلتے چہرے پر ڈالی اور غراتے ہوئے بولا۔

"شرم آتی ہے؟"

"حیا بھی آتی ہے لیکن غیرت کو میں اپنے بیڈ روم کے روم فریج میں اسٹاک کر آیا تھا' واپس جا کر چیک کروں گا' ایلی نا لگ گئی ہو۔" وہ مزہ لینے والے انداز میں بولا اور ساتھ ہی ساتھ کرسی پر بیٹھ کر اپنے جاگرز کے لیسز کھولنے لگا۔

"میں نے کہا تھا نا میر! کہ یہاں ایسی کسی حرکت سے باز رہنا لیکن تمہیں میری بات کا رتی برابر اثر نہیں ہوا۔ یہ بڑے بابا کے دوست کا گھر ہے میر! یہاں نقب لگانے کا مطلب ہے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا۔ میں ان سے کیسے نظریں ملاؤں گا اگر یہ سب انہیں پتا چلا تو' بولو؟"

"انہیں پتا چلنے سے پہلے میں اپنے پاپا کو بتا دوں گا کیونکہ اس بار آئی ایم سیریس۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھے بنا، اپنے جاگرز اتار کر سائڈ پر رکھتے ہوئے بولا۔

"رئیلی؟ تم واقعی سیریس ہو' مجھے کیوں نہیں لگتا؟" برہان کے لہجے میں بے یقینی تھی، وہ اسے خوب جانتا تھا۔

"ہاں نا یار! تب ہی تو اس قدر اس کے آگے پیچھے پھر رہا ہوں ورنہ کیا تو نے کبھی میر کو لڑکیوں کے آگے پیچھے پھرتے دیکھا ہے، بول؟"

وہ اب اس کی نظر سے نظر ملا کر پورے اعتماد سے پوچھ رہا تھا' ایک لمحے کو برہان سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی امیر حمزہ خود کبھی کسی لڑکی کے پیچھے نہیں جاتا تھا لیکن لڑکیوں کو پیچھے لگانے کا ہنر اسے آتا تھا پھر یک دم کسی خیال کے پیش نظر اس سے پوچھ بیٹھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ یہ سب تم اس شرط کی وجہ سے کر رہے ہو، جو تم نے حور سے لگائی تھی۔"

"شرط...... کیسی شرط۔" امیر حمزہ نے بھنویں سکیڑ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا پھر یک دم یوں چونکا جیسے اسے کچھ یاد آیا ہو۔ "اچھا...... وہ شرط...... ارے وہ تو، نا میرے ذہن میں ہے اور نا حور نے مجھے دوبارہ ریمائنڈ کروایا ہے۔ میں سچ بول رہا ہوں جگر! اس دفعہ میرا دل اٹک گیا رے!" وہ دل پر ہاتھ رکھ کر ایک

PakiBooks.Site

طرف کو ڈھلکتے ہوئے بولا۔ برہان نے ایک لمبی سانس خارج کرتے ہوئے اسے انگلی اٹھا کر آخری دفعہ وارن کیا۔

''دیکھو میر! یہ اچھی بات ہے کہ تُو اس بار سیریس ہے۔ اوز ئے بچ میں بہت اچھی چوائس ہے لیکن یہ فیصلہ بھی سوچ سمجھ کر کرنا' وہ لڑکی بہت حساس ہے' اپنے معمولی سے ٹانگ کے نقص کو لے کر وہ بے حد سینسٹو ہے۔ یہ نا ہو کہ تم اسے ایسا دکھ دے جاؤ جو اس کی ساری زندگی کی خوشیوں کو نگل کر اسے اندھیرے غار میں بند کر دے' جہاں سے مرتے دم تک اسے روشنی کی لکیر بھی نا ملے' سمجھے۔''

''سمجھ گیا میرے ابا جی!'' امیر حمزہ نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو شکایت کا موقع ہر گز نہیں دوں گا لیکن اب آپ یہ موٹا موٹا فلسفہ میرے آگے بدبدانا بند کریں، مجھے بدہضمی ہو رہی ہے' قسم سے میرے پیٹ میں مروڑ اٹھا دیے تیرے آدرشوں نے۔ میں چلا واش روم اور فکر نا کر جانی! میں جھوٹ نہیں بول رہا، اگر بولوں تو پاپا کا جوتا ہو اور میرا سر' قسم سے۔'' وہ گردن کے نرخرے پہ انگلی اور انگوٹھے سے دباؤ ڈال کر شرارت سے بولا اور کمر سے لٹکے اپنے ہیٹ کی ڈوری گردن سے نکالی۔ ہیٹ برہان کے سر پر ٹکاتا واش روم میں جا گھسا' برہان کے سنجیدہ چہرے پر بے یقینی دھند بن کے مستقل چھائی ہوئی تھی۔ دروازے سے باہر کھڑی حور نے حسد کے شدید ترین احساس سے مغلوب ہو کر آنکھیں میچیں اور جگنو کو جی ہی جی میں خوب کوس کر ایک فیصلہ کرلی چپکے سے دبے پاؤں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

☆☆☆

قانتہ مسلسل راکنگ چیئر پر جھولتی اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھے جا رہی تھی' جگنو خود کو لاپروا محسوس ضرور کروا رہی تھی لیکن در حقیقت قانتہ کی نظریں اسے کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اس نے اپنا سارا دھیان کمرے کی کھڑکی سے نظر آتے کالے پہاڑوں پہ مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ قانتہ نے آتے ہی پہلا کام اس کے کمرے کی کھڑکی کھولنے کا کیا تھا' جگنو کو بڑے تیز بخار نے آلیا تھا، جذباتی پورشن تھی یا کل کے واقعے کا اثر وہ رات ہونے سے پہلے تپنے لگی تھی۔ جگنو نے اسے منع نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے بخار سے چھنکتے جسم کو ایک نامانوس سی راحت ملی تھی۔ اس کے کمرے میں کلون اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو پھیلی تھی اور یہ پھول ابھی چند منٹ پہلے امیر حمزہ دے کر گیا تھا۔ وہ جگنو کا حال پوچھنے آیا تھا، اس سے پہلے برہان، حور کے ساتھ اس کی خیریت دریافت کر کے جا چکا تھا۔ حور مارے باندھے ساتھ ضرور آئی تھی لیکن اس نے جگنو سے کلام تک نا کیا تھا، ان کے نکلنے کے کچھ ہی دیر بعد امیر حمزہ ہاتھ میں تازہ توڑے پھولوں کا گلدستہ سا بنا کر دروازہ کھٹکھٹا کر چلا آیا' جگنو پر نظریں مرکوز کیے وہ دھیمے قدموں سے چلتا اس کے بیڈ کے قریب آ کھڑا ہوا تھا' بالکل سائڈ پر رکھی راکنگ چیئر پر بیٹھی قانتہ کی موجودگی سے وہ یکسر لاعلم تھا او قانتہ نے بھی اسے اپنے ہونے کا احساس نہیں دلا تھا وہ تو بس خاموشی سے دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے تھی اور پھر اسے حیرت نے اپنی لپیٹ میں لے ل تھا۔ جگنو کے رویے نے اسے اچنبھے میں ڈال دیا تھ وہ امیر حمزہ کو دیکھتے ہی جیسے مسمرائز ہو گئی تھی' نگا ساکت، دھڑکنیں شوریدہ اور جذبات ہیجان زدہ۔

وہ دونوں تھے اور کوئی نا تھا یا سب کچھ تھا بس و دونوں نا تھے۔ اردگرد کا ہر منظر جیسے تحلیل ہو گیا تھا' بر ایک تار تھا جو نگاہوں سے نگاہوں کو جوڑے دل کے کو اڑ دھڑ دھڑائے جا رہا تھا۔ جگنو کے بخار کی حدت سے جلتے چہرے پہ امیر حمزہ کی پر تپش نگاہیں مزید سرخ بکھیرے اسے بھٹی کی مانند سلگائے دے رہی تھیں۔

''جلے کو جلاؤ گوری۔'' یہ آواز قانتہ کی تھی جس سے مزید برداشت کرنا دو بھر ہوا جا رہا تھا' تب ہولے سے گنگناتے ہوئے دونوں کا ارتکاز توڑا تھ دونوں کسی ان دیکھے حصار سے نکلے تھے جیسے ا ہونقوں کی طرح قانتہ کی صورت دیکھے جا رہے تھے

''اوہ تو آپ بھی یہاں تشریف رکھے ہوئے ہیں قانتہ جی۔'' امیر حمزہ نے فوراً خود کو سنبھالے ہوئے تھا اور بشاش لہجے میں قانتہ سے پوچھا۔

''جی ہاں جی! پچھلے آدھے گھنٹے سے' مگر مجال ہے جو محترمہ اوز ئے رحمانی نے ہمیں منہ لگایا ہو۔ آپ کے آنے کی دیر ہوئی اور ان کا منہ ٹھا کر کے لگ گیا' قسم سے۔''

جگنو نے اسے تنبیہاً گھورا لیکن امیر حمزہ کا قہقہہ بے اختیاری تھا' اسے قانتہ کی بات کا لطف آیا تھا۔

''چلیے کسی کو تو ان کا منہ لگا' اب وہ خوش قسمت آپ نہیں تو کیا، کیا جائے۔ آپ اس عالی مرتبت کو دعا دیجیے جس کو یہ شرف حاصل ہوا' کیا خیال ہے؟''

وہ ذو معنی انداز میں کہتا قانتہ سے پوچھ رہا تھا، اس کی بات پر جگنو سٹپٹا کر امیر حمزہ کے دیے پھولوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ قانتہ نے جگنو کو بغور دیکھا اور آنکھیں سکوڑتی ہوئی بولی۔

''یہی تو حیرت ہے کہ مجھے خبر بھی نا ہوئی اور بات منہ لگنے سے دل لگنے تک جا پہنچی۔ لوگ ایسے بے مروت ہوئے کہ ہمیں بتایا تک نہیں اور اکیلے ہی منزلیں مار لیں۔'' قانتہ کی شکایتی نظریں ہنوز جگنو کی طرف تھیں۔

''چلیے اب تو یہ ستم ہو گیا نا' اب آپ اگلے مائل اسٹون پہ انتظار کیجیے' پر پیچ راہوں میں خیر خواہوں کی بڑی ضرورت رہتی ہے۔ امید ہے مایوس نہیں کریں گی' ہم آپ پہ تکیہ کیے لیتے ہیں۔ ہوا لگنے سے بچایے گا' چلتا ہوں۔'' وہ بڑی مہارت سے قانتہ کی بولتی بند کرتا، اسے شرارت سے دیکھتا باہر نکل گیا تھا اور قانتہ اس کے لفظوں کے خوب صورت الجھاؤ میں کتنے ہی پل الجھی رہی تھی۔ جب ہوش آیا تو سب سے پہلے اپنی معمول سے زیادہ کھلی آنکھیں نارمل حالت میں کیں اور پھر تیکھے چتون لیے جگنو کی طرف رخ موڑا، جس کے لبوں پہ پرائی سی مسکراہٹ تھی' وہ اس کو متوجہ کرنے کے لیے زور زور سے راکنگ چیئر پر جھولنے لگی لیکن جگنو نے بھی اس کی طرف دیکھ کے نا دیا بلکہ وہ کھڑکی سے نظر آتے سیاہ و سفید پربتوں پہ نظریں جمائے ہوئے تھی یوں جیسے اس وقت اس سے زیادہ ضروری کام اور کچھ بھی نا تھا۔

''تم نے مجھے بتانے کی بھی زحمت نہیں کی' کیا میں اتنی بھی اہم نہیں رہی تمہارے لیے...... تمہاری زندگی میں ان چند دنوں میں اتنی بڑی تبدیلی آئی اور تم نے مجھے ہی بے خبر رکھا' جی تو چاہ رہا ہے کہ ان ہی پہاڑوں پہ لے جا کر تمہیں دھکا دے دوں۔''

جگنو کو اس کی بات پر ہنسی آئی اور وہ ہنستی چلی گئی، اتنا کہ آنکھوں کے رستے محبت بہنے لگی۔ اس نے آستین رگڑ کر آنکھوں میں آیا پانی صاف کیا اور مکمل اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

''مثلاً مجھے تمہیں کیا بتانا چاہیے تھا؟ کیا یہ کہ مجھے ایسی محبت ہو گئی ہے جس کا آغاز و انجام غیر منطقی ہے۔ میرے دل پر ایسے شخص نے نقب لگائی ہے جسے میں اس قدر جانتی ہوں بس کہ اس کا نام امیر حمزہ ہے' نا اس کے آگے کچھ اور نا بعد۔ میں ابھی تک خود کو ہی ٹٹول کے نہیں دیکھ سکی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل میں کسی نے میخ گاڑ دی ہو اور اس کے نتیجے میں میری دھڑکنیں تک مفلوج ہوئی پڑی ہیں قانتہ!'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ ایک بے بسی سی صاف محسوس کی جا سکتی تھی اس کے لہجے میں، قانتہ ایک جھٹکے سے راکنگ چیئر چھوڑتی اس کے قریب چلی آئی' اس کا ہاتھ تھاما تو وہ ابھی بھی بخار کی حدت سے گرم تھا۔

''انکل سے یا بابی جان سے بات کرو نا' وہ امیر حمزہ سے کہیں کہ اپنے والدین کو بلائے' آنکھ مچولی مت کھیلے۔''

''وہ آنکھ مچولی نہیں کھیل رہا' ابھی آنکھوں سے کھیل رہا ہے۔ تم بس دعا کرو کہ دل سے نا کھیلے' میرے دل میں میخ گڑی ہے قانتہ! اسے ٹھوکر لگائے گا تو سرخ سیال اس کے پیروں سے لپٹ جائے گا' وہ جا کے بھی جا نہیں پائے گا۔'' وہ عجیب کھوئے کھوئے لہجے میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی تو قانتہ کو

وحشت سی ہوئی، وہ اس کے دونوں ہاتھ جکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔

"خدارا جگنو...... مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو، میرے دل کو پنکھے سے لگ جاتے ہیں، مجھ سے نہیں ہضم ہوتا تمہارا گاڑھا لہجہ، تمہارے ثقیل الفاظ، انہیں ایسی کتابوں میں دبا کر اٹھا کرو جن میں پڑھتی ہو تم بھی۔"

"کتابوں سے محبت کی تو جا سکتی ہے قانتہ! سیکھی نہیں جا سکتی، سیکھنے کے لیے آسن جمانا پڑتا ہے۔ سانس سانس کے ساتھ اس کا راگ الاپنا پڑتا ہے، سبز سے زرد ہونا پڑتا ہے اور تب محبت آپ کو چرما کر آزماتی ہے کہ آپ میں اس راہ پہ بکھر جانے کا حوصلہ ہے یا نہیں، یہ سستے کا سودا نہیں ہے، تم مت الجھو قانتہ! میں ہوں نا الجھی پڑی۔"

اور قانتہ یکلخت گونگی سی ہو گئی، جگنو اس راہ چل پڑی تھی جس پر آگے کانٹے پلکوں سے چننے پڑتے ہیں۔ وہ فکرمندی سے اسے دیکھتی سوچوں کے بھنور میں اتر رہی تھی اور جگنو کے گالوں کے بھنور اداسی کی قبا اوڑھے سرمئی پربتوں پہ ڈھلتی شام جیسے پژمردہ سے آج ہرگز دلکش نہیں لگ رہے تھے۔ قانتہ نے اس پر پُر تاسف نگاہ ڈال کر اپنے چہرے کا رخ بھی کھڑکی سے دکھائی دیتے برف پوش پہاڑوں کی سمت پھیر لیا۔

☆☆☆

اس کی طبیعت آج قدرے بہتر تھی، صبح فجر کے وقت بابی جان اسے اٹھانے آئیں تو بخار بالکل نہیں تھا، انہوں نے وہیں نماز پڑھی تھی اور پھر جگنو کو نماز کے لیے اٹھانے کے بعد اس کے لیے گرم دودھ لینے چلی گئی تھیں۔ ہمیشہ سے اس وقت وہ اسے دودھ میں شہد ڈال کر دیا کرتی تھیں، جب ہی تو قانتہ چھیڑتی تھی کہ تم سے شہد کی میٹھی میٹھی اور بھینی بھینی جو مہک آتی ہے جگنو، تو وہ شاید اسی لیے۔

اس نے دودھ راکنگ چیئر پہ بیٹھ کر چھوٹی چھوٹی چسکیوں میں ختم کیا تھا، کمرے میں نیم اندھیرا تھا، کھڑکیاں بند اور پردوں سے ڈھکی تھیں، صرف چڑھتے دن کی ہلکی سی سرد روشنی بصارت کو دیکھنے کے قابل بنائے ہوئے تھی، ایسے نیم اندھیرے جگنو کو بہت لبھاتے تھے۔ یہاں وہ بیٹھ سکتی تھی، اب تو پھر ایک مضبوط وجہ جنم لے چکی تھی، امیر حمزہ کو سوچنا اور بے دھڑک سوچنا کہ جب کوئی بھی اس کا چہرہ پڑھ نہ سکے۔ اس کے دل میں اتر نہ سکے، صرف وہ ہو اور اس کے خوابوں کی پوٹلی، جو اس کی کل متاع تھی۔ جسے وہ بغل میں دابے رہتی تھی اور رات ہوتے ہی اپنے سامنے سلیقے سے کھول کے بیٹھ جاتی تھی۔ اس کے خواب یک دم قفس سے نکلے پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے اڑتے اور اس کے کمرے میں ہر سو منڈلاتے رہتے۔

وہ دودھ کا خالی مگ ہاتھ میں لیے آنکھیں موندے نجانے کتنا وقت یوں ہی خود ساختہ دنیا میں کھوئی پڑی رہی۔ گرم دودھ کی حرارت کا جو احساس جسم میں اترا تھا وہ رفتہ رفتہ ختم ہوا تو اسے اٹھنا پڑا، ٹھنڈک ہڈیوں میں اتر رہی تھی، اس نے دائیں ہاتھ سے اپنا بازو رگڑا اور پاؤں راکنگ چیئر سے نیچے اتارے تو یک دم ٹھٹک کر وہیں تھم گئی۔ بابی جان نا جانے کب آ کر ناشتے کی ٹرے چھوٹی سی گول ٹیبل پر دھر گئی تھیں جو اس چیئر کے ساتھ ہی پڑی تھی، یقیناً وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اور بابی جان نے اسے اٹھایا نہیں تھا لیکن اس کی سہولت کے لیے ناشتا رکھ گئی تھیں، اس نے ایک طویل سانس کھینچ کر خارج کیا اور ایک کپ چائے کے ساتھ ایک سلائس لیا۔

ٹرے اٹھا کر اسے کچن میں رکھنے کے ارادے سے کمرے سے باہر نکل آئی، کچن میں بابی جان نہیں تھیں صرف حبیبہ تھی جو فراغت کی وجہ سے کاؤنٹر پہ سر رکھے سو رہی تھی۔ بنا آواز کیے اس نے ٹرے رکھی اور پلٹ گئی، یک دم جی میں آیا کہ کمرے میں واپس جانے کے بجائے کچھ دیر باغیچے میں جا کر بیٹھے۔ یہ جو دل بوجھل سا ہوا جا رہا ہے اس میں یقیناً افاقہ ہوگا۔ پینج سے گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوا جیسے اسٹڈی میں ہلچل سی ہے۔ حیرت کی بات تھی کیونکہ اس وقت

حیدر رحمانی تو یونی ورسٹی میں ہوتے ہیں تو پھر ان کی اسٹڈی میں کون ہو سکتا ہے، کہیں انہوں نے آج آف تو نہیں لیا۔ یہ ہی سوچ کر اس نے بہت آہستگی کے ساتھ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے دھکیلا تو وہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ بابا کی اسٹڈی ٹیبل کی چیئر پر کوئی بیٹھا تھا لیکن اس کا رخ کھڑکی کی طرف تھا جہاں سے بے حد خوش گوار منظر دکھائی دیکھ رہا تھا، ریوالونگ چیئر کی پشت جگنو کی طرف تھی لہٰذا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہاں کون براجمان ہے۔ وہ دبے قدموں چلتی قریب آئی، پورے استحقاق سے چیئر کو پیچھے سے تھام کر اس کا رخ اپنی جانب کیا اور اگلے ہی لمحے بدک کے پرے ہوئی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا، محض مردانہ جیکٹ تھی جو سامنے سے کرسی کی پشت پر ڈالی گئی تھی اور اسے لگا کہ وہاں کوئی بیٹھا ہے، اس نے ایک لمبا سانس اندر کھینچا، مردانہ کلون کی تیز لیکن دلکش خوشبو بھی رگ جاں میں اتر گئی۔

"امیر حمزہ......" اس کے لبوں سے بے اختیار یہ نام ادا ہوا، اسے امیر حمزہ کے کلون کی پہچان ہو چکی تھی وہ بھی محض ان چند دنوں میں۔ وہ جھینپ کر واپس مڑنے لگی تھی کہ اچانک کسی خیال کے زیر اثر بے اختیار اس نے ہاتھ بڑھا کر جیکٹ کو چھوا، پہلی بار ذرا احتیاط سے، دوسری بار اپنائیت سے اور تیسری بار حق سے۔ اس نے جیکٹ اٹھا کر اپنے دونوں بازوؤں کی گرفت میں لے لی، بھینچ کر اسے ناک کے قریب کیا اور آنکھیں موند کر گہرے گہرے سانس بھرنے لگی۔ عجیب سے احساسات اسے گھیرے میں لیے بے تکی حرکات کروا رہے تھے، اسے ایسا لگا جیسے کل کائنات اس کی بانہوں میں منہ چھپائے سمٹی بیٹھی ہے۔

امیر حمزہ کب سے ایک نیم اندھیرے کونے میں بک شیلف سے کندھا ٹیکے بے خود سا اسے تک رہا تھا، وہ کھڑکی کے آگے کھڑی تھی۔ پس منظر میں سورج کی مٹیالی روشنی اور پہاڑوں کی سرمئی سفیدی لیے۔ نیوی بلو شال سر پر اوڑھے جس میں سے دو تین ریشمی لٹیں چہرے سے ٹکراتی اس کے ضبط کا امتحان بنی ہوئی تھیں۔ وہ یک دم کتاب ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرنے کی وجہ سے ہڑبڑا کر جیسے نیند سے جاگا، جگنو نے بوکھلا کر جیکٹ اچھالنے والے انداز میں واپس چیئر پر پھینکی، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر امیر حمزہ نے بمشکل اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا تھا، جگنو سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وہ...... میں...... وہ...... یہ جیکٹ...... بابا کی جیکٹ سمجھی تھی...... مجھے لگا وہ یہیں بھول گئے، سوچا کمرے میں رکھ آؤں۔"

"میری جیکٹ کو آپ کے لمس نے معتبر کر دیا اوزئے۔" اس نے جگنو کو اس کے اصل نام سے پکارا تو اسے لگا کہ اب سے پہلے اس نام کی ساری خوب صورتی کسی سیپ میں بند موتی کی طرح مقید تھی، محبوب کے لبوں سے ادا ہوا تو جیسے بند سیپ کا منہ کھل گیا۔

"آپ باتیں بناتے ہیں امیر!" اس نے جیکٹ کو نرم نگاہی سے دیکھتے ہوئے کہا، دل تھا کہ ہمک ہمک کر کہہ رہا تھا کہ اسے ساتھ لے جا، یادگار یار سے ہاتھ نہیں کھینچا کرتے مگر انا ہوش کی طنابیں کھینچے ہوئے تھی۔

امیر حمزہ نے اس کی اس خفیف حرکت کو نوٹس کیا اور مونچھوں کو انگشتِ شہادت سے نرمی سے کھجاتا دو قدم چلتا قریب ہوا، دوسرا ہاتھ پینٹ کی جیب میں جما رکھا تھا۔

"میں باتیں نہیں بنانا چاہتا، میں عمل کرنا چاہتا ہوں، آپ کہیے۔" خوب صورتی سے اسے سوال کی لپیٹ میں لیا تھا۔

"عمل کرنے کے لیے پوچھا نہیں جاتا، کرنے والے کر گزرتے ہیں۔ آپ کو اجازت درکار ہے۔" جگنو نے اک ذرا نگاہ پھیر کر دیکھا اور استفسار کیا۔

"مجھے تو ساتھ درکار ہے، ہر پل، ہر گھڑی، پاس ہو، ساتھ ہو، میں دل کی سلطنت دان کر بیٹھا۔"

"داسی کو سنگھاسن دے رہے ہیں، کہیں ہاتھ سے دونوں ہی نا نکل جائیں۔" وہ بے خود تھی، پہلی دفعہ امیر حمزہ کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا۔

''میں ایسا نہیں ہونے دوں گا' کوئی اپنے ہاتھوں اجڑتا ہے بھلا' مجھے قول نبھانا آتا ہے' میں پیٹھ نہیں دکھاتا۔''

''عشق، قول و قرار سے نہیں پنپتا میر! یہ تو دل کی بوٹی ہے، جذبوں کا پانی مانگتی ہے۔ قطرہ قطرہ جذب کرتی ہے' جب ہجر کی سیاہی ناسور بن کے پھیلتی ہے، اس وقت یہ بوٹی تریاق بن جاتی ہے۔''

اور جواب میں امیر حمزہ یک دم قوت گویائی کھو بیٹھا' وہ جو لفظوں کی بنت میں ماہر تھا، اس وقت گنگ ہو گیا۔ اسے جگنو کی آنکھوں سے پھوٹتی خیرہ کن چمک سے خوف محسوس ہوا' وہ سر سے پیر تک جذبوں میں نہائی اور سنوری ہوئی تھی۔ پور پور محبت کی چاشنی لٹا رہی تھی' اس کا دل کیا کہ اپنی انگلیوں سے اس کی ابھی لٹ چھو کر دیکھے' کیا اس کا لمس پا کر وہ آگ پکڑے گی۔

لیکن آگ تو جگنو کے پورے وجود کو لپیٹے ہوئے تھی' عشق کی آگ...... بھلا اس کے چھونے سے کیا ہوتا' آگ کو آگ نہیں بجھاتی' یہ تو وہ بھانبڑ ہے جسے پانی بھی مزید جلا بخش دیتا ہے۔ کھڑکی سے پار دکھائی دیتے پس منظر سے منسلک جگنو کا وجود امیر حمزہ کو دہکتے الاؤ سا لگا تھا جس کے گرد محبت گول گول چکراتی محو رقص تھی

☆☆☆

''ارے جانے بھی دو' کیسی باتیں کرتے ہو۔ میرے اپنے بچے ہیں' تنگ کریں گے تو کان کے نیچے رکھ دوں گا، ہاہاہا۔''

حیدر رحمانی بڑے خوش گوار موڈ میں ارمغان مشہدی سے بات کر رہے تھے۔ بابی جان ان کو دیکھ کر دھیما سا مسکرا رہی تھیں' وہ ارمغان مشہدی سے ایک دو بار مل چکی تھیں، اس لیے قطعی اجنبی نہیں تھے ان کے لیے' ان کے گھرانے پر برسوں پہلے ٹوٹنے والی آفت کے بارے میں بھی جانتی تھیں' لہٰذا دل میں ان کے لیے بے حد ہمدردی رکھتی تھیں۔

انہوں نے قہوے کی خالی پیالی ٹرے میں رکھی اور حیدر رحمانی کے لیے مزید قہوہ ڈالا۔ حیدر رحمانی نے ہنستے ہوئے دوسری طرف سے پوچھے گئے کسی سوال کا جواب دیا اور تسلی دلاسے کے بعد فون بند کر دیا۔

''کیا کہہ رہے تھے ارمغان میاں! بچوں کو لے کر فکر مند تو نہیں؟'' بابی جان نے قہوے کی پیالی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں فکر مند تو نہیں' بس ذرا تشویش کا اظہار کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ برہان سے تو مجھے کسی لاابالی پن کی امید نہیں لیکن اپنی بیٹی اور امیر حمزہ کی گارنٹی نہیں دے سکتا' دونوں کی روح کو چین نہیں' انہی کی طرف سے تسلی چاہ رہا تھا' میں نے کہہ دیا کہ یہ تینوں بے حد پیارے بچے ہیں، کم از کم ہمیں تو کسی قسم کی تکلیف نہیں دی انہوں نے بلکہ امیر حمزہ تو خاصا قابل بچہ ہے۔ میں اس کی ہر موضوع کے حوالے سے مکمل معلومات اور ذہنی استعداد سے بڑا متاثر ہوا تھا۔''

حیدر رحمانی کے انداز میں نرمی اور حلاوت تھی، وہ ان بچوں کے آنے سے واقعی خوش تھے۔ بابی جان نے بغور انہیں دیکھا جو اب قہوے کی چسکی لیتے، پرسوچ انداز میں سامنے دیکھ رہے تھے۔

''حیدر بیٹا! ایک بات کہوں۔'' بابی جان کے انداز میں جھجک تھی۔

''بھلا آپ کو کب سے اجازت کی ضرورت پڑ گئی بابی جان! سو باتیں کہیں۔''

''یہ...... یہ امیر حمزہ آپ کو کیسا لگا' میرا مطلب ہے کہ ویسے تو پسند آیا ہی ہے آپ کو لیکن کسی دوسرے حوالے سے نگاہ کی آپ نے؟''

''میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا' کس حوالے سے بھلا؟''

''ہماری اوزے اب بڑی ہو گئی ہے حیدر بیٹا! اب اس کے حوالے سے ہر حوالہ سوچنا پڑے گا۔''

''اوہ......'' وہ یکدم جیسے جھٹکا کھا کے چونکے تھے۔ ''ہماری اوزے اتنی بڑی ہو گئی اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں بابی جان!'' ان کے انداز میں بچوں کا سا گلہ تھا۔ بابی جان دھیما سا ہنس دیں اور اپنی بائیں آنکھ کا کونا چھوٹی انگلی سے مسلتے ہوئے بولیں۔

''حیدر میاں! جگنو میری گود میں تب سے ہے جب سے اسے کسی رشتے، تعلق کی پہچان تک نہ تھی' اک آپ کو جانتی تھی بس، آپ کے علاوہ نا کسی کے پاس آتی تھی اور نا مانوس ہوتی تھی لیکن پھر اس نے مجھے جان لیا اور جیسے مجھ میں ہی اسے ہر رشتہ مل گیا۔ ماں، بہن، سہیلی اور غم گسار' جب اتنے بہت سے دھاگوں سے بندھے ہونے کے باوجود مجھے احساس تک نا ہوا کہ ہماری جگنو اب بڑی ہو گئی ہے تو آپ تو پھر مصروفیات میں گھرے آدمی تھے' خیر...... بات کہاں سے کہاں نکل گئی' میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ اپنی اوزے کے لیے امیر حمزہ کے حوالے سے بھی سوچیں' اچھا سلجھا ہوا بچہ ہے اور پھر خاندانی ہے۔

اب وہ کھل کے کیسے کہتیں کہ انہوں نے امیر حمزہ کا جھکاؤ جگنو کی اور محسوس کیا ہے' بڑے مناسب الفاظ کے چناؤ کے ساتھ انہوں نے مدعا بیان کر ڈالا تھا' حیدر رحمانی کی آنکھوں میں یک دم چمک سی ابھر آئی تھی' ان کے تخیل نے بڑا سہانا منظر کھینچا' اوزے اور امیر حمزہ ساتھ ساتھ' ہاتھوں میں ہاتھ، خوشحال اور پرسکون زندگی۔

بالکل ویسا جیسا کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کے لیے چاہ سکتا ہے' ان کی آنکھوں میں بے حد خوش گوار احساس نمی بن کے چمکا۔ بابی جان نے آسودہ مسکراہٹ چہرے پر سجائی اور مطمئن ہو گئیں' جو بات بہت دن سے ان کے دل میں مچل رہی تھی آج بڑے سبھاؤ سے حیدر رحمانی تک پہنچا دی تھی۔ اوزے ان کو بچوں سے بڑھ کر عزیز تھی تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی زندگی میں آنے والا نیا موڑ ان کی نگاہوں سے مخفی رہ جاتا' وہ تو اب بس دعا گو تھیں کہ ان کی جگنو کو اس کی منزل مل جائے۔

☆☆☆

وہ اکیلی ہال کمرے کی فرشی نشست پر بیٹھی چند میگزینز کا جائزہ لیتی گرم گرم چاکلیٹ ملک کی چسکیاں بھر رہی تھی جب اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی اس کے قریب آ کر رک گیا تھا،

الف لیلہ ہزار داستانیں

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب -/1200 روپے
ڈسکاؤنٹ -/300 روپے
آج ہی -/950 روپے
منی آرڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

نظیر فاطمہ

بہت دیر کردی

اسے لگا حبیبہ ہوگی تب ہی نظر اٹھائے بغیر مصروف لہجے میں گویا ہوئی۔

''ابھی جاؤ حبیبہ! ابھی تو میرا مگ آدھے سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ ہاں اگر ڈرائی فروٹ کی پلیٹ لے جانا چاہو تو لے جاؤ۔''

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟''

اس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا تھا۔ وہاں حور اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ تن کر کھڑی تھی۔ سیاہ پنڈلیوں کو چھوتی قمیص کے اوپر سیاہ موٹی اون کا سوئٹر پہنے وہ حسن کا آتش فشاں لگ رہی تھی۔ جگنو مرعوب سی ہوگئی اور ذرا سا پرے کھسک کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''سوری...... مجھے لگا حبیبہ ہوگی۔ اصل میں دھیان بھی نیچے تھا نا۔'' اس نے نادم سا ہو کر صفائی دی۔ جواب میں ایک استہزائیہ مسکراہٹ حور کے ہونٹوں پر کھیلی اور اک ادا سے اپنے کھلے بالوں کو پیچھے جھٹکتے ہوئے بولی۔

''کوئی بات نہیں، انفیکٹ نیچے دیکھنے والوں کو کبھی اونچا دیکھنا چاہیے بھی نہیں۔ اوقات بھول جاتی ہے، اب زمین پر رینگ کر چلنے والا گھونگا اگر یہ خواہش کرے کہ باز بن کر آسمان کی وسعتیں ناپے تو یہ سراسر اس کی حماقت ہوگی نا کہ باز کا قصور کیونکہ وہ تو اڑنے کے لیے ہی پیدا ہوا ہے۔ یہ تو گھونگے کو چاہیے نا کہ اپنی ''چال'' دیکھے اور خواہش دیکھے، بلڈی فول۔''

بے حد نفرت اور حقارت سے وہ جو بھی بول رہی تھی، کس کے لیے؟ اور کیوں؟ جگنو حیرت سے ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھتے ہوئے سوچ کر رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر جواب میں اس سے کیا کہے۔ وہ اس کی مہمان تھی لہٰذا بدتمیزی تو نہیں کر سکتی تھی لیکن حور کے اس سارے فلسفے کا جواز کیا تھا۔ اس نے میگزین بند کر کے سائڈ پر رکھا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنے ہی لگی تھی کہ حور نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔

''پہلے میری سن لو کیونکہ مجھے تمہاری ہکلاہٹیں سننے کا قطعی شوق نہیں جس کو ہے اس کے بارے میں ایک بات اچھے سے جان لو کہ اسے طرحدار لڑکیوں کا بھی شوق ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک اسٹائلش اور گرومڈ لڑکی اس کے سرکل میں ہے۔ اسے ڈانس پارٹیز میں کپل ڈانس کرنا بہت پسند ہے جس میں اس کی پارٹنر قدم سے قدم ملا کر اس کا ساتھ دے سکے۔ اسے اُدھم مچانے والی اور زندہ دل لڑکیاں پسند ہیں۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کو وہ تمہاری طرف معمولی سا متوجہ ہوا اور تمہیں لگنے لگا کہ وہ تم پر دل ہار بیٹھا ہے؟'' اس کا لہجہ سرسرانے لگا تھا، اپنا چہرہ جگنو کے چہرے کے قریب کر کے وہ ڈرامائی تاثر کے ساتھ اسی لہجے میں بولی۔ ''تم نے کبھی خود کو سرتاپا آئینے میں دیکھا ہے؟ کیسی بھدی لگتی ہو چلتی ہوئی، لنگڑی بطخ۔'' جگنو پل بھر میں زرد ہوئی تھی، وہ حیران تھی کہ یہ انجان لڑکی اس سے اس شدت کی نفرت کس بنیاد پر کر رہی ہے۔ اس نے کیا کیا ہے اسے۔

''تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ امیر حمزہ کو پانے کا خواب دیکھنے کے بجائے اپنی عقل ٹھکانے لگاؤ۔ تم اس کے لیے وقت گزاری کا ذریعہ تو ہو سکتی ہو پر اس کا آنے والا وقت نہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اپنا ماسٹرز مکمل کرو اور اسی یونی میں آنے والی نسلوں کو سنوارو۔ اسی میں زندگی تمام کر دو۔ ثواب ملے گا۔''

استہزائیہ اس کا گال تھپتھپا کر زہر اگلتی نظروں سے اسے دیکھتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ راہ میں پڑے ایک میگزین کو پاؤں کی ٹھوکر سے پرے کرتی وہاں سے چلی گئی۔ یہ ٹھوکر وہ درحقیقت جگنو کو مار کر گئی تھی۔ پیچھے ساکت اور ٹھٹھرا وجود لیے جگنو جیسے فضا میں معلق ہوگئی تھی۔ ساری کائنات اس وقت اسے بلیک ہول کی مانند دکھائی دے رہی تھی جس میں اس کا بے جان جسم دھجیوں کی صورت کٹ پھٹ کر ضم ہو رہا تھا۔ وہ محبت تو کر بیٹھی تھی لیکن اس کی محبت کی کوکھ میں اعتبار نہیں پنپ سکا تھا، وہ بانجھ تھی اور بانجھ محبتیں آدم خور ہوتی ہیں۔

(باقی آئندہ ماہ)

☆☆

مقصود نے اُبرو اچکا کر طالب کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا کپ پٹخنے کے انداز میں میز پر رکھ دیا۔

"تم نے ایاز کو شادی میں بلایا تو میں شادی میں شرکت کروں گا نہ اپنے بیوی بچوں کو کرنے دوں گا۔" طالب اپنے بڑے بھائی مقصود کو اپنے بیٹے کی شادی کا کارڈ دینے آیا تھا۔ جب باتوں کے دوران مقصود کو یہ معلوم ہوا کہ طالب نے ایاز کو بھی شادی میں بلایا ہے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔

"بھائی صاحب! وہ بھی میرے بھائی ہیں۔ میں اُنھیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟" طالب نے مقصود کی بات سن کر تحمل سے کہا۔

"چلو تو پھر تم مجھے چھوڑ کر اپنے اس بھائی کو بلا لو۔" مقصود نے غصّے سے کہا۔ طالب مقصود کے لہجے پر چپ کا چپ رہ گیا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر وہ واپسی کے لیے اُٹھ گیا۔

"دیکھو تو ذرا طالب کو، اسے اتنا خیال بھی نہیں آیا کہ اپنے بڑے بھائی کی ناراضی کا ہی لحاظ کر لیتا۔" بیگم مقصود نے بجائے شوہر کو سمجھانے کے ان کو اور شہ دی۔

"ہاں مجھے بھی طالب سے یہ اُمید نہیں تھی۔ آخر میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔ اسے کچھ تو لحاظ رکھنا چاہیے تھا۔" مقصود تاسف سے سر ہلا کر بات کرتے وقت یہ بھول گیا کہ ایاز بھی طالب کا بڑا بھائی ہے۔ طالب اپنے دونوں بھائیوں سے چھوٹا اور دو بہنوں سے بڑا تھا۔

"مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ طالب نے پہلے بھی تو اپنے دو بچوں کی شادیاں کی ہیں، تب تو اسے ایاز کو بلانے کا خیال نہیں آیا تو اب کیوں؟" بیگم مقصود نے نیا نکتہ نکالا۔

"امی! آپ شاید بھول رہی ہیں کہ ایاز چچا پندرہ سال امریکہ میں رہے ہیں اور طالب چچا نے اپنے دونوں بچوں کی شادیوں میں ایاز چچا کو بلایا تھا مگر وہ شرکت کے لیے آ نہیں سکے تھے۔ تین سال پہلے وہ مستقل پاکستان شفٹ ہو گئے تھے تو ظاہر ہے اب وہ اس شادی میں شرکت کریں گے۔ آپ لوگ طالب چچا کو پریشرائز کیوں کر رہے ہیں۔" عانیہ نے چچا کو پریشان واپس جاتے دیکھا تو کہے بنا نہ رہ سکی۔

"تمھیں بڑی ہمدردی ہو رہی ہے ان سے اور یہ ایاز کب سے تمہارا چچا ہو گیا۔" بیگم مقصود نے عانیہ کو ڈپٹ دیا۔

"کب سے کیا مطلب......؟ جب سے میں پیدا ہوئی ہوں تب سے وہ میرے چچا ہیں۔" عانیہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"لو باپ اُسے بھائی نہ مانے اور بیٹی کے چچا ہو گئے۔" بیگم مقصود نے طنز کیا۔

"ماننے نا ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ حقیقت تو حقیقت ہی رہتی ہے۔ ویسے بھی خون کے رشتے زبان سے کہہ دینے سے کب ٹوٹتے ہیں۔" عانیہ کو ماں کی بات پر افسوس ہوا۔

"تم بچی ہو...... تم لوگوں کو بڑوں کے معاملوں میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے تم بھی خاموش رہو۔" مقصود نے گویا عانیہ کو اپنی حد میں رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ عانیہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔

"چاہے بڑے اپنے معاملات کو غلط طریقے سے ہی ہینڈل کر رہے ہوں مگر بچوں کو بولنے کا حق نہیں ہے واہ......" عانیہ دل ہی دل میں کہہ کر اُٹھ گئی۔

☆☆☆

مقصود، ایاز، طالب، خالدہ اور ساجدہ پانچ بہن بھائی تھے۔ سب بہن بھائیوں کی شادیاں اماں ابا کے رشتہ داروں میں ہوئیں۔ گاؤں میں ابا کی کافی آبائی زمینیں تھیں۔ اماں ابا کے دنیا سے گزر جانے کے بعد ساری زمینیں فروخت کر کے بہنوں کو ان کا حصہ ادا کیا گیا اور باقی کی رقم تینوں بھائیوں نے آپس میں برابر بانٹ لی۔ طالب سترہویں گریڈ کا سرکاری آفیسر تھا۔ اُس نے اپنی رقم ایک نئی بننے والی سوسائٹی میں پلاٹ لے کر انویسٹ کر دی۔

مقصود اور ایاز نے اپنی رقم ملا کر کاروبار شروع کر دیا جو دونوں کی محنت سے خوب چل نکلا۔ پانچ سات سال دونوں نے اکٹھے کام کیا۔ پھر ایاز نے اپنے سسرالیوں کے پاس امریکہ شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے کاروبار سے اپنا حصہ الگ کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ مقصود کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ حالانکہ یہ کوئی ناجائز مطالبہ نہیں تھا۔ ایاز نے یہ بھی کہا کہ وہ اسے اس کے حصے کی رقم دے دیں اور پورا کاروبار اسی طرح چلاتے رہیں۔ مگر مقصود حصہ الگ کرنا چاہتا تھا نہ رقم دینا چاہتا تھا۔ اس نے آنا کانی کرنا شروع کر دی تو دونوں بھائیوں میں تو تو میں میں ہو گئی جو اتنا بڑھی کہ پورا خاندان اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ بڑی مشکلوں سے ایاز کو اس کا حصّہ دلایا گیا۔ مقصود نے اس کا حصّہ تو دے دیا مگر ساتھ ہی اس سے اپنا ہر تعلق ختم کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔

ایاز اپنا حصّہ لے کر امریکہ چلا گیا۔ پندرہ سالوں میں وہ کوئی تین چار بار پاکستان آیا۔ پہلی دفعہ جب وہ پاکستان آیا تو اپنے باقی بہن بھائیوں سے ملنے کے ساتھ ساتھ وہ مقصود سے ملنے بھی گیا مگر مقصود نے ایاز کو گھر میں قدم نہ رکھنے دیا اور دروازے سے رخصت کر دیا۔ سب نے مقصود کو اپنا طرزِ عمل بدلنے کا مشورہ دیا مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹا رہا۔ اس کے بعد ایاز جب بھی پاکستان آیا، مقصود سے ملے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

پندرہ سال امریکہ میں گزار کر تین سال پہلے ایاز اپنی فیملی سمیت دوبارہ پاکستان شفٹ ہو گیا تھا۔ تین سالوں میں ایاز نے بہت دفعہ صلح کی کوشش کی مگر مقصود نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔ اب طالب کے بیٹے کی شادی تھی اور مقصود کی ضد تھی کہ ایاز کو شادی میں نہ بلایا جائے۔

☆☆☆

طالب گھر پہنچا تو تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"دے آئے کارڈ سب کو؟" بیوی نے دیکھا تو پانی کا گلاس لیے چلی آئی۔

"ہاں" طالب نے پانی کا گھونٹ بھرا۔

"اب ہو گئی ہے نا تھکن...... میں نے کہا بھی تھا کہ لڑکے کارڈ دے آئیں گے مگر آپ کو بھی ضد ہی ہو گئی تھی کہ اپنے بہن بھائیوں کو کارڈ دینے آپ خود جائیں گے۔" بیوی کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"نہیں...... گاڑی پر گیا تھا کارڈ دینے۔ پیدل تھوڑی گیا تھا جو تھکن ہوتی۔"

"پھر ایسے کیوں بیٹھے ہیں؟" جواب میں طالب نے مقصود کا مطالبہ دہرا دیا تو ان کی بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"مجھے حیرت ہے کہ بچپن میں ایک پلیٹ میں کھانے اور ایک گلاس سے پانی پینے والے بہن بھائی بڑے ہو کر آپس میں کیسے ایسی ناراضیاں پیدا کر لیتے ہیں کہ ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں رہتے۔" طالب نے افسوس سے کہا۔

"مقصود بھائی بڑے پکے ہیں اپنی ضد کے۔ اٹھارہ سالوں سے ایک بات کو لے کر بیٹھے ہیں۔ چھوڑیں بھی اب۔ زندگی کے چند سال ہی بچے ہیں ہم لوگوں کے پاس۔ وہ تو بندہ اپنوں کے ساتھ محبت

غم ہے یا خوشی ہے تو

تنزیلہ ریاض

ناولٹ

دوسری قسط

کرنے میں گزارے۔" طالب کی بیوی خالی گلاس پکڑ کر اُٹھ گئی۔

☆☆☆

"یار تو ہی کوئی کوشش کر...... باپ کو منا کسی طرح۔" طالب نے مقصود کے سب سے بڑے بیٹے کو فون کرکے منت کی۔

"یار چچا! میں کیا کرسکتا ہوں بھلا۔ آپ کا تو پھر لحاظ کرلیا اُنھوں نے مگر میری تو وہ بیچ میں جوتوں سے تواضع کریں گے۔ آپ کیا جانتے نہیں ہیں اُنھیں؟"

"اچھا چلو میں دیکھتا ہوں۔" طالب نے مایوس ہو کر فون بند کردیا۔ پھر سب کے سمجھانے بجھانے پر اتنا ہوا کہ مقصود نے بیوی، بچوں اور بہوؤں کو شادی میں جانے کی اجازت دے دی۔ بیوی نے تو جانے سے صاف انکار کردیا البتہ بچوں اور بہوؤں نے خوشی خوشی شرکت کی۔ شادی میں ایاز اور اس کی فیملی سے ملاقات ہوئی۔ ایاز کتنی دیر بھتیجوں بھتیجیوں کو گلے سے لگائے کھڑا رہا۔ بچے بھی یوں ملے جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی فاصلہ آیا ہی نہیں تھا۔ شادی بخیر و عافیت انجام پائی۔

☆☆☆

طالب کے بیٹے کی شادی کو کوئی دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ ایک روز صبح صبح مقصود کے موبائل پر طالب کی کال آئی۔

"ہیلو" روتے ہوئے طالب کی آواز سن کر مقصود پریشان ہوگیا۔

"کیا بات ہے طالب؟ رو کیوں رہے ہو؟ سب خیریت ہے نا؟" مقصود نے پریشانی سے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔

"ایاز بھائی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔"

"کیا؟" مقصود ایک دم صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایاز کی موت کی خبر سن کر اس کا دل یوں اچھلا جیسے ربڑ کی گیند زمین سے ٹکرا کر اونچائی تک جائے اور پھر زمین پر واپس آجائے۔

"ک...... ک...... کب؟ کیسے؟" اُسے سمجھ میں نہ آئی کہ کیا پوچھیں۔ اس کے اردگرد جیسے ایک بوجھل، سرد اور بھیانک سی تاریکی پھیلنے لگی تھی۔

"رات کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" مقصود فون بند کرکے اپنے اس بھائی کے لیے رونے لگا جس کو اس نے اٹھارہ سال پہلے اپنے لیے مرا ہوا قرار دے دیا تھا۔

وہ روئے جاتا تھا اور اس کے سامنے، بچپن اور جوانی کے وہ ایام جب دونوں بھائیوں میں بہت محبت اور سلوک تھا، فلم کی طرح چلنے لگے۔

☆☆☆

"ہائے، ایاز اُٹھ...... دیکھ تیرا بھائی تجھ سے صلح کرنے آیا ہے...... اُٹھ یار...... یہ دیکھ...... معاف کردے۔" مقصود گھٹنوں کے بل جھک کر ایاز کی میت کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا۔ سب کے چہروں پر آنسوؤں کے ساتھ مقصود کے لیے تاسف ہی تاسف تھا۔

"اُٹھیے تایا...... ابو بہت دور چلے گئے اب۔" ایاز کے بیٹے نے مقصود کو اُٹھا کر نہ جانے گلہ کیا تھا یا حقیقت بتائی تھی۔ مقصود سائڈ پر بیٹھ کر روئے جارہا تھا۔ اُس کا دایاں ہاتھ اپنے دل پر تھا مگر دل پر ہاتھ رکھ لینے سے کبھی بھی اضطراب کم نہیں ہوتا۔ سو وہ بھی اضطراب میں گھمن گھیریاں کھا کر آنسو بہائے چلا جارہا تھا۔

"آپس کی ناراضی جسے تین دن میں ختم کر دینے کا حکم ہے، اُسے ہم لوگ سالوں اپنے ساتھ کیوں رکھتے ہیں؟ کیوں ہم لوگ صلح کرنے کے لیے دوسرے کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں؟ ہم اپنی زندگیوں میں ہی ناراضی ختم کرکے صلح کرلیا کریں تو یوں پچھتاوے کے آنسو بہانے کی اذیت سے بچ جائیں۔" طالب اپنے بڑے بھائی کو زار و قطار روتے دیکھ کر سوچ رہا تھا۔

☆☆

"دوستوں کے درمیاں، دوستوں کے درمیاں
وجہ دوستی ہے تو...... میری زندگی ہے تو
غم ہے یا خوشی ہے تو...... میری زندگی ہے تو"

نصرت فتح علی کی آواز اتنی بھلی لگ رہی ہے کہ میں اطمینان سے بس غزل کے اشعار میں گم ہوگیا۔ معذرت خواہ ہوں کہ وہ بات جو آپ کو بتا رہا تھا، وہ ادھوری ہی رہ گئی۔ مجھے ذرا اطمینان سے نشست سنبھال لینے دیجیے پھر میں آپ کو باقی کی تفصیل سے آگاہ کرتا ہوں۔

ہاں جی تو میں آپ کو اپنی بہو کی اس گھر میں آمد کے دلچسپ واقعہ کے متعلق بتا رہا تھا۔ آئیں وہاں سے ہی شروع کرتے ہیں جہاں سے گزشتہ بار سلسلہ ادھورا چھوڑا تھا۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ساری عزت مآب خواتین کے درمیان ایک رشتے کے معاملے پر ٹھن گئی تھی اور بات یہاں تک آ پہنچی تھی کہ اہلیہ کے اصرار بے شمار پر میں نے ساہیوال ہمشیرہ کے گھر جانے کا ارادہ کرلیا تھا تاکہ بچوں کو ایک بار باضابطہ ایک دوسرے کو دیکھنے اور بات کرنے کا موقع مل سکے حالانکہ مجھے امید تھی کہ اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلنے والا تھا لیکن پھر بھی آپ کو پتا ہی ہے کہ بیگمات کے آگے کسی کی نہیں چلتی اگرچہ ان کا ساہیوال جانے کا ایجنڈا کچھ اور تھا، میرا کچھ اور لیکن میں تو ان کی خاطر خاموش ہی رہا مگر وہ جس کی وجہ سے یہ سارا کھڑاک شروع ہوا تھا وہ یہ بات سنتے ہی چلانے لگا تھا، آئیں ذرا اسی جگہ سے دوبارہ شروع کرتے ہیں۔

☆☆☆

"میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے آپ کی نظر میں، زبانی کلامی اکلوتا بیٹا ہوں میں آپ کا اور ذرا وہ لوگ ملیں مجھے کسی دن جو کہتے ہیں کہ اکلوتی اولاد ماں باپ کی آنکھوں کا تارا ہوتی ہے۔ مجھے نہیں دیکھا انہوں نے ابھی تک...... اونہہ آنکھوں کا تارا...... یہاں صورت حال یہ ہے کہ لوگ سامان باندھ کر اوکاڑے جارہے ہیں اور اکلوتے بیٹے عرف زبانی کلامی آنکھوں کے تارے کو کچھ اتا پتا ہی نہیں ہے۔"

وہ چڑ کر بولا تھا۔ مہناز بیگم نے گھنٹہ بھر پہلے اسے اسٹور روم کی الماری کے اوپر پڑے سوٹ کیس اتارنے کا حکم دیا تھا اور تب اسے پتا چلا کہ اس کے والدین اس کے سمیت پھپھو سے ملنے پنجاب جارہے ہیں اور اس کو اعتماد میں لیے بنا ہی اس کی ہوائی جہاز کی ٹکٹ بھی بک کروالی گئی تھی۔ اس کا مزاج کافی برہم ہوگیا تھا کیونکہ اسے اندازہ تو تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے پھپھو کے گھر کی پلاننگ بلاوجہ نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے وہ ماں کے ہر سوال کا جواب چڑ چڑ کر دے رہا تھا۔

"میں پوچھتا ہوں آخر میری کوئی اہمیت بھی ہے اس گھر میں یا نہیں؟" اس نے مہناز بیگم کی مسلسل خاموشی سے چڑ کر دوبارہ کہا تھا، اب کی بار انہیں بھی غصہ آگیا۔

"ارے تو اور اہمیت کسے کہتے ہیں۔ تمہاری ساری پیکنگ کردی ہے، ہر جوڑا استری کرکے رکھا ہے۔ ٹائی اور موزے سمیت تمہارا شیمپو، پرفیوم اور ہیئر جیل تک رکھ دیا ہے حتیٰ کہ اس موئے موبائل کا چارجر بھی جبکہ میرا اور ماسٹر جی کا سارا سامان ابھی تک کھلا پڑا ہے۔ ان کی شوگر اور بلڈ پریشر کی دوائیاں تک نہیں رکھیں اور کیا چاہتے ہو تم، اب کیا کلیجہ نکال کر سامنے رکھ دوں کہ تمہیں یقین آجائے کہ تم واقعی میرے اکلوتے بیٹے ہو۔" انہوں نے سخت ناگواری بھرے انداز میں کہا تھا۔ التمش نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔

"امی زیادہ اوور اسمارٹ نا بنیں۔ میں پیکنگ کی نہیں، اس پلاننگ کی بات کررہا ہوں۔ یہ بیٹھے بٹھائے آپ کو پھپھو کی یاد کیوں آنے لگ گئی؟" وہ بچہ نہیں تھا، اسے اندازہ تھا کہ اس کے ماں باپ کس نہج پر سوچ رہے ہیں اور کیا کیا حکمت عملی اپنا رہے ہیں۔

"بیٹھے بٹھائے نہیں۔ کب سے ارادہ کررہے ہیں ماسٹر جی۔ یہ تو بس بارہ ربیع الاول کی چھٹی آگئی جمعہ کو، بس پھر انہوں نے سوچا کہ آگے تین چھٹیاں خود کرلیتے ہیں۔ پانچ دن کی تو بات ہے، جمعرات کی دوپہر کو نکلیں گے اور ان شاء اللہ بدھ کی صبح اپنے گھر موجود ہوں گے۔" انہوں نے اسے تفصیل بتائی تھی

وہ کاؤچ پر نیم دراز تھا اور بے زاری اس کے ہر عضو سے ظاہر ہورہی تھی۔

"اب بتانے کا فائدہ، یہ ہی سب باتیں پہلے بھی بتائی جاسکتی تھیں۔ ٹکٹ لینے سے پہلے بھی تو مجھ سے پوچھا جاسکتا تھا نا۔" وہ اسی انداز میں بولا۔ مہناز بیگم نے اسے ناقدانہ نگاہوں سے گھورا۔

"ارے اتنے بھی نواب نہیں ہو تم کہ ہر کام تم سے اجازت لے کر کیا جائے۔ اب کیا اتنا حق بھی نہیں ہے ہمارا تم پر کہ تمہیں اپنے ساتھ کہیں لے جاسکیں۔"

"ہاں جی بس میری باری آپ کو یہ ہی جذباتی قسم کے ڈائیلاگز یاد آجاتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ اہمیت اس گھر میں دودھ والے اور سبزی والے کی ہے جسے آپ نے ایک سال پہلے ہی اپنے اس سرپرائز ٹرپ ٹو اوکاڑہ کے بارے میں بتادیا ہوگا لیکن مجھ سے ایسے چھپایا جیسے میں آپ کا شریکا ہوں۔" وہ واقعی بہت ناراض تھا۔ مہناز بیگم کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے مسکراہٹ چمکی پھر غائب ہوگئی۔

"اوکاڑہ نہیں ساہیوال...... ساہیوال رہتی ہیں وہ اور ان سب کو پہلے سے بتانا ضروری تھا نا ورنہ وہ روز آکر گھر کا دروازہ بجاتے رہتے اور پھر جتاتے کہ مہینے کے پورے پیسے دو کیونکہ ہم تو روز آتے رہے ہیں۔" انہوں نے محبت سے اسے سمجھایا تھا۔

"میں چاہے خوار ہو ہو کر بیمار ہوجاؤں لیکن آپ کو کیا پروا، آپ بس اوکاڑے جائیں۔" وہ پھر غرا کر بولا تھا۔ مہناز نے اس کی جانب گھور کر دیکھا۔

"نہیں ہوتے تم بیمار، اتنی محبت کرنے والی پھپھو کے گھر جارہے ہو۔ دیکھنا کیسے جان نچھاور کریں گی تم پر اور بار بار اوکاڑہ اوکاڑہ کیوں کررہے ہو، جیسے جانتے نہیں کہ وہ ساہیوال رہتی ہیں۔"

"ایک ہی بات ہے، اوکاڑہ ہو یا ساہیوال۔ ہمارا مسئلہ تو وہی ہے نا چار فٹ دس انچ۔ مجھے سمجھ نہیں ہے جیسے۔" اس نے یہ جملہ دھیمی آواز میں کہا تھا پھر ان کو دیکھ کر بلند آواز میں بولا۔

"میری ٹکٹ کیوں لی آپ لوگوں نے مجھے بتائے بنا۔ مجھے نہیں جانا، ہمارے ٹیسٹ ہورہے ہیں۔ میرا فائنل ٹرم کا ایگزام ہے سر پر اور آپ لوگوں کو پھپھو صاحبہ کی یاد ستانے لگ گئی ہے۔ میں نہیں جارہا کہیں بھی۔" وہ بچوں کے سے انداز میں بولا۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ التمش! کسی کی محبت کا جواب ایسے دیتے ہیں کیا۔ وہ تمہیں اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتی ہیں، عزت دیتی ہیں اور تم......" مہناز بیگم نے زچ ہوکر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"التمش ہوں میں۔ مجھے تو سب ہی چاہتے ہیں۔ جانے انجانے سب کو ہی محبت ہوجاتی ہے مجھ سے تو اب کیا میں ہر ایک کی خاطر اپنی روٹین خراب کرتا رہوں۔" وہ ناگواری بھرے انداز میں بولا تھا اور ابھی مزید کچھ کہنا بھی چاہتا تھا لیکن مہناز کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مزید کچھ نہیں بولا۔

"ارے ارے...... توبہ توبہ...... اتنا نخرہ...... خدا کو مانو التمش! تمہارا مسئلہ کیا ہے، اتنا خود پسند ہوگئے ہو تم...... تم دو دن نہیں نکال سکتے رشتہ داروں کے لیے...... کس بات کا غرور ہے تمہیں...... غضب خدا کا کب سے سمجھا رہی ہوں مگر تم ہو کہ ایک ہی بات پر ٹھہر گئے ہو۔" وہ سخت ناراض ہورہی تھیں پھر اپنی جگہ سے اٹھیں اور کرسی اٹھانے کے لیے بڑھیں تاکہ خود ہی الماری پر پڑا سوٹ کیس اتار سکیں لیکن اس سے پہلے ہی التمش نے کرسی ان کے ہاتھ سے جھپٹ لی تھی اور الماری کی جانب بڑھا تھا۔ بڑبڑاہٹ الگ سے عروج پر تھی۔

"ہاں بس میں ٹھہر گیا ہوں ایک بات پر...... آپ لوگ نہیں ٹھہرے ایک بات پر۔ میں چھوٹا بچہ ہوں نا...... مجھے نظر نہیں آرہا جیسے کہ بیٹھے بٹھائے یہ ایمرجنسی ٹرپ کیوں پلان کیا گیا ہے۔ کل دوپہر تک تو ایسا کچھ نہیں تھا آج سورج نکلتے ہی ماسٹر جی کو پھپھو کی یاد ستانے لگ گئی۔ یہ تو وہی بات ہوگئی کہ اکتیس دسمبر کی رات کو سوئے تو سب ٹھیک تھا۔ صبح اٹھے تو اگلا سال۔" اس نے سوٹ کیس ان کے آگے رکھا تھا۔ انہوں نے ایک نظر بھی نا ڈالی وہ چند لمحے ان کی

جانب دیکھتا رہا۔

"اچھا بابا! کیوں ناراض ہو رہی ہیں۔ چلو مرا جاؤں گا اوکاڑے، خوش ہو جائیں بس......" اس نے اتنا کہا پھر دھپ دھپ کرتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

"اوکاڑے نہیں ساہیوال۔ بار بار غلط شہر کا نام لے کر یہ ثابت مت کرو کہ تم کو یہ بھی نہیں پتا کہ تمہاری پھپھو کس شہر میں رہتی ہیں۔" مہناز نے عقب سے جتا کر کہا تھا۔ اس کی مسلسل بڑبڑاہٹ عروج پر تھی۔

"آآآآ...... میں کیوں ہوں اتنا فرماں بردار۔ کیوں مان جاتا ہوں آپ کی ہر بات۔ ایسی معصوم اولاد بھی نا ہو کسی کی۔ رحم یا اللہ...... رحم...... ماؤں کی بلیک میلنگ سے سب کو بچا یا رب۔ دشمن کو بھی کبھی اس مصیبت میں نا ڈال یا رب۔ سب کو محفوظ رکھ مالک۔" اس کے کمرے سے ابھی بھی مسلسل بڑبڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مہناز مسکراتے ہوئے سوٹ کیس کھول کر اس میں چیزیں رکھنے لگ گئی تھیں۔

☆☆☆

"میں ہمشیرہ سے ملنے ساہیوال جا رہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں سب دیکھ ریکھ تم ہی کو کرنی ہے۔ یہ سارے لڑکے بہت سر چڑھ گئے ہیں، ان کی بہت شکایتیں آنے لگی ہیں۔ بہت باتیں کرنی آ گئی ہیں ان کو۔ آتے جاتے ٹچ کریں (تضحیک آمیز گفتگو) کرتے ہیں لوگوں کو۔ ذرا کھینچ کر رکھنا ہے ان سب کو۔ زیادہ سر نہیں چڑھنے دینا اور نا ہی کسی کو شکایت کا موقع دینا ہے۔" ماسٹر جی نے رب نواز کو نصیحت کی تھی۔ وہ ان کا دست راست تھا۔ ان ہی کی طرح ہر کام میں مہارت تھی اسے۔ بہت اچھے طریقے سے ہر ذمہ داری پوری کرتا تھا۔ کلاس کے سب سے اچھے اور پر اعتماد مانیٹر کی طرح وہ ان کی غیر موجودگی میں سب کو سنبھال کر رکھتا تھا۔

"آپ فکر نا کریں ماسٹر جی! پہلے بھی تو میں ہی سنبھالتا ہوں۔ آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔" اس نے انہیں تسلی دی۔

"اچھا تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں بس جھک مارنے آتا ہوں یہاں۔ سب کچھ تم کرتے ہو، ماسٹر جی بس یہاں ٹانگیں دبوانے آتا ہے۔" انہوں نے اسے گھورا۔

"نہیں ماسٹر جی! یہ نہیں کہہ رہا۔ میرا مطلب تھا آپ اطمینان سے جائیں۔ میں ہوں نا یہاں، کاہے کی فکر۔"

"اوہ رب نواز! اسی لیے تو فکر ہے کہ تُو ہے یہاں۔ تجھ سے نہیں سنبھلتے اب یہ چار ہیروز۔ ان کو لگام دے کر رکھنا ہی نہیں آتا تجھے۔ یاد ہے جب گزشتہ بار میں نے کسی وجہ سے چھٹی کی تھی تو تم لوگوں نے کتنا کھڑاک پھیلایا تھا۔ میڈم تہمینہ لاما (شکایت) لے کر آ گئی تھیں کہ آپ کے لڑکے بدتمیزی کرتے ہیں، بات نہیں سنتے۔ کئی دن انہوں نے شکل نہیں دیکھی تھی ہمارے اس غریب خانے کی۔ تین بار فون کر کے معذرت کی تھی میں نے۔" انہوں نے یاد دلایا۔

"ماسٹر جی! میڈم تہمینہ سنتی بھی تو نہیں ہیں کسی کی۔ میں نے ان کو سمجھایا تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہیں ہمارے بس کا روگ نہیں ہے۔ ان کو ہمارا کام ہی پسند نہیں آتا۔ بس اپنی ہی بولتی جاتی ہیں، بولتی جاتی ہیں۔ کوئی مشورہ، کوئی تجویز، ہر چیز رد کر دیتی ہیں اور جب کام مکمل کر کے دو تو کیڑے نکالنے لگتی ہیں۔" رب نواز نے شکایت کی تھی۔ ماسٹر جی نے اس کے کندھے پر ایک چپت رسید کی۔

"اوئے تُو ہوتا کون ہے انہیں مشورے دینے والا۔ تیری اتنی اوقات ہے کہ تو انہیں مشورے دے۔ شکل دیکھی ہے اپنی، وہ میڈم تہمینہ ہیں۔ ہم سب ان جیسوں کے دم سے یہاں بیٹھے ہیں۔ آیا وڈا مشورے دینے والا۔" انہیں سخت برا لگا تھا جبکہ رب نواز کا منہ بھی لٹک گیا۔

"آپ کچھ بھی کہیں۔ مجھے ان کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ پہلے خود ہی الٹی سیدھی اسائنمنٹ بنوالی ہیں ہم سے پھر خود ہی ناراض ہو جاتی ہیں کہ تم لوگ بہت نالائق ہو۔ ان کو کوئی عقل مت دینے کی کوشش کرو تو پھر آپ کو ہماری جھوٹی سچی شکایتیں لگاتی رہتی ہیں کہ لڑکے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں

ماسٹر جی آخر......" اس نے لمحہ بھر کے لیے رک کر ماسٹر جی کا چہرہ دیکھا، وہ جو بات کرنے والا تھا، وہ ماسٹر جی کو بری بھی لگ سکتی تھی۔

"وہ ایسے کپڑے کیوں پہنتی ہیں جو ان پر اچھے نہیں لگتے۔ ان کو کون بتائے کہ ہر فیشن ان پر سجتا نہیں ہے اب۔ چھوٹی چھوٹی قمیص پہن کر وہ خود کو ماہ نور بلوچ سمجھ تو سکتی ہیں لیکن بن نہیں سکتیں۔"

وہ چڑ کر بولا تھا۔ ماسٹر جی نے اسے ایسی نگاہ سے گھورا کہ وہ فٹافٹ دو قدم پیچھے ہٹ گیا کہ جانتا تھا اب کی بار صحیح تھپڑ پڑے گا۔

"بے ہدایتے یہ کیسی بات کی ہے۔ خبردار دوبارہ نا سنوں میں۔ بہت زبان چلنے لگی ہے تیری...... یہ پچھلی گلی کے لونڈے لپاڑوں سے دوستی رنگ لا رہی ہے۔ ایسے بات کرتے ہیں کسی کے بارے میں۔ دوبارہ ایسی بات نا سنوں میں تیرے منہ سے، یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمارا کام سب کی عزت کے ساتھ خدمت ہے۔ عزت کے ساتھ خدمت...... وہ میڈم تہمینہ ہیں ہمارے لیے ماہ نور بلوچ سے بڑھ کر ہیں۔" انہوں نے آخری دو الفاظ پر زور دے کر کہا تھا۔ رب نواز کے چہرے کے تاثرات طنزیہ ہوئے تھے لیکن وہ چپ رہا۔

"یاد رہے یہ بات، میں دہراؤں گا نہیں۔" ماسٹر جی نے انتہائی سخت لہجے میں دوبارہ کہا تھا۔ رب نواز نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"معافی ماسٹر جی...... معافی......" وہ کہتے ہوئے دو قدم مزید پیچھے ہٹا تھا پھر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا کہ فرار میں آسانی ہو۔

"لیکن پھر بھی ایک بات ضرور کہوں گا ماسٹر جی! آپ کی محبت اندھی ہو سکتی ہے۔ ہماری نہیں اس لیے میڈم تہمینہ کو بھی سمجھائیں ورنہ لڑکے اسی طرح ان پر ہنستے رہیں گے، ان کا مذاق اڑاتے رہیں گے۔ اونہہ...... شباب پچپن (55) والا، تے خواب بچپن والا۔" وہ اتنا کہہ کر رکا نہیں تھا بلکہ باہر کی جانب دوڑ لگا دی تھی۔ ماسٹر جی بھاگ نہیں سکتے تھے لیکن انہوں نے کرسی کے نیچے پڑا اپنا جوتا اٹھا کر اس کی جانب پھینکا تھا جو دروازے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا تھا۔

"کمینہ...... رب نواز......" انہوں نے منہ بنا کر اس کے نام کو دہرایا تھا۔

"ایسے تو ضرور ہی نواز دے گا رب تجھے، نانجار......" وہ بڑبڑا رہے تھے۔

☆☆☆

"یہ کیا ہے؟" اس نے دیوار کی جانب دیکھتے ہوئے ان سے سوال کیا تھا۔ عطیہ بیگم نے بھی اسی جانب دیکھا جہاں وہ دیکھ رہی تھی پھر خوش ہو کر بولیں۔

"یہ میں نے یہاں لگائی ہیں۔ اچھی لگ رہی ہیں نا۔"

"ایک دم فضول لگ رہی ہیں امی! آپ نے ساری دیوار بھر دی ہے کالی پیلی تصویروں سے۔ یہ تو ایک بھی اچھی نہیں لگتی اور آپ نے سارا اسٹاک ہی سجا دیا۔" اس نے دیوار پر سے وہ سب تصاویر اتارنا شروع کر دیں۔ دو سال پہلے اس نے کینوس پر فیبرک کلرز کے ساتھ اپنے کسی کسٹمر کے کہنے پر تصاویر کی ایک سیریز بنائی تھی جو کہ ان کو بعد میں پسند نہیں آئی تھی تو سونیا نے ان کی ایڈوانس ادائیگی کے طور پر ادا کی گئی ساری رقم واپس کر دی تھی۔ یہ تصاویر تب سے اسٹور میں ہی پڑی تھیں۔ عطیہ بیگم نے وہ سب نکال کر لاؤنج میں صوفے کے پیچھے والی دیوار پر لگا دی تھیں۔ وہ تصاویر بری نہیں تھیں، لاؤنج بھی سج سا گیا تھا لیکن سونیا کو جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔ امی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جو بھی اس نے بنا بنا کر رکھا ہوا ہے وہ سب نکال کر گھر میں سجا دیں۔ پہلے انہوں نے اس کے بنائے ہوئے تیٹ کے پھولوں سے ڈرائنگ روم سجایا تھا پھر چھوٹی بڑی وہ سب وال پینٹنگز جو وہ کسٹمرز کے آرڈرز مکمل ہو جانے کے بعد لیفٹ اوورز سے بنائی تھی۔ وہ سب عطیہ بیگم نے نکال کر جگہ جگہ پھیلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سب گملے جس کو اس نے پینٹ کیا ہوا تھا۔ وہ سب پورے صحن میں نمایاں جگہوں پر مزید نمایاں کر کے رکھ دیے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کا کروشیا سے بنایا گیا ٹیبل کلاتھ نمایاں تھا، چاروں کمروں میں اس کی ایپلک ورک کی بیڈ شیٹس بچھائی تھیں۔ اس بات کی کسر رہ گئی تھی کہ وہ ان سب چیزوں کے نیچے بڑا

بڑا کر کے ''محراب'' لکھ دیتیں جبکہ ''محراب'' عرف سونیا کو سب سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہیں۔ وہ ان کی حرکتوں پر جھنجلائی چلی جا رہی تھی۔

''یہ ایک ہی کافی ہے یہاں۔ باقی سب اتار دی ہیں میں نے اور پلیز امی اب دوبارہ مت لگائیے گا۔ آپ نے اتنا کچھ نکال کر یہاں وہاں پھیلا دیا ہے کہ ہمارا گھر، گھر کم اور میوزیم زیادہ لگ رہا ہے۔'' اس نے بدقت اپنی ناگواری چھپائی تھی۔

''اچھا! یہاں مت لگاؤ۔ ایک اپنے کمرے میں لگا لو اور یہ والی ہمارے بیڈ روم میں لگا دو۔ اتنی محنت سے بنائی ہوئی ہیں۔ تمہاری ممانی کو پتا چلنا چاہیے کہ میری بیٹی کتنی ٹیلنٹڈ ہے۔'' وہ پرجوش سے انداز میں بولی تھیں۔ سونیا نے سر جھٹکا۔

''ان کو سب کچھ پہلے سے پتا ہے امی! جسے نہیں پتا اور آپ جس کو بتانا چاہ رہی ہیں نا۔ اس کو ان سب چیزوں سے فرق نہیں پڑنے والا۔ پورا لنڈا بازار بنا لیا ہے گھر کو......'' اس نے جل کر کہا تھا۔

''خواہ مخواہ میں اور ایویں نہیں پڑے گا فرق۔ لڑکے بہت متاثر ہوتے ہیں ایسی باتوں سے۔ تم دیکھ لینا وہ ہر چیز کی تعریف کرے گا اور میری بات کان کھول کر سن لو تم...... خبردار جو تم نے پرانے زمانے کی ہیروئنوں کی طرح سر جھکا جھکا کر اس کی تعریفوں کو وصول کیا تو...... فخر کے ساتھ نخرے کے ساتھ کہنا کہ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں تو اس سے بھی زیادہ بڑے بڑے کام کرتی ہوں۔ اس کو اپنے سب پروجیکٹس کی تفصیل بتانا۔'' وہ برتنوں کی الماری سے برتن نکال کر صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اسے نصیحتیں بھی کیے چلی جا رہی تھیں۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ایسی سستی مارکیٹنگ کی اور اگر آپ نے بھی فلموں والی ماؤں کی طرح پانی کے گلاس، تندور سے آئی روٹیوں اور کولڈ ڈرنک کی بوتل تک کو میری محنت کا صلہ قرار دیتے ہوئے ایسا کچھ کیا تو یاد رکھیے گا۔ ان کے سامنے ہی میرا اور آپ کا جھگڑا ہو جائے گا۔'' اس کا موڈ بالکل خراب تھا اور اسے انتہائی بے زاری ہو رہی تھی لیکن وہ ان کی ہدایات کے مطابق کاموں میں لگی ہوئی تھی۔

ایک دن بعد ماموں ممانی اپنے ہونہار سپوت کے ساتھ تشریف لانے والے تھے۔ عطیہ بیگم نے گھر ایسے چمکایا تھا جیسے کسی سلطنت کا بادشاہ تشریف لانے والا ہو۔ اب کی بار بھائی بھابھی تین سال بعد آ رہے تھے لیکن انہیں ان سے کہیں زیادہ بھتیجے کی فکر تھی۔ انہوں نے ہر چیز اس کے شایان شان سجانے بنانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مینو کا فیصلہ تین دن پہلے ہی کر لیا تھا، ہر دیسی ڈش کے ساتھ ایک عدد چائنیز ڈش تیار ہونی تھی جس کی مستند ترکیب یوٹیوب سے تلاش کی گئی تھی۔

التمش نے جس کمرے کو پانچ دن استعمال کرنا تھا، اس میں خاص طور پر منجھلی آپی کی شادی کی تصاویر کا کولاج جس میں منجھلی آپی کم اور محراب زیادہ نمایاں تھی بنا کر لگایا تھا۔ اس کمرے کے اے سی کی سروس دوبارہ سے کروائی گئی تھی۔ عطیہ بیگم نے اپنے تئیں وہ سب کر لیا تھا جس سے وہ التمش سے اپنی محبت جتا کر اس پر ثابت کر سکتی تھیں کہ وہ بہترین ساس ثابت ہو سکتی ہیں لیکن مسئلہ تھا تو سونیا کا، جس کے چہرے پر پھیلی بے زاری انہیں ہولائے دے رہی تھی۔

''ایسے کیوں کہہ رہی ہو۔ جھگڑا کیوں ہوگا تمہارا میرا...... یہاں آؤ ذرا...... میرے پاس بیٹھو۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی صافی سائیڈ پر رکھی اور برتنوں والی الماری بند کر کے اس کی جانب توجہ مبذول کر لی۔

''تم سمجھتی ہو میں جو بھی کر رہی ہوں۔ وہ کوئی غیر اخلاقی حرکت ہے۔ کیا تمہیں بھروسا نہیں ہے اپنی ماں پر؟'' انہوں نے کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ سونیا نے ان کی جانب دیکھا پھر ناک چڑھا کر بولی۔

''نہیں......'' عطیہ بیگم نے اس کے دو ٹوک جواب پر براسا منہ بنا کر اسے دیکھا۔

''ہاہ...... ہائے۔ ایسی بے دید اولاد دی ہے اللہ نے مجھے۔''

''اس ایک معاملے میں بالکل بھی بھروسا نہیں ہے مجھے آپ پر امی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے ڈی گریڈ کروا کر ہی دم لیں گی۔'' اس نے ان کی ناراضی کے ڈر سے فوراً کہا تھا۔ عطیہ بیگم نے گہری سانس بھری تھی۔

''سونیا...... اتنی بے اعتباری...... بھلا ڈی گریڈ کیوں کرواؤں گی تمہیں۔ میری بیٹی ہو تم، میرا کل اثاثہ۔ پاگل، میں جو بھی کر رہی ہوں نا وہ اپنی بیٹی کی بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔ اسے تم ایک ادنیٰ سی کوشش بھی کہہ سکتی ہو۔ آخر تم بھی تو یہی کرتی ہو نا۔ تمہیں جب اپنا کوئی نیا پروجیکٹ کرنا ہوتا ہے تو کسٹمرز کو تلاش کرنے کے لیے اپنی بہترین چیزیں ہی ان کے سامنے رکھتی ہو۔ ان کو بتاتی ہو کہ تم ان کا کام کتنے اچھے طریقے سے کر سکتی ہو، ان کو جتاتی ہو کہ تم مارکیٹ میں موجود باقی سب لوگوں سے بہتر ان کے لیے کام کر سکتی ہو۔ ان سے بحث بھی کرتی ہو، بعض اوقات اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے ضد بھی کرتی ہو اور ان کو رضامند کرنے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کرتی ہو نا۔ میں بھی بس یہ کر رہی ہوں۔ بحیثیت انسان آخر ہم اپنا بہترین ہی سامنے کی جانب رکھتے ہیں نا تو بس میں یہی کر رہی ہوں۔ مجھے وہ لڑکا اپنی بیٹی کے لیے پسند ہے۔ میں اس پر ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ میری ہیرے جیسی بیٹی اس کے حق میں بہترین جیون ساتھی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ میرا حق ہے، مجھے تو نہیں لگتا کہ میرا مذہب یا یہ معاشرہ مجھے میرے اس حق کو استعمال کرنے سے روک سکتا ہے۔ میں کسی کی حق تلفی تو نہیں کر رہی، کسی کا دل تو نہیں دکھا رہی۔ بس اپنی بیٹی کے اچھے مستقبل کے لیے کچھ الجھی ہوئی ڈوریاں سلجھا رہی ہوں۔ کچھ راستے سیدھے کر رہی ہوں، اس میں برائی کیا ہے، میرے پاس ہیرا ہے۔ میں تو اسے پروموٹ کروں گی ہی نا۔''

وہ دل ہی دل میں بیٹی کی بے زاری سے ناراض تو تھیں لیکن پھر بھی اسے سمجھاتے ہوئے تحمل کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ سونیا نے ان کے مدلل انداز پر ایک لمحے کے لیے سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر سر جھٹکا۔

''امی! اتنا ہی ہیرا ہوتی اگر آپ کی بیٹی تو پہلے ہی چمکتی دمکتی نظر آ چکی ہوتی اسے۔ آپ کو اس ہیرے کو بار بار رگڑ رگڑ کر چمکانا نا پڑ رہا ہوتا، تراش تراش کر اس ہیرے کا تراوہ نا نکالنا پڑ رہا ہوتا آپ کو۔'' اس کے الفاظ امی کے دل میں جیسے گڑو سے گئے تھے۔ وہ کتنی بجھی ہوئی لگتی تھی۔ انہوں نے اسے مزید کچھ نصیحت کرنی چاہی لیکن انہیں الفاظ ہی نا ملے تھے۔ انہوں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

''اوہو میں بھی کن باتوں میں پڑ گئی ہوں۔ وہاں قیمہ ابالنے چڑھایا تھا کوفتوں کے لیے، چلو تم کپڑے وغیرہ نکلوا لو اپنے۔ میں ذرا کوفتے بنا لوں۔'' وہ کچن کی جانب چل دی تھیں۔

☆☆☆

''اوہو، ایک ہفتے کے لیے نہیں جا رہا صرف پانچ دن کے لیے جا رہا ہوں اور اپنی پھپھو کے گھر جا رہا ہوں۔ افغانستان جہاد کے لیے نہیں جا رہا جو تم نے بوتھا لٹکا لیا ہے۔'' التمش نے چڑ کر زرمین سے کہا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں لیٹا ویڈیو کال پر اس سے بات کر رہا تھا۔ اس نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے پھپھو کے یہاں ساہیوال جا رہا ہے۔ زرمین اس کے سمجھانے کے باوجود یہ ماننے کو تیار نا تھی کہ اس کے والدین زبردستی اسے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔

''اس سے بہتر تھا کہ تم واقعی افغانستان جہاد کے لیے چلے جاتے۔ کم از کم مجھے یہ بے چینی تو نا ہوتی کہ تم اپنی چار فٹ دس انچ کی کزن کے سات ایک ہفتہ گزارنے گئے ہوئے ہو۔ تمہیں احساس بھی ہے کہ میں کیسے گزاروں گی یہ ایک ہفتہ۔ مجھے تو رات کو نیند بھی نہیں آئے گی پورا ایک ہفتہ۔ پنجاب میں تو ویسے بھی آج کل بارشیں ہو رہی ہیں۔ کہیں اس نے ''رم جھم رم جھم پڑے پھوار...... تیرا میرا انت کا پیار'' گا کر تمہارا دل جیت لیا تو میں کیا کروں گی۔ میں نے تو خالہ کے دیور کو بھی تمہاری وجہ سے انکار کر دیا ہوا ہے۔ میں تو پھنس گئی نا مشکل میں، تمہیں کچھ احساس بھی ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہی تھی لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اسے چڑا رہی ہے۔ التمش کو اس کی یہ شوخیاں ایک آنکھ نا بھائی تھیں۔

''اوہ بھائی میرے کندھے پر رکھ یہ بندوقیں نا چلاؤ۔ مجھے اپنے خاندانی معاملات سے دور ہی رکھو۔ خالہ کے دیور کو تم نے خود ہی انکار کیا تھا اور اگر پچھتا رہی ہو تو ابھی وقت گزرا تو نہیں ہے۔ کال کر کے اس سے معذرت کر لو۔ اگر میری پھپھو کی بیٹی گانے گا کر میرا دل جیت سکتی ہے تو کیا پتا تمہاری خالہ کے دیور کو بھی دوسر سواد والے گانے آتے ہی ہوں۔ بلوا لو واپس اسے، کیا پتا آہی جائے وہ غزلیں کافیاں گاتا ہوا۔ اب ہر شخص التمش کی طرح گزرا وقت بھی نہیں ہوتا کہ واپس پلٹ کر نا آسکے اور جس کے لیے عزت نفس ہر چیز سے بڑھ کر ہو۔'' وہ سابقہ انداز میں مزید طنز شامل کر کے بولا تھا۔ زرمین کو اس کا مغرور انداز بھی شاید برا لگا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ سی ہو گئی۔ التمش نے چند ساعتیں اس کے بولنے کا انتظار کیا پھر سگنل کو الٹی چیک کی تھی جو کہ ٹھیک تھی۔

''اچھا تمہیں مزید طنز نہیں کرنا تو میں بند کر رہا ہوں اب فون، مہارانی جودھا بائی آسکیں تو ناراض ہوں گی کہ میں اب تک تیار کیوں نہیں ہوا۔'' وہ جانتا تھا فون بند کرنے کی دھمکی ہی اس وقت زرمین کو بولنے پر مجبور کرے گی۔

''ماشاءاللہ، یعنی پھپھو کے گھر جانے کے لیے تم ایک دن پہلے سے تیار ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔ سچ کہا ہے بزرگوں نے، بھائی کہ شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ التمش نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اوہ بی بی! ابھی گھنٹہ بھر بعد کی فلائٹ ہے ائیرپورٹ کے لیے نکلنے لگے ہیں ہم۔ پہلے لاہور جائیں گے پھر وہاں سے بائی روڈ ساہیوال۔'' زرمین کا چہرہ مزید تن گیا تھا

''واقعی......'' اس نے حیرانی سے پوچھا پھر چڑ کر بولی۔

''تو پھر یہ بات تم مجھے وہاں پہنچ کر ہی بتا دیتے نا۔ فلائٹ سے ایک گھنٹہ پہلے بتا کر احسان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' زرمین سخت ناراض ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر التمش مزید بے زار ہو رہا تھا۔

''اس لیے کہ التمش نام ہے میرا۔ احسان کرنا عادت ہے میری۔'' وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔ زرمین نے فون کی اسکرین سے ہی اسے ایسے گھور کر دیکھا جیسے کچا کھا جائے گی۔

''بڑی مہربانی کہ تم نے بتا دیا مجھے کہ یہ عادت ہے تمہاری۔ میں خواہ مخواہ اسے تمہاری محبت سمجھتی رہی، جاؤ بھاڑ میں تم۔ سلجھاؤ اپنی پھپھی کا مسئلہ چار فٹ دس انچ، گڈ بائے۔'' اس نے فون بند کر دیا تھا۔ التمش نے ایک ساعت کے لیے موبائل کو دیکھا پھر غصے سے اٹھا اسے بستر پر پھینک دیا تھا۔

☆☆☆

''ہمارے سارے محلے میں سونیا سے اچھی بریانی کوئی نہیں بناتا۔ سب ہی پسند کرتے ہیں اس کے ہاتھ کی بریانی، مسالا ایسا بناتی ہے کہ ہر چیز کا ذائقہ الگ الگ محسوس ہوتا ہے اور چاول ایسے ذم دیتی ہے کہ ہر دانہ الگ الگ نظر آتا ہے۔'' عطیہ بیگم نے بہت محبت سے بریانی والی ڈش میں سے چمچہ بھر کر مہناز بیگم کی پلیٹ میں ڈالا تھا لیکن سنایا التمش کو تھا جو بنا کسی کی جانب دیکھے بس کھانا کھانے میں مگن تھا۔ ان کی بات سن کر اس نے اپنی پلیٹ میں پڑے چاولوں کو دیکھا۔

PakBooks

''اتنی الگ تھلگ بریانی واقعی پہلی بار کھائی ہے ہم نے۔ ایک چاول دوسرے چاول سے اتنا الگ ہے کہ لگتا ہے آپس میں کوئی خاندانی لڑائی ہے۔'' التمش کے چہرے پر بظاہر مسکراہٹ تھی اور وہ پلیٹ میں پڑے چاولوں کو چمچے سے اِدھر اُدھر کرنے میں مگن کہہ رہا تھا لیکن سونیا کو احساس تھا کہ وہ طنز کر رہا ہے۔ آج چاول اس سے ذرا سخت رہ گئے تھے، امی بار بار آ کر اتنی ہدایتیں کرتی جا رہی تھیں کہ وہ اعتماد سے کام ہی نہیں کر پائی تھی۔ مہناز بیگم نے مسکراتے ہوئے سونیا کو دیکھا کہ جیسے جتا رہی ہوں کہ دیکھا میں نے کہا تھا وہ متاثر ہو جائے گا۔

''سارے محلے میں دھوم ہے سونیا کے ہاتھ کی بریانی کی۔'' مہناز نے عطیہ بیگم کو دیکھ کر کہا تھا۔ ان کا چہرہ کھل سا گیا تھا۔

''اچھا تو پھر گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اس کا نام آیا کہ نہیں۔ جتنی تعریف آپ کر رہی ہیں۔ آئی

ایم شیور ضرور ہی آ چکا ہوگا۔'' اس نے پھپھو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ لوگ گیارہ بجے کے قریب پہنچے تھے اور جہاز میں کھانا نہیں ملا تھا سو بھوک تو سب ہی کو لگی تھی۔ سب ہی رغبت سے کھا رہے تھے۔ ایک واحد سونیا تھی جس کے چہرے پر نا چاہتے بھی بے زاری چھائی ہوئی تھی۔ سونیا کو اس کی باتوں پر کم لیکن اپنی امی کی باتوں اور حرکتوں پر زیادہ غصہ آ رہا تھا۔

''ارے میری جان تم مذاق سمجھ رہے ہو لیکن یہ بات سچ ہی ہے۔ سونیا کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ یاد ہے میزاب (سونیا کی مجھلی بہن) کی شادی پر بھی اس نے یہ دیگ جتنا بڑا پتیلا بھر کر سارے خاندان کے لیے بریانی بنائی تھی اور سب ہی انگلیاں چاٹتے رہ گئے تھے حالانکہ تب یہ بہت چھوٹی سی تھی لیکن تب ہی سے بہت اچھا کھانا بنا لیتی ہے۔'' عطیہ بیگم نے اس کی جانب شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی آنکھوں ہی آنکھوں میں بیٹے کو تنبیہ کی تھی کہ زبان کو کنٹرول میں رکھو۔

''دیگ جتنا بڑا پتیلا؟'' التمش نے ماں کی نصیحت آموز گھوری کے بعد مصنوعی حیرانی سے کہتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تھا۔

''آرام سے چمچہ چلا لیتی ہو تم اتنے بڑے دیگچے میں۔ میرا مطلب سیڑھی ویڑھی کی مدد تو لینی پڑتی ہوگی۔ اکیلے تمہارے بس کا روگ تو ہے نہیں یہ۔'' وہ اب کھل کر مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ مہناز کے چہرے کے تاثرات تن سے گئے تھے۔ سب سے پہلے سونیا کے ابا مسکرائے تھے۔

''یہ بات تو ہم سب کو بھی حیران کرتی ہے کہ آخر میری یہ چھوٹی سی بیٹی! اتنے بڑے بڑے کام اتنی آسانی سے کیسے کر لیتی ہے لیکن کر لیتی ہے۔ میں تو خود اس سے پوچھتا رہتا ہوں کہ بیٹا جی کون سا منتر پڑھتی رہتی ہو۔ لوگوں کے بیٹے نکمے اِدھر اُدھر آوارہ گردیاں کرتے پھرتے ہیں اور ہماری یہ بیٹی بیٹوں سے بڑھ کر کام کر رہی ہے۔ گھر بیٹھے اپنا لاکھوں کا بزنس چلا رہی ہے۔'' وہ اپنی بیٹی کی جانب دیکھتے ہوئے فخریہ انداز میں بولے تھے۔ انہوں نے جتایا نہیں تھا لیکن التمش کو محسوس ہوا کہ چچا جی کا یہ جملہ اس کے لیے شٹ اپ کال تھی وہ چپ سا ہو گیا۔

''بہت خوب! اچھی بات ہے۔ زمانہ ویسے بھی بہت بدل گیا ہے۔ لڑکیوں کو بھی سب کام کرنے چاہئیں۔'' مہناز بیگم نے اپنی رائے دی تھی۔

''فیس بک پر کریمیں شیمپو بیچنے کو بھی بزنس کہنے لگے ہیں لوگ۔ زمانہ تو واقعی بدل گیا ہے۔'' التمش نے دھیمی سی آواز میں کہا تا کہ ساتھ بیٹھی مہناز ہی سن پائیں پھر پھپھو کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر ذرا اونچی آواز میں بولا۔

''واہ بھئی واہ! بہت متاثر ہوئے ہم سب سونیا کے کارنامے سن کر۔ پھپھو کچھ اور بھی بتائیں نا۔ بہت مزا آ رہا ہے۔'' عطیہ نے اس کے انداز پر قہقہہ لگایا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں سونیا بولی۔

''نہیں۔ اب ہماری باری ہے۔ نہیں بھی تو مزا آنا چاہیے نا۔ اب تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ کوئی جاب واب بھی تلاش کی ہے یا دھکے کھاتے ہی ہوا بھی تک۔ تین سال سے تو یہی سن رہے ہیں کہ التمش یونیورسٹی جاتا ہے۔ یہ تم ڈگری لے رہے ہو یا بیمہ پالیسی......'' التمش کو امید نہیں تھی کہ وہ ننھی سی لڑکی منہ میں اتنی زبان بھی رکھتی ہوگی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ اس طعنے پر چپ سا ہو گیا پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔

''التمش کہتے ہیں مجھے۔ ڈگری ہو یا بیمہ پالیسی، سب جچتا ہے مجھ پر۔'' سونیا نے استہزائیہ انداز میں اسے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن پھر عطیہ پر نگاہ پڑ گئی جن کا پورا وجود ''درخواستِ خاموشی'' بنا کھڑا تھا۔ سونیا چپ رہ گئی۔ التمش کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی کہ جیسے اس نے اس لڑکی کو شکست دے ڈالی ہو۔

☆☆☆

''بہت دبلی ہو گئی ہو عطیہ! اپنا خیال نہیں رکھتی نا؟'' ماسٹر جی نے محبت سے بہن کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اصغر صاحب (سونیا کے والد) کھانا کھا کر

واپس آفس چلے گئے تھے جبکہ مہناز جان بوجھ کر تھکن کا بہانہ کر کے لیٹ گئی تھیں تاکہ عطیہ اور ماسٹر جی کو تنہائی میں بیٹھ کر بات کرنے کا موقع مل سکے۔ تین سال بعد بہن بھائی کی ملاقات ہو رہی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ سو دکھ سکھ جمع ہوتے ہیں جو بہنوں کا دل چاہتا ہے کہ بھائی ہی سنیں۔ مہناز چاہتی تھیں کہ عطیہ اپنے منہ سے بھی بھائی کو بتائیں کہ وہ بیٹی کی شادی کے لیے پریشان ہیں اسی لیے وہ چپ چاپ سونے چل دی تھیں۔

"کہاں بھائی جی! اچھی گئی ہوں۔ بس عمر کا تقاضا ہے۔ بوڑھی ہوگئی ہوں۔" انہوں نے چائے کے کپ میں کیتلی سے چائے انڈیلتے ہوئے محبت سے بھائی کی بات کا جواب دیا تھا۔ چائے کی کیتلی پر ٹی کوزی لگی تھی جو کروشیا سے سونیا نے بنائی تھی۔ سونیا نے تو چائے ڈال کر معمول کے مطابق مگ میں انڈیل کر ٹرے میں سجا دیے تھے کیونکہ وہ لوگ چائے کے لیے مگ ہی استعمال کرتے تھے۔ ٹی سیٹ کے ساتھ والے کپ چھوٹے ہوتے تھے اور ان کی چائے کی طلب کو پورا کرنے میں ناکام رہتے تھے لیکن عطیہ نے ضد کر کے دوبارہ سے چائے ٹی پاٹ میں ڈلوائی تھی۔ ساسرز کے ساتھ کپ رکھوائے تھے اور دودھ دانی اور چینی دانی بھی بلا ضرورت ٹرے میں رکھ دی تھی۔ سونیا نے برتن دھوتے ہوئے اور چائے بناتے ہوئے ان سے ایک بات بھی نہیں کی تھی۔ وہ سخت ناراض تھی جبکہ فی الوقت عطیہ کی ساری توجہ صرف مہمانوں پر مرکوز تھی۔

"ارے ابھی تو میں بوڑھا نہیں ہوا۔ تم کیسے اتنی جلدی بوڑھی ہوگئیں۔ تم تو چھ سال چھوٹی ہو مجھ سے۔" ماسٹر جی نے اطمینان سے دیوان پر ٹانگیں چڑھا کر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ کی بیٹیاں نہیں نا بھائی جی۔ آپ تو بوڑھے ہوں گے بھی نہیں۔ میں بیٹیوں کی ماں وہ بھی تین تین بیٹیوں کی۔ میرا آپ کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔" عطیہ کے منہ سے بالآخر وہ بات نکل ہی آئی جو وہ کب سے بھائی کو جتانا چاہ رہی تھیں۔ ماسٹر جی نے سر جھٹکا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو عطیہ! آج کل تو بیٹیاں بیٹوں سے بڑھ کر ہوگئی ہیں۔ تم ہمارے اپنے گھر کا ہی حال دیکھ لو۔ میرے نکمے بیٹے کے مقابلے میں تمہاری تینوں بچیاں ماشاء اللہ زیادہ قابل ہیں۔ سیماب بھی تو ماسٹرز ان کیمسٹری اور گولڈ میڈلسٹ۔ میزاب نے فارمیسی میں آنرز کر کے سلور میڈل لیا اور پھر یہ سب سے چھوٹی تو سب سے قابل ہے۔ ایسی قابل بچیوں کی ماں کو تو یہ بات کبھی ہی نہیں چاہیے جو تم کہہ رہی ہو۔" انہوں نے یہ بات واقعی دل سے کہی تھی۔ انہیں بہن کی تینوں بیٹیوں پر ہمیشہ ہی فخر محسوس ہوتا تھا۔

"آپ کی بات تو ٹھیک ہے بھائی جی! بس کبھی کبھی پریشان ہو جاتی ہوں تو نکل جاتا ہے منہ سے۔ بیٹیاں تو واقعی قابل دی ہیں اللہ نے لیکن بس یہ سونیا کا رشتہ میرے لیے بہت پریشانی بن گیا ہے۔ کہیں سلسلہ بنتا ہی نہیں ہے۔ اتنی منتیں مرادیں مانگ رکھی ہیں اس کے بر کے لیے لیکن جانے کیا مسئلہ ہے کہ تاخیر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کسی سے پوچھوایا ہے ہم نے۔ کہتے بندش ہے، رب ہی جانے۔" انہوں نے بہت دکھی دل سے یہ باتیں بھائی کے سامنے کہی تھیں۔ ماسٹر جی کے چہرے کے تاثرات یک دم بدلے۔

"لاحول ولا...... یہ بندش وندش کچھ نہیں ہوتی۔ اللہ کی مرضی ہے، تاخیر بھی اس کی جانب سے۔ تعجیل بھی اس کی جانب سے۔ بندے کی تو مرضی ہی نہیں ہوتی ایسے معاملات میں۔ مجھے یہ بتاؤ یہ کہیں لکھا ہے کہ اللہ نے اپنی مرضی کی بجائے "کن" بندے کی مرضی سے کہہ ہے۔ کیا وہ کسی سے پوچھ کر "کن" کہتا ہے۔ یہ بندش والی بات کہہ کر تم یہی ثابت کرنا چاہ رہی ہو نا کہ رب سوہنا تو "کن" کہنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا لیکن یہاں زمین سے کسی بابے نے چھڑی گھما کر نعوذ باللہ رب کو روک دیا۔ بتاؤ ہے کسی کی اتنی اوقات کہ وہ رب کے "کن" میں رخنہ ڈالے۔" ماسٹر جی کو بہن کی بات ذرا اچھی نہ لگی۔ عطیہ بھی لمحہ بھر کو چپ سی ہوئیں۔

"نعوذ باللہ...... میں یہ تو نہیں کہہ رہی بھائی جی۔ اللہ معاف کرے مجھے۔ بے شک اس کی "کن" کو کون روک سکتا ہے لیکن بیٹی کی ماں ہوں نا بھائی

...ں۔ ڈھکوسلوں میں جلدی آجاتی ہوں لوگوں کے۔ کیا بتاؤں لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی جی۔ ...ں کا رشتہ آج کل سب سے مشکل کام بن کر رہ گیا ہے ماں باپ کے لیے۔ ایسے ایسے سوال سننے کو ملتے ہیں اللہ کی پناہ! اب تو یہاں تک سننے کو ملنے لگا ہے کہ شاید بچی کماؤ ہوگئی ہے اسی لیے ماں باپ بیاہنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ بہت باتیں کرتے ہیں لوگ بھائی جی۔" ...گلوگیری ہوگئی تھیں۔ انہیں بڑی شرمندگی ہوئی تھی کہ وہ جذباتی ہوگئی تھیں۔ دوسری جانب ماسٹر جی کا دل بھی بہن کا چہرہ دیکھ کر بڑا ہی بے چین ہوا۔ مہناز بیگم درست ہی کہتی تھیں کہ عطیہ جب آس امید بھرے انداز میں ان سے یہ ذکر کرتی ہیں تو ان کا دل چاہتا ہے فوراً سے پیشتر بیٹے کا رشتہ دے ڈالیں۔ ماسٹر جی کا بھی دل بہت زور سے چاہنے لگا کہ ان کو کوئی تسلی اس ضمن میں دے ڈالیں لیکن بیٹے کی ضدی طبیعت سے بھی واقف تھے۔ وہ چند لمحے سوچتے رہے۔

کہ ایسا کیا کہیں کہ بہن کے دل کو چین آجائے مگر وہ خود بھی مجبور تھے۔

"لوگوں کی باتوں پر کان مت دھرا کرو میری بہن۔ لوگ تو بہانے ڈھونڈتے ہیں باتیں کرنے کے۔ وہ کریں بھی کیا بے چارے۔ یہ ہماری قومی تفریح ہے۔ ہمارا قومی مشغلہ، پروا نا کرو۔ معاف کر دیا کرو لوگوں کو۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائے۔ عطیہ بیگم کا دل ہی ٹوٹ گیا۔ ان کا خیال تھا کہ ایسی جذباتی باتیں کر کے وہ بھائی کو مجبور کر دیں گی کہ وہ آج کے آج ہی بیٹے کا رشتہ دے ڈالیں لیکن وہ اس طرف آ ہی نہیں رہے تھے۔

"کیوں بھئی۔ کیوں معاف کرنا ہے کسی کو۔ ہم انسان ہیں کوئی فرشتہ تو ہیں نہیں۔ جو ہمارا دل دکھائے گا۔ ہم سے بھی منہ کی کھائے گا۔ کوئی ضرورت نہیں لوگوں کی ہر الٹی سیدھی بات سننے کی۔ جو بھی کوئی الٹی سیدھی بات کرے۔ اس کو منہ توڑ جواب دیا کرو۔" مہناز نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شاید آخری بات ہی سنی تھی اس لیے چڑ کر بولی تھیں۔

"ایسی اچھی بیٹی ہے تمہاری۔ اس کو تو کوئی بھی خوشی خوشی اپنی بہو بنا کر لے جائے۔ جس گھر میں جائے گی چراغاں کر دے گی۔ ایسی بچی کے لیے تو کوئی بھی خوشی خوشی جوتیاں گھسا لے اپنی۔ کیوں ماسٹر جی۔" وہ مکمل طور پر اسی گفتگو کو طول دینے کے موڈ میں تھیں لیکن عطیہ کو سمجھ ہی نا آئی۔

"ارے چھوڑو تم لوگوں کو۔ مجھے سنبھالنا آتا ہے سب کو۔ اتنی بھی معصوم نہیں ہوں میں اب۔ آؤ بیٹھو۔ تمہارے لیے چائے گرم کرواتی ہوں۔" وہ ٹرے لے کر اٹھی تھیں اور باہر نکل گئی تھیں۔ مہناز کو ان پر جی بھر کر غصہ آیا۔

"ستیاناس ہو عطیہ تیرا۔ کیا جاتا اگر ایسی دو باتیں مزید جذباتی کر لیتی بھائی کے سامنے ویسے تو سارا دن "میرا سلطان" دیکھتی رہتی ہو۔ سیکھا خاک نہیں۔ وہاں ماکائیں کیسے ایک پیارا سا سلطان منٹ میں قابو کر لیتی ہیں تم سے۔ ایک بھائی نہیں قابو کیا جاتا...... احمق...... مائیں بیٹیوں کے لیے کیا کیا نہیں کرتیں۔ تم دو ڈائیلاگ نہیں بول سکتی تھی۔ کیا جاتا اگر بھائی کے سامنے بیٹھ کر دو ڈ کھڑے رو لیتی شاید ان کا دل پسیج جاتا لیکن نہیں بھئی۔ تم کر لو یہ چائے لسی والی مہمان نوازیاں۔ ضرور ہی منڈھے چڑھے گی یہ بیل اس طرح......" وہ دل ہی دل میں جلتی بھنتی ماسٹر جی کے پاس آبیٹھی تھیں۔ یہ ان ہی کی ضد اور اصرار کا نتیجہ تھا کہ ماسٹر جی نے اس طرح اچانک ساہیوال آنے کا قصد کیا تھا۔ مہناز کا خیال تھا کہ ماسٹر جی اور بالخصوص اتمش کو ایک دفعہ سونیا کو ضرور دیکھنا چاہیے، اس سے بات کرنی چاہیے تاکہ وہ عقل مندی سے فیصلہ کر سکے لیکن انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان کا یہ فیصلہ ان کے حق میں مزید خراب ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

"یہ تم لوگوں کے پنڈ (گاؤں) میں کوئی نیٹ ورک ٹھیک نہیں آتا کیا۔ میں کب سے کبھی اس کارنر، کبھی اس کارنر سگنلز تلاش کرتا پھر رہا ہوں لیکن مجال ہے کہ کہیں کوئی سرا ہاتھ لگا ہو۔ اسی لیے مجھے یہ چھوٹے چھوٹے شہر پسند ہی نہیں ہیں۔" اتمش اپنے

کمرے سے نکلتا ہوا لاؤنج میں آیا تھا۔ سونیا کو بیٹھے دیکھا تو اسی سے پوچھ لیا ورنہ ارادہ تھا کہ پھپھو سے اس مشکل کا حل دریافت کرے گا۔ کئی گھنٹے ہو چلے تھے، اس نے زرمین کو کوئی واٹس ایپ میسج نہیں کیا تھا اور اسے غصہ بھی تھا کہ زرمین نے اتنی ناراضی دل میں رکھ لی تھی کہ ابھی تک میسج کر کے اس کا حال نا پوچھا تھا۔ اسے بہت بے چینی بھی ہو رہی تھی اور غصہ الگ آ رہا تھا اور غصے میں وہ ویسے بھی کافی بدلحاظ ہو جاتا تھا۔ سونیا چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اسے اپنی امی سے شکوہ تھا۔ التمش سے اس کی کوئی ناراضی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک ناراضی کا مطلب کسی پر حق جتانا ہوتا ہے، وہ التمش پر حق جتانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس کے لیے اتنا اہم نہیں تھا لیکن شہروں کے متعلق اس کے طعنے اسے اچھے نہیں لگے تھے۔

"اتنا تردد کرنے سے پہلے پوچھ لیتے کسی سے۔ قیمتی وقت بچ جاتا تمہارا ویسے بھی تھک گئے ہو گے تم۔ بستر پر بیٹھ کر روٹیاں توڑنا آسان کام تو نہیں ہوتا۔ اچھی خاصی توانائی لگتی ہے بھئی۔ بڑے شہر کے بڑے سارے نواب صاحب۔" سونیا نے ناک چڑھاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا تھا۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ التمش تک مکمل طور پر پہنچی نہیں تھی لیکن سونیا کے چہرے کے تاثرات ایسے ضرور تھے کہ وہ سمجھ ضرور گیا تھا کہ اس نے کوئی جملہ ہی کسا تھا۔

"ہیلو۔ کچھ پوچھا ہے بھئی میں نے۔" وہ چلا کر بولا تھا۔ سونیا نے ناگواری بھرے انداز میں اسے دیکھا پھر بدقت خود پر قابو رکھتے ہوئے تحمل سے بولی۔

"سگنلز نہیں آئیں گے۔ ابھی کوشش مت کرو۔"

"کیوں جی۔ کیا یہاں سگنلز بھی نایاب ہیں۔ سونیا بی بی کی طرح، الگ تھلگ۔" اس نے پرانے زمانے کے کسی چالیس سالہ ہیرو کی طرح "الگ تھلگ" پر زور دیتے ہوئے گردن کو ہلا کر تمسخرانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا تھا۔ یہ کھلا طنز تھا۔ سونیا کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ اتنا طنز کیوں کرتا تھا۔ وہ دونوں ہی آپس میں زیادہ بات نہیں کرتے تھے لیکن معاملہ یہاں تک بھی کبھی نہیں پہنچا تھا کہ ان کے درمیان اس طرح کی احمقانہ نوک جھوک ہوتی رہی ہو۔ پہلے بھی ان کی باضابطہ کوئی لڑائی جھگڑے والی نوبت آئی تو نہیں تھی لیکن اس دفعہ تو وہ طنز کرنے کا کوئی موقع جانے ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔

"آج بارہ ربیع الاول ہے نا، لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال کی وجہ سے سگنلز نہیں آئیں گے۔ ہو سکتا ہے ایک آدھ گھنٹے تک آ جائیں۔" اس نے اب کی بار واقعی تحمل اپنایا۔ وہ ان کے گھر مہمان تھا اور وہ بلا وجہ اس کو بے توقیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ اس کی تربیت نہیں تھی مگر وہ اسے غصہ دلا رہا تھا۔

"ایک آدھ گھنٹہ۔ اب اتنا صبر کون کرے۔" وہ جل کر بولا، سونیا کو مزید برا لگا۔

"تمہیں ہی کرنا پڑے گا۔ ہم جیسی لوکل پبلک تو نہیں کرے گی نا کیونکہ بقول تمہارے تمہیں ہی بجتا ہے سب کچھ۔" وہ کندھے اچکا کر بولی تھی۔ التمش نے اس کی بات پر غور سے اس کی جانب دیکھا۔ کاؤچ کے اوپر وہ ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہاتھ میں موبائل تھا جبکہ ٹی وی پر کوئی کوکنگ پروگرام لگا رکھا تھا۔ التمش کے دل میں جانے کیا سمائی کہ اس کے سامنے والے سنگل کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

"بڑی معلومات ہیں میرے بارے میں آپ کو محترمہ عرف سونیا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر تمسخرانہ سی مسکراہٹ تھی۔ سونیا کو اس کا انداز بے حد برا لگا جیسے کوئی چھچھورا سا شخص آپ کو نیچا دکھانے کے لیے چیلنج کر رہا ہو

"یہ سمجھتا کیا ہے خود کو؟ ہیرو ہو گا تو اپنے گھر میں ہو گا۔ ہمیں کس لیے اتنا ایٹی ٹیوڈ دکھا رہا ہے۔" اس نے جل کر سوچا تھا لیکن چہرے پر اسی کے جیسی تمسخرانہ مسکراہٹ سجائی تھی۔

"ہاں نا! ہیں تو سہی۔ کیوں۔ اس میں کوئی بری بات ہے کیا...... کیا تم خود کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ تمہارے بارے میں کوئی معلومات رکھی جائیں۔" وہ اتنا کہہ کر لمحہ بھر کے لیے رکی پھر دوبارہ

PakiBooks.site

اسی انداز میں بولی۔

"آئی ایم سوری! یہ بات مجھے پتا نہیں تھی۔ اب تو رکھ لیں میں نے تمہارے بارے میں معلومات لیکن میں آئندہ احتیاط کروں گی۔" یہ ایک انتہائی تلخ جملہ تھا۔ التمش کی مردانہ انا کو ٹھیس تو بہت پہنچی کیونکہ وہ توقع کر رہا تھا کہ جیسی دھان پان سی وہ نظر آتی ہے، گفتگو بھی ایسی ہی کرتی ہو گی لیکن اس کے کاری وار نے التمش کو سمجھا دیا تھا کہ اس کی توقعات بالکل غلط ہیں۔

"سوال یہ نہیں ہے کہ میں کس قابل ہوں، سوال یہ ہے کہ تم میرے بارے میں معلومات رکھ کیوں رہی ہو۔ کوئی اسپیشل ریزن، کچھ انٹرسٹ ہے تمہارا مجھ میں؟" اس نے پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا اور اپنی جانب سے سارا بدلہ لے لیا تھا۔ سونیا کے چہرے کا رنگ ایک دم بدلا۔ اس کے سارے بدن میں خون کی روانی تیز ہوئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہونے لگا تھا۔ اس کا دل چاہا اس شخص کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارے۔ وہ خود کو سمجھتا کیا تھا اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک دم سے اس بدتمیزی کا کیا جواب دے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی۔ التمش کے موبائل کی بپ تین چار بار مسلسل بجی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے سگنلز تو آ رہے ہیں۔ اچھا ڈیئر کزن! تم سے ذرا بعد میں بات کرتا ہوں۔ ابھی ذرا کچھ ضروری، انتہائی ضروری کام نمٹا لوں تب تک تم بھی کوئی نئی قسم کی بریانی سیکھ لو۔ وہ الگ تھلگ والی تو بھائی فلاپ کر دی ہم نے، اب ہمیں متاثر کرنا ہے تو کچھ اسپیشل کرنا پڑے گا۔ التمش کہتے ہیں مجھے، عام سی بے کار چیزیں مجھے بالکل نہیں بھاتیں۔" وہ ایک ایک لفظ کو جتانے والے انداز میں کہہ کر، طنزیہ ہنسی ہنستا باہر نکل گیا تھا۔ سونیا کے سارے چہرے سے جیسے آگ نکلنے لگی تھی۔ وہ بہت دھیمے مزاج کی لڑکی تھی لیکن اس لمحے اسے جانے کہاں سے بس غصہ آئے چلا جا رہا تھا۔ ٹی وی پر کوکنگ شو میں "دم پخت بریانی" تیار ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"میزاب کیسی ہے؟ اس نے دوبارہ کوئی خوش خبری دینی ہے کہ نہیں؟ وہیں سات سالوں سے اسی اسکور پر کھڑی ہے۔" وہ دونوں فراغت سے کام نمٹا کر سب کو کھانا وغیرہ کھلا کر بیٹھی تھیں۔ اب یہ وقت تھا کہ وہ دونوں پرانی باتیں یاد کرتیں، ایک دوسرے کو بچپن کی باتیں یاد دلاتیں۔ عہد رفتہ کی کوئی یاد تازہ کرتیں۔

"اس کو تو بہت سمجھاتی ہوں میں کہ یہی وقت ہے ایک اور بے بی لے لے۔ سیماب کے ماشاءاللہ تین بچے ہو گئے ہیں اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔ سات سال کا ہو چکا ہے ماشاءاللہ، مگر......" وہ چپ سی ہوئیں تو مہناز نے استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

"کہتی ہے اب کی بار میں یہ غلطی نہیں کروں گی۔ پہلی بار میں حشر ہو گیا تھا میرا، کہتی ہے اکیلے مجھ سے نہیں سنبھالا جاتا چھوٹا سا بچہ اور فرماتی ہے اگر آپ وعدہ کریں کہ آپ کینیڈا آئیں گی میرے پاس تو پھر کچھ سوچ سکتی ہوں ورنہ تو یہ ایک ہی بہت ہے۔ اب تو جاب بھی کر رہی ہے، بیٹے اور شوہر کے ساتھ ہی نکل جاتی ہے۔ شام کو بیٹے کو اسکول سے لے کر گھر آ جاتی ہے۔ شکر ہے رب کا خوش باش ہیں بڑی دونوں اپنے گھر میں۔ (گہری لمبی سانس) مسئلہ تو بس اس چھوٹی والی کا ہے۔ اس کے لیے ہلکان ہوئی جا رہی ہوں بس۔"

انہوں نے مہناز کی جانب دیکھا پھر نظریں سی چرا لیں کہ وہ کہیں آنکھوں میں چھپی غرض کو خود غرضی نا سمجھ لیں۔ مہناز بس چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھتی رہیں، کچھ سوچتی رہیں۔

"تو تم چلی جاؤ نا اس کے پاس چھ ماہ سال کے لیے۔" انہوں نے مشورہ دیا تھا

"ارادہ تو کیا ہے اور اب تو ویزا بھی مل سکتا ہے۔ وہ آرام سے نکلوا سکتی ہے۔ ان کو پاسپورٹ مل چکا ہوا ہے نا۔ وہ تو کہتی ہے آپ ایک بار ہاں کہیں تو آپ کو اور ابو دونوں کو بلوا لیتی ہوں لیکن وہی بات۔ سونیا کا کہیں سلسلہ بنے تو یہ ہامی بھروں نا۔ اسے

کہاں چھوڑوں گی۔ اب اپنی ایک بچی کی خاطر دوسری کو تو یہاں نہیں چھوڑ سکتی نا۔ دعا کرو مہناز اس کا کوئی جلد سلسلہ بنے تو میری جان کو سکون ہو جائے، بڑی پریشانی ہے مجھے۔" وہ بے چارگی سے بولی تھیں یعنی اگر التمش کی زبان پر بھروسا کیا جاتا تو مسئلہ واقعی "چار فٹ دس انچ" کا تھا۔ مہناز چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ وہ اپنی بیٹی کی بار بار اس طرح بات کرتی کتنی معصوم لگتی تھیں۔ وہ باتیں جو وہ بھائی کے سامنے کرتے جھجک جاتی تھیں، سہیلی ہونے کے ناطے ان کے سامنے کتنے آرام سے کر رہی تھیں۔ یہ ان کا بھروسا ہی تو تھا۔ مہناز کا دل پسیج سا گیا اور یہی وہ موقع تھا جب انہوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور خطرناک فیصلہ کر ڈالا تھا۔

"عطیہ! دیکھو...... گھما پھرا کر بات اس کے سامنے کرے انسان جو غیر ہو۔ تم سے بڑھ کر تو اس سارے خاندان میں کوئی نہیں ہے میرا۔ تم میری بہن پہلے ہو سہیلی بعد میں اور نند تو کہیں بہت بعد میں ہوئی ہو۔ تم سے تو میں بنا کوئی بھید بھاؤ رکھے ہر بات کر سکتی ہوں۔" وہ تمہید باندھ رہی تھیں۔ ان کے ہر جملے پر عطیہ کا دل ہچکولے لینے لگا۔ وہ ان کی مرضی کی بات کریں گی یا نہیں، یہ سوچ سوچ کر انہیں خفیف سے جھٹکے لگنے لگے تھے۔

"عطیہ......" مہناز نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ عطیہ کو لگا اب کی بار تو وہ ضرور ہی ان کے دل کی مراد زبان پر لے آئیں گی۔

"پریشان مت ہوا کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ نے سب کا جوڑ بنا رکھا ہوتا ہے جلد یا بدیر۔ تم دیکھنا سونیا کے لیے کوئی بہت ہی بہترین شخص مل جائے گا ان شاء اللہ۔" عطیہ کا منہ تک کڑوا ہو گیا یعنی وہ ان کے دل کی بات ابھی بھی نہیں کرنے والی تھیں۔

"ہاں جی ضرور۔ اللہ کی ذات پر بھروسا ہے مجھے۔" انہوں نے دل ہی دل میں جلنے بھننے کے باوجود تحمل سے ہی کہا تھا۔ بیٹیوں کی ماں تھیں، اتنا تجربہ تو ہو چکا تھا کہ تحمل کیسے برقرار رکھتے ہیں۔ مہناز مسکرائیں۔

"لیکن اگر تم کو بہترین شخص نہیں چاہیے اور تمہارا معیار ذرا گر چکا ہے تو......" وہ پھر لمحہ بھر کو رکیں۔

"میرا نکما بیٹا حاضر ہے، ویسے تو اس میں کوئی بھی قابل فخر بات نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ میرا بیٹا ہے لیکن تم اپنے بھائی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو اپنی فرزندی میں قبول کر لو تو میں اسے ساری زندگی کے لیے تمہارا احسان سمجھوں گی۔" مہناز نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا تھا۔ عطیہ کی جیسے سانس میں سانس آ گئی۔ ان کا دل چاہا مہناز کے سامنے رو ہی پڑیں۔

"مہناز...... تم سچ کہہ رہی ہو نا۔" انہوں نے بھیگتی آنکھوں کے ساتھ ان سے پوچھا تھا۔

"ہاں......" وہ مصنوعی جھلاہٹ سے بولیں۔

"اگر تم نے تہیہ کر ہی لیا کہ ہے تمہیں اپنی بیٹی کی بھلائی عزیز نہیں ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہتی ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔" وہ شرارتی ہو رہی تھیں۔ عطیہ نے ان کو گلے لگایا اور زور سے بھینچتے ہوئے بولیں۔

"تمہیں کیا پتا تم نے کیسے مجھے سکون پہنچایا ہے۔ میری دیرینہ خواہش پوری کر دی ہے تم نے مہناز! تمہیں اندازہ بھی نہیں کہ التمش کتنا عزیز ہے مجھے۔ میرے لیے تو وہ شہزادے سے بڑھ کر ہے، تم خواہ مخواہ میرے بچے میں کیڑے مت نکالو۔ ایسا اچھا بچہ ہے وہ کہ جس لڑکی کا نصیب بنے گا، وہ ملکہ بن جائے گی۔ میری بیٹی کے تو بھاگ جاگ اٹھیں ہیں مہناز۔" عطیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کو گود میں اٹھا کر گول گول گھما ڈالیں۔ مہناز نے ان کی گرم جوشی کو پورے خلوص سے محسوس کیا تھا۔

"اچھا میری بات سنو، دیکھو یہ بات فی الحال تمہارے اور میرے درمیان ہی رہے گی۔ میں التمش کی پڑھائی اور پھر جاب ہو جانے سے پہلے یہ قصہ نہیں چھیڑنا چاہتی تھی۔ سونیا اتنی اچھی بچی ہے۔ اس کے اعتماد کے لیے ضروری ہے کہ جس شخص سے وہ

شادی کر رہی ہے وہ ایک قابل فخر جاب تو کرتا ہو اور میرا بیٹا تو فی الحال ویلا نکما بے روزگار ہے۔ اس لیے میں ابھی تک چپ تھی کہ ذرا یہ مسئلہ سلجھے تو تم سے کوئی بات کروں لیکن تمہاری پریشانی بھی مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ تو میں خود کو روک نہیں پائی لیکن جب تک میں نہیں کہوں گی۔ وعدہ کرو کہ تب تک یہ بات کسی سے نہیں کرو گی۔ مناسب وقت پر ہم یہ بات سب کو بتا دیں گے لیکن اس سے پہلے یہ ہم دونوں سہیلیوں کے درمیان راز رہے گی۔" وہ سہیلی کو تسلی دیتے ہوئے بولی تھیں۔ عطیہ ان کے موقف اور رائے پر مطمئن ہو گئی تھیں اسی لیے سر ہلایا۔

"اچھا۔ اب ذرا ایک بات اور سن لو۔ ذرا تسلی سے سننا اور پریشان مت ہونا۔" انہوں نے ان کے قریب ہوتے ہوئے کہا تھا۔ عطیہ خاموشی سے ان کی بات کو سننے لگی تھیں۔

☆☆☆

"آ گئیں آپ...... کر لیں میری اور میرے بیٹے کی چغلیاں اپنی سہیلی سے۔" مہناز نے کمرے میں قدم رکھا تو ماسٹر جی نے انہیں چڑاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کھلا ہوا چہرہ لیے ان کے پاس بستر پر آ بیٹھیں۔ عطیہ سے بات کر کے وہ کافی مطمئن ہو گئی تھیں اگرچہ جانتی تھیں کہ یہ مسئلہ کافی گمبھیر ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی انہوں نے بیٹے کا پروپوزل دے ڈالا تھا۔

"آپ کی چغلیاں کیوں کروں گی۔ میں تو بس حقیقت ہی بتا رہی تھی آپ کی بہن کو کہ ماسٹر جی اور ان کا بیٹا کس قدر تنگ کرتے ہیں مجھے۔ اس کو سمجھا رہی تھی کہ پریشان نا ہوا کرے۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد سونیا کے لیے کوئی بہترین سبیل بنا دیں گے ان شاء اللہ۔" وہ تفصیل بتا رہی تھیں۔ ماسٹر جی کو بھی بہن کا بجھا بجھا ہوا چہرہ یاد آ گیا تھا۔

"عطیہ تو سٹھیا گئی ہے۔ ایسے تھوڑی پریشان ہوتے ہیں کسی بھی بات کے لیے۔ مل جائے گا رشتہ بھی۔" ماسٹر جی کے موقف میں ذرا تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"جان بوجھ کر تو کوئی بھی پریشان نہیں ہوتا ماسٹر جی! وہ ماں ہے۔ مائیں ایسے معاملات میں جلدی پریشان ہو جایا کرتی ہیں۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ میزاب اسے اور اصغر بھائی کو کینیڈا بلوانا چاہ رہی ہے۔ عطیہ اس لیے بھی کچھ عجلت دکھا رہی ہے کہ جانے سے پہلے محراب کا مسئلہ حل کر لے تاکہ سکون سے وہاں سال چھ مہینے رہ سکے۔" مہناز انہیں تفصیل بتائے چلی جا رہی تھیں۔ ماسٹر جی سر ہلا رہے تھے لیکن انہیں اس سارے قضیے میں ابھی تک کوئی بات غور طلب لگی نا تھی۔ وہ مرد تھے ان کے لیے بچوں کے رشتے میں دیر سویر ایک بہت عام سا مسئلہ تھی۔ ہر گھر میں یہ سب ہی ہو رہا تھا۔ جوان ہوتے سب ہی بچوں کے والدین اس قسم کے مسائل کی وجہ سے ہلکان ہوئے جا رہے تھے۔ وہ اپنی اہلیہ اور بہن کی طرح اس ذرا سی بات پر پریشان نہیں ہو سکتے تھے۔

"مجھ سے نہیں دیکھی جاتی عطیہ کی یہ پریشانی۔ دل چاہتا ہے کہ فوراً سے پیشتر اس کا یہ مسئلہ حل کر دوں۔ بھلا اپنے ہی اپنوں کے کام نا آئیں گے تو فائدہ بہن بھائیوں کا اور ویسے بھی ہم یہاں صرف بریانی کوفتے کھانے تو آئے نہیں ہیں۔ ہم تو ایک خاص مقصد کے لیے آئے ہیں۔ ہیں نا ماسٹر جی! آپ ہی بتائیں میں کوئی غلط کہہ رہی ہوں۔" انہوں نے کہتے ہوئے ماسٹر جی کا چہرہ بھی دیکھا تھا۔

"نہیں جی۔ آپ نے آج تک کبھی کوئی غلط بات کی بھی ہے۔ یہ تو ہمارے خاندان کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا کہ کسی بیوی نے کوئی غلط بات کی ہو۔ یہ صرف شوہروں کے نصیب میں لکھا ہے۔" وہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے شرارتی انداز میں بولے تھے۔ مہناز ان کی جانب مڑتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

"ہاں جی۔ مجھے پتا تھا آپ یہی کہیں گے۔ اسی لیے میں نے آپ کی منشاء و مرضی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے عطیہ کی بچی کو اپنے بیٹے کے لیے مانگ لیا ہے۔" انہوں نے انکشاف کر ڈالا تھا۔ ماسٹر جی کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ وہ سمجھے مہناز مذاق کر رہی ہیں۔

"اب اتنی بے وقوفی کی امید بھی نہیں ہے مجھے

PakBooks.Site

آپ سے۔ یہ غلطی نہیں کرسکتیں آپ۔" وہ مسکرائے تھے لیکن اندر سے ان کا دل ہچکولے لینے لگا تھا۔

"اس میں غلطی والی کیا بات ہے ماسٹر جی! بحیثیت ماں کیا میرا حق نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹے کے لیے بہترین کا انتخاب کروں۔ سو میں نے یہی کیا ہے۔ میں تو اسے غلطی اور بے وقوفی نہیں مانتی۔" وہ اطمینان سے بولی تھیں اگرچہ ان کو پتا تھا کہ التمش کو منانا ان کے لیے ایک بہت مشکل کام ثابت ہونے والا تھا اور ان کی بچھائی بساط الٹی بھی پڑ سکتی تھی لیکن وہ جو کر آئی تھیں فی الوقت اس پر مطمئن اور فاتحانہ انداز میں شوہر کو بتانا اپنا فرض سمجھ رہی تھیں۔ ان کا ہک دک چہرہ دیکھ کر وہ مزید بولیں۔

"بحیثیت ماں یہ میرا فرض تھا ماسٹر جی! سو میں نے عطیہ کو تسلی دے دی ہے کہ فکر نہ کرے۔ میرا بیٹا اس کا ہی ہے۔" مہناز کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا جیسے اپنی چال چل کر اب جیت کے لیے بالکل پر عزم ہو چکی تھیں۔ ماسٹر جی سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

"یہ کیا کر دیا آپ نے بی بی! آپ کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ کو میری بہن کو جھوٹی تسلی دینے کی کیا ضرورت تھی۔" مہناز نے ان کی بات کاٹ دی۔

"جھوٹی تسلی کیوں دوں گی۔ آپ جانتے ہیں میں جھوٹ نہیں بولتی۔ یہ میری عادت نہیں ہے۔" اب کی بار ان کے چہرے پر چھلکنے والے عزم نے ماسٹر جی کو باور کروا دیا تھا کہ ان کی اہلیہ وہی کر بیٹھی ہیں جس کا خدشہ ستا تا رہا تھا انہیں۔

"بی بی! آپ کو یہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ جانتی ہیں یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے۔ یہ آپ کے بیٹے کی زندگی بھر کا مسئلہ ہے۔"

"اسی لیے تو میں اتنی پرسکون ہوگئی ہوں ماسٹر جی! میں نے اپنے بیٹے کے لیے ایک بہترین فیصلہ کیا ہے۔ ساری زندگی احسان مند رہے گا میرا۔" وہ واقعی پرسکون ہوگئی تھیں۔ ماسٹر جی نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔

"وہ تو احسان مند رہے گا لیکن اس کے بارے میں سوچا ہے جو ساری زندگی آپ کو کوستی رہے گی۔ کسی کی بچی سے دشمنی لینے کا فائدہ، کہاں کا جوڑ کہاں ملانے کی بات کر رہی ہیں آپ۔ زمین آسمان جتنا فرق ہے دونوں کی طبیعتوں میں۔ وہ بچی کیسے گزارا کرے گی آپ کے بیٹے کے ساتھ۔ یہی سوچ لیتیں آپ۔" وہ سخت ناراض تھے۔

"سب سوچ لیا ہے میں نے ماسٹر جی! سب ٹھیک ہو جائے گا ماسٹر جی! دیکھیے گا دونوں بچے ایک دوسرے کے ساتھ بہترین زندگی گزاریں گے۔" مہناز نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"جب سب سوچ لیا ہے تو کیجیے گا بھی خود۔ مجھ سے یہ امید مت رکھیے گا کہ میں اس معاملے میں آپ کی کوئی مدد کروں گا۔" ماسٹر جی سخت برا منا کر بولے تھے۔ مہناز نے چند لمحے ان کی شکل دیکھی پھر اطمینان سے سرہانہ سیدھا کیا، بستر پر دراز ہوئیں اور لحاف اوپر تک چڑھا لیا۔

"آپ سے امید نا ہوتی تو یہ قدم کبھی نا اٹھاتی۔ آپ کسر نفسی سے کام مت لیجیے۔ میں جانتی ہوں آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں اور آپ کو ہی کرنا ہے۔" لحاف کے عقب سے وہ بولی تھیں۔ ماسٹر جی کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ انہیں بے حد غصہ آنے لگا تھا اور غصے میں وہ ہمیشہ خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ وہ کچھ دیر اسی طرح لحاف میں چھپی اپنی اہلیہ کی جانب دیکھتے رہے پھر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بستر سے قدم نیچے رکھے تھے اور بڑبڑاتے ہوئے باہر چل دیے تھے۔

"میں کیا کرسکتا ہوں۔ سمجھانا آپ کو مشکل ہے تو سمجھانا آپ کے بیٹے کو بھی آسان نہیں ہے بی بی جیسی ضدی ماں ویسا ضدی بیٹا۔ یہ غریب ماسٹر کیا کرسکتا ہے، اونہہ بتاؤ جب اس کی مرضی ہی نہیں ہے تو کسی کی بچی کو مشکل میں ڈالنے کا فائدہ۔"

☆☆☆

"سونیا...... میری بچی......" عطیہ اس کے کمرے کے اندر داخل ہوئی تھیں اور اسے بانہوں

میں بھر لیا تھا۔ وہ اس کا منہ اور ماتھا چوم رہی تھیں۔ انہوں نے بالکل دھیان نہیں دیا تھا کہ ان کی بیٹی کی آنکھیں نم اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"مجھے تو خوشی کے مارے نیند نہیں آرہی۔ تم کیوں جاگ رہی ہو اب تک، کیا کر رہی ہو یہاں بیٹھی۔" انہوں نے اسی طرح اسے بانہوں میں قید کیے ہوئے سوال کیا تھا۔ سونیا نے اپنا آپ چھڑوا کر ان کی جانب دیکھا اور چڑ کر بولی۔

"رو رہی ہوں۔" عطیہ بیگم نے اس کے جلتے ہوئے جملے کو بالکل بھی اہمیت نہیں دی تھی۔

"ارے میری چندا! رونے کے دن چلے گئے۔ اب خوش ہونے کے دن شروع ہوگئے ہیں۔ اب بس تم اپنی قسمت پر ناز کیا کرنا۔ فخر کیا کرنا اپنے نصیب پر۔" وہ بے پناہ خوش تھیں۔

"کیوں، اب ایسا کیا ہو گیا ہے۔" وہ چڑ کر بولی تھی۔ عطیہ نے کچھ کہنا چاہا پھر جانے کیسے خود پر ضبط کر لیا تھا۔

"وہ تو میں تمہیں وقت آنے پر بتا دوں گی۔ ابھی ذرا میں نوافل پڑھ لوں۔ سیانے کہتے ہیں جب بہت زیادہ خوشی ملے تو شکرانے کے نوافل ضرور ادا کرنے چاہئیں۔ بس میں یہ کام کر آؤں پھر اپنی بچی کا صدقہ اتارتی ہوں۔" وہ جیسے آنا فانا آئی تھیں ویسے ہی باہر نکل گئیں۔ سونیا نے ان کے آنے کی پروا کی تھی نا جانے کی۔ اس کا دل بس بے حد بجھا ہوا تھا۔ اسے ہر شخص پر، ہر چیز پر غصہ آرہا تھا۔

☆☆☆

"ناراض ہوگئی ہو۔" وہ بہت ہی دھیمی آواز میں بولا تھا۔ سگنلز کے ٹھیک ہوتے ہی وہ باہر لان میں آگیا تھا کیونکہ نیٹ ورک آ تو گیا تھا لیکن سگنلز ابھی بھی ویک تھے۔ اس کا خیال تھا کہ باہر کھلی فضا میں کال کوالٹی کسی قدر بہتر ہوگی۔ زرمین نے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ التمش خاموشی سے اس کی خاموشی کو محسوس کرتا رہا پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔ اس نے اس کا فون تو اٹھا لیا تھا لیکن ناراضی کے اظہار کے طور پر کچھ بول نہیں رہی تھی۔

"اوہ، آئی ایم سوری۔ مجھے سمجھ میں آگیا کہ تم خاموش کیوں ہو۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ تم نماز پڑھ رہی ہو۔ چلو ایسا کرو تم نماز پڑھ لو۔ میں دوبارہ فون کرلوں گا۔" اس نے اتنا کہا اور فون ٹھک سے بند کر دیا۔ ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ زرمین کا نام اور اس کا نمبر اس کے فون کی اسکرین پر چمکنے لگا تھا۔

"میں نماز نہیں پڑھ رہی تھی۔" وہ اس کے فون اٹھاتے ہی چلا کر بولی تھی۔

"اوہو، تو اس میں ایسی کون سی فخر کی بات ہے کہ اتنا چلا کر اظہار کیا جائے۔ نماز تو پڑھنی چاہیے تمہیں۔ کچھ نہیں سکھایا تمہیں تمہاری اماں نے۔ سب مجھے ہی سکھانا پڑے گا کیا۔" وہ شریر سے انداز میں بولا تھا۔

"تم اتنے بدتمیز کیوں ہو التمش!" وہ جتاتے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

"التمش کہتے ہیں مجھے۔ بدتمیزی بجتی ہے مجھ پر، کتنی بار تو بتا چکا ہوں۔ بار بار کیوں پوچھتی ہو۔" وہ ہنسا تھا۔ وہ ایک بار پھر چپ سی ہوگئی۔

"اچھا اب دوبارہ نماز کی نیت باندھ لی ہے کیا۔ دیکھو پہلے مجھ سے بات کرلو پھر اطمینان سے نماز پڑھ لینا ویسے بھی میں کوئی فارغ تھوڑی ہوں، اپنی متوقع سسرال آیا ہوا ہوں۔ اتنی آؤ بھگت ہو رہی ہے میری۔ میرے پاس ہرایرے غیرے سے بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم کرواؤ آؤ بھگت، بند کر دیتی ہوں میں فون۔" اس نے بجھے ہوئے انداز میں اتنا ہی کہا تھا کہ التمش نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اوہو، اب بس بھی کرو زرمین۔ کیوں ناراض ہو رہی ہو۔ اچھا بتاؤ، کیا چاہتی ہو۔ کیا آجاؤں ابھی واپس؟" وہ زچ سا ہو کر بولا تھا۔

"ہاں آجاؤ۔" زرمین نے کہا، التمش ہنسا تھا۔

"ہیں...... فلموں میں تو ہیروئن ایسی بات کے جواب میں فوراً سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے چپ کر جاتی ہے لیکن تم چڑ چڑ باتیں ہی کیے جا رہی

ہو۔" وہ ہنس کر بولا لیکن زرمین کچھ نہیں بولی تھی۔

"اچھا تم کہتی ہو تو آجاتا ہوں لیکن یاد رکھنا ماسٹر جی نے پوچھا تو یہی کہوں گا کہ تم نے بلایا ہے۔ وہ خوامخواہ تمہارے بارے میں غلط ملط سوچتے رہیں گے کہ شاید ان کی بہو کو پھپھو کے گھر آنا جانا پسند نہیں ہے۔ تمہارا امپریشن ہی خراب ہوگا۔" وہ اسے ڈرا رہا تھا۔ زرمین نے اس کی بات سن کر تاسف سے ٹھنڈی لمبی آہ بھری تھی۔

"میرا امپریشن تو پہلے ہی خراب ہے۔ وہ مجھے پسند ہی نہیں کرتے۔ اگر کرتے ہوتے تو اپنی بھتیجی سے ملنے اس طرح آنا فانا آگئے ہوتے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میری دال کبھی گلنے والی ہے۔ تمہارے پیرنٹس مجھے اچھا نہیں سمجھتے، مجھے پتا ہے۔" وہ بہت زود ورنج ہورہی تھی۔ التمش کا دل اس کے انداز پر تڑپ اٹھا تھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے زرمین! وہ تمہیں کیوں اچھا نہیں سمجھیں گے۔ تمہیں خود پر اعتماد نہیں ہے۔ بہت محبت کرنے والے پیرنٹس ہیں میرے۔ وہ بہت محبت کرنے والے ساس سسر ثابت ہوں گے۔ تم دیکھ لینا، بالخصوص ماسٹر جی! وہ تمہیں تمہارے فادر سے زیادہ چاہیں گے۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"التمش! مجھے جھوٹی تسلیاں مت دو۔ بس یہ بتادو۔ تم لوگ اس طرح اچانک کیوں گئے ہو اپنی پھپھو کے گھر، کہیں تمہاری امی پروپوزل لے کر تو نہیں گئیں۔ دیکھو اگر ایسا کچھ ہے تو مجھے بتادو پلیز۔ میرا دل اتنا ڈرا ہوا ہے نا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے، مجھ سے چھپاؤ مت۔" اس کے لہجے میں جو نمی تھی وہ اتنی دور بیٹھے التمش نے اپنی آنکھوں میں محسوس کی تھی۔

"ارے، خوامخواہ پروپوزل لائی ہوں گی امی! میں راضی ہی نہیں جب اس بات پر۔ مجھے پسند ہی نہیں ان کی پسند تو میری مرضی کے بنا کیوں پروپوزل دیں گی وہ۔" وہ ناصحانہ انداز میں بولا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تمہاری امی تمہیں پریشرآئز نا کریں۔ کہیں تمہیں فلموں والی امیوں کی طرح دودھ نا بخشنے والے قسم کے طعنے دے کر اپنی بات منوا نا لیں۔" زرمین نے اتنا ہی کہا تھا کہ التمش نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اوہ ہیلو...... بی بی! اتنی فلمی امی نہیں ہیں میری۔ ہم نے بس ان کا نام ہی جودھا بائی رکھا ہوا ہے۔ وہ سچ مچ کی جودھا بائی نہیں ہیں۔ اس لیے یہ اسٹوپڈ باتیں دل سے نکال دو کہ امی مجھے طعنے دیں گی۔ ماسٹر جی گن پوائنٹ پر مجھ سے کسی کاغذ پر سگنیچر کروالیں گے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں چڑ کر بولا تھا۔

"مجھے تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ چلتے پھرتے میرے ذہن میں بس ایسے ہی سین آرہے ہیں۔ جس میں تمہاری حسین وجمیل کزن دلہن بنی فخریہ جلانے والے انداز میں مجھے گھور رہی ہے اور تم بس اس کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے جارہے ہو۔" زرمین نے اپنا خدشہ بیان کر ہی ڈالا تھا۔

"واہ بھائی! تمہارے خوابوں کی کیمرہ کوریج تو بڑی زبردست ہے۔ وہ سب بھی دکھا رہے ہیں تمہیں جس کا ہم نے دور دور تک گمان بھی نہیں کیا۔ یعنی یہاں تک کھسک گیا ہے تمہارا دماغ۔" التمش اسے چڑا ہی رہا تھا۔ لان میں موسم بہت اچھا تھا۔ اسے کراچی کی نسبت وہاں کا موسم پسند آیا تھا۔ اوائل مئی کے دن تھے لیکن ہوا میں ملائم سی خنکی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دور کہیں بارش برستی رہی تھی۔ اس کا موڈ خوش گوار سا ہوگیا تھا۔ زرمین کی بے چینی تڑپ اور استحقاق اسے عجیب سا حوصلہ بخش رہا تھا۔ سارے دن کی کسلمندی جیسے غائب ہوگئی تھی۔

"مجھے تم بس یہی جلی کٹی سناتے رہنا اور وہاں حسین وجمیل کزن کے ساتھ بیٹھ کر مستقبل کی پلاننگ کررہے ہوگے۔" وہ جل کر بولی تھی۔

"ہاں، یہی بات ہے۔ ایسا ہی کررہا ہوں بلکہ ہم نے شادی ہال کی بکنگ بھی کروالی ہے۔ ہنی مون کے لیے بس موریشس کے ٹکٹس بکنگ کروانے رہ گئے ہیں۔ تم سے بات کرکے بعد اگلا کام یہی کروں گا۔ خوش یا اور کچھ بتاؤں۔" وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"التمش مذاق نہیں کرو، بتاؤ نا مجھے اس کے

بارے میں۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے۔" اس نے آس بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔ التمش نے قہقہہ لگایا پھر دھیمی سی آواز میں پوچھا۔

"کیا تم خوب صورت ہو۔ اچھا واقعی، میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں غور سے؟" وہ ایک بار پھر شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ہاں تمہیں اپنی پھپھو کی بیٹی سے فرصت ملے تو کسی اور کو دیکھو۔" زرمین نے طعنہ دیا تھا۔ وہ ہنستا ہی رہا پھر اس کی خاموشی کو محسوس کرکے بولا۔

"یار! تمہیں خود پر اعتماد نہیں ہے۔ تم جیسا کوئی ہے ہی نہیں اور اس دل میں تمہارا جو مقام ہے نا۔ وہ کوئی نہیں لے سکتا۔ التمش ہوں میں، تم سے محبت کی ہے مجھے۔ صرف تم سے محبت، تمہارا کیا خیال ہے کوئی بھی ایویں شیویں سی لڑکی میرے دل میں تمہاری محبت کو تہس نہس کرڈالے گی۔ اتنا ہی گیا گزرا ہوں میں کہ کسی بھی عام سی لڑکی کی زلفوں کا اسیر ہوجاؤں گا۔ اس دل نے تمہیں اپنا مان لیا ہے اور تمہارے علاوہ یہ اعزاز کسی کو نہیں بخش سکتا میں اور اس چار فٹ دس انچ کو تو بالکل نہیں۔ کہاں تم، کہاں وہ...... کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے تم دونوں کا۔ کیوں پریشان ہوتی ہو تم۔ مت سوچو اس کے بارے میں، وہ بہت عام سی لڑکی ہے۔ اتنی عام سی کہ میرے ساتھ کھڑی ہو تو نظر بھی نہیں آتی۔ گردن نیچے کرکے دیکھنا پڑتا ہے اسے۔ ایک دم بریانی قورمہ ٹائپ، جو بس ٹیبل پر موجود کھانے کے متعلق ہی بات کرسکتی ہے بس کا کوئی ایکسپوژر نہیں ہوتا۔ ایسی لڑکی کو لائف پارٹنر بناؤں گا میں۔ میرا اسٹینڈرڈ اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہے مائی ڈیئر! میں تو کسی ایسی لڑکی کو لائف پارٹنر بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا جسے میرے کندھے سے کندھا ملانے کے لیے بھی سیڑھی کی ضرورت پڑے جو میرے ساتھ چلے تو آٹھ انچ کی ہیل بھی اسے میرے برابر لانے کے لیے ناکافی ہو اور جو گفتگو کرے تو بس دار چینی سفید زیرہ سے آگے نا بڑھ سکے۔ ایسی ہے وہ، کیوں دل جلا رہی ہو اپنا۔ جب میں اس چار فٹ دس انچ کے مسئلے کو زیرو پرسینٹ اہمیت بھی نہیں دے رہا تو تم کیوں خود کو خوار کررہی ہو۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا، محبت سے ملائمت سے۔ وہ واقعی اس سے محبت کرتا تھا اور محبت بعض اوقات کس قدر خود غرض ہوجاتی ہے۔ وہ نہایت دھیمی آواز میں باتیں کررہا تھا لیکن اس کو بالکل احساس نہیں ہوا تھا کہ کسی نے اس کی ساری باتیں سن لی تھیں۔

☆☆☆

"لو دوستو...... بس یہاں تک آپہنچی تھی یعنی جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں براجمان تھی۔ مجھ سے تو یہ معاملہ سلجھ ہی نہیں رہا تھا۔ میری ہر تدبیر الٹی پڑگئی تھی۔ میں تو کچھ اور سوچ کر وہاں گیا تھا لیکن وہاں میری اہلیہ کی مہربانی سے کچھ اور ہی پیچا پڑ گیا تھا۔

میرے سمجھانے بجھانے کے باوجود انہوں نے ایک سنگین غلطی کرڈالی تھی اور اب مجھ سے توقع کررہی تھیں کہ میں ان کی غلطی پر پردہ ڈال لوں گا اور مجھے ان کی اس توقع پر پورا اترنا ہی تھا کیونکہ بیوی کو انکار کرنے کی ہمت تو کسی مائی کے لال میں نہیں ہوتی لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ اس معاملے کو اب اپنے طریقے سے سلجھانا پڑے گا مگر اب یہ قصہ میں آپ کو اگلی قسط میں سناؤں گا۔ آپ بھی کوئی نماز روزے کی فکر کیجیے یا بس ڈائجسٹ کی کہانیوں میں ہی گم رہنے کا ارادہ ہے۔ چلیں اٹھیں، شاباش...... اب اگلے شمارے میں ملیے گا مجھ سے۔

(باقی آئندہ ماہ)

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... ماہ وش
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی .... موسیٰ رضا

بشریٰ ماہا

داد

''بہو کے روپ میں اگر آپ کو بیٹی مل جائے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوتی ہے......اور پھر وریشہ تو ہمارے لیے بیٹی سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئی ہے......بس اب تو زبان سے ہر لمحہ اس کے لیے دعا ہی نکلتی ہے......اللہ ایسی بہو قسمت والیوں کو دیتا ہے۔'' خالدہ بیگم اپنی پڑوسن رفیعہ بیگم کے سامنے مسلسل اپنی بہو کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔

کچن میں کھڑی وریشہ کے پاس بھی اپنی ساس کی آواز بالکل صاف پہنچ رہی تھی......کچھ دیر پہلے اسے کام بوجھ لگ رہا تھا، مگر یہ تعریفی کلمات سن کر اس کے اندر مزید طاقت بھر گئی تھی......اس نے گوشت بھونتے ہوئے دوسرے چولہے پر کڑاہی چڑھائی اور فریج سے چکن رول نکال کر فرائی کرنے لگی۔

یہ چکن رول اس نے خاص طور پر فجر کے لیے بنائے تھے۔ سات سالہ فجر چکن رولز کی تو دیوانی تھی اور وریشہ بیٹی کی پسند ناپسند کو سب سے پہلے ترجیح دیتی تھی، مگر چوں کہ رفیعہ خالہ خالدہ بیگم کی گہری سہیلی تھیں اور اس بار انہوں نے چکر بھی کافی عرصے میں لگایا تھا۔ تو اسے اچھا نہیں لگا کہ انہیں خالی چائے بسکٹ پر ٹرخا دے......ویسے بھی مہمان تو رحمت ہوتے ہیں۔ اللہ ان کے نصیب کا ہمیں خود دیتا ہے۔

اس نے سالن کی آنچ دھیمی کی اور چائے اور دیگر لوازمات کو سلیقے سے ٹرے میں سجا کر باہر صحن میں چلی آئی......اور لوازمات ٹیبل پر سجا کر رفیعہ خالہ کے آگے دعا کے لیے سر جھکایا تھا اور جواب میں رفیعہ خالہ نے ڈھیروں دعائیں کیں اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تھا۔

''سچی تعریف کرتی ہو تم خالدہ......وریشہ تو ہے ہی تعریف کے لائق......اور ایک ہماری بہو ہے......مجال ہے جو کبھی اس نے بوڑھی ساس سے کبھی ہنس کر بات کی ہو......بہو لائی تھی......لیکن بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔'' وہ ایک آہ بھر کر بولی تھیں......خالدہ بیگم نے دیکھا؟ رفیعہ بیگم کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

برآمدے کے پچھلی طرف چھت کو جانے والی سیڑھیاں تھیں......وہ بے حد خاموشی سے وہاں آکر بیٹھ گئی تھی......اس کی نظریں سامنے لگے سفیدے کے درخت کی طرف تھیں......جب کہ سوچ آٹھ سال پہلے کا سفر کر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ صبح سے بھوکی پیاسی اپنے کمرے میں بند تھی۔ حالاں کہ اس حالت میں ڈاکٹر نے اسے اپنا خیال رکھنے کی سخت تاکید کی تھی......مگر صبح ناشتے پر ہونے والے زبردست معرکے کے بعد سے اس کا موڈ کسی کی شکل دیکھنے کا نہیں چاہ رہا تھا۔

عبدالرحمن اور اس کی شادی کو ابھی محض چھ ماہ ہوئے تھے، مگر روز روز ہونے والے جھگڑوں کے سبب ان سب کی زندگی تباہ ہو چکی تھی......اسے یاد تھا کہ کتنی مشکل سے پاپا اس کی اور عبدالرحمن کی شادی کے لیے راضی ہوئے تھے......کتنا روئی پیٹی تھی وہ......اور کچھ یہ ہی حال عبدالرحمن کا بھی تھا......مگر اب ریشہ کو لگتا تھا جیسے یہ فیصلہ زندگی کا سب سے غلط فیصلہ تھا......اسے لگتا تھا کہ عبدالرحمن صرف اپنی ماں سے محبت کرتا ہے......اور اس کے لیے کچھ اہم ہیں......اور کچھ یہ ہی حال خالدہ بیگم کا تھا۔

جب بھوک مزید برداشت نہیں ہوئی تو وہ کچن میں چلی آئی تھی......ہاٹ پاٹ کھولا تو وہاں بیسن کی روٹی دیکھ کر بھوک مزید چمک اٹھی......وہ ٹرے میں پودینے اور املی کی چٹنی کے ساتھ بیسن کی روٹی رکھ کر کچن سے نکل ہی رہی تھی کہ اس کے کانوں سے خالدہ بیگم کی نم آواز ٹکرائی۔

''ایک عورت کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی اولاد ہوتی ہے......اور اگر کوئی دوسرا اسے بھی چھین لے، تو باقی کیا رہ جاتا ہے......کچھ بھی نہیں......زندگی بوجھ جیسی لگنے لگتی ہے......بالکل ایسی زندگی جی رہی ہوں میں بھی۔ پچھلے چھ ماہ سے، عبدالرحمن تو بھول چکا ہے کہ ماں کے حقوق آخر ہوتے کیا ہیں۔'' خالدہ بیگم کی آنکھوں سے تر تر آنسو

بہہ رہے تھے......ان کے ساتھ بیٹھی دُرزن خالہ ترحم بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

اس کے اندر شرمندگی اور دکھ کا احساس فوری طور پر جاگا تھا......وہ بھی تو ماں بننے والی تھی......اور اگر اسے ایک ماں کی بددعا لگ جاتی تو......اس نے ٹرے واپس سلیب پر رکھی اور بھاگتی ہوئی صحن میں آئی۔

''امی......مجھے معاف کر دیں امی......'' اس نے ان کے گالوں پر بہتے آنسو دیکھ کر لمحے میں آنٹی سے امی تک کا سفر طے کیا تھا......اور ان کے گلے لگ گئی تھی......اور تب تک گلے لگی رہی جب تک انہوں نے اس کی کمر پر پیار سے ہاتھ نہیں پھیرا......

☆☆☆

پھر اس دن اس نے خود سے بہت سارے وعدے کیے تھے......بہت لگن سے رات کا کھانا بنایا......کیوں کہ ابھی اسے عبدالرحمٰن کو بھی تو منانا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ حقوق اللہ کے تو اللہ معاف فرما دیتا ہے......لیکن حقوق العباد جب تک معاف نہیں ہوتے جب تک آپ خود اس انسان سے معافی نا مانگ لیں۔ اس رات عبدالرحمٰن گھر میں نہیں آسکا تھا......جو گھر پہنچی تھی وہ عبدالرحمٰن کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع تھی۔

دریشہ اور خالدہ بیگم روتے ہوئے ہسپتال پہنچی تھیں......اور وہاں آئی۔سی۔یو میں پڑے عبدالرحمٰن کے ساکت وجود کو دیکھ کر تڑپ اٹھی تھیں......بین کرتی زبان پر خاموشی کے قفل لگ گئے تھے......وجود ساکت......صرف ایک آنکھیں تھیں جن پر اختیار نہیں تھا......قیامت تھا وہ لمحہ۔

عبدالرحمٰن کو پورے پندرہ گھنٹوں بعد ہوش آیا تھا......اس دوران وہ دونوں ایک ہو کر اس کے لیے دعائیں مانگتی رہی تھیں۔

دو دن گزرے......وہ مزید بہتری کی طرف گامزن ہوا......ڈاکٹرز کا کہنا تھا۔ مزید دو دن بعد اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ مگر کیا بات تھی کہ عبدالرحمٰن ڈاکٹرز کے علاوہ کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شکوے کیوں تھے۔ شام میں اماں گھر چلی گئی تھیں......اب صرف دریشہ ہی تھی ہاسپٹل میں......کچھ دیر پہلے ڈاکٹر اس کا چیک اپ کر کے گئے تھے......اور اب دریشہ اس کے لیے سیب کا جوس نکال رہی تھی۔

''یہ لیں عبدالرحمٰن جوس پی لیں......آپ کا پسندیدہ سیب کا رس۔'' اس نے مسکراتے ہوئے عبدالرحمٰن کے آگے گلاس کیا۔

مگر یہ کیا عبدالرحمٰن نے تو اس کی طرف دیکھنے کا تردد بھی نہیں کیا......''عبدالرحمٰن......کیا ہوا ہے۔ آپ ہم سے بات کیوں نہیں کر رہے۔'' وہ شاکڈ تھی اس کا شوہر اس کی طرف دیکھ تک نہیں رہا تھا۔ دل یکا یک درد سے بھر گیا تھا۔

''نہیں پینا مجھے جوس......اور تم دریشہ مہربانی کر کے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' اب کی بار وہ بے رخی سے بولا تھا۔

''آپ ایسا کیوں بول رہے ہیں......کیوں خفا ہیں آپ عبدالرحمٰن۔'' اس کی آنکھیں نیر بہانے لگی تھیں......آنسو کی دھند کے پیچھے سے اس نے عبدالرحمٰن کو بے چین ہوتے دیکھا۔ ہاں یہ ایک حقیقت تھی کہ وہ مرد کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''بس کرو......دریشہ مت ظلم کرو ان آنکھوں پر......میں تم سے نہیں خود سے خفا ہوں......نہیں جینا چاہتا اب میں یہ زندگی دوبارہ۔'' وہ شکستگی سے بولا۔

''آپ ایسا کیوں بول رہے ہیں......کیوں اتنے خفا ہیں۔'' اس کی بات سن کر دریشہ کے آنسو میں روانی آئی تھیں۔

''کیوں کہ میں تھک چکا ہوں یار تم لوگوں کے روز روز کے جھگڑوں سے......امی اور تم، دونوں ہی مجھے بے حد عزیز ہو۔ مگر تم دونوں میں کسی کو بھی مجھ سے محبت نہیں ہے۔''

''میں محبت کرتی ہوں آپ سے عبدالرحمٰن۔''

وہ اس الزام پر تڑپ کر بولی۔

''نہیں کرتی ہو تم مجھ سے محبت۔ دریشہ عبدالرحمٰن، تمہیں صرف خود سے محبت ہے......اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو میری ماں سے بھی محبت کرتیں۔ انہیں عزت دیتیں۔'' وہ اب لڑ نہیں رہا تھا......بس دکھ سے بول رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں عبدالرحمٰن آج کے بعد آپ کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا۔ آج کے بعد آپ اور امی دونوں مجھ پر فخر کریں گے۔'' اس نے بنا احتجاج کیے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی......اور جو وعدہ اس دن اس نے کیا تھا وہ اب تک نبھا رہی تھی۔ وہ عبدالرحمٰن سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اس کے لیے اپنی انا بھی مار سکتی تھی۔

☆☆☆

''جانتی ہو رفیعہ ایک خوش حال گھرانے کا راز کیا ہے......کیسے تمہاری بہو تم سے محبت کرنے لگے گی جانتی ہو۔'' خالدہ بیگم آبدیدہ تھیں......آج رفیعہ بیگم کو دیکھ کر انہیں کیا کچھ نہیں یاد آ گیا تھا۔

ہاسپٹل کا وہ کمرہ......بیٹے کے الفاظ......درد بھرا لہجہ اور بہو کے آنسو......اس دن انہوں نے انجانے میں عبدالرحمٰن اور دریشہ کی ساری گفتگو سن لی تھی......اور پھر وہ چپ چاپ، وہاں سے چلی آئی تھیں۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا ان کا بیٹا ان سے کوئی نہیں چھین سکتا......اس دن پہلی بار انہوں نے دریشہ کو بہو کی جگہ بیٹی سمجھا......اور پھر اس کی ہر خطا خود بخود بھول گئیں......وہ اپنے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی تھیں......اس لیے انہوں نے اسے دریشہ سے بانٹ لیا......اور پتا ہے پھر کیا ہوا......انہیں بیٹے کے ساتھ بیٹی بھی مل گئی......اس دن کے بعد ان کے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا......لوگ رشک کرتے تھے ان سب کی محبت دیکھ کر......

''رفیعہ تم حماد کو سونیا سے بانٹ لو......قبول کر لو کہ تمہارا بیٹا کسی اور سے بھی محبت کرنے لگا ہے......تم بس پشت نہیں گئی ہو، بس کوئی اور ہے جس نے تھوڑی سی توجہ لے لی ہے......اور جو لڑکی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آئی ہے، وہ تھوڑی سی توجہ کی تو حق دار ہے نا رفیعہ۔'' انہوں نے رفیعہ بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پُراثر لہجے میں سمجھایا۔

''مگر خالدہ......وہ۔'' رفیعہ بیگم نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے نرمی سے ٹوک دیا۔

''بس ایک بار رفیعہ سونیا کو انعم کی جگہ رکھ کے دیکھو......اسے بیٹی بنا کر تو دیکھو......وہ بھی تمہیں ماں کے طور پر قبول کر لے گی......ایک گھر کو جنت بنانے کا یہی راز ہے۔'' وہ مسکرا کر بولیں تو رفیعہ بیگم نے بھی بات مان کر سر ہلا دیا......انہوں نے دل ہی دل میں عہد کر لیا تھا کہ سونیا اور اپنے تعلقات کو سنوارنے کے لیے وہ ایک بار اسے بیٹی ضرور بنائیں گی۔

☆☆

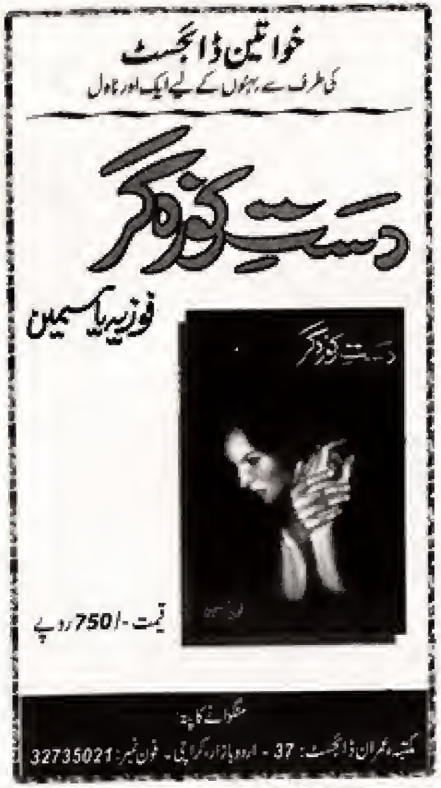

مکمل ناول

سدرۃ المنتہیٰ

اگر ہم ستارے ہوتے

فیبروری سال کا دوسرا مہینہ ہے

یہ نام رومی دیوتا فیبرا (Fabrua) کے نام پر رکھا گیا تھا اور یہ دیوتا مذہبی خوش بختی کی علامت تھا۔ جس کی بدولت اس مہینے کو ہر طرح کی خوشی اور خوش قسمتی سے منسوب کیا جاتا ہے۔"

اور آج دوسرے مہینے کو تیرہویں لگ چکی تھی وہ جاتی ہوئی ٹھنڈ کے بقیہ آثار سمیٹنے کے لیے سنگ مرمر کے ٹھنڈے پڑتے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی، سرسبز لان کی گھاس کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔

اس کا نام عرشیہ عبدالشکور تھا اور وہ اپنی نانی کی بے حد چہیتی تھی، اور مزاج میں بھی قدرے ان پر گئی تھی، اور اس وقت انہیں بستر پر لٹا کر وہ باہر آ گئی تھی سعدیہ سے بات کرتے ہوئے اس کی نگاہ گھاس سے اوپر اٹھ کر چھت کے سائے میں سر اٹھائے سامنے نظر آتی آسمانی چھت پر بچھی تاروں بھری چادر پر ٹک گئی۔

ستاروں کی طرف جب نگاہ اٹھتی تو کچھ لمحوں کو تھم جاتی تھی اسے نانی کی برسوں پہلے کہی ہوئی بات یاد آ گئی کہ ستارے ہم سے بات کرتے ہیں۔ یہ بولتے ہیں۔

PakiBooks.Site

پھر اس نے خود سے تہیہ کر لیا کہ جو جس کے نام کا ستارہ ہوگا وہ اس انسان کو بہت سارا چاہتا ہوگا۔

اور جب انسان زمین سے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھتا ہوگا تو اس کے نام کا ستارہ مسکراتا ہوگا۔

اور یہ سوچ کر ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی

"تم کہیں اپنے حصے کا ستارہ تو نہیں ڈھونڈ رہی ہو؟ دیکھو کہیں...... ہے؟" وہ اس کی ماموں زاد سعدیہ تھی

وہ اس پر طنز بھی کرتی تھی، مگر تا حال اس کے لہجے میں طنز کی جگہ ترحم تھا۔

"کتنے لوگوں کو تم نے محبت میں کامیابی کی خبر دی ہے؟ اور کتنوں کے دل توڑے ہیں؟" وہ اب ترحم سے طنز پر آ گئی تو عرشیہ مسکرائی۔

"میرے نام کا ستارہ تو مجھے اچھی طرح سے

جانتا ہے البتہ میرے کام کا ستارہ مجھے خود ڈھونڈ لے گا اور یہ میری خوش فہمی نہیں ہے۔ خواہش ہے۔“

یہ اس کی پہلی بات کا جواب تھا ”مگر میں نے کتنوں کو محبت میں کامیابی کی خبر دی ہے یہ قصہ الگ ہے۔ البتہ ایک لڑکی علینہ ہے جو بہت خوب صورت لگتی ہے۔ جس نے زندگی سے بہت اچھی امید رکھی ہے باوجود اس کے کہ اس کے نام کا ستارہ مشکل تھا مگر اس نے کر دکھایا...... اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عدیل کے ساتھ شادی کر لی...... اور وہ بہت خوش ہے۔ حالانکہ میں سمجھتی تھی وہ ہمت ہار دے گی مجھے صاف نظر آیا تھا کہ اس کے اور عدیل کے ستارے آپس میں نہیں ملتے۔ مگر اس نے کہا کہ ملتے ہیں۔

اور اس نے حاصل کر لیا ہے...... وہ بہت خوش ہے یہ بتاتے ہوئے عرشیہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

”تم بس لوگوں کی خوشی پر خوش ہوتی رہنا۔ اور اپنی خوشی کی کوئی فکر نہ کرنا۔“

سعدیہ کے لہجے نے طنز سے ترحم لے لیا تھا۔

”محمود کو منا لو عرشیہ وہ جیسا بھی ہے۔ ہے تمہارا منگیتر نا؟“

”محمود کی بات چھوڑو سعدیہ...... وہ اپنے لیے رستہ ڈھونڈ رہا ہے اسے ڈھونڈنے دو اسے خود فیصلہ کرنے دو۔ شادی زبردستی نہیں کی جاتی۔ وہ لڑکیاں بے وقوف ہوتی ہیں جو محبوب کو پانے کے لیے جنتر منتر گھڑتی رہتی ہیں۔“

”تمہارے منہ سے یہ بات عجیب لگتی ہے عرشیہ تم تو خود قسمت کا حال بتاتی ہو۔ قسمتیں بنانے کا کہتی ہو۔“ سعدیہ کا لہجہ ترحم اور طنز دونوں کو چھوڑ چکا تھا۔

فی الوقت۔

”میں تقدیر بتا کر تدبیر کی بات کرتی ہوں۔“

”تم امیدیں جگا دیتی ہو لوگوں کے دلوں میں عرشیہ۔“

”لوگ متجسس ہوتے ہیں سعدیہ...... وہ خود میرے پاس آتے ہیں...... پوچھتے ہیں...... درخواست کرتے ہیں عجز کا استعمال کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض دفعہ رو پڑتے ہیں۔ ایسا کہ مجھے رونا آ جاتا ہے۔ ایسا کہ مجھے ان کو زندگی کی طرف لانا پڑتا ہے۔ اب میں کیا کروں......“ ”تم نے سنا اس دن جس روز تمہارا فون آیا ہوا تھا اور ایک لڑکی نینا آئی ہوئی تھی۔ جسے میں نے کہا تھا کہ تمہارے اور تمہارے منگیتر کے ستارے نہیں ملتے اور اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔“

”اور کیا وہ سچ تھا؟“

”نہیں وہ جھوٹ تھا۔ میں نے پہلی بار کسی سے جھوٹ بولا تھا اور وہ پتا ہے کیوں بولا تھا؟ اس لیے میں اگر اس سے یہ سب نہ کہتی تو وہ کبھی اسے پانے کے لیے بے چین نہ ہوتی۔“

”پر اگر ستارے مل رہے تھے تو وہ تو قسمت کے لکھے پر چل سکتے تھے۔“

”نہیں سعدیہ نہیں...... ستارے مل رہے تھے میچ کر رہے تھے...... مگر اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ لڑکی کا ستارہ آسمان سے نیچے تھا۔

اس کے برے دن شروع ہونے والے تھے مجھے لگا یہی بہتر ہوگا۔ اب وہ کوشش کرے گی۔ بلکہ کی۔ روئی دھوئی۔ چلائی۔ مجھے برا بھلا کہا یہاں تک کہ اس کے منگیتر نے مجھ سے بات کی......“

”اور اب اگر ان کی شادی نہ ہوئی یا پھر ان کے ساتھ کچھ برا ہوا تو اس سب کی ذمہ دار تم بنو گی عرشیہ......!“

”اگر وہ برا نہیں کرے گی تو برا نہیں ہوگا۔ دیکھو بہت سارے لوگوں کے لیے تدبیر کام کرتی ہے یا اگر نہ ہو تو انتظار لمبا ہو جاتا ہے۔“

”اور اگر تقدیر بری ہو تب بھی؟“

”تقدیر...... بری ہو...... تب بھی......“ اس نے صرف سعدیہ کی بات دہرائی

”تمہیں نہیں لگتا کہ عرشیہ تمہارا علم ادھورا ہے؟ پہلے اسے امپروو کرو...... پھر جا کر لوگوں کو ان کی تقدیروں کا حال بتانا سجیں...... طنز پھر سیدھے رستے سے آیا تھا ”اور اندر آ جاؤ...... دادی کو فکر ہے کہ تم ٹھنڈ میں بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”یہ ٹھنڈ تو بس چند دنوں کی مہمان ہے۔“ وہ سعدیہ کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ”اور بہتر ہے کہ محمود سے بات کر لو۔“ ”کل ویلنٹائن ڈے ہے۔“

”چھوڑو سعدیہ۔ اگر محبت زندہ ہو تو ہر دن محبت کا ہوتا ہے۔“

”مطلب کہ محبت کبھی تھی؟“ طنز اور ترحم کے بیچ سوال آ گیا تھا۔ وہ بظاہر سیادہ اور احمق سی دکھتی تھی جو اس کی ماموں زاد سعدیہ تھی۔ مگر آج کے روز اس نے دوبارہ اسے لاجواب کیا تھا ”اور ہاں...... تمہارا فون بج رہا تھا۔“

”اسے سوئچ آف کر دو...... مجھے فی الحال کسی سے بات نہیں کرنی اور ہاں...... تم پلیز کسی کو ادھر کا پتا مت بتانا۔“

”نہیں اس سلسلے میں میری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے کیونکہ مجھے دکھ رہا ہے کہ عنقریب تم یہاں چھپ کر بیٹھ جاؤ گی...... لوگوں کے سوالوں سے تنگ آ کر اچھا یہ ہوتا تو کہ تم دادی کا کہنا مانتیں اور اس ستاروں کے علم کا راز چھپا کر رکھ لیتیں۔“

”علم...... اور محبت یہ دو ایسی چیزیں ہیں جو کبھی نہیں چھپتے......“

”تو گویا محبت کا اقرار کر چکی ہو......“ سعدیہ ہنس دی تھی اور اس نے لب بھینچے عرشیہ عبدالغفور نے جس نے آج دوبارہ اس کے سامنے یہ غلطی کی تھی جو غلطی وہ کبھی محمود کے سامنے نہ کر سکی تھی جسے لوگ اس کی قسمت کا ستارہ کہتے تھے اور وہ اس کا تو کیا اپنی قسمت کا ستارہ بھی نہ دیکھ پایا تھا۔

اور اس نے ٹھنڈے ستون سے ہٹ کر شال اچھی طرح لپیٹ لی تھی۔ چہرہ پورا سرخ تھا۔ اور سردی میں مسلسل کھڑے رہنے کی وجہ سے موسم بدلنے سے پہلے والا زکام ظاہر ہو چکا تھا۔ چھینکیں خاموش اور ارتعاش پیدا کرنے لگیں۔

اسے مجبوراً ہی اندر جانا پڑا تھا اور آ کر رانی کے بستر میں گھس گئی۔

وہ نیند میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جس کا پتا ان کے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
[illegible]	شازیہ چوہدری	250/-
ہم سفر	فرحت اشتیاق	400/-
بن روئے آنسو	فرحت اشتیاق	250/-
[illegible]	فرحت اشتیاق	500/-
دل والیس	فرح بخاری	350/-
ہستی کا آہنگ	فرح بخاری	300/-
وہ پگلی سی دیوانی سی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
آرزو گھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان امید اور محبت	عمیرہ احمد	200/-
لا حاصل	عمیرہ احمد	180/-
امر بیل	عمیرہ احمد	400/-
اک دیا جلائے رکھنا	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
میری جنت	[illegible]	[illegible]
جنون	[illegible]	[illegible]
اے وقت گواہ رہنا	راحت جبیں	350/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	300/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی	400/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	400/-
پیا آنگن	نیم سحر قریشی	300/-
میرے خواب لوٹا دو	نگہت عبداللہ	400/-

ناول منگوانے کے لیے فی کتاب ڈاک خرچ -/30 روپے
منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37- اردو بازار کراچی۔
فون نمبر: 32216361

کرائے دے رہے تھے جو پوری طرح سے جاگ چکے تھے۔

سعدیہ کان لپیٹ کر دوسرے کمرے میں جا چکی تھی۔

اور وہ سوچتی رہی کہ وہی محمود کو نہ چاہ سکی اور نہ شاید وہ اسے۔ باوجود اس کے بھی وہ اس کی تعریف کر دیتا تھا باوجود اس کے بھی وہ اس کے ساتھ کھڑا رہتا تھا باوجود اس کے بھی وہ اس کے لیے چائے کا کپ لے آتی تھی۔ باوجود اس کے بھی وہ دونوں ایک دوسرے کو وشنگ کارڈ دے دیتے تھے۔

اور ابھی فون کی اسکرین چمکی تھی۔ سعدیہ نے بجائے سوئچ آف کرنے کے فون اس بیڈ کے سرہانے والی میز پر رکھ دیا تھا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔ محمود کا میسج تھا۔ وہ اس کا حال احوال پوچھ رہا تھا صرف حال احوال......

اس سے آگے...... حالانکہ وہ کسی مخصوص محبت کے دن کو منانے کے حق میں نہ تھی تب بھی لمحے کو لگا کہ محبت کو تو بس بہانے چاہیے ہوتے ہیں اظہار کی خوشی کے۔

تو یہ توقع کیوں ہوئی بھلا کیا میں بھی؟

وہ خود سے سوال کرنے کا حق رکھتی تھی

کیا وہ بھی؟ اس سے کیا جانے والا سوال بھی وہ خود سے کر رہی تھی۔

تو کیا محبت بھی؟

اور یہ تو ایسا سوال تھا کہ جس کا جواب ستاروں کے پاس بھی نہ تھا۔

تو پھر کس سے ...... حالانکہ ستارے تو پیار کرتے ہیں اس نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

فروری کی سردی کی جاتی ہوئی ٹھنڈ جیسی اور کئی سوال ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ لوگوں جیسے...... اور کئی باتیں غیر واضح تھیں۔ اور کوئی جملے ادھورے تھے ڈھکے چھپے ہوئے......

اور کئی باتیں بغیر مفہوم کے کی جاتی تھیں جن سے توقعات جڑے نہیں۔

تب بھی یہ کہہ نہ پاتی...... بس خواب دیکھنے پر دسترس تھی، اور رات ابھی بہت باقی تھی۔ زندگی جیسی

☆☆☆

وقت بھی اپنے پاس کچھ ماضی رکھتا ہے۔ یہ چڑھتا ہے۔ جب خوب صورت ہوتا ہے۔ کھیلتا ہے۔ اور جیت جاتا ہے۔ خوش خوش رہنے لگتا ہے۔

اور یہ سب تب ہوتا ہے۔ جب وقت محبت کرتا ہے۔ اتنی خوب صورت باتیں علینہ ہی کر سکتی تھی یہ تو وہ بھی جانتا تھا۔

وہ علینہ کا وہ تھا۔ اس کا نام عدیل بن عبدالعزیز تھا اور عدیل بن عبدالعزیز پچھلے سترہ سالوں سے اپنے باپ کے ساتھ سخت نفرت کرتا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے باپ کی قسمت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں رہی۔ اور یہ بھی کہ وہ صرف شکل صورت کے اعتبار سے اپنے باپ پر نہیں گیا بلکہ اس کی قسمت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ سوائے ایک خوب صورت ممتاز عد حقیقت کو چھوڑ کر کہ عبدالعزیز کو اپنی وہ محبت بھی نہیں ملی جو انہوں نے حاصل کرنا چاہی تھی اور وہ بھی نہ ملی ان کی قربت کے لیے کوشاں رہی۔

مگر اس کے پاس علینہ تھی۔ جو پہلے صرف اس کی وہ تھی پر اس رشتے کو نام دینے کے لیے اب ان کے پاس واضح اتھارٹی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ بیوی، جو اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ بیوی، جو اس کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ گئی تھی۔ بیوی جس لیبل کے لیے اس نے ماں باپ کی رنجش کا رسک لے لیا تھا۔ اور بیوی، جس کے ماں باپ نے نہ کبھی عدیل بن عبدالعزیز کو بطور داماد قبول کیا اور نہ ہی علینہ کو عبدالعزیز کی فیملی نے بطور بہو تسلیم کیا تھا۔

اسے پتا تھا اس معاشرے میں پسند کی شادی کو قبول کرنے کے لیے بھی ایک طرح کا ظرف چاہیے ہوتا ہے۔

درحقیقت تو کسی کو خوش دیکھ کر خوش رہنے کے لیے ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کہ قدرے کم

پایا جاتا ہے۔

اسے پتا تھا۔ ظرف کی قلت ہے۔ اسے پتا تھا روزگار کی قلت ہے۔ اسے پتا تھا سچائی کی بھی قلت ہے۔ اور اسے پتا تھا محبت کی بھی قلت ہے۔

باوجود اس کے بھی اس نے علینہ سے اس قدر محبت کی تھی۔ باوجود اس کے بھی علینہ نے اس سے محبت کی تھی اور اتنی تلخیوں اور پریشانیوں کے باوجود وہ پر امید تھی۔

اسے زندگی کی خوب صورتی کا ادراک تھا

اور وہ محبت بھری باتیں کر کے اپنے ماضی کو بھی یاد کر لیتی تھی۔

اور وہ کہتا تھا میں ماضی میں پلٹ کر نہیں دیکھتا۔ مجھے ماضی میں دیکھنے سے چڑ ہے۔ نفرت ہے۔ وہ جب بدک جاتی اس بات پر، اور کہنے لگتی۔

"تو پھر اپنی زندگی سے ماضی کا وہ حسین دن نکال دو جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ جب ہم نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

یا پھر جب ہمارے اندر محبت نے پہلی بار کسی کا نام لیا تھا اور وہ نام تمہارا تھا۔ عدیل۔ جو میرے دل نے لیا اور وہ نام میرا تھا، علینہ! جو تمہارے دل نے پکارا ہوگا۔"

اور وہ اتنی پریشانی میں رہ کر بھی ہمیشہ کی طرح مسکرا دیتا۔ وہ محبت ہی کیا جو مسکرانے پر مجبور نہ کر دے۔

چاہے خیالوں میں رکھے۔ چاہے خواب میں دکھائے، چاہے خواب جھوٹے ہو یا سچے۔ پر یہ اگر سچی ہو تو سب اچھا دکھنے، رہنے، ہونے لگتا ہے، تمام منظروں سے دھول چھٹنے لگتی ہے۔

دل کے اندر پھول کھلنے لگتے ہیں، تو پانی چڑھتا اور پھول ملتا ہے۔ محبت کا پودہ سفر کرتا ہے۔ اور انسانوں کو ان کے دکھ بھولنے لگتے ہیں

تبھی وہ اس کے بازو پر سر رکھ کر آنکھیں بند کیے ہوئے پوچھ رہا تھا کہ کیا وقت بھی محبت کرتا ہے علینہ؟"

"ہاں وقت بھی محبت کرتا ہے عدیل! اسے انسانوں نے محبت کرنا سکھائی ہے"

وہ اس کے بال سہلاتی ہے اپنے بائیں ہاتھ کی مدد سے......

"تو پھر وقت بہت اچھا ہوتا ہے علینہ"

"اس لیے تو کہتی ہوں اسے اچھی یادوں اور اچھے دنوں سے یاد کیا کرو۔" وہ دیر تک اس کے بکھرے بال سہلاتی ہے۔ اور وہ اپنے ماضی کے سارے وقتوں کی اچھی یادوں میں کھونے لگتا ہے۔ وہ جب علینہ زندگی میں آئی، اور اس سے پہلے جب دادی پیار کیا کرتی تھیں جب اس سے بھی پہلے کہ ماں زندہ تھی، اور وہ ان کی گود میں لیٹ جایا کرتا تھا، اور وہ بھی اس کے بال سہلاتی تھیں، اور تب بھی محبت کا احساس اسے سکون کی نیند سلاتا تھا۔ جو دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔

اور ایک صبح ہے جو کھڑکی سے روزانہ ان کے کمرے میں جھانکتی ہے۔ اور وقت کیلنڈر کے صفحات پر ایک نئے دن کی تاریخ رقم کرتا ہے۔ جہاں سے زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔

☆☆☆

رات کی سیاہی نے مکانوں کی چھتوں کو اندھا کر دیا تھا (اور کسی کو محبت نے) لوگوں نے سونے سے پہلے بتیاں بجھا دیں گھروں کی، کہیں کوئی کسی کھڑکی سے زیرو بلب کی روشنی گلاس ونڈو سے چھن کر دھندلی روشنی کا عکس پھینک رہی تھی۔ ایسی جس میں سائے نظر آئیں۔ وہ بھی کملائے ہوئے، کھڑکیوں سے نظر ہٹا کر، اپنی کھڑکی سے وہ جھانکنے لگی چاند کی ہلکی روشنی میں زندگی کے آثار مدھم تھے۔ (کہیں اس دل میں بھی کچھ ٹوٹنے کا بعد کا شور تھا)

اور ستارے آسمان کے دامن پر ننھی ننھی بتیوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔

اور اسے لگا کہ جل رہے ہیں ستارے جل رہے ہیں۔

آگ کی ننھی ننھی کرنوں کی صورت شعلے پھینک رہے ہیں روشنی کو آگ سے تشبیہ دے کر وہ مطمئن

PakiBooks.Site

تھا۔ درحقیقت تو بس دل جلا ہوا تھا۔ مگر پھر کیوں لگتا کہ ستارے بھی جلتے ہیں

ہاں اگر یہ محبت کرسکتے ہیں تو جل بھی سکتے ہیں

جو محبت کرتا ہے، وہ جل بھی سکتا ہے۔

ہاں وہ جلتا ہے، اس نے خود خیالی پر حامی بھری، خود اپنے آپ کو شاباشی دی۔

تو نینا ذوالفقار تم جل سکتی ہو، اس لیے کہ تم محبت کرتی ہو، مگر آخر یہ عبدالمنان کو کون سمجھائے...... اسے، جو روٹھا ہوا تھا

اور وہ جو اس کی ناراضی کا سوگ مناتے ہوئے، رو دھو کر بیٹھی تھی، انتظار میں، گھڑیاں گھر کی ساری ایک ہی وقت بجا رہی تھیں۔ یہ رات کے ڈھائی تھے اور وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ سارے لوگ سو چکے تھے۔ وہ بے چینی سے گھر میں ٹہل کر تھک گئی تو کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

تاروں کی چھین کر آتی ہوئی روشنی کے ساتھ ٹھنڈی یخ بستہ رات کی ہوا نے ایک قسم کا جھگڑا چلایا ہوا تھا۔ اس نے گلاس ونڈو کھڑک سے بند کی۔ اور فون اٹھالیا۔ اس کا فون ٹرائی کیا۔ وہ جو اس کا وہ تھا اور جس کا نام تھا عبدالمنان۔ جس نام کی بازگشت سننے کے اس کے کان عادی ہو چکے تھے۔

اور وہ...... وہ بھی کہ روئے جا رہی تھی۔ وہ جس کا نام نینا تھا۔ جس سے جس کا وہ روٹھ گیا تھا۔ جو اس کا شوہر بھی تھا۔

اس نے مسز شبیر کو فون کیا، اسے اندازہ تھا وہ جاگ رہی ہوں ہو گی تبھی انہوں نے دوسری بیل پر ہی فون ریسیو کرلیا تھا۔

''کیسی ہو نینا؟ مجھے پتا ہے تم جاگ رہی ہو، تمہارے کمرے کی بتی جل رہی ہے۔'' سامنے کی گلی کے نکڑ سے پہلے ان کا گھر آتا تھا۔ اور مسز شبیر دور سے اس کے کمرے سے چمکتی روشنی دکھ کر سمجھ جاتی تھیں۔

''آپ بھی تو جاگ رہی ہیں، پھر بتی کیوں بجھا کر رکھتی ہیں۔'' سوں سوں کرتی ناک کو ٹشو سے رگڑتے ہوئے وہ کچھ خفا خفا سے انداز میں بولی۔

''مجھے اندھیرا اچھا لگتا ہے نینا......!''

''یہ کب کی بات ہے مسز شبیر؟''

''بس قریب قریب کی ہے......''

''آپ میرے پاس آسکتی ہیں؟ اگر شبیر بھائی گھر پر نہ ہوں یا پھر وہ سو رہے ہوں......'' کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ اپنی پہلی بیوی کے پاس بھی ہو سکتے ہیں ہفتے میں دو تین دن وہ وہیں ہوتے تھے۔ تب اکثر وہ مسز شبیر عرف ثوبی سے مل کر ڈھیر ساری باتیں ہوتیں چائے کے ایک کپ پر، دنیا بھر کی باتیں۔

کبھی کبھار منان بھی اس گفتگو میں شامل ہو جایا کرتا تھا۔ وہ جب سے اس نئے محلے میں شفٹ ہوئی تھی کچھ زیادہ وقت نہ ہوا تھا یہی کوئی آٹھ نو ماہ۔

مگر اسے محسوس ہوتا مسز ثوبی کے ساتھ اس کی بڑی پرانی واقفیت ہے اب بھی وہ اس کے ایک دفعہ کہنے پر آ گئی تھیں۔ بیل بجنے پر اس نے فون رکھا اور دروازہ کھولنے کے لیے باہر نکلی۔

دروازہ کھولتے ہی مسز شبیر نے اسے ایک نظر دیکھ کر اس کا گال تھپکا تھا۔ عمر میں تیرہ سال بڑی تھیں۔ دکھتی کوئی پچاس کی تھیں۔ اپنی عمر سے ٹھیک سات آٹھ سال بڑی دکھتی تھیں۔ اور چہرے ملائمت اور لہجے کی شفقت تائید کرتی تھی اس نے بھی یقین کرلیا تھا ان کے بڑے ہونے کا سمجھ دار ہونے کا دوست ہونے کا، اس سے زیادہ وہ انہیں سمجھنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔

نینا ذوالفقار کا بس ایک مسئلہ تھا کہ لوگ اسے کیوں نہیں سمجھتے۔ کون کون اسے چاہتا ہے کس نے اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ کون اس کے ساتھ وفادار ہے۔ کیا دیا، کیا دے سکتا ہے وغیرہ۔

''منان کدھر ہے؟'' وہ اس کے ساتھ اندر آ گئیں۔

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔'' لہجہ خفا ہی تھا۔

''فون کرو اسے''

''کئی بار کیا...... نمبر بند ہے اس کا......''

اس کے کسی دوست کے پاس؟''

''انجم بھائی ہیں، ان سے پوچھ لیا ہے۔ وہ تو خود شہر سے باہر ہیں۔''

''اس کے علاوہ اس کا کوئی دوست نہیں ہے؟''

''مجھے نہیں بتایا اس نے......''

''تم ذرا بھی اپنے شوہر کی راز دار نہیں ہو......'' انہیں شکوہ تھا۔'' وہ بات کرتے ہوئے اس کے کچن تک آ گئیں بہت دفعہ وہ آ کر خود اپنے اور اس کے لیے چائے بنا لیا کرتی تھیں فریج میں، دودھ نہیں تھا۔

''تم نے آج شام کی چائے نہیں پی؟''

''مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔''

''میں اپنے گھر سے چائے بنا کر لاتی ہوں؟''

''نہیں پلیز...... آپ یہاں بیٹھ کر میری بات سنیں۔''

''اچھا سناؤ......'' وہ ہنس پڑیں۔

''ویسے شروع کرنے سے پہلے یہ ضرور بتانا کہ شادی کے سوا سال میں یہ تم دونوں کا کون سا جھگڑا ہے۔''

''کم از کم مسز شبیر آپ تو مجھے سمجھتی ہیں نا۔'' وہ جھنجلائی۔ مسز شبیر سر ہلا کر رہ گئیں۔ قہوے کے لیے پانی چڑھایا۔ ''مگر وہ مجھے ابھی تک نہیں سمجھتا۔''

''وہ تمہیں چاہتا ہے، یہ سب سے ضروری ہوتا ہے، نینا، شبیر بھی بہت ساری باتوں میں مجھے نہیں سمجھتے، مگر میں نہیں سمجھتی کہ اس پر لڑا جا سکتا ہے۔''

''مگر آپ کو دکھ تو ہوتا ہو گا نا۔''

''ہاں پہلے بہت ہوتا تھا۔ اب نہیں ہوتا، اب عادت ہو گئی ہے۔ تم بھی عادت ڈال لو تو دکھ نہیں ہو گا۔''

''میں کیوں عادت ڈالوں...... وہ بھی تو ڈالے نہ۔ کچھ تو وہ بھی کرے؟''

''کچھ تو...... مجھے تو لگتا ہے اس نے تمہارے لیے بہت کچھ کیا ہے نینا!''

''مثلاً......'' وہ یہ بات ان سے پوچھ رہی تھی۔ منان ہوتا تو ڈوب مرتا اس بات پر۔

''مثلاً...... اپنے پیرنٹس کو بھی چھوڑ دیا۔''

''یہ تو میں نے بھی کیا ہے اس کے لیے۔''

''لڑکیاں تو کرتی ہیں، وہ رخصت ہو کر آتی ہیں۔''

''لڑکوں کو بھی کرنا چاہیے۔'' نینا کی ایک ہی رٹ تھی۔

''چلو کر تو دیا نا۔ اب خوش ہو جاؤ۔''

''کر دیا ہے، مگر......''

''مگر کیا...... کیا تم یہ کہہ سکتی ہو کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔''

''کرتا ہے، مگر......''

''محبت کے بعد، مگر نہیں آنا چاہیے نینا! اگر محبت کے بعد مگر آتا ہے تو وہ سارے اگر کھا جاتا ہے، کوئی گنجائش نہیں رہتی پھر......'' وہ خوف زدہ تھیں۔

''محبت...... ادھوری محبت مسز ثوبی۔ جہاں نہ رازداری ہو، نہ بھروسا ہو، نہ دوستی ہو تو ایسی محبت کا کیا کرنا۔''

''تمہیں اس سے کیا چاہیے نینا۔ سرفہرست بتاؤ۔'' وہ دونوں بیڈ روم میں آ گئیں اور اسی کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئیں۔ مسز ثوبی بند کھڑکی کے شیشے سے نظر آتے اندھیرے میں اکا دکا روشنی کے ذرات کو محسوس کر رہی تھیں، جن میں بھی ان کا دھندلا عکس تک دکھنے لگتا تھا۔

''مجھے وہ چاہیے، پورے کا پورا، اپنے دل و دماغ سوچوں سمیت۔''

''محبت کی یہ بڑی عجیب شرط ہے نینا! اور ذرا بھی اچھی نہیں ہے۔''

''کیوں اچھی نہیں ہے، جب میں اس کی ہوں، میرا دل اس کا ہے، میری سوچوں میں بھی وہ ہے، میری ہر بات اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی ہے، تو اس کی کیوں نہیں آخر...... اس کی کیوں نہیں ہوتی۔ مجھے لگتا ہے وہ ذہنی طور پر مجھ سے دور زندگی گزارتا ہے۔''

''نینا دل کے معاملات میں فوری حکومت نہیں ملتی ہے۔ بڑا لمبا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ پرچی کٹوانی پڑتی ہے، لائن میں لگنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے آپ کے پاس وہ خصوصیات ہوں۔ جس سے محبوب آپ کو خود منتخب کرے۔ لائن میں سے چن لے، باری آنے سے پہلے

چن لیے یا پھر باری آنے پر پہچان لے، اس کے بعد جو آپ کی حیثیت ہوگی، وہ ایک دنیا دیکھے گی۔ مگر حیثیت تو دور کی بات ہے، تم ڈائریکٹ حکومت چاہتی ہو۔ حکومت بہت بری شے ہے۔ پورے دل کے خطے پر حکومت اچھی نہیں ہوتی۔"

"کیوں نہیں اچھی...... جب میرا دل اس کا ہے تو اس کا پورے کا پورا میرا کیوں نہیں ہے۔"

"نینا...... نینا...... تم بچی ہو بالکل...... اسے کچھ تو وقت دو یار۔"

"وقت کتنا دوں مسز شبیر...... آخر کتنا۔ سولہ ماہ اٹھارہ دن، کتنے لمحے ہوگئے اس میں، میں نے تو اسے بچپن سے چاہا ہے، تب سے، جب سے مجھے محبت کا شعور بھی نہ تھا۔ آپ کو پتا تو ہے مسز شبیر......" وہ رو پڑی تھی کہتے ہوئے۔

"تب سے میں اس کی عادی تھی، جب عمروں میں سمجھ ہی نہ تھی، ہم ایک کالونی میں رہتے تھے۔ وہ میری سگی پھپھو کا بیٹا ہے، ہم ساتھ پلے بڑھے ہیں، میں اس کے ساتھ کھیلی ہوں، بچپن میں کوئی مجھے مارتا، وہ دوڑا جاتا، اس سے بدلہ لے آتا۔ اس کی موجودگی میں مجھے کوئی ڈر نہ تھا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا، بارہ تیرہ سال تک ہم ایک اسکول میں رہے۔ پھر اسکول تبدیل ہوا، تب بھی چھٹی کے بعد وہ روزانہ آتا تھا، اپنی پاکٹ منی سے میرے لیے کیا کچھ نہ لاتا، میٹرک تک وہ میرا دوست تھا، بہت گہرا دوست، جس سے ہر اک بات کہی جاسکتی ہے۔ پوچھی جاسکتی ہے، میرے ذہن میں ہر آنے والا سوال اسی سے جواب مانگتا تھا۔

کالج لائف میں مجھے پتا چلا کہ ممی میری منگنی اپنے بھانجے ندیم کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں، جب کہ میری بچپن سے منان کے ساتھ نسبت طے ہے۔ یہ ایک انوکھا سا احساس تھا۔ میری دادی، باپ، چاچو، پھپھو سب ممی کے خلاف کھڑے ہوگئے تھے، میری اور منان کی منگنی کی پکی رسم ہوگئی، تب سے مجھے پتا چلا کہ میں نے ساری زندگی اسی کے ساتھ گزارنی ہے۔ میں کسی اور کو چنتی تو چن سکتی تھی، مگر میں ایسا کیوں کرتی، میں نے ایسا نہیں کیا، میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ یہ تعلق کس قدر پرانا ہے۔"

"گویا تم لوگ بہت آسانی سے ایک ہوگئے تھے۔"

"نہیں مسز شبیر...... میری پھپھو نے گھر میں حصہ مانگا اور اس کے بعد اچانک اختلافات پڑ گئے تھے۔ ممی تو خلاف تھیں ہی، بابا کے دل میں بال آگیا تھا۔"

"حالانکہ تمہاری پھپھو نے اپنا حق ہی تو مانگا تھا نینا۔"

"جی بالکل...... میں بھی یہی چاہتی تھی کہ ان کو ان کا حق ملے۔ بابا نے آبائی گھر بیچ کر ان کو حصہ تو دے دیا، مگر ان کے دلوں میں جو بٹوارہ آیا اسے نہیں، گھر بدلا ہمارا، کالونی بدلی، ہمارے حالات کچھ خراب ہوئے، ابا کے دل سے پھپھو اتر گئیں۔ یہ تب کی بات تھی، جب سیکنڈ ایر کلیئر کر کے منان اچھی سی یونی ورسٹی ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کا داخلہ دوسرے شہر ہوگیا، وہ ہوسٹل چلا گیا، ہمارے گھرانوں کے حالات بدلے، نفرتیں بڑھ گئیں۔ پھپھو گھر آکر برا بھلا کہہ گئیں۔ ابا نے بہن کو لالچی کہہ کر منگنی کی انگوٹھی لوٹا دی۔ سارے رشتے ختم ہوگئے جیسے۔ آنا جانا، بات چیت سب بند تھا۔ بس ایک منان تھا جس نے مجھے یہ حوصلہ دیا تھا کہ سب بہتر ہوجائے گا۔

ان چار سالوں میں میرے رشتے آتے رہے اور میں منع کرتی رہی، اپنے گھر والوں کے آگے میں اکیلی ڈٹی ہوئی تھی۔ یہ چار سال میں نے کیسے کاٹے، مجھے پتا ہے۔ وہ گریجویشن کے بعد باہر چلا گیا اور میں انتظار ہی کرتی رہی۔ میری نمازوں کی دعائیں، گھر والوں سے مقابلہ، ہر جگہ وہ تھا، ہر ہفتہ میں اس کی کال کے انتظار میں گزارتی تھی۔ میں نے ایک زندگی اسے دی ہوئی ہے اور آپ کہتی ہیں حکومت نہیں۔ حکومت کیوں نہیں، جب مجھ پر اس کی حکومت ہو تو اس پر میری کیوں نہیں، بتائیں کیوں

نہیں۔ اگر محبت ڈزرو کرتی ہو تو حکومت کیوں نہیں۔" وہ کہتے ہوئے رو رہی تھی۔ انہوں نے ساتھ لپٹا لیا۔

"میں اس سے بات کروں گی نینا...... اس سے بات کروں گی، تم فکر مت کرو، میں اس سے ضرور بات کروں گی۔"

"وہ نہیں سمجھے گا مسز شبیر، وہ سمجھتا ہی نہیں ہے، وہ مجھے نہیں سمجھتا، شاید سمجھا تھا اور نہ شاید سمجھ سکے گا۔ قدر نہیں ہے اسے میری محبت کی۔" قدر کی بات پر وہ بھی چپ ہوگئی تھیں۔

"وہ قدر کرے گا نینا، اسے قدر تو کرنی پڑے گی۔"

☆☆☆

یہ علاقہ شہر کے شور سے کچھ دور آباد ہوا تھا۔ فصلوں اور کھیتوں کو کاٹ کر رستہ بنایا گیا تھا، آس پاس سبزہ تھا، نزدیک کھیت تھے۔ پارک تھا، درخت تھے اور نئی کالونی بنائی گئی تھی۔ یہاں بیس پچیس گھر بن چکے تھے۔ کچھ ان میں بنگلو، کچھ کاٹیج تھے، باقی تعمیرات کا کام چل رہا تھا۔

منان کو رہنے کے لیے یہ علاقہ بہت پسند آیا تھا، قدرے سستا بھی تھا، قوی امکان تھا کہ اگلے چار، پانچ سالوں میں یہ علاقہ شہر سے پوری طرح جڑ جائے گا۔ بجلی کا بہت زیادہ مسئلہ گھٹے گا، گیس کا بحران بھی کم ہوگا۔ وہ بھی زندگی سمیت علاقے کی ترقی کے لیے انتظار کی اسی لائن میں کھڑا تھا۔ بس ایک علاقائی سکون تھا۔ گرمی میں ہوائیں اور سردی میں دھوپ سینکنے کا مزا تھا۔

وہ فون لے کر درخت کی چھاؤں میں بینچ پر بیٹھا ہوا اسکرین زوم کر کے پرانے ٹیکسٹ پڑھ رہا تھا، جب مسز شبیر سبزی کی ٹوکری ہاتھ میں لیے سامنے سے جاتی ہوئی دکھائی دیں اور اسے دیکھ کر رک گئیں۔ وہ سر کے اشارے سے سلام کرتا ہوا اٹھا، جب تک وہ بھی نزدیک آچکی تھیں۔

"کیسے ہو؟" ان کے لہجے کی بے تکلفی اور اپنائیت اسے بھلی لگی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں...... آپ کیسی ہیں؟"

"جیسی نظر آرہی ہوں۔" وہ کندھے ہلا کر مسکرائیں۔

"ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت اور دل نشین۔"

"اتنی تعریف اپنی بیوی کی بھی کردیا کرو۔" وہ مسکرائیں۔

"اسے تعریف کی ضرورت نہیں، اتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے وہ خوش نہیں ہوتی۔"

"وہ تمہارے ہونے سے خوش ہوتی ہے منان!"

"مجھے معلوم ہے اس نے بڑے دکھڑے سنائے ہوں گے آپ کو۔"

"کہیں بیٹھ کر بات کرلیں؟" وہ مسکرا نہ سکیں۔

"آپ غالباً سبزی لینے جارہی ہیں۔"

"ہاں...... کیوں کہ کل سے سبزی والا اس طرف نہیں آیا، سوچ رہی ہوں مارکیٹ سے لے آؤں۔"

"شبیر بھائی نہیں آئے، کتنے دن ہوئے۔"

"دوسرا ہفتہ ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ انہیں معلوم ہوگا۔" وہ لاپروائی ظاہر کررہی تھیں، مگر تھیں نہیں۔

"آپ نے فون نہیں کیا انہیں۔"

"ضرورت نہیں محسوس کی۔ چلو بیٹھتے ہیں کچھ دیر۔"

"ضرورت کیسے نہیں محسوس ہوئی۔" وہ فکر مند سا ہوگیا تھا۔ اس علاقے میں جب سے آیا تھا ان دونوں میاں، بیوی نے طرح طرح سے ان کی مدد کی تھی۔

شبیر اسے بھائیوں جیسا پروٹوکول دیتے تھے، کیوں کہ کسی زمانے میں منان کے والد نے شبیر کو بہت سہارا دیا تھا۔ وہ تب سے ان فیملی کے مقروض تھے۔ پھر جب منان سے عرصے بعد ملاقات ہوئی

PakBooks.Site

اور اسے پریشان دیکھا تو، گھر ڈھونڈنے اور ادائیگی کرنے کے ساتھ چھوٹی بڑی چیزوں کی پیش رفعت میں وہ آگے آگے تھے۔ منان کو پتا تھا کہ اگر وہ ساتھ نہ دیتے تو وہ اتنی آسانی سے نینا کو لے کر ایک الگ گھر میں نہیں بس سکتا تھا۔

"تم کہاں تھے منان۔"

"امی کی طبیعت بہت خراب تھی، وہاں تھا۔"

"نینا سے بات تو کر لیتے تم۔ بہت فکر مند تھی وہ۔"

"نہیں، آپ نہیں جانتیں، اگر اسے پتا لگتا تو وہ کتنا ہنگامہ کرتی، میرے وہاں ہونے پر۔"

"یہ سوچا کہ وہ اکیلی یہ دو تین دن کیسے گزارے گی۔"

"آپ بھی تو اکیلی رہتی ہیں۔ وہ ان کے برابر آکر بینچ پر بیٹھ گیا تھا۔ "ہاں...... وہ آپ جیسا ظرف لا ہی نہیں سکتی۔"

"رہنے دو...... اور میں اس جیسی محبت نہیں لا سکتی۔"

"رہنے دیں...... محبت ایسی نہیں ہوتی۔"

"اچھا...... میرے ایک دو سوالوں کا جواب دو۔"

"پوچھیے۔"

جب تم دونوں کے خاندانوں کے درمیان ناچاقی تھی، منگنی ٹوٹ چکی تھی، تم باہر جا چکے تھے، اس کے لیے رشتے آ رہے تھے۔ تب ایسی کیا چیز تھی، جو تم دونوں کو اپنی اپنی جگہ کھڑا کر رہی تھی۔ کیا تمہیں احساس نہیں کہ عورت ہو کر وہ لڑی ہے تمہارے لیے، اپنے لیے۔"

"قدر کرتا ہوں اس کی۔ میری ماں اس کی پھپھو ہے، میں نے اسے بہت سمجھایا، دیکھو ان کی سن لو، نظر انداز کر دے، بالآخر وہ نرم ہوں گی۔ ایک تو ہمارے گھروں کا دستور نرالا تھا۔ لوگ اصولوں اور روایتوں کے پیچھے اٹل ہوتے ہیں۔ بچپن کی منگنی حرف آخر بھی جاتی ہے۔ یہاں الٹ تھا، ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر دونوں خاندان الگ کھڑے تھے۔"

"تم نے شادی کے لیے کیسے منایا ان کو منان۔"

"بہت مشکل سے میں باہر گیا تھا، پڑھ رہا تھا مزید اور کام بھی ڈھونڈ رہا تھا۔ عنقریب مجھے یقین تھا کہ کچھ بنا کر یا بچا کر لوٹوں گا تو معاملات اور آسان ہوں گے۔ ہر ہفتے اسے تسلی دیتا تھا، سمجھاتا تھا کہ بہتر ہو جائے گا سب، مگر وہ میری ایک سننے کو تیار نہ تھی۔ ضد اور رٹ۔ کسی ستارہ شناس کو ہاتھ دکھا آئی اور کہنے لگی۔ ہمارے ستارے نہیں ملتے۔ اب اسی سے ایک طرح کی بے ایمانی ہو گئی۔ میں تو اسے روکتا تھا، ایسی باتوں سے، محبت میں ایک طرح کا یقین ہونا چاہیے کہ آپ سچے ہیں، پھر کوئی طاقت دنیا کی آپ کو نہیں ہلاتی۔ اس کے اندر شروع سے یہ کمی تھی۔ بالآخر میں کام چھوڑ چھاڑ کر آ گیا، گھر والوں کو زبردستی راضی کیا تھا، وہ خائف تھے۔

ادھر نینا کی ٹیلی اٹل تھی، بڑے برے حالات میں یہ شادی ہوئی، اس ساری صورت حال کو دیکھ کر نینا کو اندازہ تو ہونا چاہیے تھا کہ دشواریاں ہوں گی۔ مگر نہیں...... بچپنا تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ چلیے اپنے گھر والوں سے لڑتی رہی، پھر میرے گھر والوں سے لڑنے لگی۔ اب اسے کون سمجھائے کہ محبت صرف لڑ کر ہی نہیں جیتی جا سکتی، بلکہ تحمل اور صبر بھی کوئی چیز ہے۔"

"دیکھو میں تو جہاں تک سمجھی ہوں منان کہ وہ بس تمہیں شیئر نہیں کر سکتی، کسی کے ساتھ بھی نہیں، پھر چاہے فیملی کیوں نہ ہو۔"

"وہ بہت بے صبری ہے۔ بہت بے یقین زندگی کو اپنی چابی سے چلانے والی...... حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔"

"زندگی میں ہر رشتہ اپنے وقت پر اپنا کردار ادا کرتا ہے اور اہمیت رکھتا ہے۔ اسے سمجھنا ہوگا، مگر اسے وقت دو منان۔ اس کی لڑائی کا جواب لڑائی سے مت دو۔ اس کی خفگی پر اسے مناؤ۔"

"یہ ہی سب کیا ہے بچپن سے اور اب تک اور اس نے سوائے محبت کے مجھے کچھ نہیں دیا۔ محبت بھی جو ادھوری، آسرے سے خالی، ہمدردی سے خالی، بھروسے سے خالی، خوشی سے خالی۔" وہ منان کی باتوں کے اندر کا دکھ سمجھ رہی تھیں۔

"آپ یہ اسے بھی سمجھائیں کہ رشتے کو بچانے میں میرا ساتھ دے۔" وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو ایک بار اسے عقل آ گئی تو سب مسائل حل ہو جائیں گے۔" وہ مسکرا بھی نہ سکا، بس سر ہلا دیا اور دھوپ میں چمکتی گھاس کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

"وہ تھکی ہوئی شکل والا شوہر ہے تمہارا؟" وہ سوپر مارکیٹ کے سب سے بڑے مال میں کھڑی اس سے پوچھ رہی تھی۔ علینہ نے مال کے فرسٹ فلور پر دو جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ ادھر ادھر دیکھتے حواس باختگی لیے دائیں سے بائیں طرف جاتے ہوئے عدیل کو سیکنڈ فلور پر کھڑے ہو کر ریلنگ سے جھانک کر دیکھا تھا۔

"ہاں...... عدیل شاید مجھے لینے کے لیے آ رہا ہے۔ مگر آج بھی اسے سیکنڈ فلور پر میرا کیبن بھول گیا ہے۔ وہ رستے بھول جاتا ہے۔" علینہ نے قدرے افسوس اور ہمدردی سے کہا تھا، روزی کی بات کے جواب میں......

"یہ خود کیا کرتا ہے۔"

"ہوا خوری کرتا ہے۔ علینہ کے لبوں پر تھکی ہوئی مسکراہٹ آئی۔

"اسے بتاؤ کہ رزق بہت مشکل سے آتا ہے اور تم کتنی محنت کرتی ہو یہاں پر......"

"یہاں پر تو ہر کوئی محنت کرتا ہے روزی" یہ کہتے ہوئے علینہ کا لہجہ چور چور تھا تھکن سے۔

"یہ شادی تمہیں بہت مہنگی پڑ گئی ہے علینہ۔ عموماً مرد تھکتے ہیں، وہ کام تم سے لیتا ہے اور تھک خود جاتا ہے۔" روزی اسے کوئی دوسری بار دیکھ رہی تھی، مگر حالات کا اندازہ اسے بخوبی ہو گیا تھا، دوسری نظر میں نظر آنے والا عدیل پہلی ملاقات جیسا ہی تھا۔ کھویا ہوا، سوچوں میں جکڑا، تھکا ہوا، حواس باختہ، بائیں سے پھر دائیں آیا اور اوپر سیڑھیوں پر چڑھنے لگا، جب علینہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے متوجہ کیا۔ کوئی دوسری، تیسری بار ہاتھ ہلانے پر، عدیل نے دیکھا تھا اور اس طرف آ گیا تھا۔ روزی کو سلام کر کے وہ علینہ کی طرف مڑا۔ "چلیں۔"

"میرے آف ہونے میں ابھی پندرہ منٹ ہیں، تم کہیں بیٹھ جاؤ۔"

"او کے۔" وہ کہہ کر نیچے بنے فوڈ کورٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"اس نے ابھی تک دیا کیا ہے تمہیں علینہ؟"

"ڈھیر ساری محبت۔"

"بس محبت، مجھے پتا ہے ڈھیر ساری تم نے اسے دی ہو گی۔ وہ بس چھوٹے موٹے بہلاووں سے کام چلا لیتا ہو گا۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔" وہ روزی کے ساتھ نیچے شاپ کے گودام میں جا رہی تھی۔ شاپ آنر نے گودام سے نیا مال لینے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے بعد اسے دوبارہ اپنا اکاؤنٹ والا کیبن سنبھالنا تھا اور ٹھیک پندرہ منٹ بعد اس کی اور روزی کی جگہ دوسری ورکرز نے ایوننگ آورز کی لے لینی تھی۔

اس نے چند دن کے ایف سی میں کام کیا، کچھ روز آئس کریم پارلر پر بیٹھ گئی، بات نہ بنی تو اس مال میں روزی کے توسط سے کچھ مہینوں کے کنٹریکٹ پر کام مل گیا تھا اور اس دوران عدیل صرف سی وی لے کر گھومتا رہا تھا، اس دفتر سے اس دفتر، نتیجتاً کسی سے منہ ماری، کسی سے بدتمیزی، کسی سے بدکلامی کر کے فائل بغل میں دبائے ہوئے شام میں خالی لوٹ آتا اور کچھ روز سے اس نے یہ والا پروگرام بھی کینسل کیا ہوا تھا۔ گھر بیٹھ کر دن میں کڑھتا، رات میں تارے گنتا، بلاوجہ کا سر درد، تھکان اور نزلہ ساتھ میں لیے

لیے پھرنے پر بھی وہ خوش نہیں تھا، چہرے پر المنا کیوں جیسی داستانیں تھیں۔

علینہ روزی کے ساتھ گودام سے مال نکلوا کر اسٹور میں لائی، سیٹ کروایا۔ اکاؤنٹ کے کیبن میں دوسری لڑکی آگئی تھی۔ آدھے گھنٹے کے دورانیے کے بعد وہ فوڈ کورٹ میں آگئی۔ جہاں عدیل بیٹھ کر انتظار کررہا تھا۔ روزی بھی ساتھ تھی، مگر اس نے اپنے لیے نزدیکی ٹیبل دیکھ لی اور علینہ، عدیل کی طرف آگئی۔

"کچھ کھائیں؟" وہ سامنے لگے کھانے کے کچھ اسٹالز اور کیبن کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

"تمہارا باس پندرہ منٹ زیادہ لے لے گا، مگر پندرہ منٹ پہلے نہیں، کبھی چھوڑ سکتا۔" لہجہ کاٹ دار تھا۔ وہ اسے افسوس سے دیکھنے لگی۔

"ہماری مجبوری ہے کام کرنا، اس لیے چھوٹی موٹی چیزوں کو نظر انداز کرنا ہی سمجھ داری ہوگی۔ میں کچھ لے آئی ہوں۔"

"رہنے دو...... روز، روز تمہارے پیسوں کا کھا کر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔"

"عدیل یہ ہم میں میرا اور تمہارا کب سے آگیا؟ پھر اگر تمہارے پیسے ہوتے تو کیا میں اس طرح کہتی؟ نہیں کہتی، تمہارے پاس یہ سہولت نہیں ہے، اس لیے کہ تمہاری روزی روٹی میرے ذمے ہے، تا کہ میری تمہارے تو پھر ٹھیک ہے، محنت کرو، کام کرو، پھر دیکھیں گے۔"

"کام ملے تو کروں نا علینہ!" وہی بے بسی۔

"دیکھو دنیا میں کام ختم نہیں ہوگئے عدیل، پروفیشن کے حساب سے نہ سہی، کچھ بھی، فی الحال تو کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔ مجھے دیکھو ٹیکسٹائل میں پڑھنے کے باوجود میں ایک چھوٹے سے کیبن میں بطور اکاؤنٹنٹ اور شاپ کیپر کام کررہی ہوں۔"

"تو تم چاہتی ہو میں بھی شاپ کیپر لگ جاؤں۔"

"میں نے یہ کب کہا...... اگر ہو بھی تو بڑی بات نہیں ہے، مگر......"

"یہ چار دن کی دو ٹکے کی نوکری کیا دے گی ہمیں۔"

"کوئی بھی کام دو ٹکے کا نہیں ہوتا عدیل اور اگر ہے بھی تو دو ٹکے بھی محنت سے آتے ہیں۔"

"مجھے اپنا محنت نامہ مت پڑھاؤ ابھی پلیز......" وہ بے زار تھا ناحق۔

"اچھا نہیں پڑھاتی، تم رکو، میں کچھ لاتی ہوں۔ یہ بتاؤ بروسٹ لاؤں، یا کچھ اور......"

"زہر لاؤ۔"

"معلوم کرتی ہوں، مل گیا تو دونوں لے لیں گے، ایک بار میں قصہ ختم ہو جائے گا۔"

"اچھا ہے۔" وہ تلخی سے اٹھا اور وہ کچھ لیے بغیر اس کے پیچھے ہولی۔

روزی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، آج پھر تم بھوکی سو جاؤ گی۔ اسے علینہ کی فکر تھی۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو صبح کی باسی دال تھی، رات والی سوکھی روٹی کو پانی چھڑک کر گرم کیا اور لے آئی۔ عدیل نے محض دو نوالے لے کر ہی ہٹا دیا۔ اور اس سے بھی کھایا نہیں جا رہا تھا۔ اس کا دل کررہا تھا رو دے، ایک تو پتلی مسور کی دال، پھر عدیل کا موڈ، آخر کس دیوار سے سر پھوڑے وہ۔ برتن اٹھا کر کچن کی طرف لے جانے لگی، جب دروازے پر بیل ہوئی، اور عدیل ایک لفافہ لیتے ہوئے آیا۔

"یہ ڈلیوری تم نے منگائی تھی؟"

"نہیں تو......" وہ لفافہ لے کر دیکھنے لگی۔ دو بروسٹ کے بڑے پیس چٹنی کا پیکٹ، چار کباب اور پراٹھے تھے۔ "یہ روزی نے آرڈر کیا ہوگا۔"

"اسے بھی بتا دیا ہے تم نے میرے بارے میں......" کہتی ہوگی نکما ہے، کچھ نہیں لاتا، نہ کھلاتا۔"

"نہیں عدیل کیا ہوگیا ہے، اس نے ہمیں بغیر کچھ کھائے اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔"

"تم کب تک ایسا کرو گی میرے ساتھ علینہ!"

"میں نے کچھ نہیں کیا عدیل، معمولی سی بات کو مت بگاڑو۔"

"میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا علینہ!"

"تمہارا ضمیر گیا بھاڑ میں، مجھے بھوک لگی ہے، میں کھا رہی ہوں، تم جانو تمہارا ضمیر جانے، وہ اگر تمہیں کچھ پکا کر دے تو کھا لینا تم بھی۔" وہ یہ کہہ کر ٹرے میں کھانا نکالنے لگی۔

"تم اسے یہ پیسے دے دینا۔" اس نے جیب سے چند سو روپے نکال کر علینہ کے سامنے میز پر رکھے تھے۔ وہ نوالہ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے رکی۔

"میں اتنی کم ظرف نہیں ہوں، کسی کی محبت کا اس طرح جواب نہیں دیتے۔"

"یہ محبت نہیں ہے علینہ، یہ ہمدردی ہے۔"

"اسے ہم انسانیت بھی کہہ سکتے ہیں عدیل۔" وہ بے بس تھی۔ "تم کیا چاہتے ہو کہ میں یہ دو نوالے بھی خود پر حرام کرلوں۔"

"نہیں تم رج کر کھاؤ، میں سوکھی روٹی چبا لوں گا۔" وہ کرسی پر بیٹھ کر روٹی کے نوالے توڑ کر کھانے لگا اور علینہ نے سر جھٹک کر پیس اٹھا لیا۔ مگر اسے سوکھی روٹی کھاتا دیکھ کر رک گئی یاد آیا کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ دینے کا ہر حال میں وعدہ کرچکی تھی۔ خود بھی اٹھا کر سوکھی روٹی کھانے لگی۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر ہنس دیا۔ کباب کا پیس اٹھا کر اس کا نوالہ بنا کر علینہ کو کھلایا۔

"میں تمہیں اس گھر میں سوکھی روٹیاں کھلانے کے لیے نہیں لایا۔"

"تم مجھے یہاں صرف جھڑکیاں کھلانے کے لیے لائے ہو۔ لڑنے کے لیے لائے ہو، موڈ آف رکھنے کے لیے۔"

"بس کرو اب، کھانا کھالو۔"

"تم بھی کھاؤ نا۔"

"تم کھلاؤ گی تو کھاؤں گا۔"

"تم بچے نہیں ہو۔ خود کھاؤ، ساری خدمتیں میں ہی کروں۔" کہتے ہوئے ہنس دی، ہنستے ہوئے نوالہ اٹکا تو وہ پانی کا گلاس لے آیا اور اپنے لیے ایک پیس نکال کر کھانے لگا۔

"ویسے تمہاری دوست بہت اچھی ہے۔ مجھے خوشی ملے گی تو خوش رہوں گا، فکر مت کرو۔"

"میں کیا کسی خوشی سے کم ہوں۔"

"تم ہو تب ہی تو زندہ ہوں، تمہارے لیے۔" وہ مسکرایا اور اس کو نوالے بنا کر کھلانے لگا تھا۔

"ہم دونوں ساتھ ہیں۔ اور ہمیشہ رہیں گے، سری یہ کہتے ہوئے بھی عدیل کے لہجے میں کچھ خدشات سے تھے، جیسے وہ بھی جانتا تھا۔ اور پاس کھڑی علینہ بھی جو اس کی وہ تھی۔

☆☆☆

"نیا رشتوں کو اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنی بے اعتباری میں زندگی کیسے گزرے گی بھلا، وہ اس سے خائف تھیں۔ "میں ابھی تک تو یہ ہی سمجھی ہوں کہ جس بات کا کوئی سرا نہیں ہے، تم اس کی وجہ سے خود بھی پریشان ہو اور اسے بھی کررہی ہو۔" "جو بات ذہن میں چل رہی ہوتی ہے مسز شبیر اس کا کہیں نہ۔

کہیں کوئی سرا ضرور ہوتا ہے۔" یہ اس کا ماننا تھا۔

"وہم اور وسوسے کا کوئی سرا نہیں ہوتا، یہ بغیر منہ سر کے ہوتے ہیں، ان کو اہمیت نہیں دینی چاہیے۔"

"یہ وہم نہیں ہے، اس کے پیرنٹس اب بھی اسے قائل کررہے ہیں کہ وہ مجھے ساتھ رکھے یا پھر نہیں، آپ ان کا عناد دیکھیں، وہ عورت میری سگی پھپھو ہے اور آپ اس عورت کا حسد دیکھیں۔"

"دیکھو بیٹا! تم نے ان کا اکلوتا بیٹا چھینا ہے ان سے۔ وہ برہم تو ہوں گے ہی۔"

"آپ بھی سمجھتی ہیں، میں نے منان کو ان سے چھینا ہے۔"

PakiBooks.Site

"میں سمجھوں یا نہ سمجھوں، وہ تو یہ ہی سمجھتے ہیں نا اب ایک طرف وہ ہیں، دوسری جانب تم ہو۔ تمہیں چاہیے کہ اپنا پلڑا بھاری کرو۔ اور وہ صلہ رحمی سے ہوگا۔ وہ رعایت سے ہوگا۔ وہ سہولت سے ہوگا۔ اسے یہ سوچنے پر مجبور مت کرو کہ وہ شادی کر کے پچھتا رہا ہے۔ اس کی زندگی کو آسان کرنے کے لیے اس کا ساتھ دو۔"

"اسے کھلی چھوٹ دے دوں۔"

"وہ آزاد ہے، اسے تم نے قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش چھوڑ دو، صرف یہ سمجھو کہ تم دونوں نے ایک گھر بنایا ہے اور اب اس گھر کو قائم کیے رکھنا ہے۔ دیکھو نینا، میں ہمیشہ یہاں بیٹھ کر تمہیں سمجھا نہیں سکتی۔ اگلے ماہ شبیر دبئی شفٹ ہو رہے ہیں، کاروبار کے سلسلے میں اور مجھے بھی شفٹ ہونا ہے ان کے ساتھ۔ اور میں نے اس وقت کا انتظار ضرور کیا تھا۔ مگر انہیں ان کی دوسری فیملی سے ہٹانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ نینا، تم صرف سسرال والوں سے جنگ میں ہو۔ اور میرے مقابل میری سوتن ہے، اس کے بچے ہیں۔ شبیر کی فیملی ہے۔ ماں، باپ ہیں۔ سب ہیں۔ میں نے کبھی یہ دیکھ کر نہیں سوچا کہ سب کچھ میرا ہوا۔ سب کچھ مجھے ملے، سب میری گرفت میں ہو۔ میں نے بس یہ سوچا ہے کہ میں جس شخص کے ساتھ ہوں، وہ میرا کتنا ہے۔ وہ مجھے سمجھتا ہے کہ نہیں، چاہتا ہے کہ نہیں۔ یہ سوچ کر شادی کی تھی، مگر یقین کرو، شادی کے بعد تو یہ بھی نہیں سوچا، شبیر کی دلچسپی گھٹتی ہے۔ حصول کے بعد جنون نہیں رہتا، مگر اصل آزمائش ہوتی ہی تب ہے۔ منان جب والدین کے پاس جاتا ہے تو تم ان سیکیور ہو جاتی ہو، مگر میرا شوہر اپنی بیوی، بچوں کے پاس جاتا ہے۔ مجھے زیادہ ان سیکیور ہونا چاہیے۔ مگر میں نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ، فکرات، وہمات اور ان سیکیورٹی آپ کی زندگی کبھی نہیں بچاتی، آپ کی زندگی، آپ کا یقین بچاتا ہے۔"

"مجھے یہ وہم کیوں ہوتا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ دے گا اور یہ بھی کہ وہ مجھ سے خوش نہیں ہے، کیا آپ نے اس کے لہجے کی بے زاری نہیں دیکھی۔ وہ کتنا بے زار رہتا ہے مجھ سے۔ وہ خوش نہیں ہے مسز ٹوبی، وہ خوش دکھائی نہیں دیتا۔"

"اسے خوش رکھنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اسے سہولت دو، اور میری بات لکھ لو کہ وہ تمہارے ساتھ صرف خوش ہوگا نہیں بلکہ تمہیں خوش رکھے گا بھی۔"

"ٹھیک ہے، ایک موقع دیتی ہوں میں خود کو اور اسے بھی اللہ کرے جو آپ کہہ رہی ہوں وہ سب ٹھیک ہو۔ جیسا میں سوچتی ہوں، وہ سب غلط نکلے، کیوں کہ اس سوچ نے مجھے کچھ اور سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

"اسی لیے تم اب اس سب کے بجائے خود پر دھیان دو گی۔ اپنے آپ پر، اور اپنے رویے پر......"

"اور ایسا کرنے سے کچھ بہتر ہوگا؟"

"ایسا کرنے سے بہت کچھ بہتر ہوگا نینا! مجھے یقین ہے تم کر پاؤ گی۔"

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے نا۔" کتنی معصوم لگ رہی تھی۔ وہ یہ سوال کرتے ہوئے۔

"یہ تمہارے دل کے اندر وہم ہے جو تمہیں اس سے دور کر رہا ہے، اس لیے یہ وہم اپنے دل سے ایسے نکال دو جیسے دودھ میں سے مکھی کو نکال پھینکا جاتا ہے، سمجھیں۔"

"اب ایسا کروں گی۔"

"پکا وعدہ؟" وہ مسکراہٹ دبا کر پوچھنے لگیں۔

"نہیں تھوڑا کچا، تھوڑا پکا۔" نینا نے آنکھ مار کر کہا۔

"مجھے شک تھا۔" وہ ہنس دیں۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے اس نے محسوس کیا تھا کہ نینا اس کا بہت خیال رکھ رہی ہے۔ اس کی چھوٹی موٹی چیزوں کا اور اس کا دل بھی نرم ہو رہا تھا۔ تو وہ ایسی

PakiBooks.Site

بھی نہیں، جیسا وہ سمجھتا ہے۔ شام میں وہ اسے لے کر باہر ڈنر پر گیا تھا۔ اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ زندگی جیسے ہلکی پھلکی لگنے لگی تھی۔

صبح نکلتے اس نے باپ سے بات کی کہ آج ملنے آئے گا، صرف نینا کا ری ایکشن دیکھنے کے لیے، مگر نینا نے کوئی تاثر نہیں دیا۔ شام میں لیٹ آنے پر اس نے وجہ نہیں پوچھی۔ البتہ کھانے کے بارے میں پوچھا۔

"کیا پکاؤں آج۔"

"آج باہر چلتے ہیں کھانا کھانے کے لیے۔"

"ٹھیک ہے...... تو پھر ابھی چلیں؟ کیوں کہ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

"تم تیار نہیں ہو گی۔"

"نہیں تیار ہو کر کیا کروں گی، بس ٹھیک ہوں ایسے ہی۔" وہ فریش ہو آیا تو یہ دونوں باہر نکل آئے۔

"منان...... یہ گاڑی قسطوں پر لی ہے نا۔"

"ہاں...... تمہیں معلوم نہیں۔"

"تم نے بتایا ہی نہیں۔"

"تم نے پوچھا ہی نہیں۔" وہ ایک دو ماہ پہلے ہی گاڑی لایا تھا۔ تب اس نے یہ پوچھا ہی نہیں، بس یہ سوچا کہ شکر ہے گاڑی آ گئی، ضرورت تھی۔ ابھی اچانک پوچھنے پر وہ ذرا حیران ہوا تھا۔

"ادائیگی میں مشکل تو نہیں۔"

"یہ تم کیوں سوچ رہی ہو۔" وہ ہنس پڑا۔

"تو اور کون سوچے گا۔"

"تم کم از کم یہ مت سوچو، بس اپنے اور میرے بارے میں سوچا کرو۔ اور اپنی خوشیوں کے بارے میں۔ بس اچھا، اچھا سوچو۔" وہ اس کی بات پر مسکرا دی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات پر خوش ہو یا فکر مند ہو جائے کہ اس کا شوہر اسے نا سمجھ سمجھتا ہے۔ کھانے کے بعد وہ دونوں لانگ ڈرائیو پر گئے اور رات گئے لوٹے، لوٹنے کے بعد بھی باتیں کرتے رہے اور جب سوئے تو ایسا لگا کہ نیند سے زیادہ پرسکون کچھ نہیں ہوتا۔

صبح، شام، دوپہر سب کچھ اعتدال میں آ گیا تھا جیسے، اس شام کسی کا فون آیا، ایک دو تین، چار بیلز، اس نے بالآخر کال اٹھائی، کسی لڑکی کی تھی، منان کا لہجہ خوش گوار تھا۔

"علینہ کیسی ہو۔ کتنے عرصے بعد بات ہو رہی ہے نا۔"

"ہاں شاید تین سال بعد۔"

"دیکھو، مگر میں تمہاری آواز ہمیشہ پہچان لیتا ہوں۔ نینا چائے کا کپ لیے وہیں بیٹھی تھی اور پھر وہ بات کرتا رہا آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا اور وہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔ منان نے محسوس نہیں کیا۔ وہ کھڑکی سے دیکھتی رہی، بڑی دیر تک وہ فون پر مصروف تھا۔ اور وہ چائے کا آدھا کپ ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر کن سوچوں میں کھو گئی۔ بس سوچتی ہی رہی۔ اور یہ کہہ نہ سکی کہ حالانکہ کہنا چاہ رہی تھی۔ اس کے تئیں پوچھنا تو اس کا حق تھا۔

"یہ علینہ کون ہے؟"

☆☆☆

"زندگی سے خوشیاں کشید کی جاتی ہیں۔ جتنی خوش تم آج لگ رہی ہو، اتنی خوش ہمیشہ رہنا۔"

آج ان کی دوسری اینی ورسری تھی، اور وہ بہت خوش لگ رہی تھی مسز شبیر الوداعی ملاقات کے لیے آئی تھیں۔

ان دونوں کو بات کرتا ہوا دیکھ کر منان بھی اس طرح آیا۔

"آج تمہاری بیوی تو بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔" وہ منان سے مخاطب تھیں۔

"یہ سادگی میں زیادہ خوب صورت لگتی ہے۔ بشرطیکہ زیادہ چخ چخ نہ کرے۔" وہ اسے چڑانے کے لیے بولا۔

"دیکھا آپ نے منان بالکل روایتی سا شوہر بن گیا ہے کس طرح بات کرتا ہے۔" وہ شکوہ کناں تھی۔

"یہ اس طرح بھی اچھا لگتا ہے نینا۔"

"آپ نے تو تعریف کر کے اسے بگاڑ دیا ہے مسز شبیر!"

"کبھی تو بھابھی کہہ دیا کرو۔" وہ نینا کو ٹوکنے لگا۔

"رہنے دو" اسے جیسے آسانی ہو رشتوں کی ظاہری اپنائیت سے دلی اپنائیت زیادہ اور اہمیت رکھتی ہے منان اور یہ تو مجھے پتا ہے کہ ہم دونوں کتنی اچھی سہیلیاں ہیں۔"

"بالکل اور یہ بھی کہ میری غیر موجودگی میں میری اور شبیر بھائی کی خوب شکایتیں بھی کرتی ہیں۔"

نینا نے اسے گھورا اس بات پر البتہ مسز توبلی ہنس دی میں چائے لے کر آتی ہوں۔ وہ سب ابھی ابھی کیک کاٹ کر ادھر آئے تھے۔

شبیر صاحب اپنے پڑوسی کے ساتھ گپ شپ کر رہے تھے ان کی بیگم اور کچھ خواتین ڈائننگ ہال میں تھیں۔ نینا اسی طرف چلی گئی۔

"دیکھا میں نہ کہتی تھی نینا کو تمہاری توجہ چاہیے۔ کیسی چمک رہی ہے، تم نے دیکھا خوش ہے۔"

"میں سمجھا تھا نینا کو کچھ باتوں کا بہت شعور ہوگا۔ مگر وہ جتنی جلدی شور مچاتی ہے اس سے کہیں زیادہ کسی بھی معمولی سی خوش گوار بات پر خوش بھی ہو جاتی ہے مگر ابھی تک کچھ وہم اس کے دل سے گئے نہیں ہے۔"

"جاتے جاتے جائیں گے منان...... تم کو اس کے لیے انتظار کرنا ہوگا۔

تم دونوں نے اپنی شادی کی کامیابی کو ثابت کرنا ہوگا۔"

"آپ نے ہمیشہ بہت اچھا ساتھ دیا ہے بھابھی۔" وہ سر ہلاتے مسکرایا "اب آپ جا رہی ہیں تو ہم آپ کو بہت مس کریں گے۔"

"رہنے دو اب مجھے مت جذباتی کرو۔"

"ایک بات پوچھوں تم سے؟"

"پوچھیے......"

"علینہ کون ہے؟"

"اوہ...... تو نینا نے یہ بھی بتایا ہے آپ کو!" وہ ہنس دیا۔

"کچھ ایسا ہے جو چھپانا چاہیے تھا۔" وہ مشکوک ہوئیں ...... "نہیں نہیں ...... کچھ ایسا نہیں ہے۔ اصل میں علینہ میری کلیگ بھی، اسکول فرینڈ بھی ہے کالج میں بھی ہم ساتھ پڑھے ہیں۔

دراصل پچھلے دنوں وہ بہت پریشان رہی ہے اس نے بھی ہماری طرح پسند کی شادی کر لی ہے۔"

"اوہ ...... پھر ...... والدین سے بغاوت والی؟" وہ فکر مند ہو گئیں۔

"جی...... اصل میں عدیل کے والد نے اسے اس کا حصہ نہیں دیا جو چھوٹا موٹا کاروبار ہے اس میں سے پھر عدیل تھوڑی مایوس طبیعت والا بندہ ہے۔

اور مجھے تو لگتا ہے کہ وہ سست ہونے کے ساتھ کاہل بھی ہے شاید وہ خود کچھ نہیں کرنا چاہتا...... مجھے تو یہی لگتا ہے۔" اندر سب خوش گپیوں میں مگن تھے۔ اور مسز شبیر کے ساتھ منان لان میں آ بیٹھا تھا۔

"علینہ تھک گئی ہے بے چاری...... کئی جگہوں پر کام کر چکی ہے۔

پچھلے دنوں بہت عرصے بعد اس کا فون آیا تو نینا بیٹھی تھی۔ اب ظاہر ہے میں فون لے کر دوسری جگہ جاتا تب بھی وہ سوچتی اس لیے اس کے سامنے ہی بات کی تھی۔ پھر آپ کسی دوست کی پریشانی سن کر پریشان تو ہوتے ہیں نا۔"

"بات بس یہاں تک ہے؟"

"ہاں بالکل......" وہ ہنس پڑا۔

"پچھلے دنوں وہ پریشان تھی تو میں نے باس سے بات کر کے اپنے آفس میں کام دلوا دیا ہے۔

اس کے گھر والے اسے پوچھنے کو تیار نہیں ہیں۔ میں گیا تھا اس کے گھر والوں سے ملنے کے لیے بات کرنے مگر وہ لوگ تو کچھ کہنے سننے کو تیار ہی نہیں۔"

وہ شادی کر کے پچھتا رہی ہے۔"

"نہیں...... حیرت اسی بات پر ہے کہ وہ نہیں پچھتا رہی اسے عدیل کی اتنی فکر ہے کہ حد نہیں۔ اس کے خلاف ایک لفظ تک کسی کے منہ سے سننا پسند نہیں کرتی۔

"میں تو سمجھا تھا وہ بے زار ہو جائے گی۔ تھک گئی ہے۔ مگر بے زار نہیں ہوئی......"

"اور اب تم چاہتے ہو کہ نینا بھی اسی کی طرح بی ہیو کرے تم سے......" وہ ساری بات سمجھ گئی تھیں۔

"نہیں میں نہیں چاہتا کہ وہ دوہری ذمہ داری اٹھائے یہ بھی نہیں چاہتا کہ زیادہ مشقت کرے اسی لیے لان کی دیکھ بھال کے لیے مالی آتا ہے۔

گھر کے کام کے لیے ماسی آتی ہے۔ نینا تو کبھی کبھار اپنی نگرانی میں صرف کام لینے پر بھی چڑ جاتی ہے۔ تھک گئی ہوں۔ بے زار آ گئی ہوں، کہاں پھنس گئی، جیسے لفظ تو اس کے منہ سے جھڑتے ہیں۔ کبھی علینہ سے نہیں سنا کہ تھک گئی ہوں۔ حالانکہ اس کی آواز اس کا لہجہ، اس کے چہرے کی تھکن، آنکھوں کے گرد پڑے حلقے سب گواہ ہیں۔ اس کی تھکن کے۔ مگر ایک وہ نہیں کہتی۔ کبھی نہیں کہتی کہ بے زار آ گئی ہوں۔

کما کر لاتی ہے۔ اور تب بھی کہتی ہے کہ میں عدیل کے ساتھ خوش ہوں۔ اگر مجھے عدیل نہ ملتا میں کسی کے ساتھ سیٹ نہیں ہو پاتی ابھی تک تو وہ عدیل کو خوش رکھتی ہوئی آئی ہے —— بہت اٹل ہے۔ ثابت قدم ہے اپنے فیصلے پر۔"

"تو سمجھو یہاں تمہیں علینہ بن کر دکھانا ہوگا نینا کو۔" وہ بے بسی سے ان کے مشورے پر مسکرایا تھا۔

"نہیں ہے نا؟ اتنا ظرف نہیں ہے تو اس سے متاثر بھی مت ہو۔"

"آپ جتنا اور علینہ جتنا ظرف کاش ہر عورت میں ہو۔"

"اللہ نہ کرے...... ورنہ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

"آپ بہن بھائی کی گپ شپ ختم ہو گئی؟" شبیر بہت دیر سے دیکھ رہے تھے، بالآخر لان میں چلے آئے۔

"وہ تو کبھی نہیں ہوگی۔" وہ مسکرائیں۔

"تو پھر گھر چلنے کے بارے میں کیا ارادہ ہے؟"

"بس چلتے ہیں......" وہ اٹھی تھیں۔

"اتنی جلدی بھیا؟" منان نے احتجاج کیا تھا کمزور سا۔

"بھئی دیکھو، ابھی پیکنگ رہتی ہے، اور کل شام کی فلائٹ ہے آج کا دن دے دو، کل آ جانا، ایئرپورٹ تک باتیں کرتے رہنا تم لوگ۔"

"چلیں جیسی آپ کی مرضی۔" وہ ناچاہتے ہوئے بھی انہیں گیٹ تک چھوڑ آیا اور خود آ کر اندر بیٹھ گیا۔ سارے لوگ جا چکے تھے۔

"مسز شبیر کتنی جلدی جا رہی ہیں نا۔" نینا اندر آئی تھی۔

"ہاں...... یہ تو ہے ...... پر اچھا ہے انہیں شبیر بھائی کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملے گا۔"

"ہاں...... بس وہ خوش رہیں" وہ اپنی جیولری اتار رہی تھی۔

"تمہیں لگتا ہے وہ خوش نہیں ہیں؟" وہ تھوڑا سا الجھا تھا کچھ اندازہ تو تھا۔

"مجھے لگتا ہے بس وہ صبر ہی کر رہی ہیں۔ شبیر بھائی ان کا خیال نہیں رکھتے؟"

"ہاں مگر وہ بہت رکھتی ہیں ان کا خیال۔"

"وہ تو سب کا رکھتی ہیں منان...... مگر سوچو ان کا کون رکھتا ہے؟"

ہوں...... ان کا کون رکھتا ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ان کا کوئی نہیں رکھتا منان"

وہ یہ کہتے ہوئے اپنے کپڑے وارڈروب سے نکال واش روم میں گھس گئی۔

اور وہ اس کی حساسیت پر سوچتا رہا تھا کہ نینا دوسروں کے بارے میں کب سے سوچنے لگی ہے۔

دوسروں کا خیال آتے ہی اسے علینہ کا خیال آ گیا۔ اور اس نے فون اٹھا کر ایک دوبارا اسے ٹرائی

کیا۔ رنگ تو جا رہی تھی۔ مگر وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ فون نہیں اٹھایا تو اس نے سوچا میسج کر دے پھر رک گیا۔

نینا چینج کر کے آ چکی تھی۔ اور اسے کھویا ہوا دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں......" اس نے فون رکھ دیا۔ "مجھے بس فکر ہو رہی تھی۔" توقف کے بعد بولا۔

"کس کی؟"

"علینہ کی۔" بے ساختہ بول بیٹھا۔

"کس لیے؟" اس کی فکر کرنے کے لیے اس کا شوہر بیٹھا ہے۔"

"میں اس کا دوست ہوں۔"

"مگر شوہر نہیں ہو۔" وہ بھی کبھی کبھار بے سوچے سمجھے بولتی تھی۔

"تم بات کو غلط طرف کیوں لے جاتی ہو نینا۔ وہ صرف میری دوست ہے۔"

"وہ صرف تمہاری دوست ہے، تو تم بھی صرف اس کے دوست رہو زیادہ مداخلت مت کرو اس کی زندگی میں۔"

"یہ مداخلت نہیں ہے۔ میں تو بس خیریت ہی پوچھنا چاہتا تھا۔"

"تھوڑا عقل سے کام لو منان، یہ سوچو ہو سکتا ہے اس کا شوہر اس کے پاس بیٹھا ہو پھر یہ کوئی وقت ہے کال کرنے کا؟"

"کیا وقت ہے، رات کے نو بجے ہیں، کون سا بارہ بجے ہیں۔"

"پلیز منان، حد ہوتی ہے۔" وہ بے چارگی سے بولی۔

"میں چینج کر لوں۔" وہ جھنجلا کر اٹھ گیا۔ اور کپڑے لے کر واش روم میں چلا گیا۔

"پتا نہیں تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے منان۔" اسے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ اٹھ کر پنکھا چلایا، سردیوں کے جانے کے دن تھے کبھی رات خنک تو کبھی خشک سی ہو جاتی تھی۔ وہ چینج کر کے آیا تو باقاعدہ چھینک رہا تھا۔

"تم نے فین کیوں چلایا ہے نینا؟"

"گرمی لگ رہی ہے یار۔" وہ چادر لے کر لیٹ گئی تبھی ہلکی سی۔

"یہ گرمی تمہارے اندر کی ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"اور تمہارے اندر کیا برف جمی ہوئی ہے؟" وہ جھلائی۔

"ہاں......شاید......کچھ بھی پگھلا نہیں ہے۔"

"مجھے بھی لگتا ہے برف ہے۔" وہ خود اپنے رویے پر تھوڑا سا مایوس ہو جاتا تھا۔ جب بھی کچھ غلط ہوتا ہے، انسان کا ضمیر سب سے پہلے خود اسے خبردار کرتا ہے، اطلاع دیتا ہے۔ اسے بھی لگ رہا تھا جیسے کہیں کچھ غلط ہے مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں۔ اسے لگا نینا کی طرف سب غلط ہے۔ اور نینا کو لگا اس کی طرف کچھ غلط ہے......اور اسی لیے وہ دونوں ایک دوسرے پر شکایتوں کے بوجھ لاد رہے تھے۔ عنقریب جنہیں پہاڑ بننا تھا۔

☆☆☆

عدیل نے فون اٹھا کر کال چیک کی......اور فون لے کر علینہ کے پاس آ گیا تمہارے دوست کا فون تھا۔

"میں نے دیکھا تھا۔" وہ کچن میں کام کر رہی تھی۔

"تو پھر اٹھایا کیوں نہیں۔"

"یہ وقت نہیں ہے بات کرنے کا۔"

"تم اگر میری وجہ سے......!"

"نہیں ہرگز نہیں۔" وہ اسے ٹوکتے بولی۔

"میں تمہاری وجہ سے نہیں غیر ضروری سمجھ کر کر رہی ہوں اس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں......اور یہ وقت صرف اور صرف تمہارا ہے۔"

"مگر اس لڑکے نے کافی مدد کی ہے تمہاری، مشکل وقت میں کام آیا ہے، ہو سکتا ہے اسے واقعی فکر ہو تمہاری۔"

"اسے کوئی فکر نہیں ہے، یوں ہی کال کی ہو گی۔"

"فکر ہو گی تب ہی کال کی ہے۔" عدیل کا لہجہ تیز ہو گیا تھا۔

"بات کو بڑھاؤ مت عدیل۔ مجھے نہیں پروا کسی کی فکر کی۔"

"مگر تم روزی کے ساتھ بھی تو رات گئے بات کر لیتی ہو تو اس کے ساتھ بھی کر لو۔" اس کا لہجہ فوراً ہی اعتدال پر آیا تھا مگر لہجے میں کچھ چبھن تھی۔

"روزی کی بات اور ہے۔ وہ میری سہیلی ہے۔"

"تو اس کی بات کیا ہے؟"

"عدیل......منان میرا دوست ہے، اور اچھا دوست ہے اس نے میری ہمیشہ مدد کی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کسی کے ساتھ بھی باتیں کرتی رہوں، اور تم اکیلے بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ ظاہر ہے دن بھر میں گھر سے باہر رہتی ہوں۔ تم باہر ہوتے ہو یا گھر پر، مگر ہم اکٹھے تو رات کو ہی ہوتے ہیں......تو پھر یہ وقت صرف ہمارا ہوا نا۔"

"ٹھیک ہے، مگر دو منٹ بات سن لینے سے حرج نہیں ہوتا۔"

"ٹھیک ہے ملاؤ کال۔ بات کرواؤ۔" عدیل نے کال ملا کر فون اسے پکڑانا چاہا، مگر علینہ نے اسے پکڑے رکھنے کا اشارہ کیا، کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ آٹے سے بھرے پڑے تھے۔ فون دوسری بیل پر اٹھا لیا گیا تھا۔

"ہیلو منان......کیسے ہو؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں......خیریت ہے؟ کال کی۔"

"بس میں ذرا کچن میں تھی، عدیل نے فون دیکھا ہے ابھی بھی وہ پکڑے کھڑے ہیں تو میں بات کر رہی ہوں۔" اس نے دبے انداز میں منان کو جتانا چاہا تھا تب ہی منان نے کاغذات وغیرہ کا بہانہ کر کے فون رکھ دیا تھا۔

"گویا اس کو کوئی ضروری کام نہیں تھا۔"

"تمہیں اس پر نہیں سوچنا چاہیے عدیل۔"

"میں نہیں سوچ رہا علینہ، مجھے تم پر بھروسا ہے مگر......"

"مگر کیا؟"

"مگر یہ کہ وہ کیا سوچتا ہو گا کہ میں کتنا بے غیرت آدمی ہوں بیوی کے خرچے پر چل رہا ہوں۔"

"جب تمہیں جاب ملے گی تو میں جاب چھوڑ دوں گی عدیل۔"

"اچھا......واقعی......؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"ہاں بالکل......میں گھر سے جاب کرنے نہیں، تمہارے لیے نکلی تھی، تمہاری خاطر میں نے ان کی ناراضی اٹھائی تھی۔ اور اب تک اٹھا رہی ہوں۔ فی الحال روٹیاں ڈال لوں، میری مدد کرواؤ۔ فریزر میں کباب پڑے ہیں نکال کر تل لو۔"

"جو حکم ملکہ عالیہ۔" وہ فون اسٹینڈ پر رکھ کر فریج کی طرف بڑھ گیا۔

"سنو علینہ......میں اب دل سے کام ڈھونڈوں گا اور جیسے ہی مجھے کام ملے گا تم جاب چھوڑ دینا۔"

"پہلے کھانا کھا لیں رات کا، دن میں بھی کام، رات کو باتوں میں بھی کام۔" وہ ہنس پڑا۔

"اچھا نہیں کرتا کام کی باتیں، کھانے کے بعد واک پر چلیں گے۔"

"او کے۔" اس نے توا رکھا اور آگ تیز کی۔

"گاڑی لوں گا تو لانگ ڈرائیو پر چلا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مسکرائی۔

"میں تمہارے لیے بہت اچھا گھر خریدوں گا علینہ۔"

"مجھے پتا ہے۔ مگر مجھے بہت اچھا نہیں بس عام سا ہی چاہیے بس تم ساتھ رہو کافی ہے۔"

"تم بہت اچھی ہو علینہ......ستاروں جیسی۔"

"اور تم ستاروں سے بڑھ کر آسمان جیسے۔"

Pak Books.Site

وہ ہمیشہ اسے لاجواب کر جاتی تھی۔ اور اس کا دل خوشی سے بھر جاتا تھا، عدیل کا، جو علینہ کا وہ تھا۔

☆☆☆

"امی بہت بیمار ہیں نینا..... کیا ہم دونوں کچھ دن کے لیے وہاں چلے جائیں؟" منان نے بڑی عاجزی سے اس کی منت کی تھی۔

"تم چلے جاؤ منان..... میں یہیں ہوں۔"

"دیکھو تم اگر چلو گی تو وہ سب خوش ہوں گے۔ ان کا غصہ کم ہو گا۔"

"منان مجھے جو خوشیاں ان سے ملی ہیں اس کا تو مجھے اچھی طرح پتا ہے، اب ان خوشیوں سے تمہیں دلچسپی ہے تو تم جاؤ میں نے تمہیں تو نہیں روکا نا....."

"نینا یہ وہی لوگ ہیں جو کبھی تمہیں بہت پیار کرتے تھے۔"

"بہت پہلے کی بات ہے منان یہ، اب ایسا نہیں ہے!"

"ایسا نہیں ہے مگر ایسا ہو سکتا ہے نینا....."

"جب ہو گا تب تم بھی دیکھنا اور میں بھی دیکھوں گی۔"

"تم بھی تو پہل کر سکتی ہو؟"

"نہیں میں نہیں کر سکتی..... ایک بار مزا چکھ آئی ہوں اس گھر میں بطور بہو رہنے کا۔ اب کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ اپنے اور اس کے دھلے ہوئے کپڑے استری کے لیے نکال رہی تھی۔

"دیکھو نینا کبھی کبھار ہمیں اپنے بڑوں کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔"

"منان میں اپنے پیرنٹس کے آگے نہیں جھکی شادی کے بعد انہوں نے میری خبر تک نہیں لی۔ تو میں نے بھی نہیں لی، کیا میں گئی؟"

"تو تمہیں جانا چاہیے نا۔ میں نے تمہیں کب روکا ہے۔"

"تم نے نہیں روکا، اس لیے کہ میں نے بھی تمہیں نہیں روکا۔"

"مگر تمہارا موڈ تو آف ہو جاتا ہے میرے وہاں جانے سے۔"

"اس کے باوجود بھی تم جاتے تو ہو۔"

"تو کیا کروں والدین ہیں میرے۔"

"تو خوشی سے جاؤ..... مگر مجھے مت فورس کرو۔"

"اچھا....." وہ تھک سا گیا تھا اسے سمجھاتے ہوئے۔

"میں زیادہ تر وہاں رہوں گا کچھ دن۔ تمہیں دقت تو نہیں ہو گی؟ اب تو بھابی بھی شہر سے باہر ہیں اور کسی کے ساتھ تمہاری دوستی بھی نہیں ہے۔ تم بور ہو جاؤ گی۔"

"میری فکر چھوڑو تمہیں جو ٹھیک لگتا ہے وہ کرو۔"

"نینا..... پلیز میں تمہاری فکر نہیں چھوڑ سکتا۔"

"رہنے دو منان..... جان گئی ہوں۔" وہ سرد مہری سے بولی۔

"جانتی ہوتی تو....." اس نے لمبی سانس بھری۔ "پتا نہیں تم کب سمجھو گی۔"

"میں بھی یہی سوچتی ہوں تمہارے بارے میں۔" وہ ناگواری سے اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔

اور نینا نے کپڑے بے دلی سے بستر پر پھینکتے ہوئے جھلا کر بیٹھ گئی۔

اس کے تئیں یہ اس کا شوہر تھا، جو لاپروا نکلا تھا۔ اور منان لان میں ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے کھاتے ہوئے کچھ اور سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

اندھیرا، جس نے اس نے زندگی میں جگہ لے لی تھی اس کا بس چلتا تو وہ اپنی زندگی سے یہ بے اعتبار دن نکال دیتی۔ اتنا دل پر بوجھ، پہلے کب تھا۔ فکریں تو ہوتی ہیں، مگر زندگی کو آسان کسی کا ساتھ کرتا ہے کسی کا حوصلہ کرتا ہے اور حوصلہ جیسے اس کی مٹھی سے ریت کی طرح پھسلا ہو..... دوائیاں لے آئی تھی۔

عدیل ڈسچارج ہو کر آ گیا تھا۔ سوجی آنکھیں

تھکی ہوئیں، چہرے پر سفیدیاں، تھکن کے آثار وہ موت کی وادی سے لوٹا تھا۔

اور علینہ کے اندر جیسے موت کی سی ویرانی تھی۔ خاموشی سے اندر آئی تھی، جیسے خاموش قیامت ہوتی ہے۔ وہ کل سے منتظر تھا کہ وہ کچھ کہے اسے برا بھلا ہی کہے۔ اسے کچھ بھی کہے، پر کہے اور اس کی خاموشی عدیل کو توڑ رہی تھی۔ وہ کئی سوالوں کی ندامت لیے اس کی طرف دیکھ رہا تھا علینہ نے خاموشی سے اسے دوا پلائی تھی۔ دوسرے وزن پر اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"منہ کھولو۔" لہجے میں بلا کی اجنبیت تھی۔

"تم کچھ بولو نا..... ایسے تو مت کرو۔" اس نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ علینہ نے دوسرا وزن زبردستی اس کے منہ میں دے دیا تھا، دوا بہہ کر داڑھی کے بالوں میں جذب ہو گئی تھی۔ وہ بے بسی سے دیکھتا رہا۔ "علینہ..... مجھ سے لڑو۔"

"تم سے لڑی تو ٹوٹ جاؤں گی، مگر مروں گی تب بھی نہیں۔ کیا فائدہ۔" دوا پلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کچھ دیر میں بھوک لگے تو کھا لینا۔" اس کے سرہانے میز پر سادہ مایونیز برگر اور سوپ رکھا تھا اس نے اور کمرے سے باہر آ گئی۔ عدیل خاموش آنسوؤں سے رو رہا تھا.....

"کاش میں نہ بچ پاتا..... کاش مر جاتا۔"

اس کی یہ بڑبڑاہٹ باہر کھڑی علینہ نے سنی تھی۔ اور اپنا چہرہ بے دردی سے رگڑا تھا، جو آنسوؤں سے تر تھا اسی وقت اس کی دوست روزی آ گئی تھی۔ روزی خود ہی عدیل کے کمرے میں آ گئی تھی۔

"آپ کیسے ہیں اب عدیل!"

"میں ٹھیک نہیں ہوں روزی بہن..... اس کی آواز آنسوؤں سے تر تھی۔

"ایسے تو نہ کہیں، اللہ نے آپ کو نئی زندگی دی ہے۔"

"نئی زندگی، علینہ کی نفرت کے لیے..... پہلے محبت کے لیے تھی، اب نفرت کے لیے ہے۔ مجھے اس کی نفرت کے لیے تو نہیں بچنا تھا روزی.....!" وہ رو پڑا تھا۔

"ایسا مت کہیں عدیل..... وہ نفرت نہیں کرتی..... بلکہ کر ہی نہیں سکتی یہ تو بس وقتی غصہ ہے آپ پر۔"

"یہ وقتی غصہ نہیں ہے..... وہ پرسوں سے میرے ساتھ بات نہیں کر رہی ہے ٹھیک ہے، اس نے میری بات نہیں سنی۔ اس نے مجھ سے وجہ نہیں پوچھی اس سب کی....."

"آپ مجھے بتا دیں کیا وجہ تھی۔" وہ سب کچھ جانتی تھی مگر چاہتی تھی اس کے اندر کا بوجھ نکل کر باہر آ جائے۔

"موت بہت بری ہے روزی بہن..... موت بہت بری..... مجھے پتا نہیں تھا۔ اب پتا چلا۔ میں نے ہر طرح سے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی جب سے مزدوری کرنے میں بھی ناکام رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا علینہ کی زندگی میری وجہ سے خراب ہوئی ہے۔ وہ پریشان رہتی ہے۔ اس کی زندگی میں صرف فکریں ہیں۔ علینہ تو بس خوشیاں دیکھنے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ وہ تو گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ میں نے اسے فکریں دی ہیں۔ میں نے سوچا میرے نکل جانے سے فکریں نکل جائیں گی۔"

"بکتا ہے یہ، بکواس کرتا ہے۔" علینہ دھاڑتی ہوئی اندر آئی تھی۔ "بکواس کرتا ہے میں کماتی تھی اس کی مردانہ انا کو گوارا نہ تھا۔ محبت بھول گیا تھا، مردانگی کھا رہی تھی اسے۔ میں نے کتنا کہا تھا کہ صبر کرو، حالات اچھے ہوں گے میں کر رہی ہوں کام اس سے اچھا کہ میرا حوصلہ بنتا اس نے فرار چاہی۔ بولو اس کے مر جانے سے مجھے کیا فائدہ ہوتا، اس کے گھر والے مجھے پولیس کے آگے پیش کر دیتے قاتل بنا کر تفتیش ہوتی، بیوہ کہلائی جاتی، رسوائی ہوتی میری..... یہ، یہ بزدل آدمی جو مجھے میرے گھر سے نکاح

کر کے لایا تھا یہ مجھے دنیا کے سامنے دھکے کھانے کے لیے چھوڑ رہا تھا۔

یہ موت صرف بہانہ تھی، فرار تھا، مجھ سے مشکلوں سے یہ اگر مجھ سے اتنا بے زار تھا تو میں زہر کھالیتی، میں مرجاتی جب زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا تھا تو مرنے کا فیصلہ بھی ساتھ کر لیتے نا...... کتنا دکھ دیا ہے اس نے مجھے روزی اس سے پوچھو سولی پر تو میں لٹکی تھی کہ میرا شوہر مر رہا ہے۔ اگر یہ مر گیا تو زندگی میرے لیے جہنم بن جائے گی اور اگر بچ گیا تو بھی میں بھی اس پر اعتبار نہیں کر سکوں گی کبھی بھی نہیں۔ بہت تھکا دیا ہے اس نے مجھے...... ٹوٹ گئی ہوں اس کے اس کارنامے سے یقین ہو گیا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو مجھے زندگی کے کسی بھی موڑ پر کسی وقت بھی چھوڑ سکتا ہے۔ پھر چھوڑنے کی جو بھی صورت ہو۔"

"ایسا مت کہو علینہ...... میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔"

"بکومت تم...... بند رکھو اپنا منہ......" وہ روتی ہوئی کمرے سے چلی گئی تھی۔ روزی نے عدیل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"عدیل، میرے بھائی...... حوصلہ کریں۔ اس کا غصہ اتر جائے گا۔ یہ غصہ بھی محبت کی علامت ہے۔ بہت چاہتی ہے، سب کچھ چھوڑ آئی ہے۔ پیچھے نہیں ہٹے گی، بس آپ سے یہ درخواست ہے آپ اب کبھی ایسا نہیں مت کیجیے گا۔"

"میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ تم بس اسے یقین دلا دو اس بات کا۔" وہ التجا کر رہا تھا، اور باہر کمرے کے دروازے سے لگی علینہ کے دل پر جیسے برف گری تھی۔ سب منجمد تھا۔

☆☆☆

رات اندھیری ہوتی ہے، اگر اندھی ہو جائے تو سیاہ بختیاں مقدر میں کھل جاتی ہیں۔ اس نے علینہ کا نام لے کر کچھ پڑھا تھا زیر لب، اور دہل گئی تھی آج وہ واپس جارہی تھی گھر، اور جانے سے پہلے اس نے سارے سرخاب ورثل جلا دیے تھے، ساری کتابیں علوم کی ضائع کر دی تھیں۔

اس کی نانی کے انتقال کو بارہ دن ہو گئے تھے۔

اسے آخری بار جب اپنے حساب کتاب میں موت کا اشارہ ملا تھا تو پہلی بار اسے اپنا علم بہت بوجھل اور مشکل لگا تھا۔ پورے چار دن جیسے اس نے سولی پر لٹک کر گزارے تھے گھر کے ہر فرد کو ایک حسرت سے دیکھتے ہوئے، کہ نجانے کس کی موت ہونی ہے۔

اور تب اسے یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ نانی نے اسے صرف ستاروں کا علم نہیں دیا اسی رات وہ اسے سمجھا رہی تھیں کہ دنیا میں کچھ بھی حیران کن نہیں ہوتا، یہ علوم، خواب، بصیرت اور حسیات کی صورت ہر انسان کے اندر سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جو انسان جس تہ خانے کی تجوری کی چابی ڈھونڈ پائے اشارے کنارے، علم الاعداد، ستارہ شناسی یا پھر پامسٹری، سب حد بندیاں ہیں۔

سب اشارے ہیں، ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ اور خدا اپنی تقدیر کی چھڑی سے بہت کچھ بدل بھی سکتا ہے۔ اگر لوگ مستقبل کی فکر چھوڑ دیں اور پہلے حال کو سدھاریں یعنی مستقبل قریب کو، تو حالات اچھے ہو بھی سکتے ہیں۔ ہمیں کچھ اشارے خواب میں ملتے ہیں، زندگیوں کے کئی مسائل کی باریکیوں کے حل ہماری سمجھ کے اندر بھی ہوتے ہیں۔ ستارے تو بس چال بتاتے ہیں۔ اور کچھ حال...... مگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔

وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔ مگر وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ مدہم رکھ گئیں۔ اگلی صبح جب نانی کی موت ہوئی تو اس کا پارہ جیسے تیزی سے گرا تھا نیچے۔

اور پھر بارہ دنوں میں اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ لکیریں نہیں پڑھے گی۔ نہ ستاروں کا حال جانے گی، نہ ہی مستقبل کی پیش گوئیاں نکالے گی وہ بھی زندگی کسی بھی عام سی لڑکی کی طرح خواب دیکھتے

ہوئے گزار دے گی۔ اس شام محمود سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

محمود اپنی مرضی سے کسی اور جگہ شادی کر رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ عرشیہ اور اس کا جوڑا ایک مس میچ ہے۔ اور اس کی ماموں زاد سعدیہ جو اسے مسلسل کہہ رہی تھی کہ محمود کو منا لو، ہو سکتا ہے وہ رک جائے۔ وہ ٹھہر جائے، سعدیہ کو صرف خوش فہمیاں لاحق تھیں۔ محمود کا حصول گو کہ اس کے لیے ناممکن نہیں تھا۔ مگر وہ جذباتی طور پر گر کر محمود کے آگے مجبور نہیں ہونا چاہ رہی تھی اسے پتا تھا محمود اسے پسند کرتا ہے۔ وہ اسے بھلا نہیں پائے گا وہ کسی اور کے ساتھ اتنا خوش بھی نہیں رہ پائے گی یہ سب باتیں وہ خود بھی جانتا تھا اور اگر جانتے بوجھتے وہ خود کو یا پھر اسے کسی بات کی اذیت دے رہا تھا، اس کے اندر جلن آگئی تھی تعصب آگیا تھا۔ غصہ آگیا تھا۔

اور غصے میں وہ یہ سب کھیل رہا تھا، تو اس نے سوچا کھیلنے دیا جائے۔ وہ گھر لوٹ چکی تھی۔

اس کی ماں اسے بہت سمجھا رہی تھی کہ اپنا رشتہ بچا لو۔ آج کل رشتے ملنے بہت مشکل ہو گئے ہیں۔ اپنی انا کو ذرا سا پیچھے کر دو...... اور محمود سے بات کر لو، بڑی تسکین پہنچتی ہے کسی بھی مرد کو عورت کو خود کے سامنے اعتراف جرم کرتے دیکھ کر، یا پھر ہارتے ہوئے دیکھ کر چاہے وہ عورت کو جس قدر چاہتا ہو۔ چاہے عورت اسے جتنا چاہتی ہو۔ اس کی معمولی لاپروائی بھی مرد سے برداشت نہیں ہوتی۔ اس نے محمود کو اس کی حال پر چھوڑ دیا تھا۔

"شادی کر رہا ہے تو کرتا رہے۔" یہ جملہ اس نے بہت تلخی سے کہا تھا، اور کمرے میں چلی گئی تھی اسے علینہ سے بات کرنی تھی۔ مگر وہ سوچ رہی تھی کہ وہ علینہ سے کیا بات کرے کیا اسے اندھیرے کے بارے میں خبردار کرے...... اس سے تو وہ وقت سے پہلے مایوس ہو جائے گی، وہ بہادر لڑکی علینہ، وہ خوب صورت سوچیں رکھنے والی لڑکی، متحمل مزاج، حوصلہ مند، اسے کیسے ڈھے جاتا ہوا دیکھے گی۔ علینہ کی صورت اسے بھی حوصلہ ملتا تھا۔

وہ ڈٹ بھی جاتی اگر محمود عدیل جتنا سادہ ہوتا۔ محمود تو محبت کے ساتھ بھی جوا کھیل رہا تھا اسے تو بس جیت جانے کی خواہش تھی۔ عرشیہ کے ساتھ اس کی انا، اس کی خواہش، اس کی پرائیویسی، اس کے خیال، اس کی خودی سب کچھ جیت جانے کی خواہش تھی۔ اور عرشیہ کو اس کے وحشیانے سے خوف نہیں کراہت آتی تھی اس لیے اس نے فی الحال تمام تر نرم جذبات کو لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔ اپنی الماری میں بقیہ جات سمیٹ کر رکھتے ہوئے۔

خواہش عزت نفس سے بالاتر نہیں ہوتی، یہ جواب اس نے اپنے آپ کو دیا تھا، اسی نفس کو جو کبھی کبھار خواہش کے پیچھے سرپٹ بھاگتا ہے اس لیے اس نے فی الفور اپنے قسمت کے ستارے کو تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔

قوی امید تھی کہ پلٹ آتا، وگرنہ رخ متعین کر لیتا اپنی ایک الگ سمت کا۔

☆☆☆

زندگی اپنی ڈگر پر واپس آرہی تھی۔ اس کا اور عدیل کا رویہ بہت معتدل ہو گیا تھا۔ وہ گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹانے لگا تھا باہر جاتا تھا، نوکری ڈھونڈتا تھا، یا پھر کوئی کام، اس نے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا تھا۔ خوش مزاج ہو گیا تھا پہلے کی نسبت اس نے علینہ کے ساتھ بے جا لاڈ کرنے چھوڑ دیے تھے اپنے لیے کپڑے استری کر کے رکھنے سے لے کر چائے کا کپ بنانے تک خود کام کر لیا کرتا تھا۔

علینہ جو کچھ لاتی وہ خاموشی سے کھا لیتا تھا۔ نہ کوئی ضد، نہ تکرار، نہ کمپلیکس، نہ حسد نہ افسوس، کچھ نہیں اس نے سنجیدگی کے ساتھ باپ سے بھی بات کی تھی۔ اپنے حصے کی، باپ نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ تم نے میرے کون سے حق نبھائے ہیں جو میں تمہارا حق رکھوں۔ دادی کے گزرنے کے بعد اب کون اس کے لیے نرم بنتا۔ علینہ کے گھر والوں کا

رد یہ ابھی تک اجنبی سا تھا علینہ نے بھی زندگی سے سمجھوتہ کر ہی لیا تھا۔

زندگی بڑی سیدھی پٹڑی کی طرح چلنے لگی تھی۔

جب علینہ کو بھی کوئی کمی کھٹک رہی تھی۔ اسے بھی کچھ احساس ہوا تھا کہ سب کچھ روکھا پھیکا ہے علینہ اس کے لیے نرم پڑنے لگی تھی۔ قریب آنے لگی تھی، اس نے سوچا پھر سے محبت، پھر سے اس کے لاڈ اٹھائے۔

یہ محبت بھی عجیب شے ہوتی ہے لاڈ آپ کسی اور کے اٹھا رہے ہوتے ہیں اور مزا آپ کو آرہا ہوتا ہے۔ خوشی آپ کو مل رہی ہوتی ہے۔

وہ خوشی جو صرف دے کر ملتی ہے۔

وہ خوشی جو صرف ہار کر ہوتی ہے۔

اس دن اس نے سوچا تھا وہ عدیل سے بات کرے گی وہ دونوں اس گھپ خاموشی میں پھر سے ایک دوسرے کے لیے وقت نکالیں گے۔

سب کچھ کہنا اس بار مشکل سا لگ رہا تھا وہ تھوڑی حیران اور تھوڑی دکھی ہوئی پہلے تو اتنی سوچ کا تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔

اسی شام عدیل ایک اور حیران کن خبر لایا، اور وہ یہ خبر تھی کہ اسے کسی دوست کے توسط سے قطر میں کام مل گیا ہے۔ اس نے علینہ کو بتایا تھا، بتاتے وقت آنکھیں چمکی تھیں وہ خوش تھا، اسے ایک عرصے بعد کام ملا تھا۔

وہ بیٹھ کر پوچھنا چاہتی تھی کہ میں بھی تو تمہیں بہت عرصے بعد ملی تھی عدیل، اور بہت مشکل سے ہی ملی تھی مگر اس کی خوشی دیکھ کر پوچھ نہ سکی۔ اس نے خوشی خوشی اجازت مانگی۔

"علینہ، میں چلا جاؤں قطر..... یہ بس ایک آدھ سال کی ہی تو بات ہے..... جوں ہی ممکن ہوا تمہیں پاس بلالوں گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں ایک مدت بعد چمک دیکھ رہی تھی اس نے سوچا شادی کی پہلی رات بھی اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ یہ تو کیا یہ بھی چمک تھی ایسی ہی..... یہ بھی پوچھ نہیں سکی تھی۔

"تم کچھ کہو نہ علینہ.....!" وہ بس مسکرادی۔

"تم خوش ہو نا علینہ؟ مجھے کام ملا ہے۔"

"میں خوش ہوں عدیل..... تمہیں کام ملا ہے، اس لیے نہیں۔ تم خوش ہو اس لیے میں خوش ہوں۔"

"پگلی..... وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے لپٹ گیا تھا اور اس کے پاس کوئی احساس ہی نہ تھا۔

"علینہ ہم بہت خوش رہیں گے..... اور ہم بہت جلدی ملیں گے..... ہیں نا؟"

اگلے چند دن تک وہ ایسی ہی باتیں کرتا رہا اور اس کے سامان ضرورت کی ہر چیز رکھتی گئی کہیں اسے کوئی دقت نہ ہو، کوئی مشکل نہ ہو۔ اور کئی بار کہتی رہی..... اپنا خیال رکھنا۔ اور وہ بچوں کی طرح اسے بہلاتا رہا کہ.....

"دیکھو اب تو میں بہت سارے کام اپنے خود ہی کرلیا کرتا ہوں۔" جیسے بچہ خوش ہو کر ماں کو بتاتا ہے کہ ماں دیکھو میں بڑا ہو گیا ہوں۔ وہ بس اس کی باتوں پر مسکراتی رہی۔

اس شام وہ سینما گئے فلم دیکھنے، باہر ڈنر کیا، آئس کریم کھائی۔

"اب موسم بہتر ہو رہا ہے، آئس کریم کھالوں؟" وہ اس سے بچوں کی طرح پوچھ رہا تھا۔

"ہاں کھالو..... اس بار تم بہار کیسے مناؤ گے عدیل؟ کیا بالکل ویسے؟ جیسے ہم نے ویلنٹائن ڈے منایا تھا آدھا لڑتے ہوئے اور آدھا ہنستے ہوئے۔"

وہ کچھ لمحوں کے لیے چپ ہو گیا تھا۔ پھر کہنے لگا۔

"ہم روز بات کریں گے علینہ..... ہم ہر وقت ساتھ میں رہیں گے۔ روزانہ رات کو تم مجھے دن بھر کی روٹین بتانا۔ روزانہ رات کو میں تمہیں دن بھر کی روٹین بتاؤں گا۔ ہم ہر ایک چھوٹی بڑی بات ایک دوسرے کو بتایا کریں گے۔ بس ایک سال، صرف ایک سال، پھر ہم ساتھ ہوں گے اگر اس ایک سال میں مجھے تمہیں بلانے کی سہولت نہ ہوئی تو میں لوٹ آؤں گا۔" وہ کیسے کیسے وعدے کر رہا تھا۔ مشکل مشکل والے۔

وہ ہنس رہی تھی۔ بول رہی تھی، پر اندر دکھ بج رہا تھا اللہ جانے کس بات کا دکھ تھا جو اس قدر گہرا تھا وہ بس سنتی رہی عدیل کی یہاں تک کہ اس کے جانے کا وقت آ گیا اور اس دن اسے خیال آیا۔

"علینہ..... یار..... تم اکیلی کیسے رہو گی؟" اور علینہ کی آنکھوں میں چمک اتری۔ کہ کاش وہ کہہ دے میں نہیں جارہا علینہ..... تم اکیلی کیسے رہو گی۔

"سنو..... تم روزی کو یہاں بلالینا۔"

"روزی اپنا گھر چھوڑ کر کیوں آئے گی۔"

"پھر تم ادھر چلی جانا۔"

"میں اپنا گھر چھوڑ کر ادھر کیوں جاؤں گی؟"

"اچھا سنو..... تم منان سے کہو وہ اپنے محلے میں کوئی چھوٹا سا کاٹیج دیکھے تمہارے لیے۔"

"میں یہ منان سے کیوں کہوں؟"

"کیوں کہ وہ تمہارا دوست ہے۔"

"تو تم میرے کیا ہو؟"

"میں تو تمہارا سب کچھ ہوں..... لو بھلا میرا اور اس کا کیا مقابلہ؟" وہ چڑ سا گیا۔

"تو یہ بندوبست تم کر جاتے نا کہ....."

"کہ.....؟" وہ رک گیا سوٹ کیس بند کرتے ہوئے۔

"کہ کچھ نہیں۔" وہ سر جھٹک کر بیٹھ گئی۔

"تم..... اپنا خیال رکھنا..... دیکھو رات کو کسی کو اپنے پاس بلالینا یا پھر..... دروازے بند کر کے سونا۔"

"تمہاری فلائیٹ نہ مس ہو جائے..... چلو نکلیں۔" وہ خود پر ضبط کیے کھڑی تھی۔

اس نے بیگ اٹھائے اور باہر نکلا، گاڑی آ چکی تھی۔ وہ ٹیکسی والے سے بات کر رہا تھا جبکہ علینہ باہر آئی بیگ اٹھائے وہ اپنا سامان رکھ چکا تھا۔ ایئرپورٹ تک راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔ جیسے یہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ جیسے وہ کچھ سننا چاہ رہی تھی، مگر اتنی خاموشی حائل تھی۔

ایئرپورٹ پر منان اور نینا بھی تھے۔ روزی بھی تھی۔

عدیل جب اندر جانے لگا تو اسے لگا جیسے اس کا دل کوئی دور پار لے کر جارہا ہے۔

عدیل فکرمند بھی تھا، اور اسے فلائٹ نکل جانے کا ڈر بھی تھا علینہ کو بغور دیکھنے سے بھی کترا رہا تھا۔ ڈر رہا تھا کہ دیکھ لے گا تو تھم جائے گا، رکنا پڑ جائے گا اور اس بار وہ رکنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے یہ خود تو سوچنا بھی نہیں چاہا کہ وہ علینہ کے بغیر کیسے رہ پائے گا۔

اسے پتا تھا اگر اس نے ایسا سوچا تو وہ رہ ہی نہیں پائے گا۔ علینہ پر اک سرسری نگاہ ڈال کر، سب سے ملا، علینہ سے بات کی۔ مگر بغیر نظر ملائے ہاں جب اندر چلا گیا تو مڑا نہ تھا، البتہ اس کی آنکھیں نم تھیں، جو علینہ نے نہیں دیکھیں۔ اور علینہ کی آنکھیں نم تھیں، جو وہ بغیر دیکھے آگے بڑھا تھا۔

اس شام واپسی کے سفر پر علینہ نے بس روزی سے اتنا کہا تھا کہ....."میں نے سوچا تھا وہ مڑ کر دیکھے گا۔ وہ کئی بار مڑ کر دیکھے گا۔ پر اس نے تو ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا مجھے۔"

روزی نے اسے بس اتنا کہا تھا کہ "مڑ کر دیکھتا تو رک جاتا۔"

"تو کیا میرے لیے وہ رک نہیں سکتا تھا روزی؟"

"یہی تو محبت تھی کہ اس نے دیکھا کہ اسے پتا تھا کہ وہ دیکھے گا تو کام رک جائے گا۔"

"یہ ہماری محبت کے درمیان کام کیوں آ گیا ہے روزی۔"

"کام آتا ہے علینہ..... اس لیے کہ کام زندگی ہوتا ہے۔"

"زندگی اتنی سخت کیوں ہوتی ہے۔" محبت سے اس قدر مختلف کیوں ہوتی ہے؟"

روزی کے پاس پہلی بار اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"عدیل، علینہ سے بہت محبت کرتا ہے۔" اس

PakiBooks.Site

رات نینا نے کہا۔

منان مسکرا دیا تھا۔ ''میں بھی تو تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''وہ زیادہ کرتا ہے علینہ سے۔''

''تم نے اس کی محبت ناپی ہے؟''

''دکھ رہی تھی......'' وہ اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

''علینہ بھی تو اسے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔''

''میں بھی تو تمہیں چاہتی ہوں منان؟'' وہ فوراً بدک اٹھی منان ہنس دیا یہ سن کر۔

''مگر علینہ زیادہ چاہتی ہے عدیل کو۔''

''تم نے اس کی محبت ناپی ہے؟''

''دکھ رہی تھی......'' وہ مسلسل اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ایک نظر دیکھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اسے اتنی دور جانے کے لیے چھوڑ رہی تھی۔ تم تو مجھے کبھی نہ چھوڑو۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں؟'' وہ پھر بگڑی۔

''میں چاہتا ہوں تم میری قدر کرو۔''

''کرتی تو ہوں اب کیا بانسری بجا کر یقین دلاؤں؟''

''یقین مت دلاؤ۔ یقین آ جاتا ہے، اگر انسان سچا ہے تو۔''

''میں تمہیں کب سچی لگوں گی؟'' خفگی سے دیکھنے لگی۔

''لڑنے کا موڈ ہے کیا؟'' وہ مسکرایا۔

''میری لڑائی میں بھی محبت ہوتی ہے پاگل، ہر کسی کا اپنا انداز ہوتا ہے محبت کرنے کا۔''

''تمہارا تو نرالا ہے۔'' وہ ہنس پڑا ''چلو چائے پلا دو۔''

''خود جا کر بناؤ۔'' منہ بناتے بولی۔

''سوچ لو؟'' وارن کیا۔

''سوچ لیا۔'' کندھے اچکائے۔

''تب بھی بنا دو۔'' اٹھ سے بیٹھ گیا۔

وہ ہنسی۔ ''یہ وار تنا کام گیا تمہارا۔''

''جان بوجھ کر ہارتا ہوں تمہارے آگے۔''

''جانتی ہوں۔ پتا ہے، پتا ہے۔''

''دیکھو یہ میرا انداز ہے محبت کرنے کا۔ اب ہر کسی کا الگ انداز ہوتا ہے۔''

''بڑا بے تکا سا انداز ہے تمہارا۔'' کچن سے بولی۔

''تمہارے ساتھ رہ رہ کر بے تکا بن گیا ہوں۔''

''میرا اس سے بھی برا حشر ہوا ہے تمہارے ساتھ رہ کر۔'' چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے بولی۔

''سوچ لو پھر اب بھی وقت ہے۔'' بہ آواز بلند بولا۔

''بکومت۔ یہ گرم چائے تمہارے سر پہ انڈیلوں گی۔'' ہنسی دبا کر بولی اور کپ دھونے لگی۔ وہ سر پہ آ کر کھڑا تھا اس کے بالوں کی پونی کھینچی بچپن میں بھی ایسے کیا کرتا تھا۔

''ابھی تک گدھے ہو۔''

''یہ گدھا تم نے خود اپنے لیے پسند کیا ہے اب بولو۔''

''اسی کا تو رونا ہے۔'' مصنوعی شکل بنانے لگی وہ گھورنے لگا تو ہنس دی۔ اسے تنگ کرنے کا بھی اپنا مزا تھا۔

☆☆☆

وہ اکیلی گھر پہ تھی۔ ڈاکا پڑا تھا کمرے کی کنڈی چڑھا دی تھی اس نے گھر میں سوائے عزت کے صرف چند جوڑے تھے، کچھ پیسے بیگ میں پڑے تھے، جن سے چور کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کمرے کے بائیں دروازے سے بالکونی میں گیزر کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ یہ شکر تھا کہ فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سوئچ آف کر دیا چور خالی گھر سمجھ کر نکل گیا تھا کچھ پیسے لوٹ کر یہ شکر کہ تجوری الٹاتے ہوئے ضروری کاغذات وہیں چھوڑ گیا تھا تب تک محلے والوں کو احساس ہو گیا تھا دو چار لوگ چھت سے

کسی کے کودنے کی آواز سن کر نکل آئے تھے علینہ نے اپنے کاغذات اٹھائے اس رات محلے والوں کے گھر میں بقیہ رات گزاری تھی اس نے، اگلے دن روزی اس کے پاس آ گئی تھی۔

منان کو گھر پہ ڈاکے کا پتا لگا تھا، وہ اسے لینے آ گیا تھا۔ جس کو اس کے پاس ہونا چاہیے تھا۔ وہ دور تھا اور وہ دوسروں پر ڈپینڈ ہو کر رہ گئی تھی۔ عجیب تھا یہ سب، یا پھر اسے لگ رہا تھا۔

روزی کے چھوٹے سے گھر میں گنجائش نہ تھی، اور وہ مجبوراً وہاں سے آ گئی، حالانکہ روزی نے بہت روکا تھا اسے اس کی ماں بھی بہت محبت کرنے والی تھیں۔ مگر وہ ان کے گھر کے حالات اور بھابھیوں کے تیور دیکھ کر نکل آئی اپنے گھر۔ اس مہینے کا کرایہ ادا کیا تھا۔

روزانہ رات کو تمام دروازوں پر کنڈھا چڑھانے کے باوجود سکون بھری نیند تک نہ آئی تھی۔

منان شام میں آیا تھا اور اس پر بری طرح بگڑ رہا تھا غالباً عدیل کو بھی اسی نے بتایا تھا۔ عدیل نے بھی اسے منان کے ساتھ جانے کا مشورہ دیا تھا یہ تو اسے پتا تھا کہ وہ بھی منان کے کردار کو جانتا ہے اس پر بھروسا کرتا ہے۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کو کسی کے بھی گھر چھوڑ دیتا۔

اس وقت اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ جوائنٹ فیملی کس لیے ہوتی ہیں۔ ایک طرح کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس وقت عدیل کے گھر میں ہوتی تو بڑے دبدبے سے رہ سکتی تھی اسے چوری چکاری کا ڈر نہ ہوتا اس صورت میں نہ دربدری کا...... اس وقت وہ حالات تھے کہ وہ نہ گھر جا سکتی تھی نہ اپنے، نہ عدیل کے، دونوں گھرانوں کی خفگی عروج پر تھی خدا جانے یہ عروج کب ٹوٹتا۔ اسے بالآخر منان کے ساتھ آنا پڑا تھا۔

نینا کا بظاہر رویہ بہت اچھا تھا۔ مگر نجانے کیوں اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کے آنے سے خوش نہیں ہے اس رات وہ مسز شبیر سے بات کر رہی تھی۔ علینہ نے دو چار لفظ سن لیے تھے۔ اور دھک سے رہ گئی۔ کیا اسے اندازہ نہ تھا کہ ان کی دوستی شروع سے اچھی تھی پھر وہ رک کر اپنے آپ کو سمجھانے لگی کہ یہ جو سنا ہے یہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے جیسے اس نے سمجھا، حقیقت وہ نہ ہو اس نے سوچا تھا اس گھر سے عزت کے ساتھ جائے اس نے سوچا نینا کو کچھ بھی کہنے سے بہتر ہے کہ وہ منان کو کہے کہ اس کے لیے یہاں کوئی گھر دیکھے۔ اور اس نے نہیں کیا تو وہ خود کسی سے بات کرے گی اور وہ کر رہی تھی پوچھ پچھ۔ منان نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ وہ اس سے خفا تھا۔

''منان دیکھو...... عدیل کو سال سے پہلے چھٹی نہیں ملے گی تب تک میں یہاں تو نہیں رہوں گی نا۔'' وہ کچن میں کھڑی تھی چاول نکال رہی تھی، اس نے نینا کو اپنے کام کرنے کے لیے مشکل سے قائل کیا تھا۔ نینا بہت اچھی تھی، بالحاظ، بامروت، با اخلاق بس اس کے ساتھ کوئی غلط فہمی لگ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے پتا تھا یہ غلط فہمی بھر جائے گی تو وہ مزید ہلکی پھلکی ہو جائے گی نینا اب بھی کچن میں آ گئی تھی اور اس نے علینہ کا یہ جملہ سنا تھا منان نے ایک لمحہ نینا کی طرف دیکھا تھا پھر علینہ سے مخاطب ہوا تھا،

''عدیل کے لوٹنے سے پہلے تم کہیں بھی جانے کا خیال ذہن سے نکال دو بھابھی۔ عدیل نے بھی مجھے یہی کہا ہے۔''

''دیکھو منان وہ سب ٹھیک ہے مگر......''

''مگر کیا...... مسئلہ کیا ہے تمہیں آخر...... دفتر یہاں سے نزدیک پڑتا ہے۔ ساری سہولت ہے...... گھر ہے۔ روڈ تو نہیں ہے نا۔ نہ فٹ پاتھ ہے۔''

''حد ہو گئی منان...... بات کو کس طرف لے جا رہے ہو...... دیکھو کوئی چھوٹا سا کاٹیج لے دو یار۔''

''چپ کر کے بیٹھ جاؤ تم اب اگر اس موضوع پر بات ہوئی تو لڑائی ہو گی۔'' منان اٹل انداز میں بولا تھا۔

''سمجھاؤ نینا اپنے شوہر کو تم۔''

''میرے سمجھنے سمجھانے سے بڑا ہو گیا ہے۔'' وہ بظاہر تو سادگی سے مسکرا کر بولی تھی، مگر علینہ ٹھٹک گئی تھی دل ہی دل میں۔

وہ علینہ کے ساتھ کتنا فرینک ہے، کتنا خوش ہے۔ نینا نے غور کیا نا چاہتے ہوئے بھی کوئی وہم سنانے کی طرح پیچھے پڑ گیا تھا۔ آج سے نہیں، اسی روز سے جب علینہ کی کال آئی تھی پہلی بار اس کے سامنے۔ کچھ لوگ آخر اتنے مضبوط اور اہم کیوں ہوتے ہیں یہ تو اسے بھی پتا تھا کہ علینہ میں کچھ ایسا ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، پھر اس کا اخلاق، اور لہجہ سب اتنا ٹھنڈا، اتنا خوش گوار کیسے ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

منان اور علینہ دفتر کے لیے ایک ساتھ نکلتے تھے۔ رات کو کپڑے استری کر کے رکھتے وقت دونوں کی گپ لگی ہوتی۔ باتیں شروع ہوتیں تو ختم ہونے کا نام نہ لیتیں۔ علینہ اسے بھی بہت توجہ دیتی تھی، اسے ہر بات میں شامل کرتی تھی، مگر وہ عدم دلچسپی سے اٹھ جاتی یا چپ رہ جاتی یا پھر صرف مسکرا کر رہ جاتی تھی۔ اور اب بھی، وہ کچن سے نکل گئی تھی۔ منان اور وہ کھڑے رہے تھے کچھ دیر، پھر منان بھی باہر آ گیا تھا۔

''جاؤ علینہ کے ساتھ مل کر کچھ پکاؤ۔'' اس سے ٹی وی کا ریموٹ لے کر وہ برابر میں بیٹھ گیا۔

''کیوں میرا ساتھ بیٹھنا تمہیں برا لگ رہا ہے؟'' منان اسے نا سمجھی سے دیکھنے لگا پھر کندھے جھٹک کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ نینا کچھ دیر بے مقصد بیٹھی رہی تھی، پھر اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

''تمہاری مدد کروں؟'' وہ مہمانوں کی طرح پوچھ رہی تھی۔

''نہیں یار بس کر دیا تقریباً۔'' علینہ نے سبزی بھی چڑھا دی تھی اور ساتھ ساتھ منان کی پسند کا بروسٹ بھی بنا لیا تھا۔ ایک ساتھ کیسے وہ اتنے سارے کام کر لیتی تھی۔ اسے تعجب کے ساتھ رشک بھی ہوا تھا۔ مگر ظاہر نہیں کیا۔

ڈائننگ ٹیبل پر منان نے دل کھول کر تعریف کی تھی۔ نینا خاموشی سے کھانا کھاتی رہی تھی نہ تعریف نہ تنقید کوئی تاثر نہیں تھا۔

''تم بھی تو بولو نا نینا......'' علینہ نے اس کی خاموشی نوٹ کی تھی۔

''مجھے تعریف کرنی نہیں آتی۔'' نا چاہتے بھی اس کا لہجہ ترش تھا منان یہ سب مشکل سے ہضم کر رہا تھا۔

''اچھا۔'' علینہ بے وجہ ہنس پڑی تھی۔

''تم مجھ سے زیادہ اچھا پکاتی ہو نینا۔'' اسے اندازہ تھا کہ نینا کیا سوچ رہی ہے۔

''مجھے تعریف سننے کا شوق بھی نہیں ہے۔'' لہجہ عام سا مگر...... علینہ کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی تھی۔

منان اس وقت نینا کو گھور بھی نہیں پایا، البتہ اس کے چہرے پر ناگواری ضرور تھی۔

رات کو علینہ چھت پر تھی، جب منان اس کے پیچھے آیا تھا۔

''تم؟'' وہ حیران ہوئی۔

کیوں...... میں نہیں آ سکتا یہاں۔'' وہ اس کے سامنے آ کھڑا تھا۔

''آ سکتے ہو مگر تمہیں کبھی میں نے چھت پر دیکھا نہیں اتنے دن سے۔''

''پہلے اکیلے آ کر کیا کرتا...... ویسے ٹھنڈ نہیں ہے؟''

''کہاں ٹھنڈ ہے منان...... مارچ شروع ہو رہا ہے کل سے بہار کے دن ہوں گے...... ٹھنڈ گئی اپنے گھر۔'' بہار کے دن کہتے اسے عدیل کے ساتھ کہی گئی بات یاد آ گئی۔

''تم بہار کیسے مناؤ گے۔''

''ہم بہار کیسے منائیں گے۔ تمہیں بہار اچھی لگتی ہے علینہ؟''

''پچھلی بہار پر میں اور عدیل ساتھ تھے اس بار وہ نہیں ہو گا۔''

PakBooks.Site

''اس بار میں جو ہوں۔'' وہ بے ساختہ کہہ گیا تھا۔

''میرا مطلب ہے ہم ہیں، میں اور نینا۔'' علینہ نے اس کی طرف دیکھا تھا بے بسی سے۔

''منان...... کیا کوئی غلطی ہوئی ہے......؟''

''نہیں تو...... تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟'' وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے منان...... تم نینا کو خوش نہیں رکھ سکتے۔''

''کیا تمہیں عدیل نے خوش نہیں رکھا ہوا؟'' وہ الٹا سوال کرتا تھا۔

''عدیل...... میرا، نالائق شوہر...... اسے بس اتنی تسلی ہے کہ ہم مل گئے ہیں، اسے یہ نہیں پتا کہ نباہ کرنا پڑتا ہے مل جانے کے بعد سنبھالنا ہوتا ہے۔''

''وہ گیا تو ہے علینہ۔ تمہارے لیے تو گیا ہے وہ۔''

''رہنے دو منان...... مجھے یہیں دھکے کھانے کے لیے چھوڑ کر۔''

''تم یہاں دھکے کھا رہی ہو؟'' وہ الٹا خفا ہوا۔

''تم مجھے اپنا نہیں سمجھتیں علینہ۔''

''منان...... رشتوں کی باریکیوں کو سمجھا کرو یار۔ عقل سے کام لو...... ہم بہت اچھے دوست ہیں۔ ہمدرد بھی...... مگر نینا تمہاری بیوی ہے۔ اور اسے پسند کیوں ہو گا کہ کوئی عورت آ کر ان کے بیچ مخل ہو۔''

''تم مخل ہوئی ہو؟ مخل ہونے کا مطلب سمجھتی ہو۔''

''سمجھتی ہوں پر وہ تو ایسا ہی سمجھتی ہے نا۔''

''اس نے کچھ کہا ہے تم سے؟''

اس نے کچھ نہیں کہا...... میں اس عورت کو سلام کرتی ہوں کہ وہ ابھی تک چپ ہے۔ دیکھو اگر عدیل کوئی اپنی دوست لے آتا تو مجھے بھی ایسے ہی خدشے اٹھتے...... سمجھنے کی کوشش کرو یہ رشتہ ہی ایسا ہے۔''

''عدیل ایسا نہیں ہے، اس نے تمہیں میرے گھر رہنے کی اجازت دی، مجھ پر اتنا بڑا بھروسا کیا ہے۔''

''حالانکہ دینی نہیں چاہیے تھی۔''

''کیوں؟ کیوں نہیں دینی چاہیے تھی؟'' لہجہ شکایتی تھا۔

''وہ بزدل ہے منان۔ وہ میری ذمہ داری خود نہیں اٹھا سکتا تو اس اُس پر ڈال دیتا ہے۔''

''وہ اتنا بے شعور نہیں ہے علینہ۔ بہت سمجھتا ہے اس اُس کے پاس نہیں...... عبدالمنان کے پاس رہنے کی اجازت دی ہے اور یہاں میں اکیلا نہیں میری بیوی بھی ہے اور وہ انسانوں کی پہچان رکھتا ہے۔ یہ بتاؤ تم اس کے ساتھ ٹھیک سے بات کیوں نہیں کر رہیں؟''

''میری مرضی ہے۔ اتنا وقت نہیں ہوتا میرے پاس۔''

''علینہ...... تمہارے پاس اس کے لیے وقت نہیں ہے؟''

''وہ دفتر ٹائمنگ میں کال کرتا ہے منان۔'' اس لیے کہ وہ رات میں نائٹ ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔''

''وضاحتیں مت دو اس کی طرف سے تم اچھا۔ خود کیا کر رہے ہو...... ابھی تک یہاں کھڑے ہو جاؤ نینا انتظار کر رہی ہو گی۔''

''اور تم یہاں اکیلی کھڑی رہو گی، تارے گننے کے لیے؟''

''ہاں اور ان سارے تاروں میں، میں اپنے نصیب والا تارا دیکھوں گی۔''

''بتاؤں عدیل کو؟ نصیب کا تارا دیکھے گی۔'' دھمکانے لگا۔

''بتاؤں نینا کو۔ لڑکیوں کو کیسے دفتر میں متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہو۔''

''اچھا......؟ بتا دو...... لڑکیاں تو خود ہی دیکھتی ہیں ڈیشنگ جو ہوں اتنا۔''

''شرم کرو کچھ......'' اس نے اس کے بازو پر

مکا جڑا۔

"چلو جاؤ اب......"

"تم بھی چلو نیچے اپنے کمرے میں۔ پھر جاؤں گا۔" وہ ناچار اس کے ساتھ نیچے آئی نینا سامنے لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ان کے ہنسنے بولنے کی ہلکی آوازیں تو نیچے آرہی تھیں۔

"جاؤ اب جا کر سو جاؤ۔ تارے گننے مت بیٹھ جانا۔" منان اسے کہہ رہا تھا۔ نینا نے سمجھا تھا وہ اسے یہاں دیکھ کر ٹھٹکیں گے مگر ایسا کچھ نہ تھا۔

"شب بخیر نینا......" وہ اسے بھی کہہ کر کمرے میں چلی گئی تھی اور نینا عجیب نظروں سے دیکھنے لگی تھی منان کو۔

"چلو...... سونا نہیں کیا۔" منان نے اس سے ریموٹ لے کر ٹی وی آف کیا تھا اور اسے اندر آنے کا کہہ کر خود کمرے میں چلا گیا تھا۔

نینا کا دل چاہ رہا تھا شور مچائے لڑے بھڑے پر نجانے اسے کون سی الجھن لگی تھی، جس نے چپ اور ناگواری دے دی تھی وہ اس کے پیچھے ہی اندر آئی تھی۔

"تم میرے ساتھ تو کبھی چھت پر نہیں گئے۔" وہ اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ "کہنا کیا چاہتی ہو۔"

"جو کہہ رہی ہوں وہ تم سمجھ رہے ہو۔"

"جو کہہ رہی وہ غلط ہے۔"

"پھر جو مجھے نظر آرہا ہے وہ کیا ہے؟"

"تمہارے دیکھنے کا انداز غلط ہے نینا۔ اپنے دماغ سے بھوسا نکال دو۔ جو تمہیں خرافات ڈال رہا ہے۔"

"اور اسے بڑھا تم خود رہے ہو منان۔"

"میری بات سوچنا۔ وہ میری دوست ہے، بہت پہلے سے تھی، میں مشکل وقت میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ سمجھیں تم۔"

"تو پھر اسے پوری طرح اپنالو نا۔" وہ جلے کٹے انداز میں کہہ گئی۔ منان نے اسے سکتے کی سی کیفیت میں دیکھا تھا اور وہ لائٹ بند کر کے بستر تک چلی گئی تھی جب کہ وہ ششدر بیٹھا رہ گیا تھا۔ معاملے کی سنگینی بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

نینا اور منان کی اسے لے کر بحثیں ہونے لگی تھیں۔ اس سے یہ کب برداشت ہوتا۔ اس رات روزی کو یہ کہتے وہ رو پڑی تھی کہ "میرا شوہر دنیا کا بزدل ترین انسان یا پھر احمق ترین انسان ہے۔"

عدیل سے اس نے بات چیت بند کر رکھی تھی ہفتے سے۔ وہ اس سے بات بھی کیا کرتی، بجائے خیال رکھنے کی تاکیدوں کے اس کے پاس اس کے لیے کیا تھا۔

اس رات منان اور نینا کا جھگڑا ہوا تھا منان گھر سے نکل گیا تھا خفا ہو کر، نینا بری طرح رو رہی تھی اس نے اپنا سامان اٹھایا تھا اور نکل گئی تھی گھر سے۔

وہ رات کو دیر سے گھر آیا تو نینا بے فکری سے ٹی وی دیکھ رہی تھی اس نے علینہ کا کمرہ دیکھا۔ پھر چھت پر دوڑ گیا اور نیچے آیا تو پریشان تھا۔

"علینہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں پتا۔"

"تم اتنی انجان کیسے بن سکتی ہو، ٹھیک سے بتاؤ مجھے علینہ کہاں ہے وہ گھر پر نہیں ہے۔" وہ تقریباً دھاڑا تھا۔

"تو میں کیا کروں۔ اگر وہ گھر پر نہیں ہے۔"

"چلی گئی ہے وہ...... ایک بے بس عورت کو گھر سے نکال کر تمہیں کیا ملا؟"

"پہلی بات کہ میں نے انگلی پکڑ کر اسے نہیں نکالا۔ نکالتی تو بھی میرا حق تھا۔ جس عورت کو تم بے بس کہہ رہے ہو، وہ میرا گھر توڑ رہی تھی شوہر چھین رہی تھی مجھ سے میرا......"

اور ایک چھناکے کی آواز سے سحر ٹوٹ گیا تھا جیسے، صرف ایک تھپڑ...... جو کئی بار منان نے روکا تھا ابھی جانے کیا تھا کہ ضبط نہ رہا۔

"مگر وہ کام اب تم نے خود انجام دے دیا ہے۔" تم بھی چلی جاؤ یہاں سے...... تاکہ تمہیں پتا لگے کہ رات کو ایک عورت کا گھر سے نکلنا کیسا ہوتا ہے۔" وہ منہ کھولے منان کو یہ کہتے ہوئے دیکھتی رہی، اور ششدر رہنے کی باری اب اس کی تھی۔ مگر زیادہ دیر نہیں۔

وہ اٹھی تھی، اپنی آناً فاناً چیزیں تھیلے میں بھری تھیں اور نکل گئی تھی۔ گھر سے باہر نکلتے ہی اس نے اپنے سسر کو فون کیا تھا۔ وہ اسے مین روڈ تک لینے آگئے تھے۔ اور وہ بڑے مزے سے مظلوم بن کر سسرال چلی گئی تھی منان کی ماں چپ تھی بہر حال بھتیجی تھی اسے دھواں دھار روتے ہوئے دیکھ کر دل میں اتنی تو نرمی ہوئی کہ چپ رہے۔ سسر نے ماحول گرما دیا تھا۔

اگلے دن نینا کی فیملی بھی یہ سن کر آگئی تھی کہ منان نے نینا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ دونوں گھرانوں میں صلح نہ سہی، بات چیت ہونے لگی تھی۔

منان کی پیشی لگی ہوئی تھی گھر میں۔ ایک طرف نینا کے گھر والے اور دوسری جانب خود اس کے گھر والے تھے۔ سب اس پر برس رہے تھے اسے موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے پانسا پلٹ گیا تھا، نینا مظلوم کو سسرال میں جگہ مل گئی میکے کی ہمدردیاں مل گئیں۔ ماحول سازگار ہو رہا تھا اس کے لیے۔

نینا نے سسرال کے ساتھ رہنے کے لیے ہامی بھر لی تھی اور اسے لگ رہا تھا اب سارا کچھ اس کے حق میں ہے اب منان یہاں قابو میں رہے گا۔ بڑے وقت پر عقل مندی دکھائی گئی تھی۔ سب کچھ سازگار ہوا تھا، مگر اس سب میں، اس ساری رسا کشی میں جو اس نے کھو دیا تھا وہ منان کا اعتماد تھا۔

اعتماد جو سازش یا چالاکی کے بجائے تحمل اور درگزر سے یا پھر محبت سے جیتا جاتا ہے۔

اس دن کے بعد منان نے اسے کہا تھا۔ "آج تم نے سب جیت لیا، میرے گھر والوں کی ہمدردی اپنے گھر والوں کا پیار ایک گھر وہ، جس میں میں کبھی تمہارے ناپسندیدہ انسان کو چند دن کے لیے بھی مدعو نہیں کر سکتا سب کچھ جیت لیا ہے تم نے نینا۔ میں سوچ رہا تھا جس رات میں تمہیں گھر سے جانے کا کہوں گا تم مجھے یہ کہو گی کہ میں کیوں جاؤں یہ میرا گھر ہے اور مجھے تم پر ناز ہوگا۔ میرے دل میں نرمی آجائے گی مگر اس رات اس ایک موڑ سے فائدہ اٹھایا تم نے جو موڑ ہماری زندگی میں آیا تھا۔ اسے تم کوئی اور جواز دے کر بھی موڑ سکتی تھیں مگر تم نے عقل کی بازی کھیلی اور جیت گئیں۔ پر تم یہ نہیں جانتیں یہ میں تمہیں جتا رہا ہوں۔ اس رات تم نے مجھے ہار دیا تھا میرا دل ہار دیا تھا میری محبت ہار دی۔"

نینا کو لگا پل بھر میں یہ سارے گھر کی عمارت کا ملبا ایک آن میں ہی اس پر آ پڑا ہے۔ اور وہ ڈھے گئی ہے۔ شکستہ...... اس وقت خود پر رحم کھانے کے ساتھ اس نے یہ سوچنا گوارا نہیں کیا تھا کہ اسے صرف اپنی ذات سے ہمدردیاں کرنا آتی تھیں، یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

اس رات علینہ کہاں گئی، یہ سوائے علینہ کے کسی کو معلوم نہیں۔ منان، شبیر صاحب کے پاس دبئی آگیا تھا اور پورے دو سال ہو گئے تھے وہ جان بوجھ کر پاکستان نہیں جا رہا تھا۔ نینا کے فون پر فون آرہے تھے اور اس کے پاس جیسے کوئی احساس تھا ہی نہیں۔

پاکستان سے نکلنے سے کچھ دن پہلے عدیل کے ساتھ اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس سے علینہ کا پوچھنے آیا تھا۔ اور اس کے پاس سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہ تھا، تب بھی، اور اب بھی۔

"عدیل کو ابھی تک علینہ کا کوئی پتا نہیں ملا......" وہ شرمندگی سے مسز شبیر کو بتا رہا تھا۔ "وہ پتا نہیں کہاں چلی گئی ...... کن حالوں میں رہی، کس کے پاس رہی، رہی کہ......" آگے وہ کہنے کی سکت نہیں کر پا رہا تھا۔

"اس سب کی سزا تم نینا کو کیوں دے رہے ہو منان؟"

PakiBooks.Site

"اس سب کی سزا میں خود کو دے رہا ہوں بھابھی۔"

"تم غلط کر رہے ہو منان، ایک عورت نے اپنی عقل کے مطابق اپنا گھر بچانے کی کوشش کی تھی۔ ہر انسان اپنے ضبط اور ظرف کے مطابق ہی ردعمل دکھاتا ہے منان تم نے بہت سزا دے دی اسے اب بس کر دو۔"

"کاش وہ تھوڑا سا بھروسا کر لیتی مجھ پر یا پھر صبر سے کام لے لیتی۔ یا پھر وہ رات میری زندگی میں نہیں آتی، جہاں سے سب کچھ بگڑ گیا تھا۔"

"اگر وہ رات نہ آتی تو شاید تمہارے گھر والے کبھی نینا کو بطور بہو تسلیم نہیں کرتے، کبھی وہ ان کے فیور لینے کے لیے ان کی خدمت نہ کرتی، کبھی یہ گنجائش نہیں نکلتی۔ اس کے بعد جو صورت حال پیش آئی اس سب میں تمہارے گھر والوں نے اسے سنبھالے رکھا تھا ایک عورت کو پریگنینسی میں گھر کی دیگر خواتین کے صلاح و مشوروں کی سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

یہ ان ہی دنوں کی بات تھی۔ جب نینا اور اس کے درمیان یہ جنگ چل رہی تھی، جس رات اس نے نینا کو کہا تھا کہ وہ اسے ہار چکی نینا کی طبیعت خراب ہوئی تھی اور ڈاکٹر نے اس کی رپورٹس سے پریگنینسی شو کرائی تھی۔ اور اسے ٹینشن نہ دینے کا کہا تھا۔

مگر وہ اپنے گھر میں رہا اس دوران، ایک بار بھی نینا کے پاس نہیں گیا تھا اور اگلے دو ماہ میں وہ دبئی چلا آیا۔ بزنس کا بہانہ بنا کر اور یہاں آ کر شبیر کے ساتھ لگ گیا ادھر پورا سال نینا نے اسے کتنا مس کیا۔ اسے اس کی کتنی ضرورت پڑی، اس سے جیسے اب اسے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ نینا کی طرح خود غرض تھا یا پھر ہونے کی کوشش کر رہا تھا اب تو اس کا بچہ اگلے ماہ سال کا ہونے والا تھا۔ اسے گھر والے بچے کی تصویریں شیئر کرتے رہتے تھے۔

گھر والوں کے سامنے تو وہ کام کا بہانہ بنا کر نہ آنے کی معذرت کر لیتا تھا مگر اس کی اور نینا کی کالز میں سوائے چند جملوں کے تبادلوں کے بعد یا وہ فون رکھ دیتا یا پھر غصے میں چیخ کر نینا رکھ دیتی۔

"تمہارا بیٹا ہے منان...... نینا چاہتی ہے اس کی پہلی سالگرہ پر اس کا باپ موجود ہو...... اور وہ یہ ٹھیک کہتی ہے۔"

"آپ نے ہمیشہ اسے اور مجھے دو الگ طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، میں یہ نہیں کہوں گا کہ آپ مجھے نہیں سمجھتیں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہماری غلطیوں کی وجہ سے جو خلا کسی کی زندگی میں پیدا ہوا ہے، اسے کون بھرے گا بھابھی! لاکھ خفا ہونے کے باوجود مجھے تسلی ہے کہ نینا میرے گھر والوں کے پاس محفوظ ہے، اس کی اچھی دیکھ بھال ہو رہی ہے، اسے میری اور مجھے اس کی خبر مل رہی ہے۔ ہم کہیں نہ کہیں جڑے ہوئے ہیں۔ مگر عدیل اور علینہ...... جنہیں ایک دوسرے کا کچھ پتا نہیں ہوگا۔"

"دیکھو اس سب کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ میں سمجھتی ہوں، علینہ اگر تمہارے گھر سے گئی تھی تو اسے اپنے یا عدیل کی فیملی کے پاس چلے جانا چاہیے تھا۔ آخر وہ لوگ کب تک حق بجانب ہو پاتے۔ اور اگر نہیں بھی تو وہ کم از کم کسی کے رابطے میں تو رہتی ہی۔ کتنا غیر فطری اور نادان رویہ ہے کہ گم رہ کر اس نے سب کو تکلیف ہی دینا چاہی۔ ہو سکتا ہے اس نے سب کو تکلیف سے بچانے کے لیے یہ سب کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اچھی ہے، مگر یہ بھی ہے کہ تم اس کے لیے اچھا سوچتے ہو۔ مگر تمہاری ذمہ داری وہ نہیں ہے، نینا ہے۔"

"وہ گئی تو میرے گھر سے ہے...... یہ گلٹ تو مجھے مار دے گا۔"

"تم پاکستان جاؤ، ایک بار پھر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرنا مگر گھر والوں کو بتائے بغیر انہیں یہ سب جتانے کی ضرورت نہیں ہے آنٹی بیمار رہنے لگی ہیں۔ صرف نینا نہیں وہ تمہیں مس کرتی ہیں انکل ہیں، پھر تمہارا بچہ ہے۔ دیکھو نینا خود یہاں آ جائے گی۔ تم اس سے اور اپنے بچے سے بھاگ نہیں سکتے، اور بھاگنا بھی نہیں چاہیے۔ عدیل کی طرح غیر ذمہ داری کا ثبوت مت دو منان!

اپنی ذمہ داری پہچانو، بیوی کو پیسے نہیں آپ کی ضرورت ہوتی ہے۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔ تھکا ہوا۔

"مجھے لگتا ہے میں اب اسے وہ محبت نہیں دے پاؤں گا۔ بہت توڑا ہے اس نے مجھے، اپنی جلد بازیوں اور چالاکیوں سے۔"

"اسے رہنے دو، تم سمجھو کہ بس تم ذمہ داری نبھانے جا رہے ہو۔"

"اور اگر محبت نہ ہو تو ذمہ داری ادا ہو سکتی ہے؟"

"اس کے جواب تمہیں خود سے ملے گا۔"

"پہلے تم وہاں جاؤ تو...... انکل آنٹی خوش ہو جائیں گے۔"

"اچھا سوچتا ہوں۔"

"سوچنا چھوڑو، شبیر اگلے ہفتے تمہاری سیٹ کروا رہے ہیں۔"

"واہ...... یعنی سب کچھ طے بھی ہو گیا۔"

"ایک گڈ نیوز سنو کہ ہم بھی تمہارے ساتھ یا تمہارے بعد کچھ ہی دنوں میں دو ہفتے کے لیے پاکستان آ رہے ہیں۔"

"یہ تو اچھا ہوا...... ساتھ ہی چلتے ہیں۔"

"نہیں تمہیں کچھ ٹائم لگے گا ابھی۔" شبیر نے جواب دیا۔ وہ چائے کا کپ خالی کر کے اٹھا تھا۔ تھکن تو اب بھی اس کے چہرے پر تھی اور فکر کے ساتھ شرمندگی بھی، مگر وہ ان کی باتوں سے کسی طور قائل ہو گیا تھا

☆☆☆

عدیل بھی اسے ڈھونڈ نہیں سکا تھا۔ مگر عرشیہ نے اسے ڈھونڈ لیا تھا وہ نیوی بلیو دوپٹے کی قید میں علینہ ہی تھی۔

عرشیہ دوڑ کر اس تک پہنچی تھی

"علینہ، کیسی ہو؟"

"تم عرشیہ......"

"ہاں میں۔ اور مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" عرشیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"یہاں؟ اس طرح۔" علینہ بوکھلا گئی تھی وہ اتوار بازار کے بیچ کھڑی تھی۔ "چلو...... میری خالہ کے گھر چلتے ہیں......" علینہ اسے بالآخر ساتھ لائی تھی۔

خالہ دمے کی مریضہ کھانس کھانس کر نڈھال ہو رہی تھیں۔ اور جب کھانسی کے دوران کچھ وقفہ آتا تو وہ جلدی جلدی ہانپتے ہوئے ایک دو لفظ بول لیتی تھیں۔ وہ عرشیہ کو بتا رہی تھیں کہ علینہ جب سے آئی ہے۔ وہ بے فکر ہو گئی ہیں علینہ ان کا بہت خیال رکھتی ہے۔ بس وہ اتنا ہی کہہ سکیں کہ پھر سے ان کی کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا تھا۔ علینہ نے انہیں دوائی دی تھی نیند کی اور وہ سونے چلی گئیں اپنے کمرے میں۔

"یہاں اور کوئی نہیں رہتا ان کے پاس!"

"نہیں، ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے بیٹی کی شادی ہو گئی ہے وہ کبھی کبھار ان کی خیر خبر لے لیتی ہے۔ بیٹے کو تو اتنی بھی فرصت کم ہوتی ہے۔ اس کی دوسرے شہر جاب ہے اپنی بیوی بچوں سمیت وہیں مقیم ہے۔ یہ پہلے سال میں چند مہینے وہاں رہ آتی تھیں۔ اب ہفتوں کے لیے بھی نہیں جاتیں۔ کل بھی جب میرے کزن شہریار کا فون آیا تو میں نے اسے بہت کہا تھا کہ ان کو اس کی ضرورت ہے مگر وہ میری کہاں سنتا ہے وہ تو پہلے ہی مجھ سے خفا ہے...... میرے گھر والے شہریار کے ساتھ میری شادی کرانا چاہتے تھے۔ تب وہ مجھے بہت لاپروا اور بدتمیز لگتا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ کبھی کسی کو تحفظ نہیں دے سکتا۔ مگر میرا خیال غلط تھا اس نے کم از کم اپنے بیوی بچوں کو تحفظ دے ہی دیا ہے۔"

علینہ اس سے باتیں کرتے ہوئے کچن میں گھس گئی تھی عرشیہ بھی ساتھ تھی۔

"تمہارا عدیل کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں ہے نا؟"

علینہ نے اسے دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔

"وہ تمہیں ڈھونڈنے پاکستان آیا ہوا ہے بہت پریشان ہے جاب چھوڑ دی ہے اس نے...... میرے

PakiBooks.Site

پاس آیا تھا...... بہت فکر مند تھا روزی بھی اس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ بس تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں تمہارے ملنے کا انتظار ہے انہیں۔''

علینہ نے چائے کے لیے پانی رکھ دیا تھا۔

''مجھے نہیں پتا میں نے ایسا کیوں کیا...... مگر میں تھک گئی تھی وہ میرا شوہر ہو کر بھی ذمہ داری نہیں اٹھا پا رہا تھا۔''

اس کا طریقہ غلط تھا علینہ، پر وہ ذمہ داری ہی اٹھانا چاہ رہا تھا۔''

''ہاں...... مجھے دوسروں کے سر تھوپ کر......

میری وجہ سے منان کا گھر ٹوٹ رہا تھا۔

بتاؤ میں کیسے نہ گمشدگی اختیار کر لیتی، تب بھی مجھے پتا تھا کہ عدیل مجھے کہے گا کہ صلح کر لو، نینا کی باتیں سن لو۔ منان کے گھر پر گزارا کرو، یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ روزی کے پاس چلی جاؤ جب وہ دور ہی تھا تو میں اس کے مشوروں کا کیا کرتی۔''

''وہ بہت پریشان ہے علینہ، اس نے بھی تو سب کچھ چھوڑا تھا وہ بھی تو اکیلا ہے۔'' وہ یہ کہتے ہوئے میسج پر کچھ ٹائپ کرنے لگی علینہ کا رخ چولہے کی طرف تھا۔ اور وہ اس نے جسے میسج کرنا تھا کر چکی تھی۔

یہ شہر کا بیچوں بیچ، اتوار بازار کے داہنے طرف منڈی کے عین سامنے والا چوک، پرانی منزل، اوپرا حصہ پیلے رنگ جھڑے روغن کی دو منزلہ عمارت پر، گھر نمبر چار۔ وہ اپنے طریقے سے پتا لکھ کر، مطمئن ہو کر بیٹھی تھی علینہ نے اس کے آگے چائے رکھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے کپ لے کر کچن کے ساتھ بنے چھوٹے سے لاؤنج میں آ گئیں جہاں دو کرسیاں لکڑی کی اور ایک بوسیدہ کھدر کے کور والا گتے کا صوفہ پڑا ہوا تھا۔

باوجود صفائی کے بوسیدگی دیواروں سے لے کر فرنیچر سے عیاں تھی۔

عرشیہ نے چائے پینا شروع کی۔

''تمہیں کچھ اور لینا ہو تو میں نیچے بازار سے لے آؤں؟'' علینہ کو احساس ہوا تھا۔

''نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔ البتہ واپس جاتے ہوئے میں وہ نان خطائیاں ضرور لے کر جاؤں گی جو ابھی نیچے بیکری میں تازہ بن رہی تھیں۔''

''تم کہو تو میں ابھی لے آتی ہوں۔ ویسے تمہارا اس طرف آنا کیسے ہوا۔'' اٹھتے ہوئے خیال آیا تو پوچھ لیا۔

''نہیں تم رکو، ہم بعد میں لے لیں گے۔ میرا اس طرح اتوار بازار میں خریداری کے لیے آنا ہوا۔ مگر تمہیں بھولنا نہیں چاہیے کہ میرا گھر یہاں سے آدھے گھنٹے کے فاصلے پر ہے پیدل اور گاڑی میں منٹ لگتے ہیں آج تو میں واک کرتے کرتے چلی آئی تھی۔''

''تمہاری شادی ہو گئی؟'' علینہ خود کے موضوع سے توجہ ہٹا کر اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔

''محمود نے اپنی مرضی سے شادی کر لی......''

''تم نے اسے روکا نہیں؟''

''نہیں...... جو آپ کے لیے خود نہ رکے اسے روکنا حماقت ہے۔''

''تمہیں دکھ ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

''دکھ تو ہمیں زندگی میں کئی باتوں، اور واقعات سے پہنچتا ہے۔ پھر کیا کیا جائے...... دکھ تو ہوتا ہے آخر...... مگر ڈھل جاتا ہے۔''

وہ چائے ختم کر چکی تھی۔ تب بھی کچھ دیر بیٹھی رہی۔ اور عدیل ہوا کے گھوڑے کی طرح پہنچا تھا۔

علینہ نے شکوہ بھری نظروں سے عرشیہ کو دیکھا تھا۔

''مجھے پتا تھا تم ایسا کرو گی مگر اتنی جلدی یہ نہیں تھا......''

''تم دونوں اپنی شکایتیں آپس میں حل کرو مجھے یقین ہے شکایت شکر میں ضرور تبدیل ہو گی...... مجھے معاف کرنا علینہ...... مگر مجھے یہی ٹھیک لگا۔ پلیز اپنی زندگی کو ضد کی خاطر ضائع مت کرو۔ جو فیصلہ لیا تھا اس پر کاربند رہو۔''

''مجھ سے ایک وعدہ کرو عرشیہ، منان کو پتا نہیں چلے گا میرا۔'' ''انہیں نہیں چلے گا۔ مگر وعدہ نہیں کرتی۔ البتہ میں نہیں بتاؤں گی۔ چلتی ہوں۔''

وہ عدیل کے آتے ہی فوراً چلی گئی۔ اور عدیل کی آنکھوں میں کیا تھا۔ دکھ، شکوہ، کرب، انتظار کی بے چینی اور محبت، وہ جانتی تھی۔ وہ بہت کچھ کہنے والا ہے۔

''مجھ سے کوئی سوال مت کرنا ابھی تھکی ہوئی ہوں۔''

اس نے روکھے انداز میں عدیل کو کہہ دیا۔ اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی ضبط کر گیا۔ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''میں تم سے کوئی سوال نہیں کرتا۔ مگر بتا رہا ہوں۔ میں نے تمہیں بہت یاد کیا تھا۔''

''بکو مت عدیل۔'' وہ رونے سے خود کو روک رہی تھی۔ اس سے نظر چرا رہی تھی۔

''میں تمہارے بغیر زندہ تو تھا۔ مگر خوش نہیں تھا۔ میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا علینہ......'' وہ رو پڑا تھا۔ ''تم کیوں کھو گئی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہے...... تم تب بھی مجھ سے کھو گئیں۔''

''تم مجھے چھوڑ گئے تھے عدیل''

''ہمیشہ کے لیے تو نہیں نا...... گیا تھا سال بھر میں لوٹ آتا۔''

''تم نے نوکری کیوں چھوڑی عدیل۔'' وہ آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے اس سے شکوہ کر رہی تھیں۔

''تم نہیں تھیں، نوکری کس کے لیے کرتا۔''

''تم بہت جذباتی ہو عدیل۔''

''اور تم بہت ضدی ہو علینہ۔''

''تم نے اسی ضدی لڑکی کو اپنے لیے چنا تھا۔''

''اور تم نے اسی جذباتی لڑکے کو اپنے لیے چنا ہے۔''

''تم نے مجھے تھکا دیا عدیل۔''

''تم نے مجھے تھکنے نہیں دیا علینہ۔''

''تم نے مجھ سے جان چھڑانے کے لیے خودکشی کی کوشش کی تھی۔''

''تم نے مجھے چھوڑنے کے لیے گمشدگی اختیار کر لی۔''

''تم کہنا چاہتے ہو کہ تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے؟''

''ہم دونوں نے غلط کیا تھا؟ میں کہنا چاہتا ہوں ہم دونوں غلط کو ٹھیک کر سکتے ہیں۔''

''کیسے؟'' علینہ نے پہلی بار اتنی دیر میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میں تمہاری اجازت کے بغیر کچھ نہیں کروں گا۔ اور تم مجھے بتائے بغیر کچھ نہیں کرو گی، بلکہ ہم دونوں مل کر ایک دوسرے کے لیے کچھ کریں گے۔''

''تم بات پر قائم نہیں رہتے ہو عدیل۔''

''میں بدل گیا ہوں۔ بہادر بھی بن گیا ہوں دنیا کے لیے اور بزدل بن گیا ہوں تمہارے لیے تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''پھر محبت کو بیچ میں لا رہے ہو!''

''تو پھر کسے بیچ میں لاؤں''

''تم سننا چاہتے ہو کہ میں بھی تم سے کہوں کہ مجھے تمہاری بہت یاد آتی رہی؟''

''نہیں میں تمہارے منہ سے سنے بغیر یہ جانتا ہوں کہ ایسا تھا۔'' وہ اس کی بات پر ہنس پڑی تھی۔ وہ کئی دن بعد اس کی مسکراہٹ دیکھ رہا تھا ہنسی سن رہا تھا۔ اس دن کے لیے وہ ترس گیا تھا۔

''میں تمہیں بتا دوں عدیل کہ میں خالہ کو نہیں چھوڑ سکتی۔ انہوں نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب کسی نے میرے لیے دروازہ نہیں کھولا...... میری ماں نے بھی مجھے لوٹا دیا تھا۔ جب تم باہر تھے۔ جب منان کی بیوی مجھ پر برس پڑی تھی۔ جب ان کا گھر خطرے میں تھا۔ جب میں آدھی رات کو گھر سے نکلی تھی۔ تب صرف خالہ تھیں جنہوں نے مجھے پناہ دی تھی۔''

''ہم دونوں خالہ کے ساتھ رہ لیں گے۔ ان کا خیال رکھیں گے۔''

''یہ ان کا بیٹا نہیں چاہے گا۔ کیونکہ یہ گھر شہریار کے نام ہی ہے۔''

PakiBooks.Site

"تو ہم خالہ کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کو ساتھ رکھیں گے؟"

"پہلے ان سے پوچھ لیں، وہ سو رہی ہیں۔"

"ہم مل کر ان کو منا لیں گے علینہ...... بس تم خوش رہو۔ خوش رہا کرو، اور میں تمہیں خوش دیکھ کر خوش ہوتا رہوں گا۔"

اور اس رات وہ کھڑکی سے ستارے دیکھتے رہے۔ اور علینہ نے کہا کہ "ستارے بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔" اور عدیل نے کہا کہ "ان کے ساتھی جب کھو جائیں تو وہ انہیں ڈھونڈتے ہیں۔ ایک ستارہ پورے آسمان میں دوڑتا پھرتا ہے وہ دیکھو جو رینگ رہا ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کو ڈھونڈ رہا ہے اب جب وہ دونوں ملیں گے تو رو دیں گے۔"

علینہ نے عدیل کی نم آنکھوں کو دیکھا۔

"اس بار بہار میں ہم ساتھ ہوں گے عدیل"

"ہر بار بہار میں ہم ساتھ ہوں گے علینہ۔"

وعدہ مشکل تھا، پر وہ عدہ کر بیٹھا تھا۔

علینہ نے آسمان میں رینگتے ستارے کو دیکھا جو ستاروں کے جھرمٹ میں غائب ہو رہا تھا۔

"یہ نظر سے اوجھل ہو رہا ہے عدیل۔"

"یہ اس جھرمٹ میں اپنی محبوبہ کو جا ملے گا۔"

"مگر مجھے تو عرشیہ نے ڈھونڈا تھا۔"

"عرشیہ نے مدد کی تھی۔ مجھے پتا تھا میں تم سے آملوں گا۔ میری محبت روزانہ دنیا کا گول چکر کاٹ کر آتی تھی۔ اور روزانہ کوئی نیا سراغ سمجھ میں آتا تھا۔ میں راستے سوجھ رہا تھا۔ میں تم تک پہنچنے کے نزدیک تھا۔" وہ کہہ رہا تھا اور ستارہ جھرمٹ میں غائب ہو گیا۔ "اور میں تم تک پہنچ گیا ہوں۔"

☆☆☆

وہ دونوں خالہ کو اپنے پاس لے آئے تھے کرائے کے گھر میں شہریار نے مکان بیچ دیا تھا۔

اپنی بہن کو دیکھنے علینہ کی ماں آئی تھی۔ وہ تازہ تازہ شہریار کی بدتمیزی بیان کر رہی تھیں کہ وہ فون کر کے مکان کے بارے میں انہیں بھی دھمکاتا رہا ہے کہ کہیں آبائی مکان میں وہ حصہ لینے کے لیے نہ آجائیں چونکہ نانو نے انہیں جہیز میں امرود کا باغ دیا تھا۔ وہ شہریار سے خائف تھیں۔ انہوں نے بظاہر علینہ سے بات نہیں کی تھی۔ مگر اس کی لائی گئی چائے پی تھی۔ مٹھائی کھائی تھی۔ عدیل ان کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ وہ نپے تلے جوابات دے رہی تھیں۔

علینہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ حالات کچھ نرمی کی طرف چل نکلے ہیں۔

عبدالعزیز نے علینہ اور عدیل کو بلا کر بہت زیادہ برا بھلا کہا تھا۔ مگر کاغذات عدیل کو بہر حال دے دیے تھے کہ......

"میرے بعد یہ گھر اور دوکانیں تمہاری ہی ہوں گی۔ مگر میرے ہوتے ہوئے تم ان سے ایک تنکا نہیں لے سکتے۔"

اپنی بیوی کے نام انہوں نے ایک فلیٹ کر رکھا تھا اپنے سوتیلے بیٹے کی فیملی کو پال رہے تھے۔ کاروبار اچھا چل رہا تھا۔ جس میں ایک دوست پارٹنر شپ تھی۔ عدیل بہر حال کچھ مطمئن ہو کر وہاں سے لوٹا تھا۔

علینہ نے اس کے کاغذات پھر سے جمع کرا دیے تھے نوکری کے لیے ان کے اسی دوست کے پاس۔ اور اس بار ان کا خیال تھا کہ وہ جو بھی کریں گے ایک دوسرے کی مکمل رضا مندی اور صلح سے کریں گے تو صورت حال بگڑنے سے بچ جائے گی۔

اس نے کچھ روز بعد منان اور علینہ کو فوڈ کورٹ میں دیکھا تھا مگر عجیب سی اجنبیت تھی کہ نہ وہ ان کی طرف بڑھے نہ یہ لوگ آگے گئے۔

نیتا مسلسل منان کو نوٹ کر رہی تھی۔ اور منان انہیں نظر انداز کرنے کی کوشش میں ناکام رہا تھا۔

عدیل آگے بڑھ کر منان سے ملا تھا خاصے دوستانہ انداز میں، وہ دور کھڑی رہی تھی۔ عدیل منان کے بیٹے کو گود میں لے کر پیار کر رہا تھا۔

پھر کچھ دیر بات چیت کے بعد وہ اور منان ایک دوسرے سے رخصت لے کر مختلف سمتوں میں

نکل گئے تھے۔ علینہ کو پتا تھا منان کو اس کی فکر ضرور ہو گی جو اسے عدیل کے ساتھ دیکھ کر وہ اب کچھ مطمئن سا نظر آرہا تھا وہ لوگ لوٹ گئے تھے۔

آج اس نے اور عدیل نے روزی کو ڈنر پر انوائٹ کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں گروسری کر کے نکل گئے تھے۔ روزی کی سالگرہ بھی تھی۔ علینہ نے روزی کو یہ نہیں محسوس کرایا تھا کہ وہ یہ ڈنر اس کی سالگرہ کے موقع پر دے رہے ہیں جیسں اپنے وہ اسے سرپرائزڈ کرنا چاہ رہی تھی۔

مگر گھر سے نکلتے وقت روزانہ کی طرح تاریخ کے ہندسے کے سرخ نشان کو دیکھتے ہوئے وہ پہلے سے اس سرپرائز کے بارے میں جان چکی تھی۔

☆☆☆

آج ہم نے علینہ کو دیکھا۔

منان نے اپنی ڈائری میں سالوں بعد ایک صفحہ لکھا تھا۔ اسے عدیل کے ساتھ دیکھ کر بہت خوشی ہے۔

یہ جان کر دکھ ہوا کہ نیتا ابھی تک مجھ پر بھروسا نہیں کرتی۔ وہ مجھے مسلسل نظر میں رکھے ہوئے تھی۔

میں پاکستان آگیا ہوں پچھلے دو ہفتوں سے یہیں ہوں۔ بھابھی اور شبیر بھائی کل آرہے ہیں، ہم انہیں لینے ایئرپورٹ تک جائیں گے۔ اصولاً مجھے وجانا چاہیے۔ مگر نیتا سو رہی ہے، اور میرے بازو پر منے کا سر ہے میں پچھلے دو ہفتوں سے اسے ساتھ سلاتے ہوئے سوچتا ہوں کہ اب بھی میں اپنے بیٹے کو خود سے جدا نہیں کرسکوں گا نہ کرنا چاہوں گا۔ امی ابو کو میری ضرورت ہے۔ اس لیے کوشش کروں گا یہیں سیٹل ہو جاؤں پوری طرح سے، میں اپنے والدین سے ان کا اور خود سے اپنا بیٹا جدا کر کے خوش کیسے رہ پاسکوں گا۔

نیتا خوش ہے کہ میں آگیا ہوں۔ مگر میرے دل، میں جو ایک کانٹا تھا وہ ابھی تک موجود ہے۔ میں پوری طرح سے چہک کیوں نہیں پاتا۔ چہک کیوں نہیں پاتا...... شاید بھابھی ٹھیک کہتی ہیں میں نے غیر ضروری امیدیں وابستہ کی ہوئی ہیں۔ میں اب بھی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر تارے دیکھ رہا ہوں یہ موسم بہار کا ہے۔ ہوا خوش گوار ہے۔ ٹھنڈ رخصت ہو چکی ہے۔ مگر رات ٹھنڈی ہوتی ہے تازگی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔

مجھے شاید اسی بات پر خوش ہو جانا چاہیے کہ اس بہار پر میں اپنے گھر میں موجود ہوں۔

اسٹریٹ لائٹ بند ہونے کی وجہ سے آسمان پر تارے صاف دکھ رہے ہیں۔ مجھے اپنے کمرے سے آسمان ہمیشہ نظر آتا ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں ایک تارہ رینگتا ہوا کہیں جھرمٹ کی طرف جا رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ ستارہ کس کا ہے۔

شاید ہر دیکھنے والے کی طرح مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے کہ وہ تارہ میرا ہے۔ تو پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ مجھے آخر کس کی تلاش ہے۔

اس سے پہلے کہ نیتا جاگ جائے...... مجھے سونا چاہیے وہ لیمپ بند کر کے ڈائری تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے سو گیا۔ یہ جانے بغیر کہ صبح سویرے اس کے جاگنے سے پہلے نیتا نے وہ ڈائری کھسکا لینی ہے۔ یہ صفحہ پڑھنا ہے۔ پڑھ کر مسکرا دینا ہے اور ڈائری دوبارہ احتیاط سے تکیے کے پہلو میں دے دینی ہے۔ اب جس دن وہ ڈائری کے اگلے صفحے پر اپنا نام لکھ کر بند کر دے گی۔ اور ڈائری واپس رکھ دے گی۔ اور رات کو نیتا کے سو جانے کے بعد وہ ڈائری کھولے گا۔ اس کا نام دیکھے گا تو اسے پتا چل جائے گا کہ نیتا ہر روز اس کی ڈائری پڑھ لیتی ہے۔

آج رات سونے سے پہلے نیتا نے یہ بات سوچی ہے اور وہ جو تکیے کے کونے کے پاس روزانہ ڈائری رکھ کر سو جاتا ہے۔ اور رات کو ڈائری کے کسی بیچ پر میلاہٹ کوئی تھوڑا مڑا ہوا اور بے ہنگم انداز میں ڈائری تکیے کے نیچے رکھ دی گئی۔ یہ سارے آثار جان کر وہ کیا نہیں جان سکتا کہ نیتا ہر روز اس کی ڈائری پڑھتی ہے اور وہ ہر روز ڈائری اس طرح تکیے کے نیچے رکھتا ہے کہ کوئی آسانی کے ساتھ کھسکا لے۔

نبیلہ خان

منان دوسری جانب رخ کیے لیٹا ہوا مسکرا رہا ہے یہ سوچتے ہوئے

☆☆☆

جوتشی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تم کیوں نہیں پوچھتیں؟ کیا ہاتھ دیکھاؤں پر تمہارا یقین نہیں ہے؟ یا ستاروں کی چال دھوکا دے دیتی ہے۔"

حالانکہ وہ جوتشی کسی حد تک جان گیا تھا کہ سب سے پیچھے کھڑی لائن میں عرشیہ کی نظریں جو مختلف منظروں میں گم تھیں وہ لاشعوری طور پر یہیں توجہ رکھتی ہے۔ یہاں تک اس کے مڑ کر دیکھنے پر یہ بھی جان گیا کہ وہ بھی کسی حد تک جانتی ہے۔

آپ جیسے لوگوں نے اس علم سے کمانے کے ذریعے ہی بنائے ہیں۔ کیوں لوگوں کو متجسس کر کے کھینچ لیتے ہو۔ دو چار کمزوریاں پکڑ کر کسی کا ایمان جیت جانے سے کیا حاصل۔"

"لڑکی۔ ہر علم والا اپنے علم سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اگر تمہیں اعتراض ہے تو مکتب سے استادوں کو نکال دو یا پھر ان کا رزق بند کردو، تنخواہیں بند کر کے......"

"مگر کسی کا رزق کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوتا......"

"تم جانتی ہو کہ نجوم ستر فیصد سچ بولتا ہے۔ تب بھی......"

"میں جانتی ہوں، مگر باوجود اس کے میں نہیں چاہوں گی کہ ہم اپنے مستقبل کا خود ہی تعین کر کے وقت سے پہلے کم ہمت یا مایوس ہو جائیں، یا پھر بے پناہ خوش گمان۔"

میں نے لوگوں کی طے شدہ زندگیوں کو بدلتے ہوئے دیکھا ہے ہونا باقی خیر وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ لکیریں بدل جاتی ہیں۔ کوششیں کام کر جاتی ہیں۔ چار چاند لگ جاتے ہیں قسمتوں کو اور سب کچھ طے شدہ ہونے کے باوجود بھی انسان کا ذہن اپنی خواہش کے پیچھے دوڑتا ہے۔ چھلانگیں بھرتا ہے۔

میں نے دیکھا ہے جوتشی، انسان خوابوں کے پیچھے مرتا ہے اور کبھی کبھار یہ خواب اسے خوش رہنے کی چند گھڑیاں دے دیتے ہیں۔"

"تم پھر سے اندھیرے میں جا رہی ہوں لڑکی، علم سے لاعلمی کی طرف نکل رہی ہو۔ اس سے اچھا تھا تم تکمل کرتیں۔ اس سے اچھا تھا تم علم سے کام لیتیں اس سے اچھا تم سمجھنے کی صلاحیت کو استعمال کرتیں۔"

جوتشی جوش میں تھا۔ اور غصے میں بھی اور وہ ہنس پڑی۔

"میں رلی سے انجانی ہو کر اپنی زندگی کا دھاگا اسی طرح بنوں گی۔ جیسے کوئی عام سی لڑکی ہوتی ہے۔ مجھے مستقبل کی پیش گوئیوں کی پروا نہیں ہے میں آج اپنی ماں کے لیے کچھ لے کر جاؤں گی۔ ڈیڈ کی خواہش پر ان کا آفس جوائن کرلوں گی۔ یہ جانے بغیر کہ یہ کام میرے لئے کتنا کلی ثابت ہوگا۔ میں بس کام کرنا چاہتی ہوں۔ تقدیر بتانے والے سے، تقدیر بنانے والا بہت بڑا ہوتا ہے جوتشی۔" عرشیہ نے شہر کی مصروف شاہراہ سے نکلتے ہوئے جوتشی کی کوٹھی میں آخری جملہ پھینکا تھا۔ اور کوٹھی پھلانگ کر، شاہراہ عبور کرگئی تھی۔ اور وہ جوتشی اس کے آخری جملے میں محفوظ ہوگیا تھا۔ جسے پتا تھا کہ زیادہ دیر نہیں، وہ تو اپنے کام میں مگن ہونے والا ہے مگر یہ لڑکی جس نے اپنی راہ بدل دی ہے۔

یہ کس سمت جاکر زندگی پائے گی۔ کچھ اندازوں کے پراونچے ہوتے ہیں۔ بظاہر اسے خسارہ دکھ رہا تھا۔ مگر لڑکی کے آخری جملے کا اثر بولتا تھا۔

وہ خواب دیکھنے والوں کی راہ پر چل پڑی تھی۔

☆☆

''زرینہ او زرینہ کہاں مرگئی ہو۔ بچی کا رو رو کر برا حال ہوگیا اور اس دیوانی کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ ارے تیرا بیڑا غرق ہو اب ہوش کے ناخن لو۔ بھوک سے بچی کا برا حال ہے۔'' ساس نے پیچھے سے آکر اس کی کمر میں دو چار دھموکے مارے۔ ''ارے بدبخت نہیں کی، میرے جوان بیٹے کو تو کھا گئی اب اس معصوم کی بھی جان لے گی کیا؟''

زرینہ نے خالی خالی نظروں سے اپنی معصوم بچی کی طرف دیکھا اور منہ دیوار کی طرف کرکے لیٹ گئی۔ اس پر ساس کی لعن طعن اور دھموکوں کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ تھک ہار کر ساس ہی بچی کو اٹھا کر لے گئی۔

زرک کو بچپن سے ہی وکیل بننے کا بے حد شوق تھا اور اس نے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے دن رات محنت کی تھی اور اب وہ لاء کالج کا ذہین ترین طالب علم مانا جاتا تھا۔ ابھی وہ ایل ایل بی کے دوسرے سال میں تھا کہ اس کی زندگی کا مشکل ترین دور شروع ہوگیا۔

اسے گاؤں آئے ابھی دوسرا دن تھا۔ وہ اپنی کتابیں لے کر گھر کے پچھلے صحن میں آگیا۔ اسے پڑھتے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ وہ بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اسے یوں لگا کہ کوئی اسے مسلسل دیکھ رہا ہے مگر اس کے اِدھر اُدھر دیکھنے پر کوئی بھی نظر نہ آیا۔ زرک نے اپنا وہم سمجھا اور دوبارہ اپنی توجہ کتاب کی طرف مبذول کرلی، مگر تھوڑی دیر بعد پھر وہی بے چینی اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ کیا مصیبت ہے۔ اس نے جھنجلا کر کتاب کو زور سے بند کیا اور اٹھ کر اپنی کتابیں سمیٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

زرینہ کو زرک کی بے چینی مزا دے رہی تھی۔ وہ کافی دیر سے اسے دیوار کے پار سے چھپ چھپ کر دیکھ رہی تھی اور یہ کوئی آج پہلی بار نہ ہوا تھا۔ زرک جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا، زرینہ اسے یوں ہی چپکے چپکے دیکھا کرتی اور سوچتی کہ کاش کبھی زرک بھی یوں ہی مجھے دیکھے، مگر وہ صرف سوچ ہی سکتی تھی۔ زرک اور زرینہ کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں تھا۔ سوائے پڑوسی ہونے کے۔ وہ بچپن سے ہی زرک کو پسند کرتی تھی۔ اسے زرک کی اجلی اور نکھری شخصیت نے ہمیشہ ہی متاثر کیے تھا۔ بچپن میں بھی وہ عام بچوں کی طرح گلیوں میں کھیلنے کے بجائے گھر میں بیٹھ کر پڑھتا رہتا تھا۔ وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز ہوکر ہمیشہ اپنی کتابوں میں گم رہتا اور اس کے اس جنون نے ہی اسے منزل کے قریب تر کردیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ زرینہ کی سوچ نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ اب وہ زرک کو ٹوٹ کر چاہتی تھی، مگر یہ بات صرف اس کی اپنی ذات تک محدود تھی۔ اس نے آج تک اپنی کسی سہیلی تک کو بھی یہ بات نہیں بتائی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کا اور زرک کا ملنا، زمین و آسمان ایک ہونے کے مترادف ہے۔ زرک ایک بے حد خوب صورت اور مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا جب کہ زرینہ بہت معمولی شکل و صورت کی ایک ان پڑھ لڑکی تھی۔ اور وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھی اس لیے اس نے اپنے دل کی بات کسی پر بھی ظاہر نہیں کی تھی۔ بس جب بھی زرک پچھلے صحن میں پڑھنے بیٹھتا وہ دیوار کے پار چھپ چھپ کر دیکھا کرتی۔ اس سے زیادہ کہ وہ کوئی خواہش بھی نہیں رکھتی تھی۔

دونوں گھروں میں آنا جانا بس ایسا ہی تھا جیسا دو پڑوسیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ خاص خاص موقعوں پر ہی ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہوتا تھا۔ وہ بھی صرف بڑی بوڑھی عورتوں کو، لڑکیوں کو اس بات کی اجازت قطعی نہیں تھی کہ ایک دوسرے کے گھروں میں جاکر دوستیاں بناتی پھریں۔ ان کے قبیلے میں پردے کا رواج بہت سخت تھا۔ اس کے باوجود چھوٹی بڑی عید پر لڑکیاں اپنی بچپن کی سنگی ساتھیوں کے ساتھ مل کر مہندی لگانے کی خواہش رکھتی تھیں۔ بڑی منتوں سے تھوڑی دیر کے لیے کسی کے گھر جانے کی اجازت ملتی وہ بھی کوئی بڑی بی ساتھ ہوتی تو۔

زرینہ چونکہ چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اس لیے اس کی خواہش کم ہی پوری ہوتی۔ کیونکہ اس کے ساتھ جانے کے لیے کوئی بھی تیار نہ ہوتا۔ گھر میں چار بھابھیاں اور ان کے ڈھیر سارے بچوں میں کوئی بھی اس کے لیے فارغ نہ ہوتا۔ ماں بچپن میں ہی ساتھ

چھوڑ گئی اور باپ نے دوسری شادی کرکے اپنا الگ گھر بسالیا تھا۔ اب وہ ہوتی اور تنہائی میں زرک کی یاد ہوتی جس سے وہ اپنا دل بہلاتی۔ زرک کی چھوٹی بھابھی بہت ہنس مکھ اور ملنسار تھی وہ بھی کبھی کبھار زرینہ کے پاس آکر اس سے باتیں کرتی اور کہتی کہ کبھی تو تم بھی گھر سے باہر جاکر دیکھو کسی سکھی سہیلی سے ملو، مگر زرینہ آرام سے اس کی باتیں سنتی اور ان میں سے اپنے کام کی باتیں یاد رکھتی اور وہ کام کی بات وہ ہوتی جو زرک سے متعلق ہوتی۔ زرینہ زرک سے جڑی چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی یوں دلچسپی لیتی جیسے اس سے ضروری کوئی اور بات نہ ہو۔

زرک کہاں پڑھتا ہے، کون سے کالج میں، کون سے شہر میں، کون سے ہوسٹل میں، کیا شوق سے کھاتا ہے، کیا چیز پسند ہے کیا ناپسند کرتا ہے اسے ہر چیز ازبر تھی۔ اسے شاہینہ بھابھی بھی بہت اچھی لگتی تھی کہ وہ ہی تو اس کے زرک کی باتیں اسے بتاتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ شاہینہ بھابھی صرف زرک ہی کی باتیں کرتی تھیں۔ وہ تو اپنے سارے گھر والوں کی باتیں سناتی تھیں، مگر زرینہ صرف زرک ہی کی باتوں کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں یوں چھپا کر رکھتی تھی جیسے اس سے قیمتی خزینہ دنیا میں کوئی اور نہ ہو۔

☆☆☆

''زرک صاحب آپ سے کوئی خاتون ملنے آئی ہے۔'' چوکیدار نے زرک سے آکر کہا تو اس نے حیران ہوکر چوکیدار کی طرف دیکھا۔

''رحیم بابا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھ سے ملنے کوئی خاتون کیسے آسکتی ہے اور وہ بھی رات کے وقت۔''

''پر بیٹا وہ خاتون بضد ہے کہ زرک صاحب سے ملنا ہے۔'' رحیم بابا نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ ایک بار چل کر دیکھ لیں کہ کون ہے اور کیا مجبوری اسے اس وقت بوائز ہوسٹل کی طرف لے کر آئی ہے۔ آپ آئیں، میں اسے ویٹنگ روم میں بٹھاتا ہوں۔'' چوکیدار یہ کہتے ہوئے چلا گیا۔ زرک سوچ میں پڑ گیا کہ کون ہوسکتی ہے یہ عورت۔

''جی فرمایئے۔'' زرک نے ویٹنگ روم میں داخل ہوکر چادر میں لپٹے وجود سے پوچھا۔ سامنے بیٹھی لڑکی زرک کو دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی اور چہرے سے نقاب ہٹایا۔ زرک کے لیے یہ چہرہ بالکل انجان تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی اس سے ملنے کے لیے اس وقت کیوں آئی ہے اور کون ہے۔

''میں آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔'' لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے چوکیدار کی طرف دیکھا اور زرک سے کہا۔ رحیم بابا نے قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔

''جی اب بولیں! ویسے میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' لڑکی کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔

''جی وہ میں زرینہ ہوں۔'' زرک کے لیے شخصیت کے ساتھ ساتھ نام بھی اجنبی تھا۔

''دیکھیے محترمہ! آپ جو کوئی بھی ہیں۔ میں آپ کو نہیں جانتا۔ آپ برائے مہربانی اب یہاں سے جایئے۔ یہ ایک لڑکوں کا ہوسٹل ہے اور یہ کوئی اچھی بات بالکل نہیں ہے کہ رات کے وقت آپ بوائز ہوسٹل میں کسی سے ملنے آئیں اور آپ نے ابھی تک اپنے آنے کا مقصد بھی نہیں بتایا۔ جبکہ میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔'' زرک نے بمشکل اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ اسے غصہ تو بہت آرہا تھا، مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ لڑکی اس سے کیا چاہتی ہے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد لڑکی نے کہنا شروع کیا۔

''آپ مجھے بے شک نہیں جانتے، مگر میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور اگر میں یہ کہوں کہ میں اپنا گھر بار چھوڑ کر صرف آپ کے لیے اتنی دور تک آئی ہوں تو کیا یقین کرلیں گے۔'' زرینہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی بات مکمل کی۔

''یہ کیا بکواس ہے۔ جب میں تمہیں جانتا نہیں تو تم اس طرح کی بات کیسے کرسکتی ہو اور تم آئی کہاں سے ہو۔'' زرک کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ آپ

سے کم پر آتے ہوئے اسے بڑے غصے سے گھورنے لگا۔ زرینہ نے ڈرتے ڈرتے اپنے علاقہ کا نام بتایا۔ جسے سنتے ہی زرک اچھل پڑا۔

''کیا تم عدل کلے سے آئی ہو، مگر تم ہو کون؟ میں تمہیں بالکل نہیں جانتا اور تم یہ سب بکواس کس کے کہنے پر کر رہی ہو۔'' زرک کو بالکل یقین نہیں آیا کہ کوئی لڑکی اتنی دور سے اکیلی سفر کر کے آسکتی ہے۔ وہ بھی اس کے گاؤں کی لڑکی۔ جہاں گھر سے باہر قدم رکھنے پر بھی اتنی پابندی اور سختی کی جاتی ہے۔

''میں نے آپ سے ابھی کہا کہ میں اپنی مرضی اور خوشی سے آپ کے پاس آئی ہوں اور مجھے گھر سے نکلے ہوئے بھی ایک رات ہو چکی ہے۔ اس لیے میری واپسی اب ناممکن ہے۔ میں خان دلاور خان کی بیٹی زرینہ ہوں اور اب میں واپس گاؤں کبھی نہیں جاؤں گی۔ آپ کو خدا کا واسطہ مجھ سے شادی کر لیں۔ میرے بھائی میرے بدلے میں اپنی بیوی لانے کا سوچ رہے ہیں اور میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتی۔ میں آپ کے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کے پاس آئی ہوئی ہوں۔'' زرینہ نے زار و قطار روتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''تمہیں اپنے باپ کی عزت تار تار کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ نکلو یہاں سے۔ میں نے تمہاری بہت بکواس سن لی۔ پتا نہیں کس کا گناہ میرے سر تھوپنے آ گئی ہو۔ دفع ہو جاؤ۔ ہونہہ شکل دیکھو اپنی اور خواب دیکھو۔ ارے تم نے سوچ کیسے لیا کہ میں تم جیسی بدصورت لڑکی سے شادی کروں گا۔ چلی جاؤ میرے سامنے سے ورنہ تمہارے باپ اور بھائیوں سے پہلے میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ آوارہ، بدچلن، بے حیا عورت تو ہوتی ہی اس قابل ہے کہ اسے گولی سے اڑا دیا جائے۔'' زرک نے زرینہ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''رحیم بابا! یہ لڑکی گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ آپ فوراً پولیس کو فون کریں۔ اب پولیس جانے اور یہ لڑکی جانے۔'' زرک نے زرینہ کو چوکیدار کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

''زرک بیٹا! آپ مجھے پوری بات بتائیں پھر ہی کچھ سوچتے ہیں۔'' رحیم بابا ایک ہمدرد اور نیک انسان تھا۔ وہ بھی بیٹیوں والا تھا اس لیے زرینہ کو دیکھ کر بھی وہ غلط نہیں سوچ سکتا تھا۔ رحیم بابا نے پوری بات سن کر اس کا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ لڑکی کو اس کے گھر بھیجنا ہی ایک درست قدم ہوگا اور یہ کام اسے خود ہی کرنا ہوگا۔

''بیٹا اور تاخیر نہ کرو جتنی جلدی ہو سکے اس لڑکی کو گاؤں چھوڑ آؤ۔ ابھی تو یہ بات اتنی پھیلی نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بچی بدنام ہونے سے بچ جائے۔ بہر حال یہ تمہارے گاؤں کے ایک عزت دار خاندان کی بیٹی ہے۔''

''ہونہہ! عزت دار خاندان کی بیٹی۔ اگر اسے اپنے خاندان کی عزت کا پاس ہوتا تو یہ ایسا سوچتی بھی نہ۔'' زرک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر گزرے۔ زرینہ کا رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔ اس نے کل سے کچھ بھی کھایا پیا نہ تھا۔ اب رونے کی وجہ سے کانٹے پڑ رہے تھے اور واپس جانے کے بارے میں سوچ کر اور بھی حالت خراب ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔ ''چلو لڑکی! اس سے پہلے کہ میں تمہاری وجہ سے بدنام ہو جاؤں تمہارے گندے وجود کو وہیں چھوڑ آؤں جہاں سے تم آئی ہو۔'' زرک یہ کہتے ہوئے جھٹکے سے جانے کے لیے مڑا۔ زرینہ کو زور سے چکر آیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

☆☆☆

وہ زرینہ کو سیدھا اپنے گھر ہی لایا تھا تاکہ صورت حال کا اندازہ لگایا جائے۔ زرک کو پہنچتے ہی پتا چلا کہ اس کے بھائی زرینہ کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور ساتھ ہی اس شخص کو بھی جس کے ساتھ زرینہ گھر سے بھاگی ہے۔ انہوں نے ہر طرح سے پتا چلانے کی کوشش کی کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے، مگر زرینہ نے اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کی تھی۔ اس لیے کسی کا بھی دھیان زرک کی

طرف نہیں گیا۔ ویسے بھی وہ گاؤں میں کم ہی ہوتا تھا۔ وہ ایک شریف اور اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان تھا۔ وہ ایک مثالی کردار رکھتا تھا۔

''مورے اس عذاب سے اب ہماری جان کیسے چھوٹے گی۔ میں اسے لے تو آیا ہوں، مگر اس کے گھر والے یہ بات کبھی نہیں مانیں گے کہ میں بے قصور ہوں اور ہم کتنے دن اس کو اس طرح رکھ سکتے ہیں۔ میرا تو سوچ سوچ کر برا حال ہے۔'' زرک نے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے اپنی ماں سے کہا۔

''زرک بیٹا پریشان نہ ہو۔ میں نے تمہارے بڑے بھائی زالان سے کہا ہے کہ وہ خان جہانگیر خان کو بلا کر ساری بات بتا دے۔ ویسے بھی ان دونوں کی آپس میں بہت دوستی ہے۔ وہ سب بھائیوں میں سمجھ دار ہے اور امید ہے کہ وہ آرام سے بات سن لے گا۔'' ماں نے زرک کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اور ہو سکے تو تم اپنے ہوسٹل کے چوکیدار کو بھی گواہی کے لیے بلوا لو۔ یہ ہمارے حق میں بہتر رہے گا۔''

''ٹھیک ہے مورے...... میں آج ہی رحیم بابا کو فون کرتا ہوں۔ اللہ کرے کہ اس مسئلہ سے جلد ہی میری جان چھوٹے۔ مجھے تو اس کی شکل دیکھ دیکھ کر غصہ آتا ہے۔'' زرک نے بے بسی سے کہا۔

☆☆☆

زالان خان آفریدی کافی دیر سے اپنے بھائی زرک خان آفریدی کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ زرینہ سے شادی کر لے کیونکہ اس کے گھر والے اسے واپس لینے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں الٹا وہ زرک کی جان کے دشمن ہو رہے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ زرینہ جیسی کمزور اور بزدل لڑکی اتنا بڑا قدم اکیلے نہیں اٹھا سکتی۔

یہ تو جرگہ کا فیصلہ تھا کہ خون خرابا کرنے کے بجائے آپس میں صلح صفائی سے مسئلے کو حل کیا جائے اور اس کا حل یہ نکالا تھا کہ زرک کی چھوٹی بہن گل بانو کو زرینہ کے بھائی خان عالمگیر خان کے نکاح میں دیا جائے اور زرینہ کا نکاح زرک سے کیا جائے، مگر زرک اس فیصلے کو ماننے سے صاف انکار کر رہا تھا۔

''لالا! میں اپنی بہن کو قربانی کا بکرا نہیں بنا سکتا اور نہ ہی خود اس بدچلن لڑکی سے شادی کروں گا۔'' زرک نے غصے میں اپنے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔

''مورے آپ ہی سمجھائیں اس کم عقل لڑکے کو کہ اگر یہ زرینہ سے شادی نہیں کرے گا تو وہ لوگ اس کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے اور جہاں تک گل بانو کی شادی کی بات ہے تو یہ فیصلہ جرگہ نے کیا ہے اور ہم اس سے منحرف نہیں ہو سکتے۔ یہ کیوں اپنے ساتھ ساتھ ہم سب کا دشمن بن رہا ہے۔ اس کے ایک انکار کی وجہ سے ہمارا خاندان برباد ہو کر رہ جائے گا۔'' زالان نے تھک ہار کر اپنی ماں کی طرف دیکھا جو خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ''ویسے بھی زرینہ بری لڑکی نہیں ہے۔ اگر اس نے نادانی میں ایک غلط قدم اٹھایا ہے تو اس کا ازالہ کیا جا سکتا ہے اور اس نے یہ سب تمہاری خاطر ہی کیا ہے۔ اب تمہارا فرض بنتا ہے کہ اسے سہارا دو۔'' زالان خان نے ماں کو خاموش دیکھا تو ایک بار پھر سمجھانے لگا۔

''لالہ! اگر وہ بری لڑکی نہیں تو آپ خود کر لیں اس سے شادی، ویسے بھی ہمارے قبیلہ میں تو چار چار شادیاں کرنے کا رواج عام ہے اور یہ آپ کی دوسری شادی ہوگی۔'' زرک نے انتہائی جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہاری خاطر بھاگی ہے اور شادی بھی تمہیں ہی کرنی ہوگی۔ جلد یا بدیر اور یہ فیصلہ اٹل ہے اور تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ بہتر ہے کہ گل بانو کی شادی کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی شادی ہو جائے۔ اب میں مزید ایک لفظ بھی نہ سنوں۔ میں نے بہت برداشت کر لیا تمہاری باتوں کو۔ اگلے جمعہ کو گل بانو کی رخصتی ہے اور ساتھ میں تمہارا نکاح بھی۔ یہ ایک پٹھان کی زبان ہے اگر تم اب بھی انکار کرو گے تو تم سوچ لو کہ پھر اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ جمعہ آنے میں ابھی چھ دن باقی ہیں۔'' زالان نے تحکم بھرے لہجے میں کہا اور کمرے سے

باہر نکل گیا۔

پھر سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا کہ زالان خان آفریدی نے چاہا۔ زرینہ کو اس کی محبت مل گئی۔ زرک نے نکاح پڑھوا کر شہر کی راہ لی کہ اس کی پڑھائی کا بہت ہرج ہوا تھا۔ اس لیے اس نے فی الحال اپنی ساری توجہ پھر سے پڑھائی کی طرف مبذول کرلی، مگر کبھی کبھی دل میں ہوک سی اٹھتی تھی کہ کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا، مگر تقدیر سے انسان جیت نہیں سکتا۔ سو اسے بھی ہار ماننا پڑی۔

☆☆☆

آج زرینہ صبح ہی سے بہت خوش پھر رہی تھی کیونکہ آج زرک گاؤں آرہا تھا۔ ان کی شادی کو دو ماہ ہوچکے تھے۔ زرک جب سے شہر گیا تھا واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اب دو ماہ بعد بھی ماں کے بار بار کئی فون کرنے پر آنے کی ہامی بھری تھی۔ زرینہ نے یہ دو ماہ انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزارے تھے۔ گھر والوں کا سلوک اس کے ساتھ بہت برا تھا۔ خاص کر ساس نے تو اس کا جینا حرام کیا ہوا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے زرینہ کو طعنے دیتی رہتی، مگر زرینہ سب کچھ خاموشی سے سہہ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن اس کی محبت رنگ لائے گی اور وہ ان سب کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنالے گی۔ ویسے بھی اس نے گھر کی آدھی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی۔ کام کاج میں وہ شروع ہی سے تیز تھی۔ اب صبح سے کچن میں گھسی زرک کی پسند کی چیزیں بنا رہی تھی۔ یہ احساس ہی اس کے دل کو سکون دے رہا تھا کہ زرک آج اس کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھائے گا۔

''زرینہ ایسا کرو کہ تم بھی جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ زرک کے آنے میں تھوڑی دیر ہے۔ ویسے بھی کھانا اب تقریباً تیار ہے اور ہاں کوئی اچھا سا سوٹ پہننا اور تھوڑا سا میک اپ بھی کرلینا۔'' شاہینہ بھابھی نے آکر زرینہ سے کہا۔ ایک واحد وہی تھی جو زرینہ سے سیدھے منہ بات کرتی تھی ورنہ باقی سب تو اس کی شکل سے بھی بےزار رہتے تھے۔

''مگر بھابھی میرے پاس تو کوئی بھی اچھا سا سوٹ نہیں ہے۔ آپ کو تو پتا ہے کہ میری بھابھیوں نے میری کوئی بھی چیز مجھے نہیں دی ہے۔ میرے کپڑے تک بھی اپنی بہنوں میں بانٹ دیے ہیں۔ میرے پاس صرف دو ہی سوٹ ہیں جنہیں میں دو ماہ سے استعمال کررہی ہوں۔ اب میں اچھا سوٹ کہاں سے پہنوں؟'' زرینہ نے قدرے جھجکتے ہوئے اپنی بات مکمل کرلی۔

''اچھا تم پریشان نہ ہو۔ میں آج ہی خان جی سے تمہارے کپڑوں اور سامان وغیرہ کے لیے بات کروں گی۔ فی الحال تم ایسا کرو کہ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اپنا کوئی سوٹ دیتی ہوں۔ نہا دھو کر پہن لو۔ جلدی کرو زرک نے اس حلیے میں دیکھا تو اس کا دماغ گھوم جائے گا۔ صفائی کے معاملے میں وہ ایسا ہی ہے اور یہاں تو نئی نویلی دلہن کا یہ حال ہے جسے شوہر نے ڈھنگ سے ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ تمہیں تو پتا ہے کہ وہ شروع ہی سے نفاست پسند ہے۔ وہ ہمارے بچوں کو بھی گندے حلیے میں برداشت نہیں کرتا، کہاں اس کی بیوی ایسے حلیے میں اسے ملے ویسے یہ تو ہماری غلطی ہی ہے کہ ایک بار بھی کسی نے تمہاری ضروریات کا نہیں سوچا۔ بس فالتو چیز سمجھ کر گھر کا ایک کونا سونپ دیا۔ کسی نے سچ ہی کہا کہ سہاگن وہ جو پیا من بھائے۔'' شاہینہ بھابھی نے جلدی سے ایک اچھا سوٹ اس کے حوالے کیا اور غسل خانے کی طرف دھکیل دیا۔

☆☆☆

کمرے میں جاتے ہوئے اس کی آدھی جان ہوا ہوچکی تھی۔ صبح سے تو جیسے تیسے اس نے وقت گزار ہی لیا تھا، لیکن اس کی زندگی کی سب سے عجیب رات نے اسے بری طرح خوف زدہ کردیا تھا۔ وہ رات جو ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔ جو رات ساری زندگی کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ وہ اپنی اسی بنیاد سے ڈر رہی تھی کہ جانے اس کی زندگی کا انجام کیسا ہوگا۔ زرک نے ایک بار بھی اس کی طرف نگاہ اٹھا کے نہیں دیکھا تھا۔

PakiBooks.Site

حالانکہ وہ بہت دل سے تیار ہو کر اس کے سامنے آئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اس کی محبت میں اتنی طاقت ہے کہ پتھر بھی موم ہوجائے، مگر یہاں تو دور دور تک شناسائی بھی نہیں تھی محبت کیا خاک ہوتی۔ اب وہ کانپتے ہاتھوں سے دروازے کے پٹ کو پکڑے کھڑی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ کمرے میں بیٹھے شخص سے کلام کرسکے حالانکہ یہ شخص اس کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش تھا۔ اس نے اس شخص کے علاوہ بھی کچھ اور نہیں سوچا تھا، مگر یہ ادراک اسے زندگی کی اس گھڑی ہوا کہ یکطرفہ محبت بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔ اور یہ عذاب شاید اسے زندگی کے آخری لمحہ تک اکیلے ہی بھگتنا تھا۔ وہ ابھی واپس پلٹی ہی تھی کہ زرک کی نظروں کی زد میں آگئی۔ وہ اب بھی اپنی کتابوں میں سر دے کر بیٹھا تھا۔ اچانک اس پر نظر پڑی تو اسے پکار بیٹھا۔

''اے لڑکی ادھر آؤ، کیا اب بھی اپنا پرانا شوق جاری رکھا ہوا ہے۔ ابھی تو چھپ چھپ کر دیکھنے کا اتنا بھیانک نتیجہ مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ کھلم کھلا پتا نہیں کیا ہوجاتا تھا۔ خیر یہ سزا بھی کچھ کم نہیں جو نجانے میں کب تک بھگتوں۔ ایک بات میری کان کھول کر سن و۔ جیسے میری زندگی تم نے برباد کی ہے ویسے میں بھی تمہیں چین سے جینے نہیں دوں گا۔ ہونہہ! بڑی آئی لیٰ کی جانشین اور سنو آئندہ میرے کمرے کی طرف خ بھی مت کرنا، سمجھی تم۔ جب تک میں خود تمہیں نہ اؤں اپنی یہ منحوس صورت دکھانے کی ضرورت ہیں۔ اب جاؤ یہاں سے، سارا موڈ خراب کردیا۔'' ک نے دوبارہ سے اپنی کتاب کھول لی۔ زرینہ کو ی اس عزت افزائی کا اندازہ پہلے سے تھا، مگر کہیں ے نہاں خانوں میں ایک امید کا جگنو بھی ٹمٹما رہا کہ شاید وہ اس حقیقت کو تسلیم کرلے کہ اب وہ اس بیوی ہے۔ مگر دل کی ہر خواہش پوری ہوجائے ایسا ن نہیں۔ ان سب باتوں میں نصیب کا بھی عمل ہوتا ہے۔ اب زرینہ کے نصیب کی بات تھی کہ ے اپنی اچھی بھلی عزت والی زندگی کو خود ہی

ذلت کے اندھیرے میں دھکیل دیا تھا۔ اب یہ اس کا خدا ہی جانتا تھا کہ کب اس کے حالات پلٹا کھائیں گے، لیکن فی الوقت تو ایسا ہونا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔

زرک اپنی تعلیم مکمل کرکے اپنے گاؤں مستقل طور پر آگیا اور زرینہ کی زندگی کا مشکل ترین دور شروع ہوگیا۔ ساس پہلے ہی اس کا جینا حرام کیے رکھتی، مگر اب زرک سے بھی کچی جھوٹی لگا کر اس کو وہ مار پڑواتی کہ الامان الحفیظ۔ زرک اس بری طرح اسے زدوکوب کرتا کہ زرینہ بےچاری لہولہان ہوجاتی، مگر ماں اور بیٹے کو اس پر رحم کے بجائے مزید غصہ آتا۔ زرینہ کی آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے گرتے، مگر اس کے منہ سے کبھی کوئی آواز نہ نکلتی۔ اس میں بلا کا حوصلہ تھا۔ اس نے زرک کو منانے کی اپنی ہر کوشش کی، مگر اس کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ ہاں اتنا فرق پڑا کہ زرک اپنی ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہوکر اپنے قرب سے زرینہ کو نوازنے لگا تھا کہ بہرحال ایک انسان بھی تھا خاص کر ایک مرد جسے اپنی ضرورت کے لیے کوئی چاہیے ہوتا ہے۔ چاہے وہ ناپسندیدہ ہستی ہی کیوں نہ ہو۔

زرینہ روز روز کی مار کے باوجود صبر کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتی تھی کیونکہ اس کے میکے والوں نے مڑ کر بھی اس کی خیر خبر نہیں لی تھی۔ کیونکہ اب تو سب جانتے تھے کہ یہ سب کچھ زرینہ نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ اس میں زرک کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کے میکے والے زرک کی کسی زیادتی کو بھی غلط نہیں سمجھتے تھے۔ زرینہ کے بدلے میں جانے والی گل بانو اپنے گھر میں بہت خوش تھی اور راج کررہی تھی کیونکہ اس سب میں قصوروار صرف اور صرف زرینہ ہی تھی جس نے زرک جیسے شخص سے محبت کرنے کی غلطی کی اور اب وہ اس غلطی کو بھگت بھی خود رہی تھی۔ اس دوران زرینہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ بیٹا اور بیٹی کے آنے سے اس کی زندگی کا محور اب اس کے بچے بن گئے تھے۔ بولتی تو خیر وہ پہلے بھی کم ہی تھی، مگر اب صرف اپنے بچوں سے ہی باتیں

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

کرتی کیونکہ وہ معصوم صرف اس کی باتیں سن سکتے تھے، مگر سمجھ نہیں سکتے تھے۔ کبھی کبھی تو دیکھنے والے سمجھتے کہ زرینہ کی دماغی حالت خراب ہو چکی ہے۔

اس دن کی تیز و تند بارش نے جہاں پرندوں اور جانوروں کو پریشان کیا وہاں انسان بھی ہراساں ہو کر رہ گئے۔ شہروں میں تو بارش سے پھر بھی اتنا برا حال نہیں ہوتا جتنا گاؤں کی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ زرک بھی بارش رکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس بارش نے ان کے گھر کے در و دیوار کو بھی متاثر کیا تھا۔ باہر کی جانب والی دیوار زمین بوس ہو چکی تھی اور چھتوں سے بھی مسلسل بارش کا پانی کمروں میں آ تا رہا تھا۔ اب زرک سوچ رہا تھا کہ چھتوں پر تو مٹی وہ خود ڈال لے گا، مگر دیوار کے لیے مزدور لگوانے پڑیں گے۔ اس کے دونوں بڑے بھائی شہر گئے ہوئے تھے۔ اس لیے یہ کام اسے خود کرنا پڑ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے بارش رکی تو اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ چھتوں پر مٹی ڈال کر پھر کسی مستری کو دیوار ٹھیک کرنے کے لیے لائے گا۔

''زرک بچے اس مسٹنڈی کو مٹی ڈھونے پر لگا دو اس طرح تم جلدی فارغ ہو جاؤ گے۔'' ماں نے زرینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ زرک نے کچھ دیر اس کی متوقع حالت کے پیش نظر اپنی ماں کو حیرت سے دیکھا پھر جیسے اسے اپنی ماں کی آنکھوں میں چھپے انتقام کی تپش نے سب کچھ لمحوں میں سمجھا دیا۔ اس نے اپنی ماں کی آنکھوں کے پیغام کو پوری طرح سمجھا۔ اس کے اندر کا وحشی انسان لمحے کے ہزار ویں حصہ میں بے دار ہوا اور اس نے کسی فیصلے پر پہنچ کر زرینہ کو آواز دی اور اس کے ناتواں وجود کو مٹی ڈھونے پر لگا دیا۔ زرینہ کی حالت اس قابل ہرگز نہ تھی کہ وہ کوئی بھاری کام کر سکے۔ اس کا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا، لیکن ان ظالم ماں بیٹے کے دل میں اس کے لیے رحم کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ آدھے گھنٹے کی مسلسل محنت نے زرینہ کو نچوڑ کر رکھ دیا اور وہ وہیں مٹی کے ڈھیر پر نڈھال ہو کر گر پڑی۔

''اری او حرام خور، بڈ حرام، کھاتے وقت تو تیرے ہاتھ پیر ساتھ نہیں چھوڑتے اور ذرا سا کام کیا کیا جیسے جان ہی نکل گئی۔ چل اٹھ جلدی جلدی ہاتھ چلا تا کہ کام جلدی ختم ہو۔'' اس کی ساس نے آ کے اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور نفرت بھری نگاہ اس پر ڈال کر واپس مڑ گئی۔ زرینہ میں اس کے حکم سے سرتابی کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے اس نے دوبارہ سے تھال میں مٹی بھرنی شروع کر دی۔ دو گھنٹے کی مسلسل محنت سے اب کام کچھ سمٹا تھا۔ زرینہ نے بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔ ورنہ اسے لگ رہا تھا کہ اب گری تب گری۔ ابھی وہ بیٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ اسے لگا اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اسے صرف اتنا یاد رہا کہ اس پر کسی بھاری چیز سے وار کیا گیا ہے۔ پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ بس اس کے سن ہوتے دماغ نے سب سے آخر میں جو بات سوچی وہ زرک کے مرنے کی بددعا تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹروں کی انتھک کوشش سے اس کی اور اس کے بچے کی جان بچالی گئی تھی، مگر سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے ابھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہ تھی۔ اسپتال میں اس وقت اس کے پاس شاہینہ بھابھی اور زالان خان آفریدی کے سوا کوئی نہ تھا۔ زالان خان نے اپنی بیوی کو باہر بلا کر زرینہ کے متعلق استفسار کیا کہ اب زرینہ کی حالت کیسی ہے۔

''خان جی دعا کریں کہ زرینہ کو کچھ نہ ہو ورنہ سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے۔ پتا نہیں زرک جیسے پڑھے لکھے شخص نے ایسی بچگانہ حرکت کیوں کی۔ پہلے تو اس بے چاری سے بیگار لیتا رہا اور آخر میں اس کے سر پر اینٹ دے ماری۔ اس پر ستم یہ کہ لہولہان ہوتی بیوی کو بے یار و مددگار چھوڑ کر باہر کی راہ لی۔ اب ایسی بھی کیا دشمنی کہ اس معصوم کی جان کے درپے ہو گیا۔ اپنے ہونے والے معصوم بچے کا ہی کچھ خیال کر لیتا۔'' شاہینہ بھابھی نے اداس لہجے میں ساری صورت حال اپنے شوہر کے گوش گزار کر دی۔

"خان جی! اگر آپ وقت پر نہ پہنچ جاتے تو یہ بے چاری تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔ اب بھی ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ شاید سر کی چوٹ کی وجہ سے زرینہ کے اعصاب اس کا ساتھ نہ دیں۔ اللہ ہی رحم کرے اس بے چاری بے زبان پر۔" شاہینہ بھابھی کی بات سن کر زلالان گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس وقت سارا قصور اپنا ہی لگ رہا تھا کہ اگر وہ زرک کے ساتھ زبردستی نہ کرتا تو حالات شاید مختلف ہوتے۔

ان بیتے چار سالوں کے ہر لمحے نے زرینہ کو بے طرح دکھ دیے۔ اس کی روح اور جسم دونوں ہی بری طرح گھائل ہو چکے تھے، مگر اب کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ یہ قبائلیوں کے اصولوں کے خلاف تھا کہ جب ان کے خاندان میں کوئی عورت شامل ہوجاتی تو مر کر ہی اس کی جان چھوٹتی۔ زرینہ کی محبت اپنی موت آپ مر چکی تھی۔ اب وہاں صرف اور صرف پچھتاوا تھا اور کچھ نہیں۔

کاتب تقدیر کو زرینہ کی حالت پر رحم آ گیا۔

اسے اسپتال سے آئے دوسرا دن تھا۔ اب وہ کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس تمام عرصے میں اس کی ساس اور زرک نے ایک بار بھی مڑ کر اس کا حال نہ پوچھا تھا۔ ظاہر ہے کہ زرینہ کو اس حال میں پہنچانے کی ذمہ داری بھی ان دونوں پر عائد ہوتی تھی۔ شاہینہ بھابھی اور زلالان خان نے اس تمام عرصہ میں اس کا بے حد خیال رکھا تھا۔ نہ صرف اس کا بلکہ اس کے معصوم بچوں کا بھی۔ اس دن شاہینہ بھابھی اسے اپنے ہاتھوں سے یخنی پلا رہی تھی کہ اس کی ساس بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں شاہینہ سے بولی۔

"ارے اس منحوس کے یہ چاؤ چونچلے اب بس بھی کرو۔ ذرا جلدی سے زلالان خان کو فون ملاؤ اور اسے جلدی آنے کا کہو۔ زرک کی حالت بہت خراب ہے اسے بہت تیز بخار ہو رہا ہے اور وہ بری طرح کانپ رہا ہے۔ تم جلدی سے اس کے لیے دودھ گرم کر کے لاؤ۔ یہ سب اس نحوست کی ماری کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ میرے بیٹے کی زندگی برباد کر کے اسے چین مل گیا۔ لعنت ہو تم پر۔" اتنی پریشانی میں بھی اس کی زبان انگارے اگلنے سے باز نہیں رہی۔ وہ زرینہ کو سخت سست سناتے ہوئے کمرے سے چلی گئی۔

زرینہ کی بددعا جو اس کی زبان سے انجانے میں نکلی تھی کاتب تقدیر نے پوری کر دی۔ ایک ہفتہ موسمی بخار میں مبتلا رہ کر زرک خان آفریدی اس جہان فانی سے کوچ کر گیا اور اپنے ساتھ اپنے اعمال کی گٹھڑی بھی لے گیا جو اس نے اپنی بیوی اور بچوں سے روا رکھے تھے۔ زرک کی ماں کے لیے یہ سزا کم نہ تھی کہ اس کا جوان جہان بیٹا اس سے منہ موڑ گیا تھا، مگر جن لوگوں کے دلوں پر مہریں لگا دی جاتی ہیں وہ کچھ بھی سوچنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے اعمال کی بدصورتی کا احساس شاید روز محشر میں ہی ہوتا ہوگا جہاں انسان پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ وہ اپنی توبہ کا موقع گنوا چکا ہوتا ہے۔

زرینہ کی ذہنی کیفیت سنبھلنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ زرک کے چالیسویں کے اگلے دن ہی اس کے ہاں تیسرے بچے کی پیدائش ہوئی اور اس بار اللہ تعالیٰ نے اسے ایک اور بیٹی سے نوازا تھا۔ وہ اب تک زرک کی موت کے صدمے سے باہر نہیں آ رہی تھی۔ اسے ہر وقت یہ احساس جرم ستاتا کہ زرک کو اس کی بددعا کھا گئی ہے۔

زرینہ کی عدت پوری ہونے میں اب صرف دس دن باقی تھے اور گیارہویں دن اس کا نکاح اس کے بڑے دیور کے ساتھ ہونا قرار پایا تھا۔ کیونکہ ان کے قبیلے کا رواج تھا کہ اگر کوئی عورت بیوہ ہو جاتی تو اس کا نکاح دوبارہ اس گھر کے کسی مرد سے کر دیا جاتا تھا چاہے اس کے لیے عورت رضامند ہوتی یا نہ ہوتی اسے ہر صورت اس فیصلے کو ماننا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہ ہوتی تھی اور یہ سب اب زرینہ کے ساتھ بھی ہونے جا رہا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف، اس کے لاکھ منع کرنے اور رونے کے باوجود خاندان والوں کا فیصلہ اٹل تھا اور بالآخر اسے

اس فیصلہ کو ماننا ہی تھا۔

ذیشان خان آفریدی زرینہ کی زندگی میں بہار کا تازہ جھونکا ثابت ہوا اور اس کی زندگی کے سارے دکھ اپنے دامن میں سمیٹ کر اس کی زندگی کو پرسکون کر گیا، مگر زرینہ کے ذہنی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ کسی بھی خوشی کو محسوس کرتی۔ وہ اپنی زندگی کو مشینی انداز میں گزار رہی تھی۔ ابھی وہ اپنی پچھلی کیفیت سے باہر آنے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ ذیشان خان نے اسے ہر طرح سے اپنے خلوص اور محبت کا یقین دلایا، مگر زرینہ کو یہ سب ایک خواب محسوس ہو رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی آنکھ کھلے گی اور وہ پھر سے وہی پر اذیت زندگی میں آ جائے گی جس میں وہ پچھلے چار سال سے جی رہی ہے۔ اب تو اس کی ساس بھی اس سے چھپتی پھرتی تھی۔ اسے بھی جوان اولاد کی موت نے ادھ موا کر دیا تھا۔ اور ویسے بھی ذیشان خان نے صاف الفاظ میں اپنی ماں سے کہہ دیا تھا کہ جو کچھ اس کی ماں نے زرک کی زندگی میں زرینہ کے ساتھ کیا اب اگر اس نے ایسا سوچا بھی تو اس سے برا کوئی نہ ہوگا اور اب وہ دوسرے بیٹے کو کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ ذیشان نے ہمیشہ اپنے دل میں زرینہ کے لیے ہمدردی محسوس کی تھی۔ اسے اپنی ماں اور بھائی کا رویہ بہت دکھ پہنچاتا تھا، مگر اس وقت وہ بے بس تھا اور صرف خاموش تماشائی بن کر زرینہ پر ہونے والے ظلم دیکھتا رہا تھا، مگر اب قدرت نے اسے موقع دیا تھا کہ وہ اپنے خلوص اور محبت سے زرینہ کے لیے اس گھر میں وہی مقام بنائے جو زرینہ کا حق بنتا تھا۔ جو زرینہ کو کوئی بھی دینے کو تیار نہ تھا۔

☆☆☆

میں زرینہ ذیشان خان آفریدی آج اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن اور اپنے رب کی بہت مشکور ہوں کہ اس نے میری زندگی کی ڈور ذیشان خان آفریدی جیسے پرخلوص اور مہربان شخص کے ہاتھ میں تھما دی۔ میں اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں وہ کم ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے صبر کا اتنا اچھا انعام دے گا یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، کہتے ہیں کہ انسان کو اس کی نیت کا پھل ضرور ملتا ہے۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ کبھی نہیں رہا۔ ہاں، مگر میں نے جو ایک غلط قدم اٹھایا اس کی سزا تو بہرحال مجھے ملنی ہی تھی اور وہ سزا میں نے چار سال بھگتی ہے۔ ماں باپ کی عزت کو پاؤں تلے روندنے والی لڑکیاں برباد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے لیے صرف جسمانی تکلیف ہی سزا کے طور پر رکھی اور میری روح کو ہر آزار سے محفوظ رکھا اور اگر میں خدانخواستہ کسی غلط شخص کے ہاتھ لگ جاتی تو میرا انجام کیا ہوتا۔ یہ میں آج سوچ سکتی ہوں۔ کل جب میں نے گھر سے بھاگنے کی غلطی کی اس وقت میرے ذہن میں کوئی اور بات نہیں تھی سوائے اپنی محبت کو پانے کے اور وہ محبت پانی کا بلبلا ثابت ہوئی۔ جس نے مجھے چار سال قید بامشقت کی سزا بخشی اور پھر میرے پیارے اللہ تعالیٰ نے مجھے بیچ منجدھار سے نکالا اور ذیشان جیسے سلجھے ہوئے انسان کا ساتھ مجھے ملا۔

آج ہماری شادی کو پندرہ سال گزر چکے ہیں اور ہم ایک خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ شروع شروع میں ذیشان کی محبت اور خلوص مجھے محض دکھاوا لگتے تھے، مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس محبت اور خلوص نے مجھے متاثر کرنا شروع کر دیا اور مجھے ذیشان کی باتوں پر یقین آنے لگ گیا اور ساتھ ہی ساتھ میرا اپنی ذات پر اعتماد بحال ہونے لگا۔

ذیشان کی قربت میں مجھے یہ احساس ہوا کہ عورت ایک کھلونا نہیں بلکہ وہ بھی ایک انسان ہے۔ ذیشان ہی کی بدولت میرے میکے والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ لوگ جو کبھی میرے ساتھ اچھوتوں والا سلوک کرتے تھے اور میری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے اب میرے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔

☆☆

نگہت عبداللہ

ہوائیں رخ بدل گئیں

حیدر علی اور احمد علی دو بھائی تھے۔ حیدر علی بڑے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھاوج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔

حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھی، وہ جتنے نرم خو تھے حمیدہ بیگم اس قدر تیز و طرار اور کسی حد تک بدزبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخرہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔

حیدر علی کی تین بیٹیاں سبینہ، خزینہ اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔

سبینہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خزینہ اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خزینہ کا خالہ زاد شرجیل اس کو چاہتا ہے۔

حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حمیدہ بیگم کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں، ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔

چھٹی قسط

PakBooks.Site

لیکن تیمور غزنی کو دیکھ کر ان پر ایسی مرعوبیت طاری ہوئی کہ اس کے سلام کے جواب میں بمشکل سر ہلا سکیں۔ بیٹھنے کا کہا نہ اشارہ کیا جبکہ وہ منتظر کھڑا تھا۔ آخر اسے کہنا پڑا۔

"جی مجھے تیمور غزنی کہتے ہیں۔"

"آں ہاں بتایا ہے خزینہ نے بیٹھو۔" خود پر قابو پانے کی سعی میں وہ کہنے کے ساتھ بیٹھ بھی گئیں۔

"شکریہ" وہ بیٹھا تو کہنے لگا۔ "خزینہ نے آپ کو یہ بھی بتایا ہوگا کہ میرے والدین اس رشتے کے حق میں نہیں ہیں اور مجھے انہیں منانے میں بہت وقت لگ سکتا ہے۔"

"بتایا ہے خزینہ نے ساری باتیں بتائی ہیں اور وہ تمہارا اعتبار بھی کر رہی ہے لیکن یہ نہیں سوچ رہی کہ شادی کے بعد اگر تم نے اپنے والدین کے دباؤ میں آکر اسے ایک طرف کر دیا تو اس کا کیا ہوگا۔" حمیدہ بیگم نے اپنا خدشہ بیان کرنے میں دیر نہیں کی۔

"ایسا نہیں ہوگا۔ میرا مطلب ہے خزینہ کو ایک طرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں شادی کر رہا ہوں۔ اپنی بیوی کو ہر طرح کی سیکورٹی دوں گا اس کے علاوہ آپ جو سیکورٹی چاہیں مجھ سے لکھوا سکتی ہیں۔" تیمور غزنی نے گویا حمیدہ بیگم کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد کہنے لگیں۔

"بیٹا یہ میری مجبوری ہے۔ کیونکہ میری بیٹیوں کے سر پر نہ باپ ہے ان کا نہ کوئی بھائی۔ میں اکیلی عورت۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی اور سب کچھ آپ کے حسب منشا ہوگا۔ باقی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" وہ پوری طرح ان پر حاوی ہو رہا تھا۔ بلکہ ہو چکا تھا۔

"پھر بھی مجھے کچھ تیاری......"

"نہیں میں نے کہا ناں، آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس آپ شادی کا سوچیں اور جہاں آپ کہیں گی میں وہیں انتظام کر دوں گا۔" وہ انہیں آمادہ دیکھ کر ہی بولا تھا۔ حمیدہ بیگم خاموش رہیں۔ پھر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"ارے۔ تم کیوں اٹھ گئے۔ بیٹھو میں چائے بھجواتی ہوں۔" وہ کہہ کر کمرے سے نکل آئیں۔ خزینہ اور شہرینہ دونوں کچن میں تھیں۔ حمیدہ بیگم نے پہلے لوازمات سے سجی ٹرے پر نظر ڈالی پھر بس اتنا کہا۔

"چائے لے جاؤ۔"

"امی میں بھی جاؤں، دیکھوں گی ناں۔" شہرینہ نے اتنی لجاجت سے کہا کہ حمیدہ بیگم نے اجازت دے دی۔

شہرینہ نے جلدی سے لوازمات کی ٹرے اٹھائی اور خزینہ کو آگے چلنے کا اشارہ کیا تو وہ حمیدہ بیگم کو دیکھ کر بولی۔

"امی آپ بھی چلیں ناں۔"

"نہیں بس۔ تم جاؤ۔" حمیدہ بیگم پلیٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تو خزینہ ان کے پیچھے دیکھنے لگی۔

"چلو ناں۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

"ہاں چلو۔" وہ سر جھٹک کر چل پڑی۔ دونوں آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو خزینہ چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر بولی۔

"یہ میری چھوٹی بہن ہے شہرینہ۔"

"السلام علیکم!" شہرینہ نے فوراً سلام کیا تو تیمور غزنی مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اور چائے کے دوران اس سے اس کی تعلیم اور دیگر مشاغل کے بارے میں بات کرتا رہا۔ پھر دوبارہ جلدی آنے کا کہہ کر اٹھا

تھا۔

☆☆☆

"ربیکا۔" حسان صاحب نے کھانے میں مصروف رہ کر اسے مخاطب کیا اور وہ کھانے سے ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"جی ڈیڈی۔"

"تم حمزہ کے گھر گئی تھیں؟" حسان صاحب کی مصروفیت ہنوز تھی۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" ربیکا نے پوچھتے ہوئے ثمرہ کو دیکھا جن کی پیشانی پر ناگواری کی لکیر ابھر آئی تھی۔

"تم میری بات کا جواب دو۔ حمزہ کے گھر گئی تھیں۔" حسان صاحب بہت نارمل پوچھ رہے تھے۔

"جی۔"

"کیوں؟" انہوں نے سوالیہ نظریں اس پر ٹکا دیں لیکن ربیکا نے کوئی جواب نہیں دیا تو قدرے رک کر وہ خود ہی کہنے لگے۔

"ٹھیک ہے میں نے حمزہ کو واپس جاب پر آنے کا کہہ دیا ہے۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا۔" اب وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"لیکن تمہیں میں اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم آفس میں اس کے ساتھ کوئی رابطہ رکھو۔ جس سے لوگوں کو باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔" انہوں نے ابھی بھی نارمل انداز میں تنبیہ کی تھی۔ اگر سخت لہجے میں کرتے تب بھی شاید اس وقت ربیکا کو برا نہ لگتا کیونکہ حمزہ کو واپس بلانے کو وہ اپنی کامیابی سمجھ رہی تھی۔

"تم نے میری بات سنی۔" حسان صاحب نے اسے گم صم دیکھ کر متوجہ کیا تو وہ چونک کر بولی تھی۔

"جی۔ میں آفیشل کام کے علاوہ اس سے کوئی بات نہیں کروں گی۔"

"ہم...... کھانا کھاؤ۔" انہوں نے اس کی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"میں کھا چکی۔" وہ کہہ کر اٹھ گئی۔ ثمرہ نے اسے جاتے دیکھا پھر حسان صاحب سے کہنے لگیں۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں حسان۔ پھر اس لڑکے کو کیوں بلا لیا۔"

"تو کیا کرتا۔ سنا نہیں ربیکا اس کے گھر تک پہنچ گئی۔ اگر کسی دن اس نے حمزہ کو میرے مقابل لا کھڑا کیا تب بتاؤ میں کیا کروں گا۔"

"آپ...... یعنی آپ کچھ نہیں کر سکتے" ثمرہ شاکڈ ہوئی تھیں۔

"مجھے جو ٹھیک لگے گا میں وہی کروں گا۔ تم ٹینشن نہ لو۔" حسان صاحب اکتا کر بولے تھے۔

"اف......" ثمرہ نے اپنا سر پیٹا۔ "یہ...... یہ ٹھیک لگ رہا ہے آپ کو، بجائے بیٹی پر سختی کرنے کے۔"

"جسٹ شٹ آپ۔" حسان صاحب نے غصے سے انہیں خاموش کرا دیا پھر کہنے لگے۔ "ربیکا پر سختی کا نتیجہ جانتی ہو تم وہ ہمارے منہ پر کالک ملنے سے دریغ نہیں کرے گی۔ اور سن لو وہ لڑکا حمزہ ربیکا میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔ ربیکا ہی اسے پریشان کر رہی ہے۔"

"یہ...... یہ آپ سے کس نے کہا۔"

"کسی نے نہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے پتا نہیں کیا نظر آیا ہے اسے اس لڑکے میں کہ اپنا آپ، اپنا اسٹیٹس سب بھول گئی ہے۔ تو اب جو وہ کرتی ہے کرنے دو۔ جب تک ٹھوکر نہیں کھائے گی اس کے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے۔" حسان صاحب غصے میں بولے چلے جا رہے تھے۔

"بس کریں حسان بس کریں۔" ثمرہ روتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئیں پھر بھی کتنی دیر حسان صاحب وہیں

بیٹھے رہے تھے۔

☆☆☆

حمزہ جب سے حسان صاحب کے پاس سے آیا تھا اس کا ذہن ان کی باتوں میں الجھ رہا تھا۔ ایک تو پہلے ہی بخار میں تھا مزید ذہنی انتشار نے نڈھال کر دیا تھا۔ فاخرہ کتنی دیر اس کا سر دباتی رہیں۔ بیلا الگ پریشان تھی آخر ان کا خیال کر کے وہ سوتا بن گیا تھا لیکن اسے ساری رات نیند نہیں آئی۔ صبح کہیں جا کے آنکھ لگی تھی، دوپہر میں خود سے آنکھ کھلی۔ تو حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔

''اماں......'' اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی تھی پھر بھی کرسی پر بیٹھی فاخرہ فوراً متوجہ ہوئی تھیں۔

''اٹھ گئے بیٹا۔''

''پانی......'' وہ اٹھنے کی سعی کرنے لگا۔ فاخرہ نے گلاس میں پانی ڈال کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''کیا ہو گیا ہے بیٹا تمہیں۔ ساری رات بے چین رہے۔ دوا نے بھی اثر نہیں کیا۔'' فاخرہ خاصی متوحش تھیں۔

''بس اماں کبھی کبھی تو بخار آتا ہے۔ اچھا ہے ناں گناہ جھڑ جاتے ہیں۔'' اس نے فاخرہ کی پریشانی دیکھتے ہوئے خود کو سنبھالا تھا۔

''اچھا بس۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو میں تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔'' فاخرہ نے ٹوک کر کہا تو وہ فوراً بولا۔

''ناشتا نہیں اماں ابھی صرف چائے۔''

''کوئی ضرورت نہیں خالی پیٹ صرف چائے پینے کی۔ ساتھ کچھ کھاؤ بھی، پھر دوا بھی لینی ہے۔'' فاخرہ جانے لگی تھیں کہ خزینہ اور شہرینہ آگئیں۔

''السلام علیکم چچی جان۔'' دونوں نے ساتھ سلام کیا اور ساتھ ہی فاخرہ کے گلے لگ گئیں۔

''وعلیکم السلام۔ خوش رہو۔ آج میری بیٹیاں کیسے راستے بھول گئیں۔'' فاخرہ نے خوش ہو کر دونوں کو پیار کیا۔

''بس چچی جان! ابھی امی کی وجہ سے نکلنا نہیں ہوتا۔'' خزینہ کہہ کر حمزہ سے مخاطب ہوگئی۔ ''تمہیں کیا ہوا ہے حمزہ؟''

''بخار کو دعوت دی تھی فوراً نازل ہو گیا۔'' وہ شہرینہ کو دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔

''پریشان کر کے رکھ دیا اس لڑکے نے۔ رات اتنا تیز بخار تھا بچوں کی طرح کراہ رہا تھا۔ خیر تم دونوں بیٹھو میں اس کے لیے ناشتا بنا کر لاتی ہوں۔ ابھی سو کر اٹھا ہے۔'' فاخرہ نے کہا تو خزینہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''آپ بیٹھیں چچی جان۔ ناشتا میں بنا لاتی ہوں۔''

''بیلا سے کہیں اماں۔ وہ کیا کر رہی ہے۔''

''نماز پڑھ رہی ہے۔'' فاخرہ کہہ کر جانے لگیں تو اسے روکتے روکتے خزینہ بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ جبکہ شہرینہ کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت میں کھڑی تھی۔

''تم تو بیٹھ جاؤ'' حمزہ نے کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کتنے عجیب لگ رہے ہو۔'' شہرینہ نے شکل بھی عجیب سی بنائی تھی۔

''عجیب...... مطلب۔'' وہ خود کو دیکھنے لگا۔

''میلے میلے سے۔'' اس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنسنے لگا۔

''دانت بھی برش نہیں کیے چلو اٹھو پہلے اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی تو حمزہ نے یکدم خود کو نڈھال کر لیا۔

نہیں اٹھا جا رہا۔ بہت درد ہو رہا ہے۔''

''درد۔ کہاں درد ہو رہا ہے۔'' شہرینہ کی نظریں اس کے پورے وجود پر بھٹکنے لگیں۔

''سارے بدن میں۔ بخار نے جان نکال دی۔ اف۔'' وہ آواز میں نقاہت سمو لایا تھا۔

''دوا لی؟''

''ہاں کوئی فرق نہیں پڑا۔ دیکھو ابھی بھی کتنا تیز بخار ہے۔'' اس نے اپنی کلائی آگے کی اور جیسے ہی شہرینہ نے بخار چیک کرنا چاہا جھپٹنے کے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ کیا حرکت ہے۔'' وہ گرنے سے بمشکل سنبھلی تھی۔

''تم میری عیادت کو آئی ہو یا میرا پوسٹ مارٹم کرنے'' حمزہ نے اس کا ہاتھ اتنی سختی سے دبایا کہ وہ کراہ اٹھی۔

''حمزہ کے بچے۔''

''کہاں ہیں، کہاں ہیں میرے بچے'' وہ ادھر ادھر گردن گھمانے لگا تو وہ چیخ پڑی۔

''چچی جان!''

''ارے!'' حمزہ نے نہ صرف اس کا ہاتھ چھوڑا اچھلانگ مار کر واش روم میں بند ہو گیا جبکہ اس کی چیخ نما پکار سن کر خزینہ اور بیلا بھاگی آئی تھیں۔

''کیا ہوا؟''

''وہ'' شہرینہ خود بوکھلا گئی۔

''کیا وہ۔ بولو ناں کیوں چلا رہی تھیں۔'' خزینہ نے اس کا بازو جھنجوڑا تو وہ روہانسی ہو گئی۔

''وہ وہاں چھپکلی چھت سے گری ہے۔'' اس نے کونے میں اشارا کیا۔

''لاحول ولا۔'' خزینہ جھنجلائی اور بیلا ہنسنے لگی تب ہی حمزہ واش روم سے نکل کر انتہائی معصومیت سے پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا ہے؟''

چھپکلی سے ڈر گئی'' ۔خزینہ نے سر جھٹکا تو وہ اسے دیکھ کر بولا۔

''ڈرپوک'' شہرینہ دانت پیس کر رہ گئی۔

''بھائی ناشتا تیار ہے۔ یہیں لے آؤں یا ہمارے کمرے میں چلیں گے۔'' بیلا نے پوچھا تو وہ تولیہ ایک طرف ڈال کر بولا۔

''جہاں سب بیٹھیں گے وہیں۔''

''تو پھر آجائیں۔ چلو شہرینہ'' بیلا نے شہرینہ کا ہاتھ پکڑا تو وہ چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

''خیال رکھنا اماں کے کمرے میں بھی چھپکلیاں ہیں۔'' پھر اس کی چوٹی کھینچ کر اس سے پہلے کمرے سے نکلا تھا۔

☆☆☆

تیمور غزنی کے نزدیک حمیدہ بیگم حق بجانب تھیں۔ ان کے خدشات کو بھی وہ بے بنیاد نہیں ٹھہرا سکتا اور

خدشات کی بنا پر ہی انہوں نے جو اپنی بیٹی کی سیکورٹی کا مطالبہ کیا تھا تو اس کے خیال میں وہ بھی غلط نہیں تھا۔ پھر سب سے بڑی بات کہ وہ خود مخلص تھا۔ اس لیے کوئی منفی سوچ اسے چھو کر نہیں گزری اور پوری ایمان داری سے وہ خزینہ کے ساتھ اپنی زندگی پلان کرنے لگا۔

وہ صرف خاندان میں خزینہ کو وہ مقام نہیں دلا سکتا تھا جو سارہ کو حاصل تھا باقی ہر معاملے میں وہ برابری ہی کا سوچ رہا تھا اور اسی سلسلے میں اس نے اس وقت خزینہ کو کال ملائی تھی۔

''جناب کیسے یاد کیا؟'' کال ریسو ہوتے ہی خزینہ کی فریش آواز سماعتوں میں اتری تھی۔

''کیا تم یہ سننا چاہتی ہو کہ تم ہر پل یاد رہتی ہو۔'' وہ سارہ سے کہی باتیں دہرانا نہیں چاہتا تھا یا شاید اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

''آپ کیا ہر بات ہر کام مجھ سے پوچھ کر کریں گے۔'' خزینہ کے پوچھنے پر اس کے منہ سے بلا ارادہ نکلا تھا۔

''تم کیا چاہتی ہو۔''

''ارے۔'' خزینہ بے ساختہ ہنسی تھی۔ ''پھر وہی بات کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ یہ بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں۔''

''میں تمہارے گھر آنا چاہتا ہوں۔ آئی مین ابھی۔'' اس نے کہا تو خزینہ فوراً بولی تھی۔

''ضرور آئیں۔''

''ٹھیک ہے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچتا ہوں اور پلیز کوئی تکلف مت کرنا۔ اوکے۔'' اس نے کہہ کر ریسور رکھ دیا اور چند لمحے سوچنے کے بعد انٹرکام پر اپنے پی اے کو اندر آنے کا کہا پھر بریف کیس کھول لیا۔

''یس سر......'' پی اے کی آواز پر وہ اپنی مصروفیت ترک کیے بغیر پوچھنے لگا۔

''گلشن والا کام ہو گیا......''

''یس سر۔''

''اس کی فائل مجھے دے دیں۔'' اس نے کہا تو پی اے فوراً ہی اپنے روم سے فائل لے کر آ گیا۔

''ٹھیک ہے اس نے پی اے کو جانے کا ارادہ کیا پھر فائل چیک کر کے بریف کیس میں رکھی اور بریف کیس لے کر آفس سے نکل آیا۔

اس کے اندر اگر شوق نہیں تھا تو اضطراب بھی نہیں تھا۔ دل بھی ٹھہر سا گیا تھا۔ گویا تقدیر کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ سکون سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے خزینہ کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تھی۔ گیٹ خزینہ نے ہی کھلا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنو دیکھ کر ذرا سا مسکرایا پھر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہوئے بولا تھا۔

''مجھے آنٹی سے ملنا ہے۔''

''آپ بیٹھیں میں امی کو بھیجتی ہوں۔'' وہ واپس پلٹ گئی تو اس نے آگے بڑھ کر بریف کیس ٹیبل پر رکھ دیا لیکن بیٹھا نہیں۔ کچھ دیر بعد حمیدہ بیگم اندر آئیں تو اس کے سلام کا جواب دیتے ہی بولیں۔

''کھڑے کیوں ہو، بیٹھو۔''

''جی۔'' وہ ان کے بیٹھنے کے بعد بیٹھا تو معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''معاف کیجیے گا میں نے آپ کو بے وقت زحمت دی۔ اصل میں، میں نہیں چاہتا کہ میری طرف سے کوئی کوتاہی ہو۔''

حمیدہ بیگم خاموش رہیں اور انہیں بولنے پر آمادہ نہ دیکھ کر ہی اس نے بریف کیس کھول لیا اور اوپر رکھی فائل

نکال کر ان کے سامنے رکھ کر کہنے لگا۔

''میں نے خزینہ کے نام سے اپارٹمنٹ لیا ہے۔ یہ اس کی فائل ہے آپ دیکھ لیں بلکہ یہ آپ رکھ لیں اور اس دے دیں۔'' اس کے علاوہ وہ بریف کیس میں سے مزید کوئی پیپر نکالنے لگا۔ حمیدہ بیگم دم سادھے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''جی یہ......'' وہ مطلوبہ لفافہ ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔ ''اس میں بینک کا فارم ہے خزینہ فل کر دیں تاکہ ان کا اکاؤنٹ اوپن ہو جائے۔ باقی حق مہر میں آپ جو بھی لکھوانا چاہیں۔''

''بیٹا یہ سب......'' حمیدہ بیگم اندر سے واقعی بوکھلا گئی تھیں۔

''یہ سب...... کچھ بھی نہیں ہے آنٹی میں کوشش کروں گا خزینہ کو کوئی کمی کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور جہاں تک میرے والدین کی ناراضی کی بات ہے تو آپ خود ماں ہیں سمجھ سکتی ہیں کہ والدین زیادہ دیر اپنی اولاد سے ناراض نہیں رہ سکتے نہ ان کی خوشیوں سے منہ موڑ سکتے ہیں۔''

''یہ تو ہے۔'' حمیدہ بیگم قائل ہو گئیں۔

''بس تو آپ سارے خدشات دل سے نکال دیں۔'' اس نے کہا تب ہی خزینہ چائے لے کر آ گئی۔ ٹرے ٹیبل پر رکھی تو حمیدہ بیگم نے ٹوک دیا۔

''صرف چائے!''

''میں بس چائے ہی پیوں گا آنٹی۔ کیونکہ ابھی مجھے بینک بھی جانا ہے۔ یہ کام آج ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اس نے کہتے ہوئے لفافہ اٹھا لیا پھر اس میں سے بینک فارم نکال کر خزینہ کو دیتے ہوئے بولا۔

''اپنا آئی ڈی کارڈ لے آئیں اور یہ ابھی فل کر دیں۔''

خزینہ نے ناسمجھی کے عالم میں حمیدہ بیگم کو دیکھا اور ان کے اشارے پر آئی ڈی کارڈ لینے چلی گئی۔

وہ حمیدہ بیگم پر گرفت کر چکا تھا اور حمیدہ بیگم بھی نادان نہیں تھیں اس کی باتوں اور انداز سے اتنا تو سمجھ گئی تھیں کہ وہ کوئی دولتیا نہیں بلکہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ جب ہی خزینہ کے فارم فل کرنے تک وہ بہت آرام سے اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ البتہ اس کے گھر والوں کے بارے میں زیادہ سوال کرنے سے گریز کیا تھا۔

اور اس بار تیمور غزنی بھی بہت مطمئن ہو کر وہاں سے اٹھا تھا۔

☆☆☆

خزینہ خود کو بے حد خوش قسمت تصور کر رہی تھی کہ اپنی زندگی کے ساتھی کے لیے اس نے جیسا سوچا، چاہا وہی اسے مل رہا تھا۔ شام میں تیمور غزنی کے جانے کے بعد سے حمیدہ بیگم مسلسل اس کی تعریف کر رہی تھیں جس سے اس کی خوشی دوچند ہوئی تھی۔

اس وقت بظاہر ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی کہ حمیدہ بیگم کی پکار پر چونک گئی۔ گردن موڑ کر شہرینہ کو دیکھا وہ ڈرامہ دیکھنے میں مگن تھی۔ تب وہ اٹھ کر حمیدہ بیگم کے کمرے میں آ گئی۔

''جی امی!''

''ادھر آ کر بیٹھو۔ مجھے کچھ بات کرنی ہے'' حمیدہ بیگم نے کہا تو وہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

''دیکھو! مجھے کچھ باتیں پریشان کر رہی ہیں۔ تیمور کی طرف سے نہیں بلکہ اپنے لوگوں کی طرف سے ہم چھڑے چھانٹ لڑکے کو دیکھ کر سوال اٹھائیں گے۔'' حمیدہ بیگم بلا تمہید شروع ہوئی تھیں کہ وہ بول پڑی۔

''لوگوں کو چھوڑیں امی!''

”ہاں میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ حمیدہ بیگم نے کہا تو وہ سمجھی نہیں۔

”کیا مطلب کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“

”میں سوچ رہی ہوں ان ہی دنوں میں سادگی سے تمہارا نکاح کر کے رخصت کردوں۔ اس طرح بات بن جائے گی۔ کہہ سکوں گی کہ ابھی تمہارے ابو کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا اس لیے میں نے کسی کو بلایا بھی نہیں اور سادگی سے بیٹی رخصت کردی۔“

حمیدہ بیگم خاموش ہوگئیں کہ وہ کچھ کہے گی لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔

”بیٹا! اس طرح بھرم تو رہ جائے گا۔ ورنہ سوچو بارات کے نام پر صرف چار آدمی کو آتے دیکھ کر لوگ کیا کیا نہیں کہیں گے۔“ حمیدہ بیگم ٹھیک کہہ رہی تھیں وہ سوچنے کے انداز میں سر ہلانے لگی۔

”تیمور سے بھی میں یہی بات کروں گی۔ ویسے بھی وہ جلدی کا کہہ گیا ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور ادھر اپنے قریبی چند لوگ ہوں گے جنہیں میں یہی بتاؤں گی کہ تیمور کے گھر والے امریکا میں ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے ناں......!“ حمیدہ بیگم نے اس کی تائید چاہی تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”بیٹا! میری مجبوری سمجھو۔ میں لوگوں کی زبانیں نہیں پکڑ سکتی۔“ ان کی عاجزی پر خزینہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”امی! مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جیسا آپ کو ٹھیک لگے۔ اور سچ پوچھیں تو مجھے بھی یہی ٹھیک لگ رہا ہے۔“

”خوش رہو۔“ حمیدہ بیگم نے گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی پھر پوچھنے لگیں۔ ”شہرینہ کیا کر رہی ہے؟“

”ڈرامہ دیکھ رہی ہے۔“

اچھا اسے تم سمجھا دینا کسی کے سامنے زیادہ شیخیاں مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی پھر کہنے لگی۔

”شہرینہ کو تو میں سمجھا دوں گی امی! سبینہ آپا سے آپ کیا کہیں گی۔“

سبینہ کا کوئی مسئلہ نہیں وہ خود بہت سمجھ دار ہے۔ یہاں کی بات اپنے میاں تک کو نہیں بتاتی۔“

”یہ تو ہے، میں بھی نہیں بتاؤں گی۔“ وہ بے ساختہ کہہ کر پلٹ گئی۔

”تو میں شہرینہ کو دیکھتی ہوں۔“ کہتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل آئی۔ شہرینہ ہنوز ڈرامہ دیکھنے میں یوں مگن تھی کہ پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھی۔ اس نے سوچا ٹی وی بند کردے لیکن پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر صحن میں نکل آئی اور یوں ہی ادھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے اس کا دل چاہا تیمور غزنی سے بات کرے لیکن اس نے ابھی تک اپنا سیل نمبر اسے نہیں دیا تھا۔ اس کی اتنی احتیاط پر آج پہلی بار وہ کڑھنے لگی تھی۔

”آپ ایسا بھی نہیں ہوگا کہ اس کے ماں باپ ہر وقت اس کی نگرانی کرتے ہوں گے اور ان کا سیل فون چیک کرتے ہوں گے اگر ایسا ہو تب بھی وہ میرا نمبر سیکریٹ رکھ سکتے ہے۔ صبح بات کروں گی ان سے۔“ اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی وہ اندر آئی تو شہرینہ نے اسے دیکھ کر ٹی وی آف کر دیا۔

”ختم ہوگیا تمہارا ڈرامہ۔“

”ہاں۔ اینڈ ہوگیا۔ زبردست اینڈ۔“ شہرینہ نے کہا تو وہ فوراً بولی تھی۔

”اچھا آپ مجھے سنانے مت بیٹھ جانا۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”امی میری شادی کی بات کر رہی تھیں۔“ وہ کہتے ہوئے شہرینہ کے پاس بیٹھ گئی اور جو کچھ حمیدہ بیگم نے کہا تھا۔ سب اسے بتانے لگی۔

شہرینہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگی جب وہ سب بتا چکی تب انتہائی بور شکل بنا کر بولی۔

”ہائے خزی! ایسی شادی میں کیا مزا آئے گا۔ تم منع کردو۔“

”ہیں، میں کیوں منع کروں۔“ وہ اچھلی تھی۔

”اس کا مطلب ہے تم خوش ہو۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔“ شہرینہ شاکی ہو رہی تھی پھر بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

☆☆☆

وہ ہر پہلو سے سوچنے کے بعد ہی واپس حسان صاحب کے آفس اپنی سیٹ پر آیا تھا۔ جانے اس کی غیر موجودگی کے دوران اس سیٹ کا کام کس نے سنبھالا تھا اس نے جاننے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور نئے سرے سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ لیکن لاشعوری طور پر ربیکا کا منتظر بھی تھا۔ اور وہ لنچ ٹائم سے کچھ پہلے اس کے روم میں آتے ہی خوش دلی سے بولی تھی۔

”ویلکم بیک حمزہ!“ اس نے ذرا سا مسکرانے پر اکتفا کیا تو ربیکا ہاتھ میں پکڑی فائل اس کی طرف بڑھا کر کہنے لگی۔

”یہ ہمارے نئے پروجیکٹ کی فائل ہے۔ اس پروجیکٹ میں شیروانی صاحب بھی ہمارے ساتھ شیئر کریں گے۔ آپ اسے اچھی طرح دیکھ لیں کیونکہ شیروانی صاحب کے ساتھ میٹنگ میں آپ بھی شریک ہوں گے۔ اور صرف شریک ہی نہیں ہونا آپ کو اس پروجیکٹ پر بات بھی کرنی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ اس سے واقف بھی ہوں۔ سمجھ رہے ہیں ناں۔“

”یس میم......“ وہ فائل کھولنے لگا تو روک کر بولی۔

”ایک منٹ...... لنچ ٹائم ہوگیا ہے لنچ کے بعد دیکھ لیجیے گا۔“ حمزہ نے سر ہلا دیا۔

”کیا آپ میرے ساتھ لنچ کرنا پسند کریں گے۔“ وہ کہاں بخشنے والی تھی۔

”شیور......“ اس نے ذرا مروت نہیں برتی فوراً اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔

”ایک بات پوچھوں؟“ ربیکا لنچ آرڈر کرنے کے بعد اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

”ضرور۔“ وہ اسے دیکھنے لگا۔

”ڈیڈی کو آپ نے بتایا تھا کہ میں آپ کے گھر گئی تھی؟“ غیر متوقع سوال تھا پھر بھی وہ بڑے آرام سے بولا۔

”جی ہاں......“

”پھر آئی مین ڈیڈی نے کیا کہا؟“

”یہی کہ میں اپنی سیٹ پر واپس آجاؤں اور میں آگیا۔“ اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے پھر جیب سے موبائل نکال کر میسج دیکھنے لگا۔ ربیکا کو اپنی طرف سے اس کی بے نیازی سخت کھل رہی تھی جب کھانا سرو ہوگیا تب بظاہر نارمل انداز میں پوچھنے لگی۔

”کس سے بات کر رہے ہیں؟“

”کزن سے......“ حمزہ نے ٹیکسٹ لکھتے ہوئے جواب دیا۔

”شہرینہ۔“ ربیکا نے پوچھا تو اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر کوئی جواب دیے بغیر موبائل جیب میں ڈال لیا۔

”کھانا......“ ربیکا نے اس کی توجہ کھانے کی طرف دلائی۔ پھر اپنی پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے کہنے لگی۔

”میرا ذہن آپ کی بات تسلیم نہیں کر رہا حمزہ کہ ڈیڈی نے کہا اپنی سیٹ پر واپس آجائیں اور آپ آگئے۔“

"آپ کیا سننا چاہتی ہیں؟" وہ اسے دیکھنے لگا۔
"وہی جو سچ ہے......"
"سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کے لیے آیا ہوں۔" وہ کہہ کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ ربیکا غیر یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔
"کیا آپ کا ذہن اس بات کو بھی تسلیم نہیں کر رہا؟" حمزہ نے کھانے سے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولی اس پر سے نظریں ہٹا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ تو وہ وقت کا احساس کر کے بولا تھا۔
"میرا خیال ہے لنچ کے بعد ہمیں آفس بھی جانا ہے۔"
"آپ چلے جایئے گا۔" وہ ایک دم اٹھ کر چلی گئی۔
"ارے!" حمزہ نے بوکھلا کر اس کے پیچھے دیکھا پھر جھنجلاتے ہوئے تھوڑا بہت کھانا زہر مار کر کے باہر نکلا تو اس کی گاڑی کہیں نظر نہیں آئی مجبوراً اسے ٹیکسی کرنی پڑی تھی۔
ربیکا آفس میں بھی نہیں تھی۔ اس نے "میری بلا سے کہیں بھی جائے۔" کہہ کر سر جھٹکا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس کے سیل نمبر پر کال ملائی تھی۔
"ہیلو۔" تیسری بیل پر ربیکا نے کال لی تھی۔
"ربیکا اگر آپ کو میری بات بری لگی ہے تو آئی ایم سوری!" وہ اس کی آواز سنتے ہی بولا تھا۔
"نہیں حمزہ۔ یہ بات سننے کے لیے تو میں جیسے صدیوں سے منتظر تھی۔ تم...... ہاں تم سچ مچ میرے لیے آئے ہو نا؟" وہ جذب کے عالم میں پوچھ رہی تھی۔ حمزہ مشکل میں پڑ گیا۔ پھر سوچ کر بولا۔
"میں تمہاری بات مان کر آیا ہوں۔"
"میری بات؟"
"ہاں آپ نے کہا تھا کہ میں زندگی میں کچھ نہیں پا سکا البتہ آپ کا ساتھ......"
"ہاں میرے ساتھ تمہیں زندگی کی ہر آسائش حاصل ہو گی اور وہ کچھ جو تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا۔" وہ اس کی پوری بات سنے بغیر بولنے لگی تھی۔ غالباً اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اس کی طرف آیا تھا خواہ کسی طرح بھی۔
اور ادھر حمزہ خود کو انتہائی بے بس محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

گویا قدرت کو یہی منظور تھا جب ہی ہر بات تیمور غزنی کے حق میں جا رہی تھی۔ وہ جو یہ سوچ کر پریشان تھا کہ بارات کا انتظام کیسے کرے گا تو حمیدہ بیگم نے اپنا پروگرام بتا کر اسے مشکل سے نکال دیا تھا۔ وہ ایک دم پرسکون ہو گیا۔ پھر جب خزینہ کی آمد پر حسب سابق حمیدہ بیگم اٹھ کر چلی گئیں تب تیمور غزنی جیب سے چیک بک نکال کر خزینہ کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔
"یہ تمہاری چیک بک اپنا اماؤنٹ چیک کر لینا۔" خزینہ کو جانے کیوں عجیب سا لگا۔ حالانکہ اس نے جتایا نہیں تھا۔ پھر بھی جز بز ہو کر بولی تھی۔
"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"
"کیوں ضرورت نہیں، تمہیں اپنی چیزوں کا خود خیال رکھنا ہے اور ہاں تم اپنی شاپنگ اسی میں سے کر لو، آنٹی پر میں کوئی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔" تیمور غزنی نے کہہ کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔ پھر اچانک خیال آنے پر پوچھنے لگا۔ "تمہاری سسٹر کہاں ہے۔ کیا وہ مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتی؟"
"یہ آپ اسی سے پوچھ لیں۔ اسے بلاؤں یا آپ چلیں گے۔"

"میں چلتا ہوں" اس نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ رکھ دیا۔
"آیے۔" خزینہ آگے بڑھی تو اس کی تقلید میں وہ لاؤنج سے گزر کر اس کے کمرے میں داخل ہو کر رک گیا۔
"شہرینہ! غزنی تم سے ملنے آئے ہیں۔" خزینہ نے کہا تو الماری میں سر دیے کھڑی شہرینہ جانے کیا سوچ کر شرارت سے بولی۔
"بٹھاؤ انہیں میں آتی ہوں" ۔خزینہ نے قدرے بوکھلا کر تیمور غزنی کو دیکھا اور اس کے اشارے پر پوچھنے لگی۔
"کہاں بٹھاؤں؟"
"میرے سر پر۔" الماری کے اندر سے ہی جواب آیا۔ تیمور غزنی نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر ہنسی روکی تھی جبکہ خزینہ دانت پیس کر بولی۔
"یہ کام تم خود کر لو، اور ذرا جلدی۔"
کیا ہے خزی!" شہرینہ نے کھٹاک سے الماری کا پٹ بند کیا اور پلٹتے ہی یوں ٹپٹائی کہ فوراً واپس گھوم کر پوری الماری میں گھسنے کی کوشش کرنے لگی۔
"اب کوئی فائدہ نہیں چھپنے کا۔ غزنی سب سن چکے ہیں۔"
"نہیں میں نے کچھ نہیں سنا" ۔تیمور غزنی کی ہنستی آواز پر وہ بے اختیار پلٹی تھی۔
"سچ کہہ رہے ہیں آپ؟"
"کیا شکل سے میں تمہیں جھوٹا لگتا ہوں۔" تیمور غزنی کے ہونٹوں میں ابھی بھی محظوظ مسکراہٹ دبی تھی۔
"نہیں وہ......" شہرینہ نے مدد طلب نظروں سے خزینہ کو دیکھا تو وہ کہنے لگی۔
"غزنی کہہ رہے تھے تم شاید ان سے ملنا پسند نہیں کرتی اس لیے میں انہیں یہاں لے آئی۔"
"آپ بیٹھیں نا۔" شہرینہ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
"بس چلتا ہوں۔ اب تو آنا جانا رہے گا۔" اس نے کہتے ہوئے خزینہ کو دیکھ کر چلنے کا اشارہ کیا تو وہ اسے چھوڑنے باہر تک آئی۔
"تم اپنی شاپنگ ضرور اور جلدی کر لینا۔" اس نے خزینہ کو تاکید کر کے گاڑی آگے بڑھائی تھی۔

☆☆☆

اس کا دل چاہا وہ سونیا کو ساری صورت حال سے آگاہ کرے لیکن پھر خیال آیا کہ وہ اپنے مشورے دینے بیٹھ جائے گی اس طرح وہ ڈبل مائنڈ ہو سکتا تھا یوں سونیا کے پاس جانا ملتوی کر کے وہ سیدھا گھر آ گیا۔ معمول کے مطابق کچھ دیر ماما بابا کے پاس بیٹھا پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔
سارہ فون پر غالباً اپنی کسی دوست سے بات کر رہی تھی۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگا۔ بات کرتے ہوئے وہ اپنے بالوں کی لٹ سے کھیل رہی تھی کبھی انگلی پر لپیٹتی تاک پر۔ پلکوں اور آئی برو کی جنبش کا تو وہ ہمیشہ سے دیوانہ تھا۔ ابھی بھی محبت سے اسے دیکھتے ہوئے اچانک ایک نئے احساس نے اس کے دل کو چھوا تھا۔
"کیا میں اپنی محبت کے ساتھ بے وفائی کر رہا ہوں۔" اس نے خائف ہو کر ایک دم اسے پکار لیا۔
"سارہ!"
"ہاں!" سارہ نے چونک کر اسے دیکھا اور جلدی سے دوست کو خدا حافظ کہہ کر اٹھتے ہوئے بولی۔ "زوہی کی کال تھی امریکا سے۔"
"آؤ میرے پاس بیٹھو۔" اس نے بیٹھتے ہوئے سارہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا تو وہ پوچھنے لگی۔
"آج تم جلدی آ گئے؟"

"بس اچانک تمہارا خیال آیا تو میں سب کام چھوڑ کر آ گیا۔"

اس نے کہا تو سارہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ گو کہ کوئی نئی بات نہیں تھی وہ تو اکثر اس کا خیال آنے پر بھاگا چلا آتا تھا۔ نئی بات یہ تھی کہ وہ بہت سیدھے سادے انداز میں بولا تھا۔ لہجے میں محبت تھی نہ انداز میں والہانہ پن۔

"کیا ہوا؟" وہ سارہ کے دیکھتے رہنے پر اندر سے خائف ہوا تھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ اٹھنے لگی تو تیمور غزنی نے فوراً اس کے کندھے پر بازو پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"تم خفا کیوں ہو گئیں سارہ میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں کچھ پریشان ہوں۔"

"کیا پریشانی ہے؟" سارہ فوراً اس کے بازو سے نکل کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"جانے دو۔" وہ ٹالنا چاہتا تھا لیکن وہ اڑ گئی۔

"نہیں بتاؤ......"

بس رات میں نے عجیب سا خواب دیکھا، وہی ذہن پر سوار ہے۔ بہت خود کو ادھر ادھر مصروف رکھنے کی کوشش کی لیکن......"

"خواب کیا تھا؟" سارہ نے بے صبری سے ٹوکا تو وہ گہری سانس کھینچ کر گویا ہوا۔

"میں نے دیکھا تم جانے کہاں کھو گئی ہو میں پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ بیابان جنگل پھر پتا نہیں کون سے زمانے کے کھنڈرات تھے۔" وہ آواز بھاری کر کے خواب کو خوف ناک بنانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ جھنجلا گئی۔

"بس کرو بھی! خواب کو لے کے پریشان ہو رہے ہو۔"

"اچھا اگر تم ایسا خواب دیکھتیں جس میں میں کھو جاتا تو!"

"تو میں اتنی زور سے چیختی کہ تم جہاں بھی ہوتے میری چیخ سن کر بھاگے چلے آتے۔" سارہ نے کہا تو وہ ایک دم جذباتی ہو گیا۔

"تو تم کیوں نہیں آئیں۔ میں بھی تو چیخ رہا تھا۔"

"میں تمہیں تنگ کر رہی تھی۔" وہ محظوظ ہو کر بولی تھی۔

"یعنی ادھر میری جان نکل رہی تھی اور تمہیں اٹھکیلیاں سوجھ رہی تھیں۔" وہ اس کی بات اچک کر اٹھ کھڑی ہو گئی۔ "چلو جلدی سے چینج کرو میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

"او کے باس......" وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور اس کے جاتے ہی خود سے بولا تھا۔

"بہت مشکل ہے۔"

☆☆☆

حمیدہ بیگم نے حمزہ کو خزینہ کے نکاح اور رخصتی کی ساری تفصیل بتا دی تھی اور کہا تھا کہ وہ فاخرہ کو بتا دے۔ کچھ سینہ تھی۔ جس نے سارا پروگرام سن کر اپنے مزاج کے مطابق بہت باتیں بنائیں۔ لیکن حمیدہ بیگم جو سوچ چکی تھیں اسی پر قائم رہیں اور آج عالیہ خالہ کی باری تھی جو ان کے بلانے پر شرجیل کے ساتھ آئی تھیں۔ حمیدہ بیگم؛ داستان گھڑ چکی تھیں وہی ان کے سامنے دہرا کر کہنے لگیں۔

"صرف بڑے لوگ ہی نہیں خاندانی بھی ہیں۔ لڑکے کے ماں باپ دو تین بار آ چکے ہیں۔ لیکن ابھی اچانک انہیں امریکا جانا پڑ گیا۔ وہاں ان کے بڑے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس لیے رہ نہیں سکے۔ فوراً روانہ ہو گئے اور اب ظاہر ہے جلدی آ بھی نہیں سکتے اس لیے چاہتے ہیں کہ میں سادگی سے نکاح کر کے

رخصت کر دوں۔ تو میں نے سوچا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یوں بھی میں میاں کی برسی تک خوشیاں تو نہیں منا سکتی۔ بس فرض ادا کرنا ہے۔ سادگی سے ہو جائے۔ پھر شہرینہ بھی تو ہے۔"

"ہوں......" عالیہ بیگم پرسوچ انداز میں سر ہلانے لگیں جبکہ شرجیل سر جھکائے گم صم بیٹھا تھا۔

"ٹھیک ہے ناں شرجیل!" حمیدہ بیگم نے جان بوجھ کر اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر بولا تھا۔

"آپ بہتر سمجھتی ہیں خالہ......!"

مجھے یہی ٹھیک لگ رہا ہے بیٹا۔ اپنا بھرم بھی رہ جائے گا۔ ورنہ جیسی شادی وہ لوگ کرتے اس حساب سے میں اگر اپنی حیثیت سے بڑھ کر کرتی تب بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔"

"یہ تو ہے پھر کب کر رہی ہیں؟" شرجیل کو پوچھنا پڑا۔

"یہ جمعہ چھوڑ کر اگلے جمعہ کو۔" حمیدہ بیگم نے بتایا تو عالیہ بیگم حیرت سے بولیں۔

"اتنی جلدی۔"

"ہاں کل ہی لڑکے کی ماں کا فون آیا تھا امریکا سے بے چاری بہت پریشان تھیں۔ ایک ادھر اس بیٹے کے لیے اور ادھر اس بیٹے کے لیے بھی اکیلا ہے اور وہ تو اسی جمعہ کو نکاح کا کہہ رہی تھیں لیکن میں نے اگلا جمعہ کر دیا۔" حمیدہ بیگم پورے اعتماد سے بول رہی تھیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کتنی غلط بیانی کر رہی ہیں۔

"چلو اللہ مبارک کرے۔" عالیہ بیگم اب یہی کہہ سکتی تھیں۔

"آمین! میں تو بہت پریشان تھی آپا کہ بیٹیوں کی شادی کیسے کروں گی لیکن اللہ بڑا کارساز ہے۔ اتنا اچھا رشتہ طے ہو گیا اور وہ ابھی اتنا اچھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"خیر رشتہ تو گھر میں بھی موجود تھا۔" عالیہ بیگم کا اشارہ شرجیل کی طرف تھا اور شرجیل کو اس وقت ماں کی یہ بات عجیب سی لگی۔ حمیدہ بیگم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اٹھ کر ان کے کمرے سے نکل آیا۔

خزینہ کچن میں نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر ادھر ہی آ گیا اور چند لمحے اس کی مصروفیت دیکھنے کے بعد بولا تھا۔

"مبارک ہو......"

"ہیں!" خزینہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر بس مسکرانے پر اکتفا کیا۔ تو شرجیل نے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"خوش ہو۔"

"تمہیں کیا لگ رہا ہے!" خزینہ بات اس پر ڈال کر چائے دم کرنے لگی۔

"مجھے لگ رہا ہے تم نے من کی مراد پالی۔" وہ شکستگی کے احساس کو کسی طرح چھپا نہیں پا رہا تھا۔

"کس لحاظ سے کہہ رہے ہو؟" وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی تھی۔

"ہر لحاظ سے......" کچھ جتاتا ہوا انداز تھا وہ فوراً کچھ نہیں بولی شہرینہ کو پکار کر اس کے ہاتھ امی اور خالہ کو چائے اندر بھجوائی پھر ایک مگ شرجیل کو تھما کر کہنے لگی۔

"تم نے غلط نہیں کہا شرجیل لیکن یہ ٹھیک بھی نہیں ہے کیونکہ میں ہمیشہ سے حقیقت پسند رہی ہوں۔ میں نے کبھی اونچے خواب نہیں دیکھے تھے۔ میں نے صرف تیمور غزنی کو پسند کیا اور میرا دل اس کا تمنائی ہو بیٹھا۔ باقی وہ کون ہے کیا ہے اس سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔ البتہ اب میں اسے اپنی قسمت پر مغرور کر سکتی ہوں۔ مجھے قسمت سے وہ سب کچھ مل رہا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" بات کے اختتام پر وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ جواباً شرجیل مسکرانے کی کوشش میں ناکام ہو کر بولا تھا۔

"ایک بات پوچھوں۔ کیا تم نے میری محبت کو کبھی محسوس نہیں کیا۔ میرے جذبے اتنے بودے تو نہیں تھے۔"

"دل پر ہمارا اختیار نہیں ہوتا شرجیل! تمہاری محبت جاننے کے باوجود میرا دل بھی تمہاری طرف مائل نہیں ہوا اور زبردستی کا سودا مجھے منظور نہیں تھا۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھی۔ شرجیل سر جھکائے جانے کیا سوچنے لگا تھا۔

"سنو، اگر میری طرف سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو آئی ایم سوری!" اس نے کہا تو شرجیل ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلانے لگا۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا!

☆☆☆

وہ آفس سے لوٹا تو خلاف معمول برآمدہ خالی تھا۔ کچن سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اسے اچنبھا ہوا۔ بائیک کھڑی کرتے ہی وہیں سے پکارا۔

"اماں!" جواب نہ پا کر تیز قدموں سے اندر آتے ہی رک گیا۔

فاخرہ پلنگ پر جھلملاتے سوٹ پھیلائے بیٹھی تھیں اور بیلا بکس میں سے شاید کچھ نکالنے میں مصروف تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے زوردار آواز میں سلام کیا تو فاخرہ اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"جیتے رہو۔ خوش رہو۔ آگئے!"

"آ بھی گیا اور دیکھ بھی رہا ہوں یہ سب کیا ہے کون دے کر گیا ہے؟" اس نے پوچھا تو فاخرہ ناراضی سے بولیں۔

"کوئی کیوں دے کر جائے گا۔" تب ہی بیلا مزید دو سوٹ فاخرہ کے ساتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"امی یہ بھی دیکھ لیں۔" پھر حمزہ کو دیکھ کر پوچھا۔ "بھائی کھانا لاؤں یا چائے؟"

"چائے اور ذرا جلدی......" اس نے بیلا کے کندھے پر ہاتھ مار کر اسے بھگایا پھر فاخرہ کے سامنے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

"اماں یہ کیا کر رہی ہیں۔ میرا مطلب ان کپڑوں کا کیا کریں گی۔"

"بیٹا! تمہاری تائی نے جو یوں اچانک خزینہ کی شادی طے کردی ہے تو اس کے لیے کچھ تو کرنا ہے" فاخرہ نے بتایا تو وہ جھنجلا گیا۔

"افوہ اماں! کوئی دھوم دھڑکا نہیں ہے سادگی سے نکاح ہوگا اور رخصت کردیں گی خزینہ کو......"

"کچھ بھی ہو۔ ہم ایسے خالی ہاتھ تو نہیں جائیں گے۔ میں نے یہ سوٹ اسی لیے نکالے ہیں اسی میں سے دو خزینہ کے لیے پیک کرلیتی ہوں اور تم بتاؤ کیا دینا چاہیے" فاخرہ کچھ سوچتے انداز میں اسے دیکھنے لگیں۔

"مجھے نہیں پتا اماں! یہ عورتوں والے کام آپ ہی جانیں۔" وہ اٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

"میں سوچ رہی تھی ساتھ ڈنر سیٹ ہو جاتا تو......"

"ہو جائے گا لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ تائی جان سے پوچھ لیں۔ گھر کی بات ہے اماں، پوچھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔"

"یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو......" فاخرہ سوٹ تہ کرنے لگیں۔ پھر جیسے اچانک خیال آیا تھا۔ "سنو! تم نے لڑکے کو دیکھا ہے؟"

"کون سے لڑکے کو؟" اس کا دھیان جانے کہاں تھا۔

"ارے وہی جس سے خزینہ کا نکاح ہو رہا ہے۔" فاخرہ کے جھنجلانے پر وہ ہنسنے لگا۔

"نہیں اماں! میں نے نہیں دیکھا۔"

"پھر تو تمہیں یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ وہ کرتا کیا ہے" فاخرہ کی بات سن کر وہ بے ساختہ بولا تھا۔

"تیل بیچتا ہے......"

"ہائیں......" فاخرہ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ ناک پر انگلی جما کر اسے دیکھنے لگیں۔ جب اس کی نظر پڑی تو بمشکل ہنسی روک کر معصومیت سے پوچھنے لگا۔

"کیوں اماں تیل بیچنا بری بات ہے کیا؟"

"نہیں...... بری بات تو نہیں ہے لیکن بندہ اپنے جیسوں میں رشتے کرتا ہے۔ خزینہ کی عمر بھی کوئی اتنی زیادہ نہیں ہے پھر بھابی نے" "کیوں!"

"خزینہ کی اپنی پسند ہے۔" اس نے نیا شوشا چھوڑا۔

"تیلی!" حمزہ کے منہ سے قہقہے ابل پڑے۔ بے تحاشا ہنستے ہوئے اٹھ کر فاخرہ کے پاس آبیٹھا اور انہیں دونوں بازوؤں کے حلقے میں لے کر کہنے لگا۔

"حد ہے اماں! مذاق بھی نہیں سمجھتیں۔ اپنی خزینہ ماشاء اللہ پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہے اور اس کے لیے رشتوں کی کمی بھی نہیں ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تائی جان اسے کسی ایرے غیرے کے پلے باندھ دیں۔"

فاخرہ کچھ سمجھ رہی تھیں کچھ نہیں، البتہ چہرے پر ناراضی ظاہر ہو رہی تھی۔

"اب کہیں آپ تائی جان سے مت پوچھ بیٹھیے گا۔ لڑکے کا اپنا بزنس ہے۔ یعنی بڑا آدمی ہے۔ اتنا بڑا کہ خزینہ کو مہر میں گھر پہلے ہی لکھ کر دے دیا ہے۔" وہ اب اس ڈر سے کہ کہیں فاخرہ سادگی میں حمیدہ بیگم سے نہ پوچھ بیٹھیں پوری تفصیل بیان کر رہا تھا۔

"اچھا ماشاءاللہ...... اللہ مبارک کرے۔" فاخرہ پہلے خوش ہو کر خزینہ کو دعائیں دینے لگیں پھر اس پر بگڑ گئیں۔

"تم اس وقت سے کیا بکواس کر رہے تھے۔"

"مذاق کر رہا تھا اماں! اس نے فاخرہ کو بازوؤں میں بھینچا تو وہ اسے پرے دھکیل کر بولیں۔

"یہ مذاق تھا۔ ہلا کے رکھ دیا مجھے" تب ہی بیلا چائے لے کر آگئی تو اسے بات بدلنے کا موقع مل گیا۔

"چائے بنانے میں اتنی دیر میں تو بھول ہی گیا تھا دیکھ رہا ہوں دن بدن نکمی ہوتی جارہی ہو۔"

"کوئی نہیں!" بیلا اس سے کہہ کر فاخرہ سے مخاطب ہوگئی۔ "امی پھر کون سے سوٹ نکالے ہیں؟"

"تم دیکھ لو۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا۔ پتا نہیں آج کل کی لڑکیاں کیا پسند کرتی ہیں۔" فاخرہ نے تہ کیا ہوا سوٹ بھی بیلا کے سامنے ڈال دیا تو وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر جلدی جلدی چائے پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اماں! میں ایک دوست کی طرف جارہا ہوں۔ کھانے پر میرا انتظار مت کیجیے گا۔"

"کیوں دیر سے آؤ گے کیا؟" فاخرہ نے پوچھا تو وہ رسٹ واچ پر ٹائم دیکھ کر بولا۔

"نہیں۔ زیادہ دیر تو نہیں ہوگی۔ کھانا اس کی طرف ہے اس لیے کہہ رہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔"

"اللہ حافظ......" وہ باہر نکل آیا۔

گو کہ اس نے بہت کوشش کی مقررہ وقت پر پہنچنے کی لیکن ٹریفک جام کے باعث وہ پورا ایک گھنٹہ لیٹ ہوگیا تھا۔ اس کے باوجود ربیکا کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں تھی نہ انتظار کی کوفت، اور اس سے پہلے کہ وہ لیٹ آنے کی معذرت کے ساتھ توجیح پیش کرتا ربیکا کہنے لگی۔

جام ٹریفک نے تمہارا حلیہ بگاڑ دیا ہے جاؤ پہلے فریش ہو کر آؤ"

وہ ربیکا کی انگلی کے اشارے کی سمت واش روم دیکھ کر اسی طرح بڑھ گیا۔ بے اختیاری عمل تھا اس کے بعد وہ مسلسل خود پر جھنجلا تا رہا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

سویرا فلک

دلہن وہی جو پیا من بھائے

سارہ بھابھی ننھی اریبہ کو سلا کر آئیں تو حرا کو مسلسل اسکرین پر نظریں گاڑھے دیکھ کر کلس کر رہ گئیں بمشکل اپنے غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے بولیں۔

"حرا یہ کیا تم اب تک تیار نہیں ہوئیں۔"

"اوہ بھابھی میرا دل نہیں چاہ رہا آپ اکیلی چلی جائیں نا۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا تو سارہ کا دل تو چاہا کہ اپنی اس اکلوتی نند کو اٹھا کر پٹخ دیں مگر اپنے میاں کی لاڈلی بہن کو یہ تیور دکھانے کی جرات ان میں نہیں تھی سو اس بار بھی انہوں نے ضبط کے گھونٹ پیے۔

"حرا ایک تو تمہارا یہ دل۔ پلیز چلو نا۔ دیکھو اتنی دور میں کیسے جاؤں گی اور پھر واپسی میں کتنا سامان ہوتا ہے۔ اور میں نے اریبہ کو اتنی مشکل سے سلایا ہے ہم ابھی جائیں گے تو وہ کم از کم امی کو تنگ نہیں کرے گی۔"

"اوہو بھابھی آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہیں میں نے کہا نا اس وقت میرا موڈ بالکل نہیں ہے۔ باہر جانے کا۔ گروسری ہی کرنی ہے امی کو لے جائیں۔ اریبہ کوئی مسئلہ نہیں ہے میں دیکھ لوں گی۔" اب کہ حرا کا بگڑا ہوا تیور دیکھ کر سارہ نے اس سے مزید الجھنے کا ارادہ ترک کیا اور واپس آ کر اپنی ساس کو حرا کے گروسری کے لیے نہ جانے کا بتایا تو انہوں نے بھی بیٹی کو سخت سناتے ہوئے چادر پہن لی کہ سارہ اکیلی اتنی دور کیسے جائے گی۔

ان کا گھر عام مارکیٹ سے خاصا دور تھا اور اب مہینے کی شروعات تھی۔ راشن لانا بھی ضروری تھا۔ ساس کو تیار دیکھ کر سارہ نے بھی عبایا پہنا اور اپنی اکلوتی نند حرا کی موڈی طبیعت کے بارے میں سوچتے ہوئے ساس کے پیچھے قدم بڑھا لیے۔

☆☆☆

حرا اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ خوش شکل تھی، خوش لباس تھی مگر اس کا مزاج مکمل طور پر اس کے موڈ کے تابع تھا۔ سو وہ خوش مزاج تھی یا نہیں یہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ مزاج کے سلسلے میں اس کی شخصیت پل میں تولہ پل میں ماشہ کے مترادف تھی۔ وہ انتہا درجے کی موڈی تھی۔ شروعات میں تو کسی نے اس کی اس عادت کا نوٹس نہیں لیا بلکہ ہر بار بات ابھی بچی ہے کہہ کر ٹال دی جاتی تھی مگر اب جبکہ وہ بیس برس کی ہو چکی تھی اور چند دنوں بعد اس کی شادی تھی تو امی ماں ہونے کے ناطے اس کی جانب سے فکرمند رہنے لگی تھیں جبکہ ابو کا ابھی بھی لاڈلی بیٹی کے لیے وہی حال تھا۔ جب جب امی اسے ٹوکتیں۔

"حرا اب سدھر جاؤ نہیں تو سسرال میں جا کر ناک کٹوائے گی میری۔" ابو فوراً ان کی بات کاٹ دیتے۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتی میری بیٹی میرا فخر ہے اور آپ تو یونہی ہلکان ہوتی ہیں جب سر پر پڑے گی تو کرے گی سب کچھ۔" اور حرا ابو کی طرف داری پر اور باچھیں کھلا لیتی۔

"امی آپ تو بس مجھ سے خائف ہی رہتی ہیں اور وہ سسرال ہے یا کوئی جنگل یا جیل۔ میری پھوپھو کا گھر ہے اور کتنا چاہتی ہیں مجھے، ایک آپ ہی ہیں جنہیں میری خوبیاں نظر نہیں آتیں اور میں اچھی نہیں

لگتی۔"

وہ لاڈ سے کہتے ہوئے باپ کے شانوں سے سر ٹکا دیتی اور امی اپنی آنکھوں کے نم گوشوں کو باپ بیٹی سے چھپا کر چپکے چپکے اوپر والے سے اپنی لاڈو رانی کے اچھے نصیبوں کی دعا مانگتی رہتیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ سسرال ایک لڑکی کے لیے امتحان گاہ ہے، ایسی امتحان گاہ جہاں کوئی پرچی، سفارش اور رشتے داری کام نہیں آتی۔

☆☆☆

ادھر اس نے گریجویشن کا آخری پرچا دیا ادھر زینب پھوپھو نے حرا اور عاقب کی شادی کے لیے گویا ہتھیلی پر سرسوں ہی جمالی تھی ایک تو امی ویسے ہی پریشان ہو گئیں کہ اسے رخصت کرنے کا وقت قریب آ گیا دوسرا یہ سوچ کر ان کے ہاتھ پیر اور یوں پھولنے لگے کہ یہ سب کیسے ہو گا اتنی جلدی۔"

مگر زینب پھوپھو تو بس ایک ہی رٹ لگائے بیٹھی تھیں۔ "بھئی ذکیہ بھابھی اب ایسا بھی کیا ہے ظاہر ہے شادی تو ہونی تھی۔ جب رشتہ بچپن سے طے ہے اب مجھے بھی کیا معلوم تھا کہ یوں حالات کروٹ لے لیں گے کس نے سوچا تھا کہ میرا بڑا بیٹا بہو پردیس جا بسیں گے وہ بہت بار کہہ چکا تھا اور اب تو اس کی بیوی کو میری ضرورت ہے تو تم بس بسم اللہ کرو۔"

ایسے میں سارہ نے امی کو تھام لیا۔

"آپ فکر کیوں کرتی ہیں امی۔ ہم سب ہیں ناں اور بیٹیوں کو تو پیغمبر نے بھی رخصت کیا، اچھا ہے نا جتنی جلدی فرض ادا ہو جائے ویسے بھی ہر کام کا وقت مقرر ہے تو آپ یہی سمجھ لیں کہ ہماری حرا کے مقدر میں یہی وقت لکھا ہے۔" ادھر حرا گو کہ عاقب کو پسند کرتی تھی مگر جوں جوں بابل کے در کو چھوڑ کر جانے کا وقت قریب آ رہا تھا اس کا دل اداس ہوتا جا رہا تھا۔ ماں باپ کا گھر، جس سے اس کے بچپن اور لڑکپن و جوانی کی یادیں جڑی تھیں، جان چھڑکنے والے ماں باپ، ناز اٹھانے والے بھائی بھابھی اور ننھی اریبہ سب کو چھوڑ کر جانے کا سوچ کر ہی دل غمگین ہوئے جا رہا تھا۔ مگر عاقب کے پل پل آنے والے میسجز اسے احساس دلا رہے تھے کہ کوئی ہے جو اس کا انتظار کر رہا ہے۔

اس کی شادی سے پہلے بھر قبل ہی سے کن من بوندوں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ ہوا کی اٹھکیلیاں نے تن من کو جیسے رقص کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایسے میں عاقب کی محبت کا رنگ، اس کے ابٹن سے مہکتے اور گوٹے کناروں والی پیلے لباس میں چھپے وجود میں سر چڑھ کر بول رہا تھا اور اس کی سج دھج اور نمایاں ہو رہی تھی۔ عاقب کی بے قراریوں سے بجتی سیل کی بیپ اس کے روپ کو چار چاند لگا رہی تھی وہ کھل کر اپنی دیوانگی کا اور تڑپ کا اقرار کر رہا تھا اس کا ہر میسج اس کے دل کی حالت بیان کر رہا تھا۔

جب سے یہ پیغام ملا ہے
جاناں تم آنے والی ہو
موسم نے سارے گھر کی ترتیب بدل کر رکھ دی ہے
چوکھٹ پر ایک چاند بھی آ کر بیٹھ گیا ہے
کتنے ستارے لاؤنج بھر میں آ کر پڑے ہوئے ہیں
جگنو کب سے چھت پر گھر کے
ہر گوشے میں چمک رہے ہیں
سورج اور بارش بھی کل سے سائبان پر ٹکے
ہوئے ہیں

اور وہ محبت کی لطافت اور گدگداہٹ سے

مسکرائے جاتی تھی اور امی اس کے کھلے چہرے کو دیکھ کر بلائیں لیتے نہ تھکتی تھیں اور ان کا دل تو گویا اب دعاؤں کا سمندر بن گیا تھا۔ ☆☆☆

ان دونوں کی شادی کے ہفتے بھر بعد ہی پھوپھو اپنے بڑے بیٹے اور بہو کے پاس لندن چلی گئی تھیں۔ عاقب اور حرا دونوں کزن تو تھے ہی مگر اب جو نیا رشتہ جڑا تھا تو ان کے دل کی کیفیت بدل سی گئی تھی۔ عاقب پہلے کافی خاموش مزاج لگتا تھا مگر رشتہ طے ہوئے اور خاص کر شادی کے بعد عاقب کی بے اختیاریاں حرا کو حیران کر دیتی تھیں۔ وہ رومانٹک اور من موجی قسم کا بندہ تھا۔ زندگی کے پل پل سے خوشیاں کشید کرنے والا۔ ہر لمحے کو انجوائے کرنے والا۔ ہر پل اس کا وجود حرکت میں رہتا کبھی کہتا چلو حرا موسم زبردست ہے لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں، کبھی دو ٹکٹس لے آتا کہ چلو نئی موؤی آئی ہے دیکھ کر آتے ہیں اور کبھی اچانک رات بارہ بجے کہتا یار آئس کریم کھانے کا دل چاہ رہا ہے، چلو چلتے ہیں۔

شروع شروع میں تو حرا نے اس کا بھرپور ساتھ دیا مگر اپنے موڈی مزاج کے باعث فقط ایک ماہ میں ہی وہ اس وقت بے وقت کی حرکت سے اکتانے لگی۔ شروعات میں تو اس نے بہانوں سے کام چلایا۔

”اف عاقب میرا تو گلا دکھ رہا ہے تم کھالو جا کر یا لے آؤ۔“ کبھی یوں جان چھڑاتی ”عاقب میرے سر میں درد ہے تین گھنٹے کی موؤی دیکھ کر تو سر پھٹ ہی جائے گا۔“ مگر شریک سفر سے ایسے جھوٹ کب تک چلتے۔ آخر کار اس نے کھلم کھلا اپنے مزاج کے بدلتے تیوروں کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

توبہ ہے عاقب۔ یہ کیا بے تکا پن ہے کہ تیز بارش میں بندہ لانگ ڈرائیو پر چلا جائے یا یہ کہ یہ کون سا وقت ہے باہر جانے کا بھئی میرا تو ذرا موڈ نہیں ہے عاقب تم گھر میں ہی کوئی موؤی دیکھ لو میں تو اب اپنا ناول ختم کر کے ہی اٹھوں گی۔“

گو کہ عاقب کو حرا کو یوں جان چھڑانے والا انداز ناگوار گزرتا تھا مگر وہ صلح جو طبیعت کا مالک تھا اور اسے اندازہ تھا کہ حرا نازوں پلی لڑکی ہے سو وہ حرا پر اپنی ناراضی ظاہر نہیں ہونے دیتا بلکہ اس کے برعکس اس نے سمجھوتے کی روش اپنا کر حرا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ خود حرا سے کچھ نہیں کہتا تھا البتہ حرا کبھی فرمائش کرتی تو انکار بھی نہیں کرتا تھا حرا تو اس صورت حال سے بہت خوش اور مطمئن تھی مگر عاقب اب خود سے الجھنے لگا تھا اور الجھے تانے بانوں کو سلجھانے کی خاطر وہ کچھ کچھ اپنی ذات میں گم بھی ہونے لگا تھا مگر حرا کیونکہ اپنے موڈ کی غلام تھی تو وہ اپنے علاوہ کسی کے محسوسات کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ گو کہ زندگی کا کام گزرنا ہے اور وہ گزرتی رہتی ہے مگر انسان کی فطرت ہے کہ وہ جمود سے اکتانے لگتا ہے تبدیلی کائنات کی فطرت ہے اور ایسی ہی تبدیلی اب ان دونوں کی زندگیوں میں آرہی تھی۔

☆☆☆

باہر پھیلتی شام کی سیاہی حرا کی گھبراہٹ میں اضافہ کر رہی تھی اوپر سے عاقب کا سیل فون بھی آف جا رہا تھا۔ عاقب نے آفس تو چند روز دن بعد ہی جوائن کر لیا تھا مگر وہ شام چھ بجے اور کبھی کبھی اس سے بھی پہلے گھر پر موجود ہوتا تھا۔

اسے آفس جاتے ہوئے تین ماہ ہو گئے تھے اور اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ اتنا لیٹ ہوا ہو۔ اس نے تو سات بجے ہی امی کو فون کر دیا گو کہ وہ متفکر تھیں کیوں کہ عاقب کا فون ان کے پاس سے بھی نہیں مل رہا تھا مگر خود ان کا بی پی ہائی تھا۔ فہد ابو کو لے کر چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا تھا اور اریبہ کو وائرل انفیکشن کی وجہ سے بخار تھا تو بھابھی بھی نہیں نکل پا رہی تھیں۔ البتہ فون پر اسے مسلسل تسلیاں دے رہی تھیں۔

”تم فکر مت کرو۔ ہو سکتا ہے کسی میٹنگ یا ٹریفک جام میں پھنس گیا ہو اور فہد ڈاکٹر کے پاس سے فارغ ہوتے ہی ابو کو گھر چھوڑ کر تمہارے پاس آجائیں گے تم بس کچھ نہ کچھ پڑھتی رہو۔ ان شاء اللہ سب بہتر رہے گا۔“

اور پھر اس کی سانسوں کے ساتھ ساتھ اس کی زبان میں مسلسل حرکت کرتی رہی قریب تھا کہ وہ رو پڑتی ڈور بیل کی آواز نے گویا اس میں انجن لگا دیا وہ بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچی اور دروازہ کھلتے ہی عاقب کو سامنے پا کر اس کا دل چاہ تھا کہ اسے جھنجوڑ کر رکھ دے مگر عاقب کے ساتھ کھڑے اجنبی وجود نے اسے ساکت سا کر دیا۔ اس کے فق پڑے چہرے کو دیکھ کر عاقب نے ساری صورت حال بھانپ لی اس لیے چھوٹتے ہی اس نے حرا کی آنکھوں میں موجزن سوالوں کا از خود جواب دینا شروع کر دیا۔

”سوری یار وہ میں ٹریفک جام میں پھنس گیا اور موبائل کی چارجنگ ختم ہو گئی تھی اور یہ میری کزن ہے صوفیہ۔ ملتان سے آئی ہے۔ میں آفس سے اسے لینے چلا گیا تھا۔ صوفیہ یہاں کراچی یونیورسٹی میں اپلائی کر رہی ہے۔ آؤ صوفیہ امید ہے تمہیں ہمارے گھر میں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔“

عاقب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حرا کو آگے سے ہٹنے کا اشارہ کیا تو وہ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے سامنے سے ہٹ گئی۔

جی...... السلام علیکم، آیئے نا سوری اصل میں عاقب پہلی بار اتنا لیٹ آئے ہیں تو میں گھبرا گئی تھی۔“

”وعلیکم السلام۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ صوفیہ نے نپے تلے لہجے میں کہتے ہوئے حرا سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنا بیگ گھسیٹتے ہوئے آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ عاقب نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور وہیں صوفیہ کے عین مقابل بیٹھ گیا۔

”یار تم کراچی کی ہو کر ایسے بچوں کی طرح ڈر رہی ہو، صوفیہ کو دیکھو کیسے اکیلے سفر کر کے ملتان سے کراچی آئی ہے۔“

حرا کو یوں عاقب کا کمپیریزن کرنا برا تو لگا مگر مروت کے مارے اور اخلاقیات کے تقاضوں کے باعث وہ مسکرا کر بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”بس اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے نا۔“

”ہاں مگر ضروری ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ اپنے اندر بھی بدلاؤ پیدا کیے جائے کیونکہ جو وقت کے ساتھ نہیں چلتے وہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔“ صوفیہ گو کہ شکل و صورت میں عام سی تھی مگر اس کی شخصیت میں موجود اعتماد نے حرا کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”آپ لوگ بیٹھیں میں کھانا لگاتی ہوں۔“ حرا کو فرار کی یہی راہ نظر آئی۔ جانے کیوں وہ اس وقت اپنے ہی گھر میں صوفیہ کے سامنے خود کو بے آرام سا محسوس کر رہی تھی۔

”میں فریش ہو لوں۔“ صوفیہ کھڑی ہو گئی۔

”ہاں آؤ میں تمہیں تمہارا روم دکھا دوں۔“ عاقب نے بھی اٹھ کھڑا ہوا اور صوفیہ نے اس کی معیت میں قدم بڑھا دیے اور حرا ان سا وجود لیے کچن میں آگئی۔

☆☆☆

صوفیہ پر اعتماد ہی نہیں ذہین بھی تھی۔ وہ بڑے آرام سے عاقب کے ساتھ حالات حاضرہ سے متعلق بحث کر لیتی اور تو اور حرا کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ عاقب اور صوفیہ کی دلچسپیاں بھی مشترکہ نوعیت کی تھیں۔ عاقب کیرم کا دیوانہ تھا اور صوفیہ اس کھیل کی ایسی ماہر کہ اکثر عاقب کو ہی ہرا دیا کرتی تھی۔ روز کے تین گیمز تو لازم ہو گئے تھے۔ صوفیہ کو ادب اور شاعری سے خاصا شغف تھا خود عاقب کو کئی شعر زبانی ازبر تھے وہ دونوں اکثر کسی نہ کسی کتاب کو بھی ڈسکس کرتے پائے جاتے تھے۔ عاقب کو اب بھی گیارہ بجے آئس کریم کھانے کا دورہ پڑتا تھا اور وہ صوفیہ کو جلد ریڈی ہونے کا کہتا اور وہ بھی فوراً اٹھ کھڑی ہوتی تھی اور اگر کبھی صوفیہ حرا کو بھی ساتھ چلنے کا کہتی تو حرا کے کچھ بھی کہنے سے قبل عاقب بول پڑتا۔

”یار حرا کو ایسی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو میں بھی اصرار نہیں کرتا آخر ہر انسان کی اپنی ذاتی پسند نہ پسند ہوتی ہے تو مجھے کیا حق ہے کہ میں زبردستی کروں۔“

”خیر حق تو تمہیں ہے عاقب۔ لیکن حرا واقعی لکی ہے کہ تمہارے جیسا شوہر ملا ہے اس کو اور تم بھی شاید دنیا کے پہلے مرد ہو جو یوں حقوق نسواں کا پالن کر رہے

ہو۔'' وہ قہقہہ مار کر کہتی اور عاقب اس کی بذلہ سنجی پر کھلکھلا جاتا اور حرا کو یوں لگتا کہ جیسے وہ ان دونوں کے درمیان ہو ہی نا یا اس نے طلسمی ٹوپی پہن رکھی ہو۔
اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب عاقب کی زندگی میں ہے بھی یا نہیں۔ کیوں کہ عاقب، حرا کے حقوق و فرائض سے ہرگز غافل نہ تھا بس وہ اس کے وجود کی موجودگی کو فراموش کیے ہوئے تھا یا شاید حرا کو ایسے لگتا تھا اور اس اگر مگر اور شاید نے حرا کے دن رات کا چین اور سکون غارت کر دیا تھا وہ گم صم سی رہنے لگی تھی اور اس کی یہ گوں مگوں کی کیفیت کسی اور نے تو محسوس نہیں کی مگر اس دن اریبہ کو اس سے ملانے کے لیے لانے والی سدرہ بھابھی نے محسوس کر لی تھی۔
''کیا بات ہے حرا تم یوں کھوئی کھوئی اور چپ چپ سی کیوں ہو؟''
سدرہ بھابھی نے بے زار بے زار حرا کو دیکھ کر متفکر ہوتے ہوئے پوچھا۔ کچھ بھی تھا یہ اکلوتی چھوٹی نند انہیں بہنوں جیسی عزیز تھی۔ خود حرا اپنی اکلوتی بھابھی سے کافی کھلی ملی ہوئی تھی۔ اچھا خاصا دوستانہ سا تھا دونوں میں۔ جب حرا موڈ میں ہوتی تو بھابھی سے خوب راز و نیاز کرتی اور دونوں کو قہقہے لگاتے دیکھ کر فہد بھی مطمئن ہوتا تھا کہ چلو یہاں روایتی نند بھاوج والا معاملہ نہیں۔ اس لیے سدرہ کے پوچھنے کی دیر تھی کہ یک دم حرا کا دل بھر آیا اور بھل بھل کر کے آنسو اس کے رخساروں کو تیزی سے بھگو گئے تو سدرہ گھبرا اٹھی اور حرا کو بانہوں میں بھر لیا۔
''کیا ہوا حرا؟ ایسے کیوں رو رہی ہو پلیز! مجھے ہول اٹھ رہے ہیں۔ رونا بند کرو اور بتاؤ ہوا کیا ہے؟''
عاقب آفس میں تھا اور صوفیہ اپلائیڈ ٹیسٹ کے لیے یونیورسٹی گئی ہوئی تھی تو ایسے میں حرا کو یک دم خیال آیا کہ یہ موقع گنوانا نہیں چاہیے اور ویسے بھی اب تنہا اس دل کے بوجھ کو سہنا اسے بے حد مشکل لگنے لگا تھا سو اس نے الف سے ی تک ساری کہانی سدرہ کو سنا دی۔ دل کا غبار نکلا تو وہ بھی ہلکی پھلکی ہو گئی مگر سدرہ کو ایک نئی فکر لاحق ہو گئی کہ اس معاملے کو حل کیسے کیا جائے۔

''حرا تم نے بہت اچھا کیا جو ساری بات کھل کر بتا دی ورنہ تم گھٹ گھٹ کر اپنی طبیعت خراب کر لیتیں۔ دیکھو ہم سب تمہارے اپنے ہیں اور کبھی بھی تمہارا برا نہیں چاہیں گے۔ میں آج تک کبھی تمہیں اس انداز میں روکا ٹوکا نہیں اور نصیحت نہیں کی لیکن اگر آج بھی میں خاموش رہی تو یہ تمہارے ساتھ میری جانب سے زیادتی ہو گی۔''
''میں سمجھی نہیں بھابھی۔'' حرا نے اچنبھے سے سدرہ کو دیکھا۔
''دیکھو ڈیئر شادی سے پہلے اور بعد والی زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عاقب لاکھ تمہارا کزن سہی۔ تم اس کی چاہت سہی مگر یاد رکھو کہ وہ ایک مرد ہے۔ اور مرد بھونرا صفت ہوتا ہے جو ہر پل چمکتی چیزوں کی جانب بھاگتا ہے۔ ایک عورت کو اپنا آپ مار کر اپنے شوہر کی پسند ناپسند کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے اس میں قطعاً عورت کی شکست نہیں بلکہ یوں محکوم ہو کر ہی عورت مرد کے دل کے سنگھاسن پر راج کرتی ہے۔ اگر تمہیں عاقب کو اپنا بنائے رکھنا ہے تو اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنا ہو گا۔ اپنے موڈ کو اپنا تابع بناؤ، اپنا گھر بسائے رکھنے کے لیے اپنے شوہر کو مستقل تھامے رہو۔ اگر تم اپنا اور اس کا راستہ الگ کر کے، اسے یوں شتر بے مہار چھوڑ دو گی تو کوئی بعید نہیں کہ صوفیہ یا اس جیسی کوئی حسین جادوگرنی اس کو اپنے سحر میں گرفتار کرے۔ نادان لڑکی تم عاقب کی بیوی ہو اس بات کی اہمیت کو سمجھو اور پھر صوفیہ کو بھی بار آور کراؤ و عاقب خود بخود تمہارا ہو جائے گا۔''
حرا نے آج تک اپنی اس خامی کو تسلیم نہیں کیا تھا اور آج سدرہ بھابھی نے واقعی حق دوستی ادا کر دیا تھا اس نے تشکر بھری نگاہوں سے سدرہ کو دیکھا تو سدرہ نے مسکرا کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ جب اپنوں نے ہاتھ تھامے ہوں تو گرنے کا خطرہ کم سے کم ہوتا جاتا ہے۔ حرا کے اندر توانائی کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔

☆☆☆

ہفتہ کا دن تھا۔ عاقب کا آف ہوتا تھا۔ تو وہ گھر

پر تھا۔ صوفیہ کا آج رزلٹ اناؤنس ہونا تھا تو وہ بھی صبح ہی اٹھ گئی تھی اور حرا تو تھی ہی، صبح جلدی اٹھنے والوں میں سے۔ عاقب حسب معمول جاگنگ سے آ کر بیٹھا تو صوفیہ جو حرا سے پہلے ہی کچن میں موجود تھی فٹافٹ کافی کے دو کپ اور تازہ اورنج جوس ٹرے میں رکھ کر لاؤنج میں چلی آئی۔ جہاں حرا عاقب کے برابر صوفے پر بیٹھی تھی۔ صوفیہ خود ان کے مقابل رکھے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔
''عاقب یہ لو تم صبح اورنج جوس پسند کرتے ہو نا۔ مجھے معلوم ہے تمہاری ساری عادتیں اور حرا تم تو میری طرح ہی کافی پسند کرتی ہو، یہ لو۔'' صوفیہ نے اپنا کافی مگ اٹھایا اور ٹرے آگے کھسکا دی۔
''ارے صوفیہ میں کافی لو رہی ہوں نہیں۔'' حرا نے مبہم مسکراہٹ سے کہا تو صوفیہ اور عاقب دونوں چونک گئے کیونکہ وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ کافی کی دیوانی ہے۔
''یار میں اب کسی کی بیوی ہوں۔ تو میری پسند وہی ہے جو میرے ڈیئر ہزبینڈ کی، آفٹر آل دلہن وہی جو پیا من بھائے کیوں......؟'' اس نے کافی کا مگ سائڈ پر کر کے عاقب کا آدھا خالی کیا ہوا گلاس اس سے لیا اور لبوں سے لگا لیا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا اور پھر واپس ٹرے میں رکھ، حیرانی سے خود کو تکتے عاقب کو مخاطب کیا۔
''آپ کیوں اتنے حیران ہو رہے ہیں۔ بھئی جھوٹا پینے سے محبت بڑھتی ہے اور میں آپ کی بیوی ہوں اور ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ آپ کا پوائنٹ آف ویو بالکل صحیح ہے خالی پیٹ کافی نقصان دہ ہوتی ہے جبکہ اورنج جوس طبیعت فریش کرتا ہے میں بھی بالکل تر و تازہ محسوس کر رہی ہوں۔ اس لیے اب آپ مجھے گھمانے پھرانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ دیکھیں تو موسم کتنا اچھا ہے صوفیہ تم مائنڈ تو نہیں کرو گی آج میں اپنے سجنا سنگ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ تم پلیز ماسی آئے تو کام کروا لینا کل پھر اتوار ہے۔ اور فریج میں سالن ہے تمہارے لیے کافی ہو گا میں اور عاقب امی

کے گھر سے ہوتے ہوئے آئیں گے تو کھانا کھا کر ہی آئیں گے، برا تو نہیں مانو گی تم خاصی سمجھ دار ہو اور پھر ایک عورت ہی تو عورت کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔''
حرا نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ دشمن وہیں سے چوٹ کھاتا ہے جہاں اسے شائبہ بھی نہ ہو۔ حرا کا یہ روپ صوفیہ کو بری طرح چونکا گیا تھا خود عاقب خوش گوار حیرت میں مبتلا تھا۔ حرا یہ سب نوٹ کرتے ہوئے خوب محظوظ ہو رہی تھی اب بال اس کے کورٹ میں تھی اور وہ شاید [illegible] پھر بار بار [illegible] رہی تھی اور خوب ناک کر [illegible] رہی تھی۔
''چلیں عاقب مجھے تو [illegible] ناؤں [illegible] پسند بہت اچھی ہے اور اس [illegible] ہوں...... کیوں......؟'' اس نے [illegible] ہاتھ بڑھایا اور عاقب نے [illegible] اپنے من پسند روپ میں دیکھ کر اس کا دل [illegible] رہا تھا در حقیقت حرا اس کی محبت ہو گئی۔
دونوں اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تو صوفیہ کا اضطراب اور بڑھ گیا اور وہ بے چینی سے انگلیاں مسلنے لگی اسی اثنا میں اس کے سیل میں میسج ٹون بجی تو اس نے ان باکس چیک کیا۔ صوفیہ کی دوست، فرح کا میسج تھا جس نے اس کے ساتھ ٹیسٹ دیا تھا اور وہیں ان کی دوستی ہوئی تھی۔
''صوفیہ انٹری ٹیسٹ میں فیل ہو گئی تھی۔ صوفیہ نے بجھے دل سے حرا کے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے دونوں میاں بیوی کے قہقہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔
''اس شکست کے بعد ٹھہرنا عبث ہے۔'' اس نے خود کلامی کرتے ہوئے واپسی کی تیاری کے لیے، گیسٹ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆

سیما بنت عاصم

سب محبت کا پھیلاؤ

بات چھوٹی سی تھی...... بڑھ کر گمبھیر صورت اختیار کر گئی تھی۔

عفان آج پھر تاخیر سے لوٹے تھے' نہا دھو کر چینج کرنے میں ایک گھنٹہ اور لگا دیا۔ لوٹے تو کرن منتظر تھی، آنتیں حلق میں جا پہنچی تھیں۔ امی کی باورچن کے ہاتھوں کے کھانے پر عفان ہمیشہ ناک بھوں چڑھاتے وہ خود اپنے ہاتھوں سے بے ڈھنگی دال بھی پکا کے رکھ دیتی تو کسی خوشی منظور تھی۔ آج سوئے قسمت کھانا اس کے ہاتھ کا تھا، وہ تعریف کی منتظر تھی تب ہی اس کی نظریں عفان کے ہر نوالے پر تھیں مگر ایک ایک لقمہ ان کے حلق سے بمشکل اتر رہا تھا، بالآخر چند نوالے لے کر انہوں نے پلیٹ سرکا دی۔

''سالن پسند نہیں آیا؟ آج میں نے خود پکایا ہے۔'' وہ گھونٹ گھونٹ پانی حلق سے اتارتے رہے اور کرن اس آنا کانی کا مطلب خوب سمجھتی تھی کہ عفان احمد سیر ہو کر ہی آئے تھے۔ اس کے تلوؤں سے لگی سر پہ بجھی۔

''جب کھانا کھا کر آئے ہیں تو یہ ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی، ادھر میں بھوکی مرتی رہی، صاف کہتے کہ کھانا کھا کر آئے ہیں۔''

''جب تمہیں پتا ہے تو سوال بھی مت کیا کرو...... اور تم سے ہزار بار کہا ہے، میرا انتظار مت کیا کرو۔''

''کم از کم مجھے تاخیر کی وجہ تو معلوم ہونی چاہیے۔'' کرن کا لہجہ کڑک تھا مگر وہ کسی معاملہ میں غلط بیانی کے قائل نہ تھے' سو کھل کر کہا۔

''چھوٹی کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا ہے، اس کا ڈومیسائل بنوانے میں لگا رہا۔ بڑی کا پیپر تھا، اسے پک اینڈ ڈراپ کرتا تھا۔''

''تو وہ ان کی بڑی بہن ناعمہ کس مرض کی دوا ہے، ہر ماہ ہزاروں کا خرچ، اس کی فیملی کے لیے آپ کی پاکٹ سے جاتا ہے ویسے بھی آپ کی دونوں چھوٹیاں اب اتنی بڑی ہو گئی ہیں کہ کم از کم اپنے مسائل سنبھال سکیں۔''

''میں نے اپنی فیملی کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالا ہے، انہیں یہ سب کرنے کی عادت نہیں ہے۔''

''تو آپ کب تک ان کے لیے ڈھال بنے رہیں گے، آپ کی اپنی بھی ایک لائف ہے۔''

''یہ میرے معاملات ہیں مجھے خود نمٹنے دیا کرو۔ میں نے اپنے مسائل اپنی زندگی پر قربان کرنے کا کوئی وعدہ تم سے نہیں کیا تھا۔ تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو ہوا کرے۔'' ان کا لہجہ بگڑا اٹھا تھا۔

''مجھے حرج ہوگا تو تکلیف بھی ہوگی اور جب تکلیف بڑھے گی تو نقصان آپ کا بھی ہو سکتا ہے۔''

عفان کے لیے کرن کی یہ دھمکی نئی نہ تھی، کرن سے ان کی شادی کو چار سال ہونے کو آئے تھے اور ان چار سالوں میں کرن کی ٹوہ لینے، مین میکھ اور نکتہ چینیوں سے بڑھ کر ان کے معاملات میں جا بے جا مداخلت ان کا ذہنی سکون ابتر کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ کبھی ان کے معاملات و مسائل کو نہ سمجھ سکی نہ ہی انہیں بانٹ سکی یا کم از کم انہیں چھوٹ ہی دے دیتی تو شاید وہ اتنا ڈسٹرب نہ ہوتے۔

اب اس کا کیا کیا جائے کہ ان کی فیملی نے بھی کسی مد میں گھر سے باہر جھانکا تک نہ تھا۔ ہسپتال' مارکیٹ' بچوں کے تعلیمی معاملات حتیٰ کہ روزمرہ کے سودا سلف تک کے کام وہ خود کرتے رہے تھے۔ کرن کے لیے فل ٹائم فراغت کے لیے ابھی وقت درکار تھا کہ ابھی ان پر مزید ذمہ داریوں کا بار تھا۔ بڑا بیٹا اعلا تعلیم کے لیے لندن گیا تھا، ہر ماہ اس کے اکاؤنٹ میں ایک بھاری رقم منتقل کرنا عفان کی مجبوری تھی۔ اس سے اگلی ناعمہ کی پسند کی شادی تھی، اس کا شوہر آرٹسٹ تھا، ہوائی روزی تھی اس کے فلیٹ کا کرایہ، بچوں کی فیس و دیگر اخراجات انہی کی جیب سے پورے ہوتے۔ شادی کے وقت، کرن کی میکے سے قریب ترین گھر لینے کی شرط پر وہ گلستان جوہر کے ڈھائی سو گز کے بنگلے سے عام مڈل کلاس علاقہ کے قدرے اسٹائلش گھر میں اٹھ آئے تو ان کی بیاہتا بہن ناعمہ ہی نے اپنا فلیٹ چھوڑ کر ان کے گھریلو مسائل کو سنبھالا تھا مگر بات وہیں آ کے رکتی ہے، کرن کا ان کا شیئر ہونا منظور نہ تھا۔

''تم جو کچھ کرتی ہو اپنے...... اپنے گھر والوں کے لیے کرتی ہو، میں نے تب بھی کبھی تمہارے کسی معاملہ میں مداخلت نہیں کی، تو کیا تمہاری لغت میں میرے لیے کسی رعایت کا لفظ درج نہیں ہے۔''

''عفان! آپ اپنی فیملی کے لیے مجھے...... اس گھر کو سراسر اگنور کیے رہیں اور میں آپ کو مزید رعایت دے دوں تو صاف کہہ دیجیے کہ آپ کو میری ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''اُف......'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے، وہ ہر بات کا مطلب اور نتیجہ منفی ہی نکالتی تھی اور یہی اس کے مزاج کی اصل خرابی تھی۔ عفان نے بھی اسے اپنے معاملات میں نہیں الجھایا تھا، تب بھی کرن نے ان کی فیملی کو اپنا درد سر بنا رکھا تھا۔ بالآخر وہ چیخ اٹھے تھے۔

''تو کیا چاہتی ہو تم...... ہر وقت تمہارے گھٹنے سے لگا تمہاری مالا جپتا رہوں۔ ہزار بار تمہیں سمجھایا میری اپنی ایک لائف ہے، اس میں مداخلت نہ کیا کرو۔''

''تو نکال پھینکیے مجھے اپنی زندگی سے...... مجھے بھی یہ ترستی سسکتی زندگی منظور نہیں ہے۔''

''تم اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارتی ہوں' آفس یا میکا...... اس گھر کو تم نے سرائے بنا رکھا ہے۔ اپنی مرضی سے سوتی جاگتی، آتی جاتی ہو ہمیشہ اپنی من

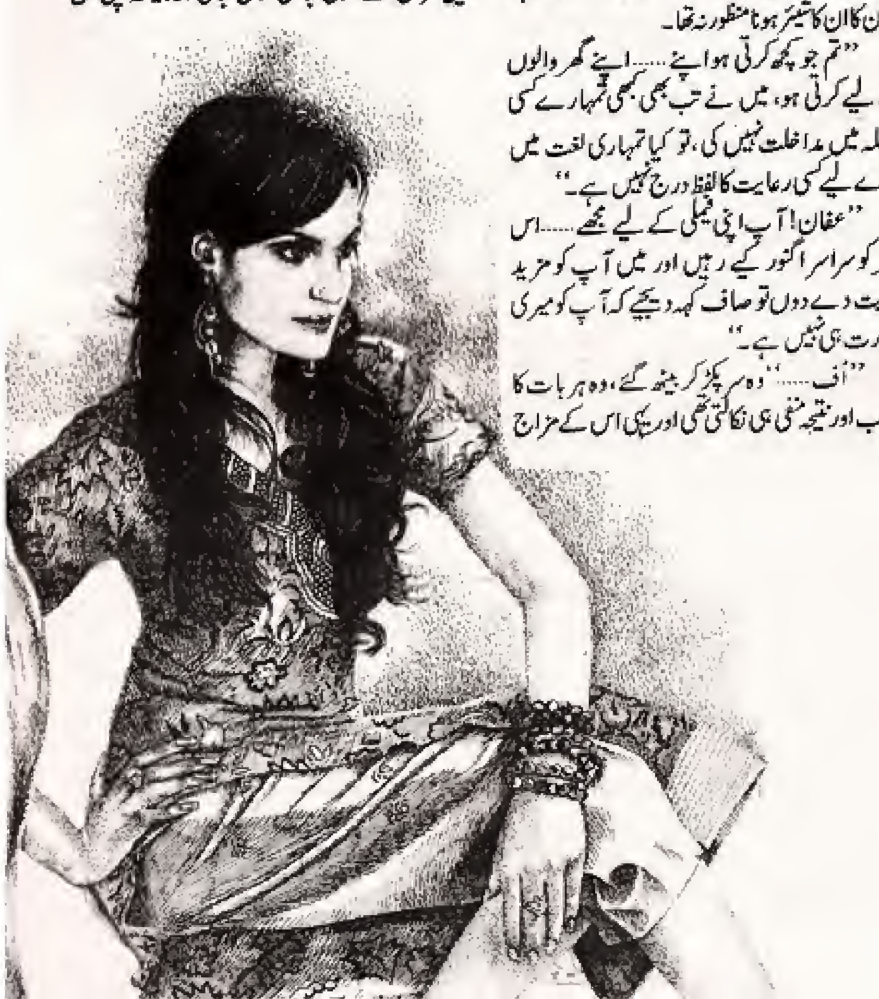

PakBooks.Site

مالی کرلی ہو۔ میں نے تم سے شادی، اپنی تنہائی بانٹنے، کچھ سکھ پانے کے لیے کی تھی مگر میں مزید بکھر اٹھا ہوں تو تمہارے اس رویے کی وجہ سے...... شوہر کو سکھ، بیوی کی اعلا ڈگری، اس کی آمدنی نہیں اس کی انوالومنٹ دیا کرتی ہے مگر تمہیں میری زندگی، میرے معاملات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں، بس اپنی زندگی، اپنے معاملات سے غرض ہے۔ اس پر تمہیں میری فل ٹائم اٹینشن بھی چاہیے۔"

"جی ہاں، کیونکہ میں آپ کی بیوی ہوں، کوئی کٹھ پتلی نہیں ہوں۔"

"تو جو تمہارا دل چاہے سمجھتی رہو، مجھے ٹینشن مت دیا کرو۔" وہ اپنا بوریا بستر اٹھا کر دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گئے تھے، وہ بھی اوتپ کرکے بیڈروم کی بتیاں بجھا کر اوندھی پڑی رہی۔

☆......❁......☆

اگلی صبح وہ منہ سر لپیٹے پڑی رہی، ہفتہ تھا سو دفتر جانے کی فکر نہ تھی۔ عفان نے بھی خاک پروا نہ کی، ناشتا تو کبھی نصیب ہوا نہیں تھا کہ خود کرن کا ناشتا ایک انڈا، ایک گلاس دودھ ہوتا۔ لنچ کی وہ عادی نہ تھی اور رات کا کھانا وہ اکثر امی کے گھر سے کھا کر نکلتی۔ میکا چار قدم پر تھا، سو ایک قدم امی کے گھر، دوسرا دفتر میں رہتا۔ اپنا گھر تو جیسے واقعی سرائے تھا، عفان اپنی ساری تیاری کرکے بنا کچھ کہے نکل گیا تو وہ بھی سر جھٹک کر امی کی طرف چلی آئی اور وہ امی ہی کیا جو اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کا اندرنہ جانچ سکیں۔

"عفان سے پھر تکرار ہوئی ہے؟"

"کون سی نئی بات ہے؟" وہ ان کے نزدیک تخت پر پیر پسار کے بیٹھ گئی۔

"تم سے ہزار بار کہا ہے، ہماری فکر چھوڑ دو۔ اپنی زندگی کی پروا کرو، بیٹا یہ آئے دن کی رنجشیں جڑ پکڑ جائیں تو دلوں میں گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔" کرن چڑ گئی۔

"میری زندگی آپ دونوں کی زندگی سے جڑی ہے امی! اور یہ بات عفان جانتے ہیں...... جب ایک بات طے ہو گئی تو ہو گئی...... اور نہ ہی یہ بات فساد کی جڑ ہے۔"

"ارے بیٹا! وہ کچھ نہ کہیں مگر بیوی، اس کے میکے کی خاطر کون مرد اپنا سکون برباد کرتا ہے۔ سب کی اپنی زندگی، اپنے معاملات ہوتے ہیں ویسے ہی ان کی بھی ایک اور زندگی ہے۔"

"سنا تھا دوسری بیوی کو لوگ سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ میں نے انہیں ان کی ہزار خامیوں سمیت اپنایا تو سوچا تھا......"

"یہ باتیں پہلے دیکھنے اور سوچنے کی ہوتی ہیں، اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل۔ تم خود خوش رہو انہیں بھی خوش رکھو تو بیشتر معاملات خود بخود حل ہو جائیں گے۔" امی حسب عادت سمجھانے بیٹھ گئیں ان کا اشارہ عفان کی دوسری فیملی کی جانب تھا۔ سو اس کا موڈ آف ہی رہا۔

"آپا کا......" مغیب عقب سے آ کر اس سے لپٹ گیا تھا۔

"میرے چاکلیٹ اور گیمز......"

"ارے میں تو بھول ہی گئی، چلو رکشا کرکے چلتے ہیں۔ کچھ اور کام بھی کرنے ہیں۔"

"زیادہ دیر نہ کرنا عفان آ گئے تو موڈ آف کرلیں۔" امی نے چلتے چلتے بھی تنبیہہ کی تھی اگرچہ عفان ہمیشہ ان کے لیے تابع دار و نیک طبع داماد ہی ثابت ہوئے تھے اور یہی نکتہ کرن کے حق میں جاتا تھا۔

"انہیں معلوم ہے، مجھے اور کہاں جانا ہے، ملا کی دوڑ مسجد......"

وہ مغیب کو لے کر نکل گئی، سیلری ملے ابھی دو ہی دن ہوئے تھے، امی کی دوائیاں، کچن کا راشن فریج کا سامان ملازم و ماسی کی تنخواہ، یوٹیلٹی بلز...... اس کے کچھ دن میکے لیے بک رہتے تب بھی دن بھر میں ایک آدھ پکار تو امی یا مغیب کی جانب سے پڑ ہی جاتی۔ وہ اسی پکار پر لبیک کہتی کبھی دفتر سے واپسی اور کبھی عفان کے لوٹنے کے بعد میکے کا رخ کرتی کہ خود اسے بھی کہاں قرار رہتا۔

آج بھی اسے لوٹنے میں خاصی تاخیر رہی۔ رات گئے عفان کی گاڑی کے ہارن پر وہ اسی آف موڈ کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی تھی راستے

پھر ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔

☆......❁......☆

کرن کی عمر تیس کا ہندسہ کراس کر چکی تھی اور کرن کی شادی سے بڑھ کر اس کا انکار امی کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ یہ انہی دنوں کی بات تھی جب امی کی عزیز از جان تابندہ کا نزول ہوا اور اس سے بڑھ کر کون جانتا کہ تابندہ کی آمد کبھی بے جا نہ ہوتی تھی، اس نے کان لگا کر سنا۔

"سن رہی ہو نا صولت! آدمی پیسے والا ہے...... پیسے والا...... پیسا بہت سی خامیوں کو ڈھانپ لیتا ہے، انسان کی زندگی میں اگر سو مسائل ہیں تو نوے پیسے کی کمی کے سبب۔ خیر سے اپنی کرن ہزاروں میں ایک ہے، اعلا بڑھیا نوکری بھگتاتی ہے پھر اس دور میں لڑکیوں کی اتنی عمر نکل جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس نے تمہیں، سارے گھر کو سنبھال رکھا ہے، یہ ساری دنیا دیکھتی ہے۔"

"مگر یہ بھی نہیں کہ تم اپنی اور مغیب کی دیکھ بھال کی خاطر اس کی شادی کی عمر ہی نکال دو۔ کچھ وقت گزر گیا...... کچھ اور گزر گیا تو ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی۔"

تابندہ کی بات بجا تھی۔

اب یہ تو امی بھی جانتی تھیں کہ کرن کی شادی کی عمر نکل رہی ہے پھر وہ کرن کے مزاج سے بھی خوب واقف تھیں، چار حروف پڑھ کر، پانچ ہندسے کی سیلری کا خمار...... اس کے دماغ کو چڑھا تھا، وہ خود کسی ایسے ویسے کو کہاں گھاس ڈالنے والی تھی۔ تابندہ نے لگے ہاتھوں تصویر کا اگلا رخ بھی دکھایا۔

"یہی وقت ہے، گزرتے وقت کی ڈور کو تھام لو، کہیں ہاتھ ملتی رہ جاؤ۔ کچھ اور وقت گزرا تو ایسا بر بھی نہیں جڑنے والا۔ عورت کا ڈھلاؤ تو یوں بھی جلد ہی شروع ہو جاتا ہے اور پچیس سال کی عمر کے بعد تو کنوارے رشتے کی امید بھی رکھنی فضول ہے۔" اور وہ بھیانک نقشہ کشی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔

کرن کو امی کی یہ ناٹھی گوڑی تابندہ ایک آنکھ نہ بھاتی، جب آتی، امی کو کوئی نہ کوئی مت ہی دے کر جاتی۔ کبھی چلتے چلتے اس کے کان میں اول فول ہانکتی۔

"ارے، تم نے یہ کس جنجال میں اپنی جان پھنسا رکھی ہے، شادی کروا اپنا گھر بساؤ، اپنی جان چھڑاؤ۔"

اب کوئی اس خوش بخت سے پوچھے، امی و کاکا کو ان کے حال پر چھوڑ دینا آسان کام تھا بھلا...... گھر کے ہزار جھمیلے ہوتے ہیں، وہ ان کے بس کے کہاں۔ سب سے بڑھ کر اس کی جاب کے طفیل گھر کی گاڑی چلتی، ان کے اور بیٹے، بہو، بیٹیاں، داماد تھے مگر سب اپنی اپنی دنیا میں مگن، مطلب پرست۔

مگر اس بار تکا لگ گیا تھا، تابندہ کے ہاتھ ایک "نادر و نایاب" رشتہ لگا تھا، بندہ ہینڈسم سیکرٹریٹ میں اعلا افسر، مڈل ایج تھی اور یہ کہاں ممکن تھا کہ اس عمر میں بندہ کنوارا ہی ہو۔ تابندہ کا فرمان بجا ہی تھا کہ پچیس سال کی عمر میں کنوارے رشتے کی امید بھی رکھنی فضول ہے۔

بات تو ٹھیک ہے مگر بات ہے سوال کی

امی اس کے بار ہا کے انکار، شادی کے معاملے میں اعلا معیار کا جواز بنا کر جتنی روش سے اتنی عاجز تھیں کہ اسے تقریباً اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ خود وہ بھی کب گزرتی عمر کی تمام تر سفاکیوں سے بے خبر تھی۔ سب سے بڑھ کر دنیا...... جو سنگ تھا سے ہر آن اس پر برستی۔ ہاں مگر...... امی و کاکا کی فکر دامن گیر نہ ہوتی تو کس کافر کو انکار تھا مگر بات وہیں آ کر ٹھہرتی ہے کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔

پھر یہ اسی ہاں اور ناں کی درمیانی کیفیت والے دنوں کی بات تھی، جب اس نے کسی طرح عفان کا نمبر حاصل کرکے خود ہی پوائنٹ بات کی۔

"مجھے آپ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں مگر میری کچھ شرائط ہیں۔"

"زہے نصیب...... فرمایئے!" وہ کچھ حیران سے تھے۔

"مجھے امی اور کاکا کے بغیر رہنے کی عادت نہیں ہے، میں ان سے دور نہیں رہتی...... رہ ہی نہیں سکتی۔ امی کی دیکھ بھال، گھر کے ہزار جھمیلے اور پھر میری جاب۔ امی شوگر، ہارٹ اور جوڑوں کی مریضہ ہیں اور

کاکا...... میرا چھوٹا بھائی، وہ تو میرے بغیر کھانا تک نہیں کھاتا۔ آفس سے پانچ منٹ بھی لیٹ ہو جائیں تو گھر سے باہر منتظر ملتا ہے، مجھ سے بہت چھوٹا ہے مگر چائلڈ برین...... اور امی! بس یہ سمجھ لیجیے کہ میری زندگی ان ہی کے گرد گھومتی ہے۔ آپ کو میرے گھر کے نزدیک گھر لینا ہوگا، یہی میری شرط ہے۔" وہ ایک سانس میں بنا رکے کہتی چلی گئی تھی۔

"جو حکم سرکار کا! ویسے یہ امی اور بھیا کی گردان کس لیے؟"

"کیونکہ میں زندہ ہی ان کے لیے ہوں۔" وہ سادگی سے کہہ گئی اور عفان کو کرن کا یہ عام سا جملہ اس وقت نہایت بے ضرر سا لگا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کا کھرا اور دوٹوک انداز، سچ تو یہ تھا کہ وہ اپنی رسیلی آواز سے ہی ان کے دل میں اترتی چلی گئی تھی۔ اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ وہ اپنی فیملی کو سپورٹ کرتی ہے اور پیسا ان کا مسئلہ نہیں تھا۔ اگرچہ کرن کی تصویر دیکھ کر وہ کچھ چپ سے ہو گئے تھے، لڑکی کی عمر پینتیس سال درج تھی، لگتی پچیس کی بھی نہ تھی یہ اور بات تھی۔ عمر کا تفاوت یوں کھٹکا کہ وہ شادی شدہ، جوان بچوں کے باپ تھے۔

یہاں شادی میں عجلت رہی اور ادھر تاخیر تھی...... تو اپنی فیملی کی خاطر اور یہ بڑی بات تھی اور اس وقت انہوں نے یہی سوچا تھا کہ جب وہ اپنی فیملی کے لیے اتنی مخلص ہے تو ان کے مسائل بھی یقیناً بانٹ لے گی۔

"مگر مجھے اپنی فیملی میں انوالو کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔" کرن کے اگلے ہی جملے نے ان کی امیدوں کو توڑ دیا تھا۔

"ان رشتوں کو اپنانے کی کوشش میں کھینچ تان چلتی ہے اور یہ تب بھی اپنے نہیں بن پاتے۔" کرن کی بات تلخ سہی مگر سچ تھی، ان کے دل کو لگی۔

"شاید وہ دوسری شادی کے بارے میں کبھی نہ سوچتے مگر بیوی کی اچانک وناگہانی موت کے سبب ان کے گھر کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تھا اور ان کی خطا یہ رہی کہ وہ اولاد کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکے۔ اس وقت گمان یہی تھا کہ رفتہ رفتہ وہ سب کچھ ٹھیک کرلیں گے، کرن جیسی میچور سمجھ دار اور ذمہ دار لڑکی ان کی بکھری ذات کو ان کے معاملات سمیت سمیٹ لے گی جب کہ ادھر عفان کے لیے اقرار کے عقب میں کرن کے زیر نظر اپنے مفادات بھی تھے اور عفان کہاں جانتے تھے۔

کرن کے زیر نظر ان کی حیثیت کے ساتھ یہ گمان بھی تھا کہ اپنی قابلیت کے سبب، ان سے برتر رہے گی، سو اس نے دوسرے لفظوں میں اپنی قابلیت کو کیش کیا تھا۔ گمان یہ تھا کہ اس جیسی کم عمر، لائق فائق اور کماؤ بیوی کے سامنے...... اس کی منشا و رضا کے خلاف کبھی سر نہ اٹھا سکیں گے۔ ان کا جھکاؤ اپنی فیملی سے بڑھ کر اس کی جانب رہے گا مگر یہاں تو بات ہی الٹی پڑ گئی تھی۔

اپنے تمام تر معاملات و مسائل سے قطع نظر عفان احمد کی شخصیت اتنی مکمل اور بھرپور تھی کہ کرن کی آنکھیں کچھ خواب سجا بیٹھی تھیں جو ایک ایک کر کے سب چکنا چور ہو گئے تھے۔ ادھر عفان احمد صدیقی کو بھی کرن کی سرکشی اور بگڑی روش نے دل بھر کے مایوس کیا تھا۔ اس سے وابستہ ان کی ساری امیدیں ایک ایک کر کے ٹوٹ گئی تھیں۔ سب سے بڑھ کر کرن کا مزاج ان کے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا تھا۔

☆......❁......☆

یہ بھی زندگی کا ایک چلن ہے، انسان جو سوچتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے۔ ہوتا وہ ہے جو قسمت میں درج ہو اور قسمت کی اپنی ایک منشا ہے جہاں آ کر ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ عفان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، زندگی کے لیے ان کی بھی کچھ پلاننگز تھیں، ان کے ساتھ اپنے بچوں کا مستقبل تھا اور ریٹائرمنٹ سر پر کھڑی تھی۔ ابھی دو بیٹیوں کے فرض کی ادائیگی باقی تھی، بڑا بیٹا اعلا تعلیم کے لیے لندن گیا تھا۔

ہر ماہ اس کے اکاؤنٹ میں ایک بھاری رقم عفان کی سیلری سے جاتی تھی۔ عفان کی کتنی امیدیں اس سے وابستہ تھیں، خود ان کے پاس جو کچھ تھا ان کے لیے کافی رہتا۔ انہیں لگتا وہ اب تھکنے لگے ہیں، دل اب سکھ کی چھاؤں میں پناہ لینے کو ہمکتا، سو انہوں نے ہنسی خوشی ریٹائرمنٹ منظور کرلی تھی۔

سوچا تھا گریجویٹی فنڈ وغیرہ کی رقم فکس ڈپازٹ کروا کے اس کا منافع و پنشن گھر کی گاڑی چلانے کو کافی رہتا۔ دو چار سال میں ان کا بیٹا ریحام تعلیم مکمل کر کے لوٹ آتا تب تک بیٹیوں کی بھی تعلیم مکمل ہو کر شادی کا مرحلہ آ ہی جاتا۔ تب پھر وہ اپنی دوسری فیملی کو کافی وقت دے پاتے۔

ان ہی دنوں ایک پرانا واقف کار سعادت مرزا ان سے آ ٹکرایا، وہ ان دنوں کسی نئے کاروبار کی داغ بیل ڈالنے کو کوشاں تھا اور عفان صدیقی کی خطا یہ رہی کہ اپنا تمام تر جمع جتھا فنڈ و گریجویٹی کی رقم سے اس کے کاروبار میں شراکت کرلی جسے سمیٹ کر اک روز سعادت مرزا خاموشی سے چلتا بنا۔

عفان صدیقی کے لیے یہ دھچکا کم نہ تھا، وہ سرتاپا لٹ گئے تھے یکا یک بے تحاشا خسارہ ان کے نصیبوں میں آ پڑا تھا۔ وہ نہایت تیزی سے کنگال ہوتے چلے گئے تھے، آخر کار ایک ساتھ دو گھرانوں کا بار اٹھانا ان کے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ کرن کی جانب خرچ بھی کم تھا، کرن اگر ان کی فیملی میں مکس اپ ہو جاتی تو بجٹ کافی حد تک قابو آ سکتا تھا۔ وہ کرن والے گھر کے رینٹ و دیگر اخراجات سے بری الذمہ ہو سکتے تھے۔

اور یہ بھی ان کی خوش گمانی ہی رہی کہ وہ کرن کو اس امر پر آمادہ کرسکیں گے مگر توقع کے عین مطابق وہ بگڑ اٹھی تھی۔ ایک بار پھر تکرار ہوئی۔ اس نے عادت کے مطابق اپنے مطلب کے معنی اخذ کر کے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا اور پھر اس کا بڑا ڈرامہ...... امی سمجھاتی ہی رہیں۔

"برا وقت کبھی کہہ کر نہیں آتا، مرد اسی عورت کی قدر کرتا ہے، جو اس کے مشکل لمحات میں اس کے ساتھ ہوتی ہے۔"

"ان کے کرائسس کا سارا بوجھ میرے ہی سر کیوں؟ اب یہ کسر اور باقی تھی کہ اپنے گھر کا خرچ بھی میں خود چلاؤں؟"

"تم اگر ان کی فیملی کے ساتھ رہنا نہیں چاہتیں تو کم از کم اپنا اپنے گھر کا بوجھ تو اٹھا ہی سکتی ہو۔"

"اپنے گھر کی گاڑی میں اپنی کمائی سے چلاتی رہوں اور ان کی فیملی کے اخراجات ان ہی کی پاکٹ سے پورے ہوتے ہیں، یہ کہاں کا انصاف ہے۔"

"اپنے گھر کے اخراجات وہ نہ اٹھائیں گے اور کون اٹھائے گا۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ سالوں کا چلن وہ صرف تمہاری وجہ سے چھوڑ دیں۔"

"تو مجھے چھوڑ دیں۔" اس نے تیزی و [illegible] سے بنا سوچے سمجھے کہا تھا۔

"کرن......" امی نے خطرناک تنبیہی لہجے میں ٹوکا تو وہ لب بھینچ کر رہ گئی اور وہ عادت کے مطابق اسے پھر سمجھانے بیٹھ گئیں۔

"وقت، زندگی اور حالات [illegible] ہے۔ تم کچھ دیر صبر رکھو، جو وقت آج [illegible] رہے گا۔ کچھ عرصہ گزرے گا، ان کا بیٹا [illegible] بیٹا اپنی فیملی کو سنبھال لے گا۔ آج نہیں تو کل [illegible] بیٹیوں کی شادی ہو ہی جانی ہے۔"

"ہاں، جیسے ایک بیاہی گئی تو اب بھی سر پر [illegible] ہے۔"

"نہیں یہی تو تمہاری خرابی ہے، ہمیشہ [illegible] تاریک رخ دیکھتی ہو۔" اور ان کے گھنٹہ بھر سمجھانے کا نتیجہ بھی صفر ہی رہا تھا۔

"شاید عفان احمد سے شادی ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی، سوچا تھا کم عمر، لائق و فائق بیوی کی قدر کریں گے۔"

"خیر اب یہ تو نہ کہو، مرد و عورت کے درمیان دس بارہ سال کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تم بھلے وقتوں میں بیاہی جاتیں تو خود بھی جوان بچوں کی ماں ہوتیں۔" انہوں نے چڑ کر اسے صاف آئینہ دکھایا تھا۔ "بھلا کمی کیا ہے عفان احمد میں، نیک، شریف الطبع، سنجیدہ و سمجھ دار...... شخصیت ایسی کہ دل کو چھو جائے۔ تم ہی ناقدر شناس ہو یا ساری دنیا کی طرح انہیں بھی جوتی تلے دبا کے رکھنا چاہتی ہو تو یہ تو ہو نہیں سکتا۔ مرد کا دبا ہوا، ڈرا ہوا یا جورو کا غلام ہونا، اس کا گن نہیں 'کمزوری' ہوتی ہے۔"

بیکی آ کر وہ مات کھا جاتی تھی، عفان احمد کی

شخصیت اتنی مکمل دبھرپور تھی کہ وہ ان کے خلاف جواز ڈھونڈتی ہی رہ جاتی جواباً خلاف طبع وہ خاموش ہی رہی تھی۔

اسی شام عفان احمد صدیقی کا نزول ہوا تھا، وہ اپنے کمرے میں تاریکی کیے بیڈ پر اوندھی پڑی تھی۔

''پھر کیا سوچا تم نے؟'' انہوں نے بلا تمہید بات شروع کی تھی۔

''آپ سے کہا بھی تھا، مجھے پریشان نہ کیجیے گا۔'' وہ اوندھی پڑی رہی، انہیں پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا مگر وہ بھی آج آر یا پار کے موڈ میں تھے۔

''تم مجھ کو اپنے لیے مخصوص رکھنا چاہتی ہو اور یہی تمہاری غلطی ہے۔ میں نے تم سے شادی کے وقت اپنی فیملی سے لاتعلق ہونے کا کوئی وعدہ تم سے نہیں کیا تھا اور نہ ہی یہ تمہاری دردسری ہے۔''

''ان سب کے اخراجات آپ کی پاکٹ سے پورے ہوتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔''

''اس سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟ میں تمہارے...... تمہارے گھر کے اخراجات بھی اسی طرح پورے کرتا رہا ہوں، اب میں تمہاری خاطر اپنی فیملی چھوڑ دوں۔ ابھی انہیں میری ضرورت ہے، تم خود مختار میچور عورت ہو۔''

''آپ کو فیملی کی ضرورت ہی کب تھی، ایک خدمت گزار ملازمہ درکار تھی، جسے آپ اپنی مرضی سے چلا سکیں۔''

''میں نے کبھی تم سے کسی بات کی بازپرس رکھی، نہ تمہیں خود کا پابند کیا۔ تم اپنی زندگی اپنی منشا کے مطابق گزارتی رہی ہو تو یہی توقع میں بھی تم سے رکھتا ہوں۔''

''تو صاف کہہ دیجیے آپ کو اپنی لائف میں میری انوالومنٹ منظور نہیں، میں آپ کا انتظار نہ کروں۔ آپ کی اپنی مصروفیات ہیں جن کے لیے آپ کو ایک کال بھی گوارا نہیں۔ میں کال کروں تو موبائل بند یا ریسیو نہیں ہوتی کہ آپ کی فیملی کو پسند نہیں۔ میرا آؤٹنگ کا موڈ ہو تو آپ کو تھکان، میں کچھ پکالوں تو آپ کھا کر آتے ہیں۔ بجوں سنوروں تو آپ رات گئے لوٹتے ہیں، جب آپ کے پاس میرے لیے وقت ہی نہیں تو مجھے بھی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے۔''

''سوچا تھا تم میرے معاملات سمجھ کر انہیں بانٹ سکوں گی، مگر......''

''جی ہاں، صاف ہے کہ آپ کے کرائسس سمیٹنے کے لیے اپنی تنخواہ آپ کے ہاتھ پر رکھ دوں۔''

''میں نے کبھی تمہاری آمدنی پر نظر نہیں رکھی، تمہیں ایک آپشن دیا ہے تم اگر ان کی ساتھ رہنا نہیں چاہتیں تو دوسرا راستہ یہی ہے کہ کم از کم اپنے گھر کو سنبھال لو۔''

''کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا آپ کی فیملی کے ساتھ گزارا ہے نہ ہی میں اپنی فیملی سے دور رہ سکتی ہوں۔''

اب وہ کہتے تو اسے مزید برا لگتا کہ اس نے مزاج ہی ایسا ٹیڑھا پایا تھا کہ گزارا تو اس کا کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ مین میکھ، نکتہ چینی...... سب سے بڑھ کر خود کے برتر ہونے کا فخر، وہ اس بار چڑ اٹھے تھے۔

''مجھے اپنا آخری فیصلہ سنا دو تاکہ تمہارا اور میرا ٹائم ضائع نہ ہو۔'' اور اس نے بے دھڑک ہو کر ایک بار پھر اپنی بات دہرا دی تھی۔

''جب کما کے گھر کی گاڑی بھی مجھے ہی چلانی ہے تو آپ کا نام لگائے رکھنے کی کیا تک بنتی ہے؟''

''گویا میرا پیار اور میرا ساتھ تمہارے لیے بے معنی ہیں۔'' وہ لاجواب ہو کر لب بھینچ کر رہ گئی تھی، یہ سچ تھا کہ عفان احمد صدیقی کا ساتھ اور ان کا پیار اس کی زندگی کی تکمیل کر سکتے تھے پھر یہ کہاں ممکن تھا کہ کوئی محبت کے جواب میں محبت سے محروم رہے۔ ان دونوں کی بگڑتی تو بس یہیں آ کر کہ عفان کا جھکاؤ اپنی فیملی کی جانب زیادہ رہتا اور کرن نے اسی بات کو اپنی چڑ بنا رکھا تھا۔

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے اور خریدتے رہیے اپنی فیملی کے لیے انڈے ٹماٹر۔'' اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔

PakiBooks.Site

''ٹھیک ہے، میں بھی آئے روز کی چخ چخ سے تنگ آ گیا ہوں، میرے گھر کے دروازے کھلے ہیں، تمہارا فیصلہ بدل جائے تو لوٹ آنا۔'' وہ حتمی لہجے میں کہہ کر پلٹ گئے تھے اگرچہ ان کا اپنا دل سکڑا تھا مگر یہ بھی سچ تھا کہ اب وہ تھکنے لگے تھے اور ہار رہے تھے۔

☆......❁......☆

''اینی پرابلم؟'' کرن کے باس شکیل صاحب نے اس کی شکل بغور دیکھی تھی اگرچہ اس کا چہرہ اس کے اندرونی کرب کا غماز تھا تب بھی وہ نفی میں گردن ہلا گئی تھی۔

''تھنک سر...... ایگزیکلی تھنک آئی ایم پرفیکلی آل رائٹ۔''

''جتنی عمر ہے نا اس سے کہیں زیادہ میرا تجربہ ہے، بیٹھ جاؤ...... اب کہو کیا بات ہے؟'' اور کرن کی زندگی ان کے سامنے کھلی کتاب تھی، سو وہ اپنے اندر کی ساری فرسٹریشن اگل گئی تھی۔

''ہم جتنی فکر دوسروں کی رکھتے ہیں اگر خود اپنی رکھ لیں تو یقین جانو آدھے مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہ زندگی ہے اور زندگی ہم سے بہت کچھ طلب کرتی ہے۔''

''آپ سب کی ان ہی باتوں نے مجھے عفان کے لیے فیصلہ لینے پر مجبور کیا تھا۔'' وہ اس کی جذباتی و نادان فطرت کو خوب سمجھتے تھے سو دھیرے سے مسکرائے۔

''گویا اس رشتے میں تمہارا پرسنل انٹرسٹ نہیں تھا۔'' وہ ایک بار پھر بے اختیار نفی میں گردن ہلا گئی تھی۔

''عفان ایک بھرپور اور مکمل شخصیت ہیں مجھے انکار نہیں مگر شاید جو رشتے سمجھوتے کی بنیاد پر جوڑے جائیں وہ یونہی ناپائیدار ثابت ہوتے ہیں۔''

''اچھا...... اور جو محبت کی بنیاد پر جوڑے جائیں ان کی پائیداری شرط ہے؟'' وہ مبہم سا مسکرائے پھر لب کشائی کی۔ ''یہ جو وقت کی سازشیں ہوتی ہیں ناں، یہ اکثر پانی سر سے گزر جانے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔ کبھی کبھی زندگی کا سکھ خود ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اگر اس سکھ کا فارمولا پا لیا جائے تو زندگی خود بخود سہل ہوتی چلی جاتی ہے۔''

''ہونہہ...... سکھ کا اگر کوئی فارمولا ہوتا تو شاید کوئی دکھی نہ رہتا۔''

''اسے اس کے حال پر چھوڑ دو، یعنی اس کے معاملات میں مداخلت بند کر دو۔ اسے اس کی زندگی میں مگن رہنے دو۔ تم اپنی زندگی میں خوش رہو، اس کے لیے لاتعلقی شرط نہیں ہے۔''

''واہ...... بہت خوب فارمولا ہے تاکہ وہ اور آزاد ہو جائے۔''

''سو واٹ...... کسی کو خود سے باندھ کے رکھنا محبت نہیں خود غرضی ہے۔ تم نے سنا نہیں تم جسے چاہو اسے آزاد چھوڑ دو، وہ اگر لوٹ آیا تو تمہارا اور اگر نہ لوٹا تو سمجھو کہ کبھی تمہارا تھا ہی نہیں۔ یہ ایک رسک ہے لیکن تصویر کا روشن رخ دیکھا جائے تو یہ اتنا مشکل بھی نہیں۔ سب کو اپنی زندگی، اپنے نظریات و معاملات ہوتے ہیں۔ تمہارا بھی ایک لائف اسٹائل یقیناً ہوگا، تم نے اپنے معاملات میں ان کو پابند رکھا، وہ اس پر قائم ہیں۔ یہی ان کا کھرا پن ہے، تم بھی ان کے معاملات سے لاتعلقی اختیار کر دو اور صرف تم ہی نہیں میاں بیوی اگر ایک دوسرے کی زندگی کے معاملات پسند و ناپسند میں مداخلت نہ کریں تو یقین جانو ایک بڑی چخ چخ سے نجات مل جائے۔''

''وہ کتنی آسانی سے اپنا فیصلہ سنا کر چلتے بنے، کیا یہی میری قدر و قیمت تھی۔'' کرن کے دل سے یہ دکھ مٹائے نہ مٹتا تھا۔

''یہ جو محبت ہوتی ہے نا، آپس کی رنجشوں میں کبھی دب جاتی ہے اور کبھی کم ہو جاتی ہے مگر یہ کبھی فنا نہیں ہوتی اگر یہ فنا ہو جائے تو تعلقات بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اپنے اندر کو ٹٹولو، اگر محبت کا ایک جز بھی ملتا ہے تو اس کی خاطر لوٹ جاؤ اور اگر نہیں ملتا تو پھر یہ ساری کھینچ تان بے معنی ہے۔''

شکیل صاحب ان لوگوں میں سے تھے جنہیں وہ خاموشی سے سن لیا کرتی تھی، سو اب بھی لب سیے سنتی رہی پھر یہ ان کے لہجے کی تاثیر تھی یا لفظوں کا

کمال کہ اسی شام وہ اسی غیر جانبداری کا عہد کر کے گھر کو لوٹ گئی تھی۔

☆......❀......☆

عفان کا بیٹا ریحام اپنی اسٹڈی مکمل کر کے لوٹ آیا، کچھ وقت لگا اسے اسٹیبلش ہونے میں، بالآخر اس نے عفان احمد صدیقی کے سارے خسارے سمیٹ لیے تھے۔ دونوں بیٹیاں اپنے گھر کو سدھاریں تو نائمہ کا بھی میکے میں رہنے کا کوئی جواز نہ رہا، اب...... عفان اس کے گھر کو افورڈ کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا، خود ان کے اور کرن کے لیے کافی تھا اور اب بھی انہوں نے کرن کو گھر کے اخراجات کے لیے پابند نہ کیا تھا۔

امی گزر گئیں تو کا کا مکمل اس کے تصرف میں تھا، اس کی اپنی زندگی چل پڑی تو آپس کی رنجشیں اپنی موت آپ مرگئی تھیں۔

اور یہ سب یکا یک نہیں ہوا تھا، ہو نہیں سکتا تھا۔ انسانی زندگی میں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے جو اچانک و غیر متوقع ہی نہیں ناقابل یقین بھی ہوتا ہے۔ کبھی خوش گوار، کبھی ناخوش گوار...... وقت، حالات اور زندگی بدلتے عرصہ لگتا ہے۔ کوئی ایک لمحہ سالوں پر محیط خساروں کو نہیں سمیٹ سکتا۔ انسان کے اندر سے اس کی فطرت کھینچ نکالنا ممکن نہیں نہ ہی سالوں پر پھیلی روش...... زندگی کا چلن اور ڈھب بدلنا، آسان ہے جب دو انسانوں کے مزاج بارہا ٹکراتے رہیں تو خسارے خود بخود اپنا رستہ تلاش کر لیتے ہیں اور جہاں محبت ہو وہاں خساروں کے سودے نہیں کیے جاتے۔

کرن نے خود کو ٹٹولا تھا اور محبت کا جز پا کر گھر کو لوٹ آئی تھی، عفان احمد صدیقی گھر کو لوٹے تو وہ ان کے بیڈروم میں اپنی تمام تر بے نیازیوں سمیت پلکیں موندے محو خواب تھی انہوں نے قریب بیٹھ کر اس کا سر ہلایا تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''تم آ گئی ہو؟''

''آ گئی ہوں تبھی تو نظر آ رہی ہوں۔'' وہ جھٹ پٹ اٹھ بیٹھی۔

''پھر میں جونک...... میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟''

''چٹکی کاٹوں......؟'' اس نے کہتے ہوئے زوردار چٹکی بھری۔

''اف...... آ گیا...... یقین آ گیا......'' عفان کے لیے اس کے مزاج کا یہ رخ نیا تھا۔ وہ اس کی کمی تو محسوس کرتے مگر وہ ازخود لوٹ آئے گی یہ سوچا بھی نہ تھا، اس کی تمام تر شکایتیں بجا ہی تھیں۔ وہ اسے وقت نہ دے پاتے یہ ان کی خطا تھی، وہ اپنی زندگی کی چک پھیریوں میں الجھ کر، اسے فراموش کر جاتے جس کے سبب ان کی اجڑی بکھری زندگی کی تکمیل ہو سکی تھی۔ انہیں اپنی خطا کا اعتراف تھا مگر اب بات بگڑ چکی تھی اور آج ان کے لیے کرن کے یہ انداز و تیور نرالے تھے وہ ایک بے یقینی و حیرت سے اسے تکتے چلے گئے تھے اور وہ سمجھ کر مسکرا دی۔

''آج ہمیں یہ اعتراف کر ہی لینا چاہیے کہ ہماری ڈیل میں ایک کوتاہی رہی۔ ہم نے ایک دوسرے کے مسائل سمیت ایک دوسرے کو اپنایا مگر ان مسائل کو بانٹ نہ سکے۔ یہ بھی نہ سہی مگر کم از کم ہم ایک دوسرے کے معاملات میں ایک دوسرے کو آزاد تو رکھ سکتے تھے خصوصاً اس صورت میں جب آپ میرے کسی معاملے میں سوال یا مداخلت نہیں کرتے۔''

یہ کرن تھی، انہیں یقین کی ڈور تھامنی دشوار ہوگئی، عفان مسکرائے تھے۔

''تو پھر مانتی ہو نا، میں نے تمہیں کسی معاملے میں انوالو نہیں کیا تھا۔ یہ ساری فرسٹریشن تمہاری اپنی خریدی ہوئی ہے اور یہی بات فساد کی جڑ تھی، تم مجھے چھوٹ دے دیتیں تو خود بھی بے فکر رہتیں۔''

''ہاں...... کیونکہ کسی کو خود سے باندھ کر رکھنا محبت نہیں خود غرضی ہے اور یہ جو کچھ بھی ہے سب محبت کا پھیلاؤ ہے۔'' کرن نے عفان کے کاندھے پر سر رکھ کر سکھ سے آنکھیں موند لی تھیں اور انہوں نے اپنی ہر خطا کے ازالے کا خود سے عہد کر کے اسے سمیٹ لیا تھا۔

☆☆

PakiBooks.Site

خاندان

مزمل سلیم

خاندان تو خاندان ہوتا ہے، بڑا ہو یا چھوٹا۔ کوئی ایک چچا اور پھپھو پہ خوش تو کچھ خواتین و حضرات آٹھ دس چچاؤں اور آنٹیوں کے گھیرے میں نظر آتے ہیں مگر بڑے خاندان کی موج تب ہوتی ہے جب آدھے سے زیادہ خاندان سے آپ کی لڑائی ہو اور باقی خاندان کسی وجہ سے آپ کے گھر نہ آتا ہو۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر میں خاندان سے اس قدر نالاں کیوں ہوں تو حضرات سنیے میں بالکل بھی کوئی خبطی یا تنہائی پسند قسم کی عورت نہیں بلکہ ایک ورکنگ وومن ہوں جو ایک عدد بیٹی کی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج گلشن آباد میں اردو کی لیکچرار ہوں۔ میاں صاحب بینکر ہیں اور گھر میں بھی اکثر حساب کتاب کرتے نظر آتے ہیں۔ یوں تو میری زندگی مکمل اور پرسکون ہے مگر میری بدقسمتی یہ کہ میری خاندان میں کسی سے کوئی لڑائی نہیں۔ میاں جی کے تین بہنیں اور ایک بھائی ہے جبکہ میرے دو بھائی ہیں۔ زندگی سکون سے اپنی رفتار میں چل رہی تھی کہ اچانک وہ دن آ گئے۔

☆☆☆

کچھ دنوں سے کھانسی نے سر میں درد کر رکھا تھا اور آج تو بخار صاحب بھی تشریف لے آئے۔ کالج سے چھٹی کر کے میں گھر میں آرام کر رہی تھی کہ اچانک سر چکرانے لگا۔ نایاب، میری بیٹی کالج گئی ہوئی تھی۔ خود ہی کسی طرح اٹھ کر میاں جی کو کال ملائی۔

"سنتے ہو، سر چکرا رہا ہے۔"

"تو آپ بھی گول گول گھومنا شروع کر دیں اور پھر دیکھیں کون جیتتا ہے آپ یا سر!" ان کی مصروف سی آواز نے کانوں میں رس گھولا۔

"میں سنجیدہ ہوں، بخار بھی تیز ہو رہا ہے۔"

"میں بھی سنجیدہ ہوں بخار کے ساتھ دوڑ لگا کر دیکھیں امید ہے صبح اٹھ کر آپ جو ورزش کرتی ہیں اس کی مدد سے آپ جیت جائیں گی۔"

"مطلب آپ کچھ نہیں کر سکتے۔" میں جھنجلائی۔

"جی بالکل ٹھیک بھی ہیں ذرا حساب لگائیں آپ نے میرے جو پانچ منٹ ضائع کیے ہیں وہی کسی اور کو بلانے میں ضائع کرتیں تو اب تک ڈاکٹر کے پاس ہوتیں۔" ان کی ہنسی مجھے زہر لگی۔ میں نے کال بند کر کے اپنی نند ہانیہ کا نمبر ملایا۔

"ہانو، فری ہو تو گاڑی لے کر آؤ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔" میں نے کمزور آواز میں فریاد کی۔

"کیا ہوا بھابھی، میں آئی ابھی۔" ہانیہ مسئلہ جلد سمجھ جاتی تھی مگر اس کے ساتھ بھی ایک مسئلہ تھا۔ وہ پیٹ کی بہت ہلکی تھی مجھے پتا تھا اب میرے بخار کی داستان پورے خاندان میں پھیلے گی۔ کچھ دیر بعد ہانیہ آئی اور مجھے سہارا دے کر ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر سمیرا میری بہت اچھی دوست ہے۔ جلدی جلدی میرا چیک اپ کیا۔

"ارے شازیہ، کتنے دن سے ہے کھانسی؟" اس نے خطرناک نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔"

"تم پڑھی لکھی ہو تم سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی، فوراً چیک اپ کروانا تھا بے وقوف۔" وہ ڈانٹنے لگی۔

"بس یار کیا کروں وقت نہیں ملتا۔" میں بے بسی سے بولی۔

"اب ملے گا وقت۔" اس نے فوراً چار پانچ ٹیسٹ لکھ کر دیے۔

"یار سمیرا کبھی ون ڈے یا ٹی ٹوینٹی بھی لکھ دیا کرو، ٹیسٹ کون دیکھتا ہے آج کل۔"

"مذاق کا وقت نہیں، جلدی یہ کروالو اور رپورٹس لے آؤ۔" اس نے جواب دیا۔ ٹیسٹ کے بعد ایک گھنٹا ویٹ کرنا پڑا اور ہم رپورٹس لے کر واپس سمیرا کے پاس پہنچے۔ اس نے بغور تمام رپورٹس کا معائنہ کیا۔

"تمہارے گھر میں کوئی سگریٹ تو نہیں پیتا؟" اس نے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا۔

"نہیں۔"

"ہم...... پھر یہ کیوں ہو گی، تم نے پہلے چیک کروانا تھا۔" اس کے لہجے میں پریشانی محسوس ہوئی۔

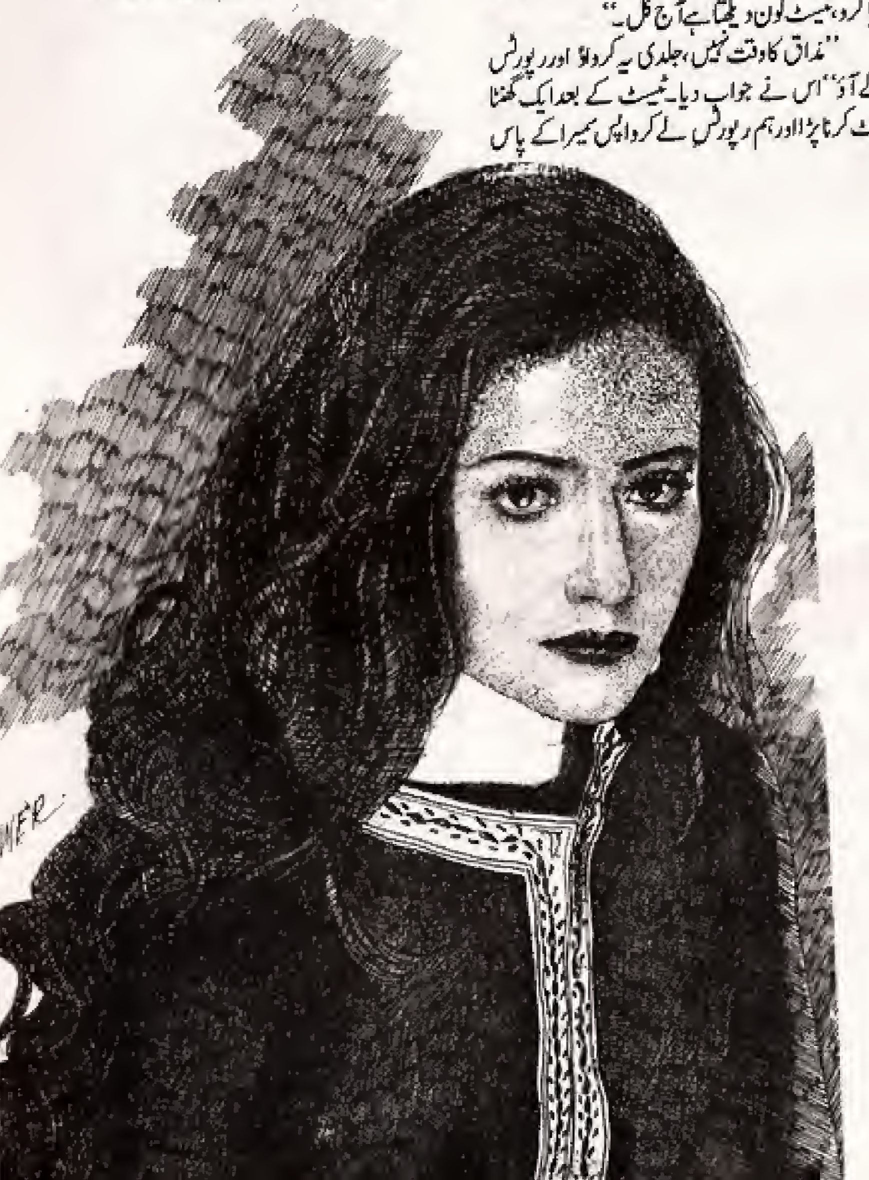

PakBooks.Site

"کیا ہوا ہے؟" ہانیہ نے پوچھا۔

"ٹی بی" اس نے دھماکا کیا۔ اگرچہ آج کے دور میں ٹی بی کا علاج نہ صرف ممکن ہے بلکہ کافی آسان بھی ہے مگر پرانے زمانے میں اس کی تباہ کاریوں نے ٹی بی کے نام کو دہشت کی علامت بنا رکھا ہے۔

"فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، یہ زیادہ خطرناک نہیں، چھ ماہ کا کورس ہوگا اور ٹھیک ہو جاؤ گی تم۔" اس نے تسلی دی۔

"مگر۔۔" ہانیہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں، شازیہ کو بس صبح اٹھ کر میڈیسن لینی ہو گی باقی یہ روزمرہ کا کام آسانی سے کر سکتی ہیں۔ البتہ زیادہ مشقت نہیں، گھر کے کام رہنے ہی دینا۔" اس نے مزید ہدایات دیں اور دس دن بعد دوبارہ آنے کا کہا۔ میں ڈری تو ضرور مگر زیادہ پریشان نہیں ہوئی۔ ہانیہ میرے ساتھ چلی آئی۔

"اب کالج سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر ریسٹ کرو میڈیسن کھاؤ۔" وہ آتے ہی شروع ہو گئی۔

"اتنے کام؟" میں ہنسی۔

"مذاق نہیں ہے بھابھی، یہ کوئی معمولی بیماری نہیں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"اچھا جی۔" شام تک آدھی سے زیادہ فیملی کو میری ٹی بی کی خبر ہو چکی تھی۔ ہانیہ کا پیٹ کچھ ہضم نہیں کرتا تھا۔

☆☆☆

میاں جی کو آفس میں کام تھا البتہ نایاب نے میری وجہ سے کالج سے چھٹی لے لی۔ دوسرے دن صبح کے دس بجے جب میں میڈیسن کھانے کے بعد آرام کر رہی تھی کہ میاں جی کی سب سے بڑی بہن ثانیہ کی آمد ہوئی۔ ان کے تین بچے ہیں باقی دونوں تو اسکول جاتے ہیں مگر سب سے چھوٹے والے ابھی ان کے ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ ٹی بی کی میڈیسن مریض کو بہت تنگ کرتی ہے، یہ کافی ہیوی قسم کی ہوتی ہے جس کی وجہ سے گھبراہٹ اور چڑچڑاہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں مریض کو ریسٹ کی ضرورت ہوتی ہے مگر میرے جیسے مریض کو ریسٹ نام کی چیز دستیاب نہیں تھی۔ ثانیہ نے آتے ہی اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔

"ہائے معصوم سی شازو، یہ کیا بیماری لگالی جان کو۔۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے، چند سال پہلے ہی تو میں تجھے اپنے ہاتھوں پہ کھلاتی تھی۔" یہ چند سال سے شاید ان کی مراد چالیس سال تھی اور ہاتھوں سے کھلانے میں پھپھو سرفہرست تھے۔

"پھپھو، مریض کے پاس روتے نہیں۔" نایاب دبی دبی آواز میں بولی۔

"تو کیا ہنسوں، میری معصوم سی بھابھی، بستر مرگ پر پڑی ہے۔" ثانیہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں، بستر مرگ کا لفظ اس نے کہیں سنا ہوگا جو یہاں استعمال کرنا ضروری تھا۔

"مگر یہ معمولی سی بیماری......" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس بس، تو کچھ نہیں جانتی، یہ معمولی نہیں، ہائے تجھے ٹی بی ہو گئی۔" رونے کا دوسرا سیزن ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ نایاب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے نظر بچا کے اسے اشارہ کیا۔ وہ کچن کی طرف چل دی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے لے کر واپس آئی تب تک ثانیہ رونا بند کر کے اپنی ساس کے گناہ معاف کروا رہی تھی۔

"بڈھی منحوس، میں تو کہتی ہوں تو بچ جاتی اور اسے ہو جاتی یہ بدبخت ٹی بی۔" وہ چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھانے میں مصروف ہو گئی مگر منے میاں کو یہ خاموشی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس نے منہ آسمان کے رخ کیا اور ایسے رونا شروع کر دیا جیسے اس پہ مظالم کی انتہا ہو گئی ہو۔

"اسے چپ کرواؤ نایاب۔" میں نے نایاب کو اشارہ کیا حالانکہ میرا دل کر رہا تھا منے میاں کا گلا دبا کر اس جگہ پھینکوں جہاں اسے مانگنے سے پانی بھی نہ ملے۔ نایاب اسے اٹھا کر باہر لے گئی۔ ثانیہ تب تک کباب اور پکوڑوں کی جانب متوجہ ہو چکی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں ٹی بی منحوس کو کوسنا شروع کر دیا جس نے اس عذاب میں ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

ثانیہ کے جانے کے بعد باقی کا دن بخیر و عافیت گزرا یعنی کسی اور مہمان کی آمد نہیں ہوئی۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ میں گیارہ بجے ناشتا کر کے صحن میں آ بیٹھی۔ پانچ منٹ بعد دو کاریں آگے پیچھے چلتی ہوئی ہمارے گھر میں داخل ہوئیں۔

میاں صاحب جو ابھی تک ایسے چل رہے تھے جیسے نیند کی حالت میں ہوں، میرے پاس آ کر بولے "یا اللہ خیر"۔ میں نے انہیں گھورا۔ اب کی بار میرے دونوں بھائی اپنے اپنے خاندان کے ساتھ تشریف لا چکے تھے۔ ان دونوں کی بیویوں کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ اتفاق سے دونوں ایک ہی وقت میں میرا حال پوچھنے آئی تھیں اس لیے نقص امن کا اندیشہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں صحن لوگوں سے بھر چکا تھا۔

"میں تاں کہتی تھی عورت صرف گھر میں اچھی لگتی ہے باہر نکل کر کام کرو گی تو یہی ہوگا۔" بڑے بھائی شامیر کی بیوی فاطمہ جو کہ ورکنگ وومین کے خلاف تھی، بیٹھتے ہی شروع ہو گئی۔

"ہونہہ! عورت گھر میں اچھی لگتی ہے۔ آج کی عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کرے تب جا کر گھر چلتا ہے۔" شامیر کے بعد شمیر کی بیوی جو کہ خود بیلتھ ورکر تھی، ورکنگ وومین کے حق میں بول پڑی۔ اس کے بعد بحث شروع ہو گئی۔ سب خاموشی سے یہ "سیلف میڈ ولائل" سن رہے تھے۔ فاطمہ خود کو کمزور پڑتا دیکھ کر بحث میں مذہب کو لے آئی تھی جبکہ حائقہ نے امریکہ اور چین کو بھی بحث میں گھسیٹ لیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد جب نایاب نے بریانی کی پلیٹیں اور کولڈ ڈرنکس سامنے رکھی تب جا کر دونوں نے کچھ سانس لیا اور اگلے معرکہ کی تیاری کے لیے پیٹ پوجا کرنے لگیں۔

شمیر اور شامیر تب تک میاں صاحب سے بینک کی تفصیلات پوچھ رہے تھے۔ میاں صاحب نظر بچا کر مجھے ایسے گھور رہے تھے جیسے ٹی بی کو میں نے دعوت دی ہو۔ میں نے جواباً انہیں گھورا تو وہ نظریں چرا کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ کھانے پینے کے بعد اب فاطمہ اور حائقہ اس کام میں مصروف ہو گئی جس کے لیے وہ آئی تھیں یعنی میری طبیعت کا پوچھنے لگیں۔ حائقہ مجھے مزید ایک ماہ کے ریسٹ کا کہہ رہی تھی جبکہ فاطمہ اپنے سسرالیوں کی ہمسائے کی موت کا بتا رہی تھی جسے ٹی بی ہوئی اور وہ چل بسا۔ اس نے مجھے بھی ایسی نظروں سے گھورا جیسے میں بس رخصت ہونے والی ہوں۔ شکر ہے خدا نے دو کان دیے ہیں اس لیے میں ایک سے سن کر دوسرے نکالتی رہی۔ اسی دوران فاطمہ کی سب سے چھوٹی بیٹی میری گود میں سوار ہو گئی۔ میں نے اس کا ماتھا چوما۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں غلط کر رہی ہوں کیونکہ ٹی بی کے جراثیم منتقل بھی ہو سکتے ہیں۔ میں نے جلدی سے اسے نیچے اتار دیا۔ اس وقت فاطمہ نے بھی یہ بات محسوس کی اور جلدی سے بولی "ارے شازیہ، ایسے کچھ نہیں ہوتا، بٹھانے رکھوا سے گود میں۔۔" اس کے لہجے میں بہت کچھ خاص تھا۔

☆☆☆

پیر کا دن مصروف دن ہوتا تھا مگر میں چونکہ ریسٹ پر تھی اس لیے میرے لیے یہ دن بھی بور ہی گزر رہا تھا کہ دانیہ چلی آئی۔ثانیہ سے چھوٹی دانیہ پورے خاندان میں مجھے سب سے زیادہ پسند تھی۔اس کی اور میری طبیعت کافی ملتی تھی۔اس کے ساتھ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔شام کو میاں صاحب آئے ،ان کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔نہ جانے کیوں مجھے وہ تھوڑے پریشان دکھائی دیے۔میرے دو تین بار پوچھنے پر انہوں نے بس اتنا کہا۔

''نایاب کا خیال رکھا کرو۔'' مجھے بے چینی ہونے لگی۔نایاب تھرڈ ایر میں پڑھتی تھی۔اس کی عمر بائیس سال تھی۔دو تین دن بعد میاں جی ایک بار پھر پریشان چہرہ لیے واپس آئے۔اس بار میرے اصرار پر انہوں نے بتایا۔

''نایاب اکیڈمی میں پڑھنے کے بعد ایک لڑکے سے ملتی ہے،ہوٹل میں دیکھا ہے دو تین بار''۔نایاب اپنے کمرے میں تھی۔مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔میں تیزی سے اس کے کمرے کی جانب بڑھی۔

''نایاب''

''کک...... کیا ہوا امی؟''وہ کال پہ کسی سے بات کر رہی تھی۔

''کون ہے وہ لڑکا؟''میں نے غصہ دبایا۔

''کک......کون؟''

''وہی جس سے تم اکیڈمی کے بعد ملتی ہو۔''

''وہ......!''

''کیا وہ، جلدی بتاؤ۔''

''میری دوست کا بھائی ہے گاؤں سے ہیں۔''اس نے نظریں جھکائی۔

''او کے، اگر وہ تم میں انٹرسٹڈ ہے تو اس سے کہو اپنی فیملی کو ہم سے ملوائے۔''میں نے اس کے چہرے پر آنے والے رنگ دیکھ لیے تھے۔

☆☆☆

اس شام مدثر اپنی ماں اور بڑی بہن کے ساتھ ہمارے گھر آیا۔وہ دیکھنے میں مہذب لگتا تھا البتہ اس کی ماں قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہونے کے باوجود پینڈو لگ رہی تھی۔کھانا کھانے کے بعد میرے کمرے میں ہی بیٹھ کر سب باتیں کرنے لگے۔مدثر ایم بی اے کر رہا تھا۔گاؤں میں ان کی کافی زمینیں تھی۔اس کی بہن بھی زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔کچھ دیر بعد نایاب اندر آئی۔اس نے میرے سامنے پھل رکھے۔مدثر نے پوچھا۔

''آنٹی میں نے دیکھا ہے آپ کافی پرہیزی کھانا لے رہی تھی،طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں بس ٹھیک ہی ہے،اصل میں ٹی بی کی مریضہ ہوں میں۔''میں نے بات چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔

''اوہ!''اس کے منہ سے نکلا۔اس کی ماں اور بہن کا رنگ تبدیل ہوا۔

''یہ تو کافی خطرناک ہے۔۔آپ کے خاندان میں اور کسے ہوئی ہے؟''اس کی بہن نے پوچھا۔

''بس مجھے ہی۔۔''میں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔

مگر چند دنوں بعد سمجھ میں آ گیا جب نایاب نے روتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی اور بتایا۔

''مدثر کے گھر والوں نے اسے مجھ سے ملنے سے روک دیا کیونکہ بقول ان کے میری مما ٹی بی کی مریضہ ہیں جس کی وجہ سے مجھے بھی ہو سکتی ہے اور مجھ سے مدثر کو بھی۔۔''میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

اپنا خاندان اپنا ہی ہوتا ہے۔چند دنوں بعد حائقہ نے جب اپنے بیٹے عالیان کے لیے نایاب کا رشتہ مانگا تو میں نے قبول کر لیا۔عالیان میڈیکل کے تھرڈ ایر میں تھا۔نایاب نے بھی کوئی اعتراض نہ کی......میں خوش قسمت ہوں جس کو اتنا اچھا خاندان ملا ہے......اپنے اپنے ہوتے ہیں۔

☆☆

شعاع عزیز

کرن کرن خوشبو

القرآن

تسبیح کرتی ہے اللہ کی ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو ہر چیز جو زمین میں ہے۔ بادشاہ ہے نہایت مقدس زبردست حکمت والا۔ وہی ہے جس نے امیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو پڑھتا ہے ان کے سامنے اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان کو اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی اور اگرچہ وہ تھے اس سے پہلے کھلی گمراہی میں۔ اور دوسرے ان میں سے ابھی نہیں جو ملے ان سے اور وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ یہ فضل ہے اللہ کا وہ عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے۔ مثال ان کی جن کو عامل بنایا گیا تورات کا پھر نہ اٹھایا انہوں نے اسے ایسی مثال ہے کہ گدھا جس پر لدی ہوں کتابیں۔ بری ہے مثال ان لوگوں کی جنہوں نے تکذیب کی اللہ کی آیتوں کی اور اللہ نہیں ہدایت دیتا ظالم لوگوں کو۔ (سورۃ الجمعہ آیت 1 سے 5)

احادیث نبوی

☆ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے صرف مومن ہی محبت کرے گا اور مجھ سے صرف منافق ہی بغض رکھے گا۔ (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر 114)

☆ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آدمی اپنی موت کے بعد جو چیزیں دنیا میں چھوڑ جاتا ہے ان میں سے بہترین چیزیں تین ہیں۔

(۱) نیک و صالح اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے۔

(۲) صدقہ جاریہ جس سے نفع جاری رہے اس کا ثواب اسے (مرنے والے) کو پہنچتا رہے گا۔

(۳) اور ایسا علم کہ اس کے بعد اس پر عمل کیا جاتا رہے۔ (سنن ابن ماجہ۔ حدیث نمبر 241)

سعدیہ وحید سعدی...... اسلام آباد

نور زیست

(۱) کائنات کی سخت ترین سزا انتظار ہے۔

(۲) غلطی تسلیم کرنے سے ذہنی بوجھ کم ہو جاتا ہے۔

(۳) دنیا مصیبتیں بظاہر زخم ہیں مگر درحقیقت ترقیوں کا موجب ہیں۔

(۴) جو انسان کبھی غلطی نہیں کرتا تو دراصل وہ دنیا میں کام ہی نہیں کر رہا۔

سیدہ لوبا سجاد...... کھروڑ پکا

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت

سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی بیوی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شدید بیماری کی وجہ سے غزوہ بدر میں شامل نہ ہو سکے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرے لیے بدر میں حاضر ہونے والے آدمی کے برابر اجر اور مال غنیمت ہے۔ (صحیح البخاری 31 30)

افشاں سمیع...... کراچی

فرانسیسی کہاوتیں

☆ نکمے مزدور کو اچھا اوزار بھی نہیں ملتا۔

☆ باپ قدرت کی طرف سے ہمارا خزانچی ہے۔

☆ مئی اور دسمبر کبھی متفق نہیں ہو سکتے۔

☆ طاقت کسی کا حق نہیں پہچانتی۔

کنول شاہین قیصر...... تلہ گنگ

حفظ ماتقدم

ایک وزیر اچانک جیل کے دورے پر پہنچا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ گھبرا گیا اور وزیر کو جیل کا دورہ کرانے لگا۔

وزیر...... یہاں پر رہائش کا انتظام کیسا ہے؟

جیلر...... سر بہت اچھا ہے۔

وزیر...... کیا قیدیوں کو تفریحی سہولیات بھی دی جاتی ہیں؟

جیلر...... سہولیات قیدی کی جیب کے مطابق ملتی ہیں۔

وزیر...... کیا جیل کا عملہ تعاون کرتا ہے؟

جیلر...... جی سر۔ جتنی آپ ان کی مٹھی گرم کریں گے آپ کا وہ اتنا ہی خیال رکھیں گے۔

جیلر...... مگر یہ سب آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟

وزیر...... کیونکہ ہماری حکومت ختم ہونے والی ہے اور اب ہم نے اپنے کاموں اور کرتوتوں کی وجہ سے یہیں آنا ہے۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں۔

ملیحہ زہرا...... کراچی

خلیل جبران

☆ اگر تم نے ہر حال میں خوش رہنے کا فن سیکھ لیا تو یقیناً تم نے دنیا کا سب سے بڑا فن سیکھ لیا۔

☆ نصیحت وہ سچی بات ہے جسے ہم کبھی غور سے نہیں سنتے اور خوشامد ایک بدترین دھوکا ہے جسے ہم پوری توجہ سے سنتے ہیں۔

شبنم حنیف...... لاہور

دور اندیشی

ایک شخص نے مارک ٹوین کے گھر گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مارک ٹوین نے بے شمار کتابیں اکٹھی کر رکھی ہیں لیکن یہ تمام کتابیں نہایت بے ترتیبی سے مختلف کمروں کے فرش اور کھڑکیوں کے طاقوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ اس نے جب اس بے ترتیبی کے بارے میں سوال کیا تو مارک ٹوین نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔

"جناب بات دراصل یہ ہے کہ لوگوں کے گھروں سے کتابیں تو مانگ کر لائی جا سکتی ہیں لیکن الماریاں نہیں مانگی جا سکتیں۔"

ثنا شہزاد...... کراچی

آنسو مفکر عالم کی نظر میں

☆ دنیا عقل کی موت پر اور جاہل کی زندگی پر ہمیشہ آنسو بہاتی ہے۔ (افلاطون)

☆ اے عورت! تو نے اپنے اتھاہ آنسوؤں سے دنیا کے دل کو اس طرح گھیر رکھا ہے جس طرح سمندر زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ (ٹیگور)

☆ سات سمندروں کے پانی کے مقابلے میں انسان کی آنکھوں سے کہیں زیادہ آنسو بہہ چکے ہیں۔ (گوتم بدھ)

شازیہ ہاشم میواتی...... کندیاں خاص

تحمل سے

اورنگ زیب عالمگیر کی ایک خوبی اس کی یادداشت تھی۔ وہ ہزاروں لوگوں کو ان کی شکل اور آواز سے پہچان جاتا تھا۔ ایک بار ایک بہروپیے نے اورنگ زیب عالمگیر سے شرط لگائی کہ جناب اگر میں آپ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤں تو آپ مجھے کیا دیں گے۔ بادشاہ نے کہا۔ "جو تم چاہو، تمہیں مل جائے گا۔" وہ بہروپیا چلا گیا۔ چند ماہ بعد وہ تاجر بن کر دربار میں داخل ہوا۔ بادشاہ نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ تین سال بعد وہ سفید بن کر دربار میں آیا، بادشاہ نے اسے اس بار بھی پہچان لیا۔ وہ دربار سے نکلا، حیدر آباد دکن گیا اور وہاں ایک پہاڑ پر درویش بن کر بیٹھ گیا۔ وہ سارا دن اور

ساری رات عبادت کرتا۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ پورے علاقے میں مشہور ہوگیا۔ پہلے علاقے کے، پھر حیدر آباد دربار کے وزراء پھر دلی دربار کے وزراء وہاں آنے لگے اور ایک دن اورنگ زیب عالمگیر بھی اس کی کٹیا میں داخل ہوگیا۔ بادشاہ اس کی شخصیت سے اتنا مرعوب ہوگیا کہ وہ اس کے پاؤں میں بیٹھ گیا۔

بہروپیے نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”جناب آپ نے مجھے پہچانا، جناب میں وہی بہروپیا ہوں اور آپ شرط ہار چکے ہیں۔“ بادشاہ نے اپنی ناکامی تسلیم کی اور اس سے کہا۔ ”ہاں۔ اب تم انگو کیا مانگتے ہو۔“

بہروپیے نے عرض کیا۔ ”جناب میں جھوٹے منہ سے اللہ کا نام لیتا تھا، اللہ نے میرے فریب کو بھی اتنی اہمیت دی کہ آپ میرے قدموں میں بیٹھے ہیں، میں اگر سچے دل سے اپنے اللہ کو یاد کروں تو آپ تصور کیجیے اللہ تعالیٰ مجھے کیا کیا نہیں دے گا۔“ اور یہ کہہ کر جنگل میں نکل گیا۔

عابد مغل۔۔۔ مانسہرہ

چمکتے موتی

1 ۔ عزت کمانا چاہتے ہو تو جتنا تمہارے پاس ہے، اس سے کم دکھاوا کرو اور جتنا علم رکھتے ہو اتنا کم بولو۔

(شیکسپیئر)

2 ۔ میں اپنے دشمن مٹانے میں ماہر ہوں۔ میں ان کو اپنا دوست بنا لیتا ہوں۔

(ابراہام لنکن)

3 ۔ اگر میرا علم مجھے انسان سے محبت کرنا نہیں سکھاتا تو ایک جاہل مجھ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

(مولانا جلال الدین رومی)

4 ۔ اگر ہر بھونکنے والے کتے پر پتھر پھینکنے لگو گے تو تم کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔

(ونسٹن چرچل)

5 ۔ میری کامیابیوں سے مجھے مت پرکھو۔ مجھے پرکھنا ہے تو اس سے پرکھو کہ کتنی بار میں نیچے گر کر پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

(نیلسن منڈیلا)

سیدہ نسبت زہرہ۔۔۔ کہروڑپکا

شیطان کی تاریخ

80 ہزار سال تک فرشتوں کا ساتھی رہا۔
40 ہزار سال تک جنت کا خزانچی رہا۔
30 ہزار سال تک مقربین کا سردار رہا۔
14 ہزار سال تک عرش کا طواف کرتا رہا۔

پہلے آسمان پر اس کا نام عابد تھا۔ دوسرے پر زاہد۔ تیسرے پر عارف۔ چوتھے پر ولی۔ پانچویں پر تقی۔ چھٹے پر خازن۔ ساتویں پر ازازیل۔ اور اب قیامت تک اس کا نام ”ابلیس“ ہے۔ غرور اور تکبر نے کیا سے کیا بنا دیا۔

مجھے تم یاد آتے ہو

کہیں بارش برس جائے
کہیں صحرا ترس جائے
کہیں کالی گھٹا اترے
کہیں باد صبا ٹھہرے
تمہارے اور میرے درمیاں
اگر خدا ٹھہرے
تو میری زندگی کے اول و آخر

تم اس لمحے
خدا کے بعد آتے ہو
مجھے تم یاد آتے ہو

فرحت عباس شاہ

حنا کرن۔۔۔۔۔ چوکی

☆☆

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر

جمال احسانی کی غزل

وہ لوگ میرے بہت پیار کرنے والے تھے
گزر گئے ہیں جو موسم گزرنے والے تھے

نئی رتوں میں دکھوں کے بھی سلسلے ہیں نئے
وہ زخم تازہ ہوئے ہیں جو بھرنے والے تھے

یہ کس مقام پہ سوجھی تجھے بچھڑنے کی
کہ اب تو جا کے کہیں دن سنورنے والے تھے

ہزار مجھ سے وہ پیمان وصل کرتا رہا
پر اس کے طور طریقے مکرنے والے تھے

تمہیں تو فخر تھا شیرازہ بندی جاں پر
ہمارا کیا ہے کہ ہم تو بکھرنے والے تھے

تمام رات نہایا تھا شہر بارش میں
وہ رنگ اتر ہی گئے جو اترنے والے تھے

اس ایک چھوٹے سے قصبے پہ ریل ٹھہری نہیں
وہاں بھی چند مسافر اترنے والے تھے

کنول شاہین قیصر، کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی غزل

اب تو خواہش ہے کہ یہ زخم بھی کھا کر دیکھیں
لحہ بھر ہی سہی، اس کو بھلا کر دیکھیں

شہر میں جشن شب قدر کی ساعت آئی
آج ہم بھی تیرے ملنے کی دعا کر دیکھیں

آندھیوں سے جو الجھنے کی کسک رکھتے ہیں
اک دیا تیز ہوا میں بھی جلا کر دیکھیں

کچھ تو آوارہ ہواؤں کی تھکن ختم کریں
اپنے قدموں کے نشاں آپ مٹا کر دیکھیں

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

زندگی اب تجھے سوچیں بھی تو دم گھٹتا ہے
ہم نے چاہا تھا کبھی تجھ سے وفا کر دیکھیں

جن کے ذروں میں خزاں ہانپ کے سو جاتی ہے
ایسی قبروں پہ کوئی پھول چڑھا کر دیکھیں

دیکھنا تو ہے محبت کے عزاداروں کو
ناشناسائی کی دیوار گرا کر دیکھیں

یوں بھی دنیا ہمیں مقروض ہی کہے گی
دست قاتل ترا احسان بھی اٹھا کر دیکھیں

رونے والوں کے تو ہمدرد بہت ہیں محسن
ہنستے ہنستے کبھی دنیا کو رلا کر دیکھیں

سیدہ ثوبیہ سجاد، کی ڈائری میں تحریر

امجد اسلام امجد کی نظم

محبت اوس کی صورت،

پیاسی پنکھڑی کے ہونٹ کو سیراب کرتی ہے
گلوں کی آستینوں میں انوکھے رنگ بھرتی ہے
سحر کے جھٹپٹے میں، گنگناتی، مسکراتی، جگمگاتی ہے
کسی فردوس کی صورت
محبت اوس کی صورت
محبت ابر کی صورت
محبت کے دنوں میں دشت بھی محسوس ہوتا ہے
دلوں کی سرزمیں پہ گھر کے آتی اور برستی ہے
چمن کا ذرہ ذرہ جھومتا ہے مسکراتا ہے
ازل کی بے نمو مٹی میں سبزہ سر اٹھاتا ہے

PakiBooks.Site

محبت ان کو بھی آباد اور شاداب کرتی ہے
جو دل ہیں قبر کی صورت
محبت ابر کی صورت

سیدہ نسبت زہرا، کی ڈائری میں تحریر

تاجدار عادل کی غزل

یہ آنکھ، یہ خواب بھی، یہ رات اسی کی
ہر بات پہ یاد آتی ہے ہر بات اسی کی

جگنو سے چمکتے ہیں اسی یاد کے دم سے
آنکھوں میں لیے پھرتے ہیں سوغات اسی کی

ہر شعلے کے پیچھے ہے اسی آگ کی صورت
ہر بات کے پردے میں حکایت اسی کی

لفظوں میں سجاتے ہیں اسی حسن کی خوشبو
آنکھوں میں چھپاتے ہیں شکایات اسی کی

کیا کہیے اچھی ہمیں لگتی ہے ہمیشہ
دیوانگی دل میں ہر بات اسی کی

جس شخص نے منظر کو نئے پھول دیے تھے
ہیں دورِ خزاں پر بھی عنایات اسی کی

آتا ہے نظر مجمعِ احباب میں عادل
لاکھوں میں اکیلی، مگر ذات اسی کی

ثروت ظفر، کی ڈائری میں تحریر

منیر نیازی کی غزل

جو مجھے بھلا دیں گے میں انہیں بھلا دوں گا
سب غرور ان کا میں خاک میں ملا دوں گا

دیکھتا ہوں سب شکلیں، سن رہا ہوں سب باتیں
سب حساب ان کا میں ایک دن چکا دوں گا

روشنی دکھا دوں گا ان اندھیرے نگروں میں
اک ہوا ضیاؤں کی چار سو چلا دوں گا

بے مثال قریوں کے بے کنار باغوں کے
اپنے خواب لوگوں کے خواب میں دکھا دوں گا

میں منیر جاؤں گا ایک دن اسے ملنے
اس کے در پہ جا کے میں ایک دن صدا دوں گا

افشاں سمیر، کی ڈائری میں تحریر

بشیر بدر کی غزل

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے میرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

یاروں کی محبت کا یقیں کر لیا میں نے
پھولوں میں چھپایا ہوا خنجر نہیں دیکھا

محبوب کا گھر ہو کہ بزرگوں کی زمینیں
جو چھوڑ دیا پھر اس کو مڑ کر نہیں دیکھا

خط ایسا لکھا ہے کہ نگینے سے جڑے ہیں
وہ ہاتھ کہ جس نے کوئی زیور نہیں دیکھا

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

شگفتہ سلیمان

مجھے یہ شعر پسند ہے

کنول شاہین قیصر ———— تلہ گنگ
آنکھوں میں کوئی خواب اترنے نہیں دیتا
یہ دل کہ چین سے مجھے مرنے نہیں دیتا
بچھڑے تو عجب پیار جتا تا ہے خطوں میں
مل جائے تو پھر حد سے گزرنے نہیں دیتا

فوزیہ ثمریٹ ———— گجرات
تم کیا جانو محبت کے میم کا مطلب
اگر مل جائے تو معجزہ اور نہ ملے تو موت

سیدہ لوبا سجاد ———— کہروڑ پکا
میرے احساس جاں کی نمو تجھ سے ہے
میں اگر سیپ ہوں آبرو تجھ سے ہے
پھول ہوں میں اگر رنگ و بو تجھ سے ہے
اور اگر جسم ہوں تو روح تجھ سے ہے

عامرہ زاہد ———— ساہیوال
چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محوِ یاس رہتا ہوں
تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

فرح سہیل ———— فیصل آباد
لمحوں میں قید کرے کوئی صدیوں کی چاہتیں
حسرت رہی کہ ایسا کوئی اپنا بھی طلب گار ہو

ثمینہ تاج ———— اسلام آباد
اسے پانا اسے کھونا اسی کے ہجر میں رونا
یہی گر عشق ہے محسن تو ہم تنہا ہی اچھے ہیں

حرا کنول ———— سکرنڈ
کب تک تجھ پہ انحصار کریں
کیوں نہ اب دوسروں سے پیار کریں
تو کبھی وقت پر نہیں پہنچا
کس طرح تیرا اعتبار کریں

شاد شہزاد ———— کراچی
بت جھڑ کی دہلیز پہ بکھرے
بے چہرہ پتوں کی صورت
ہم کو ساتھ لیے پھرتی ہے
تیرے دھیان کی تیز ہوا

لبنیٰ خاور ———— فیصل آباد
جیسے پھر ہاتھ میں خوشبو کے خزانے آئے
یاد پھر سے مجھے وہ گزرے زمانے آئے
خوب رکھا ہے مجھے رفاقت کا بھرم اس نے بھی
کٹ چکے ہاتھ تو پھر ہاتھ ملانے آئے

آسیہ جاوید ———— علی پور چٹھہ
اسے گنوا کے میں زندہ ہوں اس طرح محسن
کہ جیسے تیز ہوا میں چراغ جلتا ہے

ندا طارق ———— کراچی
ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کر دے
تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر

اسما کریم ———— جھنگ
وہ جو گیت تم نے سنا نہیں
میری عمر بھر کا ریاض تھا
میرے درد کی تھی داستاں
جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

عذرا ناصر ———— کراچی
کچھ نا خدا کے فیض سے ساحل بھی دور تھا
کچھ کشتیوں کے پھیر میں گرداب آ گیا

روبی ———— کراچی
شدتِ درد میں کوئی کمی نہ آئی
درد پھر درد رہا، الٹا لکھا یا سیدھا

اقصیٰ ناصر ———— گلستان جوہر
نیندوں کو ترستے ہیں خوابوں کے تمنائی
اک خواب کی آنکھوں نے کیا خوب سزا پائی

PakiBooks.Site

روبینہ شریف

مسکراتی کرنیں

پچے

ڈاکٹر ”اس دوا کے دو چمچے صبح، دو دو پہر، دو چمچے شام اور دو چمچے رات کو لینا۔“
مریض نے گھبرا کر کہا۔ ”جناب چمچے کچھ کم کر دیں۔ میں اتنے چمچے کہاں سے لاؤں گا۔“
نازیہ...... حیدر آباد

کمبائن اسٹڈی

ایک طالب علم شیشے کے سامنے بیٹھ کر پڑھتا تھا چھوٹی بہن نے بھائی سے شیشے کے سامنے بیٹھ کر پڑھنے کی وجہ پوچھی۔
طالب علم نے جواب دیا اس کی تین وجوہات ہیں۔
1- روائز بھی ساتھ ساتھ ہو جاتا ہے۔
2- اپنے اوپر نظر بھی رہتی ہے۔
3- کمبائن اسٹڈی بھی ہو جاتی ہے۔
سدرہ...... فاروق آباد

مجبوری

بیوی نے شرماتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا۔
”آپ ذرا بھی رومانٹک نہیں ہیں۔ راحیلہ کا شوہر اسے ”میرا چاند“ اور ”میرا تارا“ کہہ کر بلاتا ہے۔“
شوہر نے جواب دیا۔
”وہ ماہر فلکیات ہے اور تم جانتی ہو کہ میں حیوانوں کا ڈاکٹر ہوں۔“

حفظ ما تقدم

ایک بس میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ باہمی تعارف ہوا۔ ایک نے کہا۔ ”میں شاعر ہوں۔“
دوسرے نے دوسری طرف منہ کرتے ہوئے جواب دیا۔
”میں بہرہ ہوں۔“
کنول شاہین قیصر...... تلہ گنگ

پُرلطف

”محبوب کے انتظار میں زیادہ مزا ہے یا اس سے ملاقات میں۔“ لڑکے نے اپنی فلسفی محبوبہ سے پوچھا۔
جواب ملا ”محبوب کے انتظار میں زیادہ لطف ہے۔“
”اچھا تو تم ساری زندگی یہ لطف حاصل کرتی رہو۔ میں نے کل زائرہ سے شادی کر لی ہے“ لڑکے نے کہا۔

عقل مند

عقل مند آدمی جب کوئی خاص اور اہم فیصلہ کرتا ہے تو بہت سوچتا ہے دل و دماغ کی سنتا ہے حالات کو پرکھتا ہے دلیل کو زیر غور لاتا ہے مثبت اور منفی پہلو کا جائزہ لیتا ہے۔ اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے مشورہ لیتا ہے۔ اور آخر میں وہی کرتا ہے جو اس کی بیوی کہتی ہے۔
فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات

جدید دور

میاں جی اپنی زوجہ کے ساتھ صوفے پر بیٹھے ٹیلی ویژن دیکھ رہے تھے۔ جبکہ بیگم صاحبہ مالٹے کھا رہی تھیں اور فون پر ٹیکسٹ بھی کر رہی تھیں۔ میاں جی کے موبائل پر میسج ٹون سنائی دی۔ ان کا موبائل کچن میں چارجنگ پہ لگا تھا۔ وہ بادل ناخواستہ اٹھ کر کچن میں میسج پڑھنے گئے میسج بیگم کی طرف سے تھا۔
”واپسی پہ نمک لیتے آیئے گا۔“
حنا کرن...... چونکی

☆......☆

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

محبت کی تقسیم

”محبت میں یکتائی نہ رہے تو چاہنے والے پرندوں کی طرح اڑ جاتے ہیں احمد، اس پل سے ڈرو جب کوئی تمہارا ایسے کہے کہ ہمارے دل نے تمہیں چاہنا چھوڑ دیا ہے۔ جو چیز گنتی میں نہیں آتی، جسے شمار نہیں کیا جا سکتا اس کو کس طرح ہم تقسیم کر سکتے ہیں۔ سو محبت میں آسمان کے تمام ستارے کسی ایک ہی ہستی کے نام کر دیے جاتے ہیں۔ کرنا ہوتے ہیں، زندگی نے انہیں سمجھا دیا تھا، اب وہ دوسروں کو سمجھانا چاہتے تھے۔ (فرزانہ کھرل...... محبت جنوری جیسی)
فوزیہ ثمر بٹ ہانیہ عمران...... گجرات

سوگ

عورت اگر بیوہ ہو جائے تو اس کی چوڑیاں توڑ دی جاتی ہیں مگر مرد کی گھڑی اور عینک کا کسی کو خیال نہیں آتا۔ لباس بھی تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اگر رنگا ہوا دوپٹا ہاتھ میں پکڑے یا چوڑیاں پہن لے تو لوگوں کے کلیجے پھٹ جائیں۔ رنڈوا وہی سوٹ بوٹ، اچکن ڈالے پھرتا ہے۔ کیسی بے رحمی ہے دکھاوے کے لیے بھی سوگ نہیں مناتا۔ (عصمت چغتائی)
سعدیہ وحید سعدی...... اسلام آباد

جمع

جمع کا قاعدہ مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہے عام لوگوں کے لیے ایک جمع ایک کا برابر ڈیڑھ ہے کیونکہ آدھا انکم ٹیکس والے لے جاتے ہیں تجارت کے قاعدے سے ایک جمع ایک کا مطلب گیارہ ہے رشوت کے قاعدے سے حاصل جمع اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ (ابن انشاء...... اردو کی آخری کتاب)
ملیحہ زہرا...... کراچی

سفرنامہ

پچھلے دنوں مجھے محبت نامی ملک جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے اپنے سفر کا مختصر احوال سناتا ہوں، جب ٹرین سے اترا تو ملک کو تین اطراف سے دکھ مایوسی اور بے وفائی کے پہاڑوں میں گھرا پایا چوتھی سمت آنسوؤں کا موجیں مارتا ہوا سمندر نظر آیا ملک کی اہم بندرگاہ کا نام آنکھیں تھا۔ اس ملک کے دارالحکومت کا نام زخم تھا، وزیر کا نام دل اور صدر کا نام دماغ لیکن ملک کے عوام کا کہنا ہے کہ دونوں کسی کام کے نہیں۔ ایک میں سوچنے سمجھنے کی قوت نہیں تو دوسرا قوم کے درد سے خالی ہے۔ پاگل پن اور خود غرضی ملک کے دو اہم شہر ہیں۔ اگرچہ ملک کا بڑا حصہ ہمدردی کے جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے لیکن یہاں شک، رقابت جیسے خطرناک درندے بھی پائے جاتے ہیں۔ قومی پھول گلاب ہے لیکن انتظار اور جدائی نامی پھول بھی کثرت سے پائے گئے۔ (سید محمد سلطان...... ہے ایک ملک ایسا)
کنول شاہین قیصر...... تلہ گنگ

محبت کی رفتار

آج کل محبت میں رفتار کو بڑی اہمیت حاصل ہے پرانے زمانے میں بگھی میں بیٹھ کر ڈھینچوں ڈھینچوں چلتی تھی۔ آج کل موٹر میں زناٹے سے نکل جاتی ہے۔ فاک سے منزل کو جا لگتی ہے۔ بس ایک ہی مشکل ہے کہ منزل پر پہنچ کر بھی نہیں رکتی۔ (ممتاز مفتی...... روغنی پتلے)
شازیہ ہاشم میواتی...... کھڈیاں خاص

☆☆

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ ۱۹۷۰ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال وجواب شائع کیے جارہے ہیں۔

ذوالقرنین

مسز ذکریا ...... کراچی

س: "ایک نوآموز سائیکل سوار کے لیے دشوار ترین مرحلہ کیا ہے؟"
ج: "معلوم نہیں۔"

زریں فرزانہ ...... شاہ پور صدر

س: "شادی والے دن دولہا بے چارے کو کس بات کی مبارکباد دی جاتی ہے؟"
ج: "اس کے حوصلے کی۔"
س: "نین بھیا! شادی کے بعد مرد اتنا سنجیدہ کیوں ہو جاتا ہے، حالانکہ شادی سے پہلے بہت جس مکھ ہوتا ہے؟"
ج: "جس کے لیے ہوتا ہے، وہ نہیں ملی تو جب ہی تو۔"

روبینہ سراج ...... کراچی

س: "محبت کے پرجوش میچ میں جیت کس کی ہوتی ہے؟"
ج: "جو اچھا کھیلے اس کی۔"

شازیہ میر محمد ...... حیدرآباد

س: "جب سے نہلے پہ دہلا کا کالم شروع ہوا ہے آپ جواب دے رہے ہیں مگر تصویر جوانی کی ہی چلا رہے ہیں، کبھی بڑھاپا بھی تو سامنے لایے؟"
ج: "غلط فرمایا آپ نے، بتدریج ہم تصویریں بدل کر اپنی اصل عمر سامنے لاتے رہتے ہیں۔"

اقصیٰ خان مترو ...... بہاولپور

س: "ہر دماغ دو منزلہ ہوتا ہے۔ اوپر کی منزل آخرت کے کام سرانجام دیتی ہے اور نیچے کی دنیاوی آپ کی کون سی منزل بہتر کام کرتی ہے؟"
ج: "دونوں ہی بیک وقت نہایت تیز رفتاری کے ساتھ کام کرتی ہیں۔"

راشدہ پروین ...... گجرات

س: "کہتے ہیں کہ
شکوہ! خدا سے نہ کرو گناہ گار ہو گے
شکوہ! تقدیر سے نہ کرو، بن نہیں سکتی
شکوہ! سماج سے نہ کرو، اجازت نہیں
شکوہ! اپنے آپ سے نہ کرو، دیوانے کہلاؤ گے
شکوہ! اپنوں سے نہ کرو، کم تر کہلاؤ گے
بھیا! آپ ہی بتائیں پھر شکوہ کس سے کریں؟"
ج: "نہ کریں کسی سے بلکہ شکوے کی ضرورت پر نظر رکھیے "شاید ہوتی نا پھر۔"

شائستہ امتیاز ...... گجرات

س: بندہ اپنی اوقات کب بھولتا ہے؟"
ج: "جب گھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔"

نامے میرے نام

مدیرہ کرن

مقدس ایوب ...... رائیونڈ لاہور

حمد و نعت سے دل کو منور کیا۔ اس کے بعد آسیہ مرزا کا ناول "من مورکھ پڑھا" لاجواب، زبردست آسیہ جی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ رائٹر صاحبہ شکر ہے کہ آپ نے علی شاہ کو باپ کی شفقت اور حوریہ کو شوہر کا پیار دلا دیا اور بابر کے دل سے بدگمانیاں نکال دیں۔

"مجبور نشین" اس سال کا بیسٹ ناول تھا۔ الفاظ کم ہے تعریف کے لیے مصباح جی نے نہ کہیں بور یت ہونے دی اور نہ ہی کہیں کہانی سے گرفت چھوڑی۔ بہت اچھا کیا مصباح جی آپ نے روائیہ اور حنبل کو ملا دیا۔ ایشال جیسی اچھی لڑکی کے ساتھ جندب ہی سوٹ کرتا تھا مصباح جی بہت بہت مبارک باد اتنا اچھا ناول ہم تک پہنچانے کے لیے نگہت عبداللہ جی ویلڈن، اللہ تعالیٰ زور قلم اور دے آپ کو۔ "جندڑی" یہ کہانی تو صدیوں سے چلی آرہی ہے عورت ہر دور میں اپنے آپ کو مار کے سسرال کو اپناتی ہے صرف اس آسرے پہ کہ اپنے شوہر کے دل پہ راج کر سکے۔ "جنیں تو ایسے" اس بار نمبر ون پہ رہا۔ دادی نے کتنے اچھے طریقے سے کرن کی غلطی سدھاری تھی واقعی بزرگ ہر کام ہم سے بہتر طریقے سے کر سکتے ہیں۔ ارحم واقعی ذہین تھا جو دو منٹ میں ساری بات سمجھ گیا ورنہ ہم تو اینڈ پہ جا کے سمجھے تھے۔ "زمانہ شناس" واقعی آج کل یہ تو لوگوں کا معمول ہے کہ جو بات کرتا ہے وہ سچا اور جو ہاں میں ہاں ملاتا ہے وہی پکڑا جاتا ہے۔ تنزیلہ جی کا تو نام ہی کافی ہے۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ "جادوگرنیاں" کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ضد کی خاطر دوسروں کی زندگی برباد کر دیتے ہیں اور احساس تک نہیں ہوتا۔ "پھر وہی کہانی" بس حوا کی بیٹیاں کر بھی کیا سکتی ہیں معاف کرنے کے سوا۔ لیکن اولاد کی خاطر عورت کو قربانی دینی پڑتی ہے۔ چاہے وہ نوکری کی ہو انا کی یا پھر محبت کی۔ مریم ماہ منیر نے اچھے موضوع پہ قلم اٹھایا۔ لڑکیوں کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔ دانیال بہت اچھا شوہر تھا۔ کاش سب مرد ایسے ہوتے۔ "سونے دی تاویتری" ہلکی پھلکی تحریر بے حد پسند آئی۔ بس ایک کی عقل پہ افسوس کرنے کا دل چاہا۔ والدین اپنے بچوں کے لیے جو جیون ساتھی پسند کرتے ہیں وہی ہمارے لیے اچھا ہوتا ہے۔ مراد اور صائمہ کی ہلکی پھلکی مزاحیہ گفتگو اچھی لگی۔ مراد کے پرپوز کرنے کے طریقے پہ بڑی ہنسی آئی۔

ج: پیاری مقدس! کرن کی پسندیدگی کا شکریہ۔

فائزہ بھٹی ...... چونکی

ٹائٹل بس نارمل لگا۔ لمحہ بھر کو ٹھہر کر فہرست پر بھی نظر ڈالی۔ کافی بڑے بڑے نام دیکھنے کو ملے۔

حمد و نعت کے بعد آگے بڑھے تو سب سے پہلا پڑاؤ "من مورکھ کی بات" پہ ڈالا۔ آسیہ مرزا ایک اچھا ناول ختم کرنے پر مبارکباد قبول کریں۔ میری کچھ کزنز کا تو فیورٹ رہا ہے یہ ناول۔ حوریہ چلو شکر ہے تمہاری بھی سنی گئی۔ بابر تم اس دفعہ اچھے لگے ہو۔ مجموعی طور پر اس ناول نے کبھی بھی بور نہیں ہونے دیا۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا پہلا سلسلہ وار ناول ہے جو میں پڑھ رہی ہوں۔ پڑھا تو انہیں پہلے بھی ہے مگر مکمل ناولز کی صورت میں...... حمزہ اس چڑیل سے تو جان چھڑواؤ اپنی۔ ذرا بھی اچھی نہیں لگتی...... مگر سنواب حسان صاحب کی باتوں میں مت آنا۔ شہرینہ تم بھی دعائیں شروع کر دو۔ وہ چڑیل حمزہ کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ خزینہ آخر کو تم تیمور کو جیتنے لگی ہو۔

مگر ذرا دھیان رکھنا......

"مجبور نشیمن" مصباح نے بھی بالآخر ناول ختم کر دیا۔ اس ناول نے پوری طرح جکڑے رکھا۔ روائبہ اچھا لگا تمہیں سکھی دیکھ کر۔ ضبل کوئی اتنی بھی ٹینشن لیتا ہے بھلا، گردے ہی فیل کروا بیٹھے، جندب مجھے تمہارا فیصلہ بھی اچھا لگا۔ وقت کی ضرورت تھا یہ فیصلہ تمہارا...... اف مصباح! سلویٰ لوگوں کو اتنی سزا اللہ معاف کرے کانپ کر رہ گئی۔ مصباح آپ بھی مبارک باد کی حق دار ہو۔

تنزیلہ ریاض کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ "غم ہے یا خوشی ہے تو" التمش کتنا غرور کرتے ہو نا تم۔ اتنا غرور بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اور کتنی بری بات ہے نا محراب کے چھوٹے سے قد کو تم نے اتنے برے انداز میں پیش کیا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا...... تنزیلہ جی اگلی قسط اس سے بھی شاندار ہونی چاہیے۔

"جنڈری" منشا محسن علی "بیلا" کے بعد آپ مجھے اچھی لگتی ہو۔ اچھا لکھا تھا آپ نے۔ پڑھ کر مزا آیا۔ ایسی بھابھیاں تو سارے زمانے کی ہونی چاہئیں۔ مگر ایک بات ہے نندوں نے بھی بھابھی کا پورا ساتھ دیا۔ اگر وہ بھی اس کا ساتھ نہ دیتیں تو عائشہ کے لیے یہ سب کرنا ذرا مشکل ہو جاتا۔ نگہت سیما سوری میں اس دفعہ آپ کو جلدی نہیں پڑھ سکی۔ احتل کو بھی نہیں پڑھا، میری طبیعت خراب تھی۔ یہ پورا مہینہ کافی بیمار رہی ہوں۔

ج: پیاری فائزہ! اللہ آپ کو صحت و تندرستی دے آپ نے بیماری کے باوجود کرن کی محفل میں شرکت کی۔ آپ کی محبت کا بے حد شکریہ۔

شازیہ ہاشم میواتی...... کھڈیاں خاص قصور

پرچہ ملنے کے ساتھ ہی جمپ لگائی اپنے فیورٹ ناولز "مجبور نشیمن" اور "من مورکھ کی بات نہ مانو" کی جانب۔ پہلے تو "مجبور نشیمن" پر تبصرہ کروں گی۔ ہر کیریکٹر کے ساتھ بھرپور انصاف کرتے ہوئے مصباح علی سید نے دل جیت لیا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی کا مصداق آمنہ بیگم اور سلویٰ نظر آئیں، ایثار محبت کا ثبوت دیتے ہوئے جندب نظر آیا۔ معصومیت و بے ریائی کا پیکر اعشال نظر آئیں، نادانستگی میں، بدگمانی کی فضا میں سفر کرتا ضبل نظر آیا۔ لیکن اسی کریہہ فضا میں خوشگواریت کی آکسیجن جندب بنتا نظر آیا جس نے ضبل اور روائبہ کو ملانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ اب آتی ہوں "من مورکھ کی بات نہ مانو" ڈیئر رائٹر آسیہ آپ نے ناول کا اختتام میری توقع کے عین مطابق کیا۔ خاص طور پر حوریہ نے جو تیج کیا بابر کے دل کو تو دھڑکا ہی دیا۔ یقین مانیں محبت کی اس اسٹیج پر میرا اپنا دل بھی عجیب سی کیفیت میں گھر گیا ہم تو خود اسی منزل کے راہی ہیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے ہم اپنی منزل میں کامیاب و کامران ٹھہرے بس اب دعا کرنا اگلی زندگی بھی محبت کے دامن میں خوشگواریت کا سفر طے کرتے گزرے اور بابر کی محنت کو حوریہ نے پذیرائی دے کر اس کے روح و من کو سیراب کر دیا۔

ج: پیاری شازیہ! اب کی دفعہ آپ نے صرف "مجبور نشیمن" اور "من مورکھ کی بات نہ مانو" پر ہی تبصرہ کیا باقی کہانیوں پر بھی تبصرہ کرتیں تو ہمیں اچھا لگتا۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران آمنہ رئیس...... گجرات

ٹائٹل زبردست تھا آج کل مجھے برائیڈل فرسٹ ڈیج پر ہو یا ڈی میں مجھے اچھی لگ رہی ہیں۔ ہائے بچی مجھے بالکل بھی یاد نہیں رہا ورنہ اس سروے میں اس بار لازمی اپنا بھی حصہ ڈالنا تھا۔ خیر سب کی یادیں باتیں مزے کی تھیں۔ چلیے جی اب سب سے پہلے ان دونوں تحریروں کی بات ہو جائے جن کے کردار اس ماہ ہم سے بچھڑ جائیں گے ایک خوب صورت یاد چھوڑ کر۔

پہلے بات ہو جائے "من مورکھ" کی اینڈنگ حسب منشا ہی ہوئی آخر بابر نے حوریہ کے دل میں ایک تاج محل بنا ہی ڈالا۔ ویسے بابر نے جو ایٹی ٹیوڈ دکھایا اس پہ سوٹ کر رہا تھا۔ اب اتنا تو وہ حق رکھتا تھا ناں۔ ہم نے تو ابھی سے ایک اچھے ناول کی امید باندھ لی ہیں آسیہ مرزا کے دوسرا ناول کی "مجبور نشیمن" مصباح جی مبارک ہو تسی گریٹ ہو۔ کیا خوب صورت اینڈ کیا ہے۔ ایک افسوس ہے۔ سلویٰ کی گردن کا سریا بھی نکالنا تھا ناں جو تھوڑا سا شرمندہ ہو جاتی اپنے کیے پر۔ میں بھی کہوں یہ اعشال اتنی دور کیوں چاچو کی خیریت پوچھنے جا رہی ہیں۔ بھئی سمجھا کریں ناں۔ یہ بات تو ہمارے ذہن میں بھی نہیں آئی کہ جندب صاحب کا سہرا بھی روائبہ کا سسرال ہو سکتا ہے۔ ویسے یہ پل بھی جی جان سے پسند آیا ہے۔ تیسرا ناول "سونے دی تاویتری" میڈم نور جہاں کا گایا ہوا گانا گونجنے لگا۔ یہ تحریر بھی اچھی لگی۔ دونوں دوستوں کی مزاحیہ لڑائیاں اور پنجابی بولنے کا انداز مزے کا تھا۔ میرے خیال میں اس جدید دور میں آج بھی شہر اور گاؤں کا فرق ہے ابھی۔ بے شک نیٹ، واٹس اپ وغیرہ وغیرہ گاؤں گاؤں ہے۔

"جادوگرنیاں" بہت تحریر تھی۔ یہ عورتوں کی سیاست تو بڑے بڑے سیاستدانوں کو مات دے جاتی ہے اور مرد تو ازل سے ہی ان کی غلام ہیں۔

"غم ہے یا خوشی ہے تو" ابتدا شعر سے ہوئی تھی اور انداز بیان بھی مزے کا لگا۔ دونوں باپ بیٹے کی کیمسٹری غضب کی تھی۔ سسر کی داستان زلیخا سنتے سنتے یہ تو یاد ہی نہیں رہا کہ داستان کے درمیان باقی آئندہ بھی آئے گا۔ ویسے ہی جیسے شادیوں میں جلدی جلدی کھانا کھاتے ہوئے گلے میں پھندا لگ جائے تو پانی آ جاتا ہے درمیان، ویسے ہی۔ لو جی التمش کی بیوی زرمین بنی یا سونیا۔ ویسے اتنی سگھڑ کڑی کیتھوں لبھ لی سی رائٹر جی کرن کتاب میں یہ ہنر والی باتیں بھی شائع کریں۔ جیسے جینز کے بیگ وغیرہ کیونکہ میرے پاس تو Net نہیں ہیں۔

منشا علی کی "جنڈری" بھی کمال کی تھی۔ عاشی کو اپنی محنت کا آخر صلہ مل ہی گیا۔ اچھی تربیت بھی رائگاں نہیں جاتی۔

افسانے اچھے لگے۔ راشد رفعت کا "جنتیں تو ایسے" دادی کی پالیسی کی داد دینی پڑی۔ ایویں تو نہیں کہتے ہیں۔ عقل مند بزرگ بھی ایک نصیحت ہوتے ہیں۔ نفیسہ جی کا "زمانہ شناس" بھی اس زمانے کی حقیقت بیان کی ہیں کہ جو جتنا منافق ہو گا وہ اتنا ہی کامیاب ہو گا۔ دنیا میں "پھر وہی کہانی" ہاں جی پھر وہی ہی کہانی۔ وہی موضوع کائنات میں تو دو ہی تو مخلوق ہے مرد اور عورت جن کے درمیان اس کائنات کا سارا نظام چل رہا ہے۔ بس گزارے لائق تھا۔ کرن کے مستقل سلسلے سارے اچھے ہوتے ہیں مگر اس بار "کچھ موتی چنے ہیں" پہلا موتی اقتباس دل کو ہلا گیا۔ کیا سچی اور کھری بات کہی ہے۔

اس ماہ کی شاعری قابل رشک تھی۔ "تا مے میرے نام" کیا خوب محفل سجی تھی۔ دعا کریں میرے بچے گھر آ جائیں۔ میری ہانیہ فرسٹ آئی ہیں اور حسین بس پاس۔ پتا نہیں کیوں زندگی وچوں رولا نہیں مکھ دا اے رولا مکھ جائے تے فیر جائے دا کی اے۔

ج: فوزیہ جی! آپ کا خط ہم تک پہنچے اور ہم اس کو آپ قارئین کی محفل میں شامل نہ کریں ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ادارہ کرن کی جانب سے ہانیہ اور حسین کو کامیابی مبارک اللہ تعالیٰ ان کو زندگی کے ہر امتحان میں کامیابی عطا کرے آمین۔

آپ سب قارئین بہنوں سے گزارش ہے کہ اگر وہ کسی کے نام کوئی پیغام دینا چاہتی ہیں یا کسی کی کمی محسوس کر رہی ہیں تو اس کے نام پیغام بھیج سکتی ہیں۔ کرن کتاب میں "آپ کا پیغام اپنوں کے نام" اسی لیے شروع کیا گیا ہے۔ صفحات کی کمی کی وجہ سے ہم "تا مے میرے نام" میں پیغام شامل کرنے کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

انیلا...... وہاڑی

اس بار کا شمارہ ادارے اور مصنفات کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ سب سے پہلے تو شکریہ ادا کروں گی تنزیلہ جی کا، جلد آ گئیں نخرے نہیں کیے۔ "غم ہے یا خوشی" پہلی قسط بہت اچھی لگی، انداز بیان بہت دلچسپ۔ شکریہ تنزیلہ ریاض۔ اب بات کروں گی جس کہانی نے پورا سال بے چین رکھا وہ ہے "مجبور نشیمن"۔ اس کہانی میں الفاظ کو اتنے پیارے انداز اور حالات سے سجایا بے ساختہ واہ نکلی اور دیوانے ہو گئے آپ کے طرز تحریر کے۔ مصباح اب نخرے مت دکھائیے گا پلیز آپ دوبارہ جلدی آئیں مہربانی۔ نگہت عبداللہ کا وہی حسب عادت گھر کی کہانی سادگی سے شاندار۔ وہی دیورانی جیٹھانی کی مثال۔ خیر پڑھا جا رہا ہے اب یوں نہیں کہ دیکھا ہی نہیں میں نے شکریہ پھر بھی۔ احتل عزیز کے سونے بھرے ہنستے مسکراتے ہلکے پھلکے جملے

PakiBooks.Site

ایک مکمل ناول کی صورت پورا مزا۔ راشدہ رفعت، اور نفیسہ سعید افسانوں کی لسٹ میں ہوں تو بھلا پھر کیونکر رہا جائے۔ بیسٹ! "جادوگرنیاں" بھی خوب۔ نگہت سیما کا اپنا انداز...... معاشرہ اور گہرائی۔ مستقل سلسلے جان دار۔ "سروے" بہت مزے کا لگا اور بھئی کرن کتاب تو بہت نکھر گئی ہے۔ بہت چھو رہے ہیں آپ۔

ج: انیلا جی! کرن کو پڑھنے کا بہت شکریہ۔ لیکن سستی چھوڑیے اور "نامے میرے نام" میں ہر ماہ شامل ہونے کی کوشش کیجیے۔

امِ ہانی...... چکوال

مصباح علی کے ناول نے تو دل جیت لیا۔ مصباح جی ایک گزارش ہے اب انڈر گراؤنڈ مت ہو جایئے گا ہمیں آپ کے اگلے ناول کا آج سے ہی انتظار ہے۔ "من مورکھ" آسیہ جی کیا بات ہے بھئی ویسے حقیقت تو یہ ہے مجھے یہ ناول صرف شروع کی اقساط پسند آئی تھیں لیکن آخری قسط میں جان ڈال کر دل لوٹ لیا بابر اور حوریہ زبردست۔ نگہت عبداللہ کا ناول پڑھ تو رہی ہوں لیکن پرانا اسٹائل ہے۔ واہ جی تنزیلہ ریاض ایک بار پھر جلوہ افروز...... نگہت سیما واہ رے "جادوگرنیاں" منشا محسن کی "جنڈری" الفاظ کا الجھاؤ اور سلجھاؤ دونوں رنگ ملے، ان کی کہانی میں ویری نائس۔ آخری میں ایک فرمائش ایف ایم 98 کے آر جے علی سے ملاقات کروا دیں پلیز۔

ج: پیاری ام ہانی! کرن پر تبصرہ کیا مگر ادھورا سا امید ہے آئندہ پورے تبصرے کے ساتھ شرکت کریں گی۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی جائے گی۔

سدرہ...... فاروق آباد

کہنے سننے لکھنے کے لفظ مصباح علی نے چھوڑے ہی کہاں۔ لیکن داد ہے ان کے قلم کو کمال در کمال مصباح جی اگر "مجبور نشیمن" کو کرن کا شاہکار ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس ناول سے میں نے تو یہ سیکھا کسی کا دل نہیں دکھانا چاہیے۔ میں نے تو بہت لوگوں سے معافی بھی مانگی میرے پاس لفظ نہیں اس کہانی کی تعریف کے لیے "من مورکھ" کی بھی آخری قسط اور وہ بھی جان دار، خاص کر مومنہ کا گلاب کے باسی پھول کو سنبھالے رکھنا، بابر کو حوریہ مل گئی گڈ آسیہ مرزا۔ نگہت عبداللہ کا "ہوائیں رخ بدل گئیں" وہی ان کا اپنا اپنا سا انداز۔ امت العزیز نے مسکراہٹ کا جال ڈالنے کی بہتر کوشش کی اور کامیاب بھی رہیں۔ افسانے، راشدہ رفعت ہوں تو بھلا پھر کہیں کوئی ٹھہر پاتا ہے۔ معذرت کے ساتھ نادیہ احمد کا افسانہ گھسا پٹا ٹاپک اچھا نہیں لگا۔ مریم ماہ منیر کا افسانہ بیٹیوں کی ماں اور میاں صاحب کی دوسری شادی عام ٹاپک اور لکھنے میں دلچسپی کا عنصر ناپید تھا۔ منشا محسن نے بہت خوب صورت لکھا۔ گڈ۔ باقی مستقل سلسلے لاجواب اور سروے بھی بہت اچھا لگا۔ واقعی سالگرہ نمبر، سالگرہ نمبر ہی لگا۔

ج: پیاری سدرہ! سالگرہ نمبر کی پسندیدگی کا شکریہ۔

مسز سکندر احمد...... بھاگٹانوالہ

ایک ورکنگ ویمن کی زندگی اس قدر دائروں میں گھومتی ہے کہ اپنی پسند ناپسند تو ایک جانب، ذات تک یاد نہیں رہتی۔ رات تک اتنی تھکن ہو جاتی ہے یہ بھی یاد نہیں رہتا کروٹ بدلی بھی یا نہیں۔ اگر زندگی میں رسالے نہ ہوتے شاید مجھ جیسے بھاگتی مصروف خواتین تو پاگل ہو جاتیں۔ خط نہ لکھنے کی وجہ بھی مصروفیت ہے۔ مگر خط لکھنے کی وجہ "مجبور نشیمن" اس ناول نے تو بیٹ باندھ لیا ہو۔ سوچا تھا کہ ناول مکمل ہونے کے بعد تبصرہ کروں گی مگر اب جب ناول مکمل ہو گیا تو لفظ ہی نہیں مل رہے ہیں۔ مصباح جی آؤٹ اسٹینڈنگ شروع سے آخر تک دلچسپی ایسے بھی فرحت اشتیاق کا قلم ڈوب کے لکھتا تھا بہت عرصے بعد لگا کہ وہ پھر سے ادارے میں مصباح کے روپ میں آ گئیں۔ سالگرہ نمبر میں سب ہی نام قابل احترام تھے۔ راشدہ رفعت، نگہت سیما اور سب کی فیورٹ تنزیلہ ریاض۔

کرن کتاب "کرن کا دسترخوان" میں پیغامات کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے میں بھی پیغامات بھیجا کروں گی۔

ج: پیاری بہن! بہت اچھا لگا یہ پڑھ کر کہ آپ اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر کرن پڑھتی ہیں۔ سالگرہ نمبر کی پسندیدگی کا شکریہ۔ "کرن کا دسترخوان" میں اپنے پیغامات ضرور ارسال کیجیے شائع کر دیے جائیں گے۔

ماہ نور انجم...... نارتھ ناظم آباد کراچی

کرن کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے مانند ہے۔ بس اتنا کہوں گی اس کی ہر تحریر منفرد اور اچھوتی ہونے کے ساتھ آگاہی اور شعور کے بہت سے در وا کرتی ہے۔ گزشتہ برس بھی خط لکھنے کی جسارت کر چکی ہوں جو اشاعت کی سند نہ پا سکا۔ خیر! امید پہ دنیا قائم ہے کہ مصداق اپنی ناقص رائے کے ساتھ ایک بار پھر حاضر ہوں۔ مصباح علی سید کو ایک شاندار ناول مکمل کرنے پہ ڈھیروں مبارکباد۔ تعریف کے لیے ہر لفظ چھوٹا محسوس ہو رہا ہے۔ یہی کہوں گی کہ اللہ تعالیٰ زور قلم مزید بڑھائے۔

اب آتے ہیں بقیہ شمارے کی طرف۔ ہوائیں آہستہ آہستہ رخ بدل رہی ہیں دیکھتے ہیں نگہت عبداللہ انہیں آندھی میں کس طرح تبدیل کرتی ہیں۔ "جنڈری" میں منشا نے خوب صورت انداز میں لڑکیوں کو گھر بسانے کے متعلق اچھا سبق دیا۔ "جئیں تو ایسے" میں دادی کی حکمت عملی بہت بھائی۔ انتش کے خود پسند ڈائیلاگز پسند آئے۔ تنزیلہ ریاض اگلی قسط کا انتظار ہے۔ "جادوگردنیاں" گو کہ موضوع پرانا تھا لیکن طرز تحریر اچھا لگا۔ مریم ماہ منیر نے عورت کے اعلا ظرف کو خوب صورتی سے لفظوں میں ڈھالا۔ جب

"V ویڈ" ہلکی پھلکی تحریر تھی پسند آئی۔ سونے دی تاویتری میں مراد کی اردو نے بہت ہنسایا لیکن اگر مراد کے کردار سے ہٹ کر دیکھیں تو کہانی کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ کرن کو بھی لیٹ سالگرہ مبارک۔

ج: پیاری ماہ نور! ہمیں آپ کا یہ پہلا خط موصول ہوا اور شائع کر دیا گیا۔ آپ ہر ماہ "نامے میرے نام" میں شریک ہو سکتی ہیں ہمیں خوشی ہوگی۔

اقراء ممتاز...... سرگودھا

اس دفعہ کرن حسب معمول کی طرح 16 تاریخ کو مل ہی گیا۔ ٹائٹل گرل کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ سب سے پہلے سروے میں تمام بہنوں کو پڑھا کنزہ ہاشمی کیا خوب صورت ایکٹر ہے "میری بھی سنئے" میں زاہد افتخار احمد کی بھی باتیں سنی پڑھیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ نگر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حنا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-
زرد موسم	راحت جبیں	1000/-
حساب دل رہنے دو	نبیلہ عزیز	400/-
محبت من محرم	سمیرا حمید	400/-
ایک تھی مثال	رخسانہ نگار عدنان	500/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	400/-
دست مسیحا	نگہت سیما	400/-
گل کہسار	فرح بخاری	400/-

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

اب بات ہو جائے اپنے پسندیدہ ناولز کی
''مجبور نشیمن'' مصباح علی نے ایک سال ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ بہت بہت مبارک ہو اتنا اچھا ناول اپنے اختتام تک پہنچا۔
''من مورکھ'' بھی آخر کار اپنے اختتام تک پہنچا ہپی ہپی اینڈ رہا۔ ''سونے دی تادیتری'' کتنی میٹھی اسٹوری تھی ایک تو ایسا کر رہا تھا جیسے گاؤں میں بسنے والے لوگ ان پڑھ اور جاہل ہوں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ مراد اور ایک کی نوک جھوک سے خاص لطف اندوز ہوئے انجمن نے بھی ایک کو کیا تگنی کا ناچ نچایا۔
''جادوگرنیاں'' نگہت سیما جب بھی لکھتی ہیں کچھ منفرد ہی لکھتی ہیں۔ ہاشم نے جو ہی کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ بغیر کچھ سنے ہی اتنی بڑی سزا دے ڈالی۔ ''جنڈری'' اس ناولٹ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے منشا محسن علی نے کیا خوب صورت سبق دیا ہے۔ دل خوش ہو گیا۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔
ج: پیاری اقراء! کرن پر تبصرہ کرنے کا بے حد شکریہ۔

ڈاکٹر مریم، ڈاکٹر فارہ، ڈاکٹر صبیحہ، کنگ ایڈورڈ۔ لاہور
ایک نہایت تھکا دینے والی تعلیم میں اگر میں ادب پڑھنے والوں کو یہ بتاؤں کہ میڈیکل کالجز میں رسالے کس دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں تو یقیناً سب حیرت کریں گے۔ نہ صرف لڑکیاں بلکہ لڑکے بھی ان ہی رسالوں کے ذریعے تھکن اتارتے ہیں۔ ''مجبور نشیمن'' کے حوالے سے جب ڈسکس ہوا تو بھرپور ہوا۔ اسی ناول نے باقی کرن پڑھنے پر اکسایا۔ اس ماہ کے کرن میں پھر تنزیلہ ریاض نائس۔ امتل عزیز کا ''سونے دی تادیتری'' ہم لڑکیوں سے زیادہ ہماری کلاس کے لڑکوں کو پسند آیا اور ان کی زبان پر یہ ہی گانا رہا۔ ''جادوگرنیاں'' ہائے سیما نگہت جی بہت پیارا موضوع۔ ہماری ٹیچر ڈاکٹر الماس کی جانب سے بہت سا سلام وہ نگہت سیما کی بہت بڑی فین ہیں۔ ہم لڑکیاں بہت مشکل سے رسالے منگواتی ہیں۔ لڑکوں سے منگواتے ہیں اللہ بھلا کریں ان کا فی رسالہ سو روپے کالا
کر دیتے ہیں لیکن یہ نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔
ڈیئر مدیرہ! کبھی خط لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا جو سمجھ میں آیا لکھ دیا آئندہ بھی شامل ہونے کی اجازت چاہیں گے۔
ج: بہت خوشی ہوئی کہ میڈیکل کے طلباء بھی ''کرن'' پڑھتے ہیں آپ ڈاکٹرز نے اپنی رائے سے آگاہ کیا بہت شکریہ۔ آئندہ بھی آپ لوگ کرن کی محفل میں شریک ہو کر اپنی رائے کا اظہار کیجیے گا۔ ڈاکٹر الماس کا سلام نگہت سیما تک پہنچا دیا جائے گا۔

نادیہ حسین.....گوجر خان
سب سے پہلے تو کروں گی اس کی بات جس نے ہمارے دلوں میں ہل چل مچا رکھی تھی ''مجبور نشیمن'' تو کوئی ایسی جادوگری تھی جس میں مصباح نے ہمیں جہاں جہاں گھمایا ہم ان کے ساتھ بخوشی گھومے۔ ناول میں کہیں بھی بوریت نہیں ہوئی بہت ہی پرفیکٹ اختتام۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' اب تو ہوائیں تو کیا طوفان بھی رخ بدل جاتے ہیں۔ ''من مورکھ'' آسیہ مرزا کا ایک بہترین ناول مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ بلا جواز الاسٹک بنا کر کھینچا نہ جاتا بہرحال ہپی اینڈنگ کر کے ناول بیوٹی فل کر دیا۔ ''غم ہے یا خوشی ہے تو'' پہلی قسط تو سو سو لگی آگے چل کر دیکھتے ہیں کتنی خوشیاں اور کیسے غم تنزیلہ لائی ہیں اس اسٹوری میں۔ امت العزیز نے ہلکے پھلکے موضوع سے سالگرہ نمبر کو بھرپور سجایا۔ پنجابی کے تڑکے کمال کر دیتے ہیں۔
افسانوں میں کوئی متاثر کن نہیں لگا ہاں مریم ماہ منیر کے افسانے کا اسٹارٹ تو اچھا تھا مگر اختتام فضول ہی لگا حالانکہ ہپی اینڈنگ تھا مگر طرز تحریر مزے کی نہیں لگی۔
ج: پیاری نادیہ! اپنی پسند اور ناپسند سے آگاہ کرنے کا بے حد شکریہ۔
نوٹ:۔
پیاری صبا شریف! آپ کا خط تاخیر سے ملنے کی وجہ سے شائع نہیں کیا مگر پڑھ ضرور لیا گیا ہے اور پیاری کنیز ہو زاہرہ بیا! آپ کی تحریر ناقابل اشاعت ہونے کی وجہ سے شائع نہیں کی گئی۔

☆☆